حفاظت قرآن مجید اور مستشرقین

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر

سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز، پنجاب یونیورسٹی

حفاظتِ قرآن مجید اور مستشرقین

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر
سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز، پنجاب یونیورسٹی

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: ۸۸۹۸۶۳۹ [illegible]

۲۰۱۸ء

نام کتاب: حفاظتِ قرآن مجید اور مستشرقین

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر

ناشر: دار النوادر

مطبع: عمیر، عثمان، شفیق پریس

صفحات: ۲۶۰

ترتیب

اظہارِ تشکر

"حفاظتِ قرآنِ مجید اور مستشرقین" اہلِ علم کیلئے پیشِ خدمت ہے۔ یہ اللہ کے کلام کی ایک ادنیٰ سی خدمت کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کی یہ خدمت اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے۔ اس پر میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اسی کی توفیق سے یہ کام ممکن ہو سکا۔ میں اللہ کی بارگاہ میں اپنے نہایت ہی محسن اور "قرآن دوست" استاذ حافظ احمد یار رحمتہ اللہ علیہ کیلئے دعا گو ہوں کہ آج سے چالیس برس قبل انہوں نے حفاظتِ قرآن اور مستشرقین کے موضوع پر کچھ پڑھنے اور لکھنے کو کہا۔ اس وقت یہ موضوع بالکل اجنبی تھا۔ اب تو اس موضوع پر لکھنے والوں کی تعداد ہزاروں سے بھی تجاویز کر چکی ہے۔ استاذِ محترم کی زیرِ نگرانی جو کچھ اپنی صلاحیت کے مطابق سمجھ سکا، اسے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالات میں پیش کیا۔

اب وہی مواد کتابی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کام کی تکمیل میں میں اپنے اہلِ خانہ کی حوصلہ افزائی پر ان کا شکر گزار ہوں اور ان کے کیلئے دعا گو ہوں۔ یہ سب اللہ کے ہاں اجر و انعام کے حقدار ہیں۔ میرے اہلِ خانہ خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ میرے بیٹوں کو بھی میری معاونت و خدمت کے لئے مستعد رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنے ان مددگاروں کی معاونت اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کام مکمل نہ کر پاتا۔ میں اپنے بیٹوں احمد عبد اللہ اور راشد محمود کا بے حد ممنون ہوں کہ یہ کام ان کی محبت و خلوص سے بھرپور خدمت کے سبب ہی منظرِ عام پر آیا ہے۔ میں محترم قاری رشید احمد تھانوی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مقالہ کو کتابی شکل دینے اور حوالہ جات کی تصحیح و ترمیم میں بہت قابلِ قدر کردار ادا کیا۔

میرے احباب گرامی جانتے ہیں کہ گزشتہ دس بارہ برس کی انتظامی و تدریسی ذمہ داریوں کے دوران کتاب کی ترتیب و تسوید کا کام کن کن مرحلوں سے گزرا۔ میں اس دوران تعاون کرنے والوں کیلئے دست بدعا ہوں۔ یہ کام اللہ کی مدد اور توفیق ہی سے مکمل ہوا اور خالص اس نیت سے کیا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ میرے لئے توشہ آخرت بنائے۔

حافظ محمود اختر

مقدمہ

انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت کے جس سلسلے کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے کیا تھا قرآن حکیم اس سلسلہ ہدایت کی آخری اور کامل کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے وعدہ فرمایا تھا کہ میری طرف سے ہدایت تمہاری طرف آتی رہے گی۔ جس نے اس ہدایت کی پیروی کی وہ کامیاب و کامران ہوگا اور جس نے اس کی خلاف ورزی کی وہ ناکام و نامراد ہوگا۔[1] قرآن مجید کو ہدایت کی آخری کڑی قرار دیتے ہوئے اعلان فرمادیا گیا ہے کہ

﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ﴾[2]

"بے شک یہ قرآن مجید وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں خوشخبری دیتا ہے۔"

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾[3]

"اور آج ہم نے آپ کے لئے آپ کا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں آپ پر پوری کر دیں اور آپ کے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا"

قرآن حکیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ یہ پہلے انبیاء کی تعلیمات سے ہٹ کر کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتا بلکہ یہ پہلی تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کا جامع اور محافظ ہے۔ اس بات کا ذکر خود قرآن مجید یوں کرتا ہے۔

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾[4]

"اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی

---

(1) البقرۃ: 38 (قلنا اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم مني هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون۔ والذين كفروا وكذبوا بآياتنا اولئك اصحب النار

(2) بنی اسرائیل: 9

(3) المائدۃ: 3

(4) المائدۃ: 48

تصدیق کرتی ہے اور یہ ان تمام کتب پر نگران ہے۔"

اسی بات کا ذکر ایک اور جگہ یوں کیا گیا:

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾ (5)

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر فرمایا جس دین پر قائم رہنے کا حکم نوح کو دیا گیا تھا اور یہی وہ دین ہے جو ہم نے آپ ﷺ کی طرف وحی کیا اسی کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"

قرآن مجید کے اس مقام و مرتبے کا تقاضا تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے کسی تحریف اور تغیر و تبدل سے محفوظ و مامون رہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان فرمایا گیا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾

"بے شک ہم نے یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں"

ہر صاحب علم اندازہ کر سکتا ہے کہ اس ایک آیت مبارکہ میں تاکید کے کتنے الفاظ موجود ہیں۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿لا یاتیه البٰطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید﴾ (6)

"اس باطل کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یہ دانا اور خوبیوں والے اللہ کی طرف نازل ہوئی کتاب ہے۔"

﴿لاتحرك به لسانك لتعجل به۔ ان علینا جمعه وقرآنه۔ فاذا قرانه فاتبع قرآنه۔ ثم ان علینا بیانه۔﴾ (7)

"آپ وحی کی تلاوت کے لئے اپنی زبان نہ ہلایا کریں کہ اسے جلدی یاد کر لیں اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم وحی آپ کے سامنے پڑھیں تو آپ اسے سنا کریں پھر اسی طرح پڑھا کریں۔ اس کے معانی کا بیان بھی ہمارے ذِمہ ہے۔"

قرآن مجید کا کسی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ رہنا عقلی اعتبار سے بھی ناگزیر ٹھہر تا ہے۔ جب سلسلہ

---

(5) الشوریٰ:13

(6) حم السجدۃ:42

(7) القیامہ: 16تا19

نبوت ختم ہو گیا تو عقل بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ "وعدہ ھدایت" کی رو سے "ہدایت الٰہی" کسی تحریف سے محفوظ رہے ورنہ وعدہ ہدایت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

حفاظت کی ان ضمانتوں کے باوجود عالم اسباب میں بھی مسلمانوں نے تاریخ کے کسی بھی موڑ پر اس عظیم کتاب کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ انہوں نے قرآن مجید کے ساتھ اس والہانہ محبت اور لگاؤ کا مظاہرہ کیا کہ دنیا کی کسی اور کتاب اور مذہب سے اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے اسے سینوں میں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا اور کمال احتیاط کے ساتھ اسے لکھا۔ آج دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی دوسری بڑی سے بڑی الہامی یا غیر الہامی کتاب کا کوئی حافظ موجود نہیں ہے جبکہ مسلمانوں کی شاید ہی کوئی ایسی بستی ہو گی جس میں قرآن مجید کے نو عمر، جوان اور بوڑھے حفاظ کرام موجود نہ ہوں۔ اس کی روزانہ تلاوت کی جاتی ہے۔ ہر شخص کے لئے اس کی روزانہ تلاوت کرنے کی ترغیب و احکام موجود ہیں۔ رمضان المبارک میں نماز تراویح میں اس کی پورے اہتمام کے ساتھ تلاوت کا سلسلہ ہر دور میں تسلسل سے جاری رہا ہے، جس شخص کو قرآن پاک کا کوئی حصہ زبانی یاد نہ ہو اسے تباہ شدہ گھر سے تشبیہ دی گئی ہے، یہ ایسی مثالیں ہیں جنہیں ہم اپنے مذہبی پس منظر اور اپنے مذہب سے جذباتی لگاؤ کی بنا پر ہی مسلمات کے طور پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کا مشاہدہ ہر مسلم و غیر مسلم ہر روز کر سکتا ہے۔ قرآن مجید کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ کسی اور کتاب کی حفاظت کا ذمہ نہ تو اللہ تعالیٰ نے لیا اور نہ ہی کسی کے متن کو محفوظ کرنے کے لئے انسانوں نے اس قدر اہتمام کیا ہے۔

لیکن ان تمام حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے مستشرقین نے قرآن مجید کے متن کے محفوظ ہونے پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اعتراضات درحقیقت مسلمانوں کے اس موقف پر جوابی حملہ ہے کہ تورات و انجیل میں تحریف ہو چکی ہے۔ ورنہ قرآن مجید کے متن کی صحت جیسی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

میری اس کاوش کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات کا تحقیقی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ واضح کیا جائے کہ ان اعتراضات کا مقصد اور پس منظر کیا ہے۔ یہ اعتراضات انہوں نے کہاں سے حاصل کئے ہیں اور ان اعتراضات کو اچھالنے میں وہ کس قدر مبالغہ آرائی کر رہے ہیں۔

مستشرقین کے متن قرآن مجید کی صحت پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مندرجہ ذیل پہلوؤں کو بنیادی طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔

- مستشرقین کون ہیں؟ استشراقی تحریک کا ذہنی پس منظر اور مقاصد کیا ہیں؟

o ان لوگوں نے اسلام پر تحقیقات کرتے ہوئے کن مآخذ سے استفادہ کیا ہے؟ ان ماخذ کی علمی حیثیت کیا ہے؟ تاکہ یہ واضح کیا جاسکے کہ مستشرقین نے اسلام دشمنی کے جذبات میں بہہ کر ناقص اور غیر معتبر ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے خلاف حقیقت نتائج جان بوجھ کر پیش کئے ہیں۔ ان کے ماخذ کے حوالے سے یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے پیشرو مستشرقین ہی کی اندھی تقلید کی ہے۔ اگر کسی مستشرق کو اسلام کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی یا اس نے ازراہ تعصب دانستہ طور پر اسلام کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا تو بعد میں آنے والوں نے ان کی پیروی کرتے ہوئے غلط روش اختیار کر لی۔ گویا پہلی اینٹ اگر غلط رکھی گئی تھی تو مستشرقین کی عمارت کا ٹیڑھا پن بڑھتا ہی چلا گیا، کم نہیں ہوا۔

مستشرقین نے مکتب شیعہ کی کچھ غیر معتبر روایات کو اپنے نقطہ کی تائید میں پیش کیا ہے جن میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ موجودہ قرآن مجید محرف ہے اصلی نہیں ہے۔ ہم نے شیعہ علماء کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ خود شیعہ علماء کے نزدیک ایسی باتیں ناقابل اعتبار ہیں اور جن راویوں نے ایسی بات کی ہے وہ خود اہل تشیع کی نگاہ میں جھوٹے اور فساد برپا کرنے والے ہیں۔ ہم نے واضح کر دیا ہے کہ مستشرقین کے دلائل کی یہ بنیاد بھی بہت کمزور ہے اور اس سے ان کے نقطہ نگاہ کی تائید نہیں ہوتی۔

کتاب میں مستشرقین کے ایسے اقوال بھی نقل کئے ہیں جن میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ہمیں ناقص ماخذ کی بنا پر قرآن مجید اور اسلام کو سمجھنے میں غلطیاں لگی ہیں۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ، عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں قرآن مجید کی ترتیب میں تصرفات کئے گئے۔ یہ تمام تصرفات متن قرآن مجید میں تغیر و تبدل کی ایک صورت ہیں۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ واضح کیا جائے کہ ترتیب قرآن مجید توقیفی ہے اس میں کسی بھی انسان کو سرِ مُو تبدیلی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ ایسا کسی نے کیا اور نہ ایسا ممکن تھا۔ مستشرقین کا زور قلم یہ ثابت کرنے میں بھی صرف ہوا ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں بلکہ یہ حضور اکرم ﷺ کی اپنی تصنیف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں سے بعض نے کہا تھا کہ ہم حضور اکرم ﷺ کے سامنے قرآن گھڑا کرتے تھے اور بعض لوگوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے متن میں شامل کر لیا۔ گویا اس طرح مستشرقین قرآن مجید کے متن کو مشکوک بنا ڈالتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ جس حصے کو چاہتے اپنی مرضی سے قرآن میں شامل کر لیتے اور جسے چاہتے نکال دیتے۔ اس طرح آپ ﷺ کے ہاتھوں قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا اور کچھ باقی بچا۔

کتاب میں واضح کیا ہے کہ مسلمانوں نے اسی چیز کو حفظ کیا اور اسے ہی لکھا جو قرآن مجید تھا۔ اس

سلسلے میں عرضہ اخیرہ ہمارے سامنے معیار کے طور پر موجود ہے۔ اس کے بعد ترتیب زمانی کے اعتبار سے مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے مثلاً

1. عہد نبوی ﷺ میں حفاظت قرآن مجید
2. عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اعتراضات
3. عہد عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے سے کئے گئے اعتراضات

مستشرقین کے اعتراضات کی ایک قسم وہ ہے جس کی بنیاد قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہے۔ ناسخ و منسوخ کو بنیاد بنا کر مستشرقین کی طرف سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے بہت سارے حصے ضائع ہو چکے۔ ان اعتراضات کے جواب کے لئے مستقل باب قائم کیا گیا ہے۔

"سبعہ احرف" اور "اختلاف قراءت" ایسے موضوعات ہیں جنہیں مستشرقین نے غلط معانی (دانستہ طور پر) پہنائے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں ہی قرآن مجید کا متن متفق علیہ نہ تھا بلکہ اس میں اختلافات پائے جاتے تھے۔

ہم نے ان دو پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ صرف انہی پہلوؤں پر بحث کی جائے جن کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔ صرف اسی قدر مواد پیش کیا گیا ہے جس سے یہ واضح ہو کہ مستشرقین کا یہ موقف مکمل طور پر بے بنیاد ہے کہ قرآن مجید کا 6/7 حصہ ضائع ہو چکا ہے کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ حروف ضائع کر کے صرف ایک حرف باقی رکھا تھا۔ بلکہ قرآن مجید کے متن میں جائز قراءتیں موجود ہیں۔ کوئی چیز جو قرآن مجید کا حصہ تھی، قرآن سے کسی نے بھی خارج نہیں کی۔

اختلاف مصاحف کو بنیاد بنا کر بھی مستشرقین نے قرآن مجید میں اختلافات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں بہت سے لوگوں کے پاس قرآن مجید کے نسخے موجود تھے۔ پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے (سرکاری) نسخہ تیار کروایا تو اس کے بعد بھی یہ مصاحف زیر تلاوت رہے (گویا اختلافات متن موجود رہے) اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے متفقہ نسخہ تیار کروایا تو اس کے بعد بھی مصحف ابن مسعود۔ مصحف اُبیّ ابن کعب رضی اللہ عنہ، مصحف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بہت سے دیگر مصاحف موجود رہے۔ اور قرآن مجید کے متن کے اختلافات موجود رہے۔

ہم نے اختلاف مصاحف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ انفرادی مصاحف کی اصل حیثیت قرآن مجید کے مقابلے میں (جو کہ متواتر ہے) کیا ہو سکتی ہے۔ ہم نے منطقی استدلال سے بھی واضح کیا ہے کہ ان مصاحف کا قرآن مجید کے اصل متن سے کوئی تصادم نہیں تھا۔ جو اختلافات اچھالے گئے ہیں اگر

وہ قرآن مجید کے متن کا حصہ ہوتے تو وہ کسی طرح بھی قرآن مجید سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان اختلافات کی حیثیت زیادہ سے زیادہ شاذ قراءتوں کی ہو سکتی ہے اور تواتر قرآن مجید کے مقابلے میں شاذ کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے۔

کچھ اعتراضات ایسے ہیں جنہیں ہم نے متفرق اعتراضات کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے ان میں ایسے اعتراضات شامل ہیں جن کا تعلق مذکورہ بالا عناوین میں سے کسی عنوان کے ساتھ نہیں تھا۔

آخر میں ایک باب "حفاظت قرآن مجید پر خارجی شواہد" قائم کیا ہے۔ اس باب میں ایسے شواہد پیش کئے گئے ہیں جن کی موجودگی میں اس بات کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ مثلا

1. حفظ قرآن مجید میں تسلسل اور عربوں کا غیر معمولی حافظہ
2. قرآن مجید کی زبان کا تسلسل اور زندہ ہونا
3. عربی متن کے بغیر قرآن کی کتابت وطباعت کی ممانعت
4. رسم الخط عثمانی کے علاوہ کسی اور خط میں قرآن مجید لکھنے کی ممانعت وغیرہ

مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہم نے جو حکمت عملی اپنائی ہے اس کے چند اہم پہلو یہ ہیں:

ایک عنوان کے تحت کئے گئے اعتراضات کو یکجا کر لیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے عہد نبوی ﷺ، عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عہد عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بھی الگ الگ ابواب قائم کر کے ان ادوار کے حوالے سے کئے گئے اعتراضات الگ الگ ابواب میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔

اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے مستشرقین کی اصل عبارات پیش کی گئی ہیں اور اپنی طرف سے کسی توجیہہ یا توضیح سے اجتناب کیا گیا ہے۔ عقلی اور نقلی دونوں طرح کا استدلال کیا گیا ہے۔

اگرچہ بظاہر یہ بات محل نظر دکھائی دیتی ہے کہ وہ مستشرقین جو ہماری کتب اور ماخذ کو تسلیم ہی نہیں کرتے ہم ان کے سامنے قرآن، حدیث اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے دلائل پیش کر کے ان کے اعتراضات کا جواب دیں لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب مستشرقین قرآن مجید پر اعتراض کرتے ہوئے قرآن کی کوئی آیت یا حدیث دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں تو اگر اسی قران اور حدیث سے ان کے نقطہ نگاہ کے خلاف دلیل ملتی ہو تو اخلاقا اپنے موقف کے برعکس دلیل کو بھی تسلیم کرنا چاہئے۔ اگر ایک مستشرق "الاتقان فی علوم القرآن" سے ایک اعتراض پیش کرتا ہے (جبکہ الاتقان کی مدد سے ان لوگوں نے لاتعداد اعتراض کئے ہیں) تو اگر اسی کتاب کے اندر سے اس کے خلاف دلیل ملتی ہے تو (اس کتاب پر ایمان رکھنے یا نہ

رکھنے سے قطع نظر) انہیں اس دلیل کو تسلیم کرنا چاہیے۔ اس لئے کسی باب میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے سب سے پہلے نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن اسی پر اکتفا نہیں کر لیا گیا بلکہ نقلی دلائل کے بعد منطقی اور عقلی دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔

ہر باب کے آغاز میں مستشرقین کے اعتراضات تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ جوابات شروع کرنے سے قبل ان اعتراضات کا ملخص اور نچوڑ پیش کیا گیا ہے اور در حقیقت اسی نچوڑ کا جواب دینے کا التزام کیا گیا ہے۔ جزئی اعتراضات جو دراصل کسی موقف کو ثابت کرتے ہوئے کسی مستشرق نے بطور دلیل پیش کئے، زیر بحث نہیں لائے گئے۔ ماسوائے اس کے کہ اس جزئی بات کی اپنی ذاتی کوئی اہمیت ہو۔

کتاب میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ مستشرقین اور مشرکین مکہ اور ابتدائی دور اسلام کے دیگر معاندین اسلام کے انداز فکر اور رویہ میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ مستشرقین نے بالعموم اپنے انہی پیشروؤں کے انداز ہی کو اپنایا ہے۔ مثلاً یہ کہ حقائق کو مسخ کیا جائے، کتمان حقائق، اسلام کے خلاف بغض، قرآن مجید کو جادوگر کا کلام، شاعر کا کلام، پرانے زمانے کی کہانیاں وغیرہ قرار دینا، یہ فیصلہ نہ کر سکنا کہ قرآن مجید ہے کیا؟

جواب تحریر کرتے وقت آغاز میں اسلامی نقطہ نگاہ سے قرآن مجید حدیث شریف اور علمائے اسلام کے اقوال کی روشنی میں موضوع کی وضاحت کی گی ہے۔ اس کے تمام پہلو اس انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بہت سے اعتراضات کی وضاحت اسی حصے میں ہو جاتی ہے۔

حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ براہ راست بنیادی ماخذ کی روشنی میں حقائق پیش کیے جائیں۔ مستشرقین کے افکار ان کی کتابوں سے براہ راست حاصل کئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ ان کی لا تعداد کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے، تاہم مستشرقین کی لکھی ہوئی ہر دوسری کتاب میں ہمارے موضوع کے بارے میں مواد موجود ہے۔ اس لئے ہم نے وہ اعتراضات پیش کیے ہیں جو تمام مستشرقین کے ہاں "مشترک اعتراضات" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلے باب میں مستشرقین کی تحقیقات کا فکری، سیاسی اور مذہبی پس منظر، اسلام کے بارے میں ان کی تحقیقات کی نوعیت، ان کے مآخذِ تحقیق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ اسلام کے بارے میں ان کا رویہ جارحانہ ہی ہوتا ہے اس لئے قارئین کرام کو مذکورہ بالا پہلوؤں سے متعارف کروانا ناگزیر ہے کہ وہ اس پس منظر اور انداز تحقیق کو جان سکیں جس پر مستشرقین عمل پیرا ہیں۔ اسی باب میں ان کی علمی و تحقیقی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو کمزور مآخذ کو بنیاد بنانے اور کسی تحقیقی معیار کی مکمل پیروی نہ کرنے کی وجہ سے سامنے آئی ہیں۔ اس باب میں قارئین کرام کو استشراقی تحقیقات کے معیار کی چند جھلکیاں دکھائی گئی ہیں تا کہ وہ

اندازہ کر لیں کہ معاندانہ ذہنی پس منظر، کمزور مآخذ سے استفادہ اور مسلمہ تحقیقی اصول و ضوابط کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے مستشرقین جگہ جگہ غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔

پہلے باب میں مستشرقین کی اسلام کے بارے میں تحقیقات کا یہ پہلو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کے زیرِ استعمال مآخذ کی علمی و تحقیقی حیثیت و مقام کیا ہے۔ واضح کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو ان کے ہاں معتبر اور غیر معتبر مآخذ کا کوئی تصور نہیں، دوسرے یہ بات کہ معتبر یا غیر معتبر مآخذ سے وہ وہی روایت لیتے ہیں جو ان کے مزعومہ پیشگی طے شدہ نقطہ نگاہ کی تائید کرتی ہو۔

اسی باب میں مسلمانوں کا معیارِ تحقیق اور اصولِ تحقیق بیان کئے ہیں تاکہ موازنہ ہو جائے کہ مسلمانوں کے ہاں کس قدر سخت قسم کے معیارات موجود ہیں۔ اس سے قارئینِ کرام اسلامی معیاراتِ تحقیق اور مغربی معیاراتِ تحقیق کو ساتھ ساتھ رکھ کر اندازہ کر لیں کہ مستشرقین کی تحقیقات کی کیا وقعت اور حیثیت ہے۔ خاص طور پر جب وہ متنِ قرآن جیسے اہم اور حساس موضوع پر پورے شدومد کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں تو پھر انہیں اپنا معیارِ تحقیق کم از کم قابلِ قبول اور تحقیق کے مسلمہ بین الاقوامی معیارات تک تو بلند کرنا چاہیے۔

دوسرے باب میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ مستشرقین قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں نبی کریم ﷺ اس وقت کے حالات اور ماحول سے پریشان رہتے تھے اور تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اس کیلئے وہ غارِ حرا میں الگ بیٹھ کر سوچ و بچار کرتے۔ مستشرقین یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا معاشرتی زندگی سے الگ تھلگ ہو کر غور و فکر میں مشغول رہنے کا طریقہ آپ نے پہلے مذاہب کے مطالعہ سے سیکھا ہے۔ آپ کا دیگر مذاہب کے علماء سے رابطہ تھا۔ آپ پہلے مذاہب کی کتابوں کی تعلیمات سے بھی کسی نہ کسی طریقے سے آگاہ ہو رہے تھے مختلف ذرائع سے آپ کے متعین کردہ لوگ آپ کو معلومات فراہم کر رہے تھے۔ آپ نے ان تمام ذرائع سے حاصل ہونے والے مواد کے ساتھ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو ملا کر قرآن مجید تیار کر لیا۔ اس نقطہ نگاہ کے ردّ کے لئے صرف قرآن و حدیث سے ہی دلائل نہیں دیئے گئے بلکہ عقلی و واقعاتی شواہد سے بھی ان کے نقطہ نگاہ کا ردّ کیا گیا ہے۔ اس باب میں خصوصی طور پر قرآن مجید کے منزل ہونے پر عقلی دلائل دیئے گئے ہیں۔

قرآن مجید کا متن کسی تحریف سے بالکل مبرا ہے۔ یہ بات محض مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہی نہیں بلکہ دلائل و شواہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری کے باوجود مسلمانوں نے عالمِ اسباب میں حفظِ قرآن، کتابتِ قرآن، تسلسل سے اس کی تلاوت اور اس پر عمل

کرتے ہوئے اس کی حفاظت کی عظیم اور مقدس ذمہ داری پوری کی۔ اس کتاب میں حفاظتِ قرآن کو مندرجہ ذیل ترتیب سے دلائل پیش کر کے واضح کیا گیا ہے۔

☆ قرآن مجید کا اعلان کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ کے سپرد ہے۔

☆ نزول قرآن مجید کے ساتھ ہی اس کی کتابت اور حفظ کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ ثقہ روایات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نازل شدہ وحی کو لکھوانے کو سب کاموں پر ترجیح دیتے تھے۔ نہ صرف وحی کو فوری طور پر لکھوانے کا اہتمام تھا بلکہ نزول وحی کے ساتھ ہی آیات کی ترتیب بھی متعین کر دی گئی تھی اور صحابہؓ روزانہ کی تلاوت اور نمازوں میں اسی ترتیب سے پڑھتے تھے۔ ترتیبِ قرآن سے سبھی لوگ مکمل طور پر آگاہ تھے اور اس سلسلے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس موضوع پر تفصیلات تیسرے باب میں موجود ہیں۔ یہاں بھی عقلی، نقلی اور واقعاتی شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

☆ عہدِ صدیق اکبرؓ میں ایک متفقہ نسخہ کس احتیاط اور اہتمام سے تیار کیا گیا اس کی تمام تفصیلات چوتھے باب میں بیان کی گئی ہیں۔ مستشرقین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ جب مسلمانوں نے عہدِ صدیق اکبرؓ میں قرآن کا نسخہ تیار کرنے کی کوشش کی تو وہ اس وقت بھی مکمل قرآن اکٹھا نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں اشکالات کا ازالہ کیا گیا ہے۔

☆ پانچویں باب میں عہد عثمانِ غنیؓ میں جمع قرآن کی کاروائی پورے سیاق وسباق کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے۔ تمام تفصیلات مستشرقین کے اشکالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بیان کی گئی ہیں اور جہاں ضروری ہوا ہے وہاں ان کی عبارات بھی پیش کی گئی ہیں۔ ہر باب میں مسلمانوں کے مستند مآخذ کی روشنی میں حقائق پیش کرنے کے ساتھ ساتھ واقعاتی اور عقلی دلائل سے بھی واضح کیا گیا ہے کہ مستشرقین کا نقطہ نگاہ ان میں سے کسی بھی معیار پر پورا نہیں اترتا۔

☆ قرآن مجید کے متن میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے مستشرقین نے ترتیب قرآن کو بھی بنیاد بنایا ہے۔ کتاب کے چھٹے باب میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ کتاب کی ترتیب و تشکیل میں اختیار کردہ اصول کے مطابق پہلے مستشرقین کا موقف ان کی عبارات کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قرآن کی توقیفی ترتیب پر دلائل وشواہد بیان کئے گئے ہیں۔ عہد نبوی سے واقعاتی شواہد کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ ترتیب توقیفی سے صحابہ کرامؓ پہلے دن سے ہی واقف تھے اور اس کے خلاف پڑھنے کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد عہدِ نبوی میں قرآن کے مرتب شکل میں موجود ہونے پر عقلی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ نظمِ قرآن، عہدِ نبوی میں قرآن کے مرتب ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس پہلو پر چھٹے باب کے اختتام میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے ساتویں باب میں نسخ فی القرآن کے موضوع پر بات کی گئی ہے۔ نسخ فی القرآن مستشرقین کا بنیادی ہدف ہے ان لوگوں نے کچھ عبارات کے بارے میں بڑے شد و مد سے تاثر پیدا کیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آیات تھیں جو اب موجودہ قرآن میں شامل نہیں ہیں گویا موجودہ قرآن مکمل نہیں ہے۔ اس موضوع پر ان روایات اور ان کی اسناد کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے جن میں اس طرح کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مستشرقین نے الاتقان فی علوم القرآن میں موجود روایات کو سیاق و سباق اور علامہ سیوطی کی بیان کردہ تفصیلات سے آنکھیں بند کر کے مغالطہ آرائی کیلئے استعمال کیا ہے۔ وہ یہ تو لکھتے ہیں کہ یہ عبارات علامہ سیوطی نے الاتقان میں بیان کی ہیں کہ یہ قرآن کا حصہ تھیں لیکن اس کی جو تفصیل سیوطی نے بیان کی ہے، اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اگر وہ تفصیل بھی بیان کر دی جائے تو مسئلہ "الاتقان" ہی کے مطالعہ سے حل ہو جاتا ہے کہ علامہ سیوطی نے ان عبارات کو "منسوخ التلاوۃ" آیات کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس باب میں مستشرقین کی طرف سے پیدا کردہ علمی مغالطوں کو معتبر شواہد اور دلائل سے رد کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا موجودہ متن محکم اور مکمل ہے۔

آٹھویں باب میں سبعہ احرف اور اختلافِ قرأت کا موضوع زیرِ بحث آیا ہے۔ اس پہلو سے بھی مستشرقین نے حقائق کو اپنے مقصد کے تحت توڑ موڑ کر بیان کرتے ہوئے قرآن مجید کے متن کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ سبعہ احرف کی وجہ سے قرآن مجید کا متن عہدِ نبوی میں ہی مختلف فیہ تھا۔ وہ ایک طرف کہتے ہیں کہ پہلے دن سے لوگ قرآن ایک دوسرے سے مختلف طریقوں سے پڑھتے رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے سات قرأتوں میں سے چھ قرأتیں ختم کر دیں اور لوگوں کو ایک ہی قرأت پر جمع کر دیا۔ اس طرح گویا (ان کے بقول) حضرت عثمان نے قرآن 6/7 ختم کر دیا اور اب موجودہ قرآن اصل قرآن کا 1/6 ہے۔ اس باب میں پہلے سبعہ احرف کے بارے میں مستشرقین کا نقطہ نگاہ بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد سبعہ احرف کی حقیقت، جواز اور ضرورت کی وضاحت کی گئی ہے، اس کے بعد واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عثمانِ غنیؓ کا مصحف ان تمام قراءتوں جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں اور جو تواتر سے ثابت بھی ہیں، پر مشتمل ہے اور اسی طرح مصحفِ عثمانی سبعہ احرف کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

نویں باب میں اختلافِ مصاحف کے عنوان کے تحت، مستشرقین کے پیدا کردہ ان اشکالات کا ازالہ کیا گیا ہے جو اس پہلو کو بنیاد بنا کر پیش کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر پیش کی گئی تمام روایات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لے کر واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے منسوب مصحف میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو موجودہ قرآن سے مختلف ہو اور اس سلسلے میں موجود روایات صحت کے اعتبار سے ناقابلِ اعتماد ہیں۔

کتاب کے دسویں باب کا عنوان "صحت قرآن مجید پر مستشرقین کے متفرق اعتراضات" ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر منگانا کے وہ اعتراضات زیر بحث آئے ہیں جو اس نے ایک کتاب "Leaves from Three Ancient Qurans" کی بنیاد پر اٹھائے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر منگانا کی اس کوشش کا شواہد کی بنیاد پر جائزہ لیا گیا ہے کہ منگانا کے پیدا کردہ اشکالات عقلی اعتبار سے بھی ثابت نہیں ہوتے اور تحقیق کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں بھی اگر دیکھا جائے تو ایک طرف قرآن کے متن کی محفوظیت پر موجود ٹھوس دلائل ہوں اور دوسری طرف ایک ایسی کتاب جس کی کوئی اصل نہیں ہے، اس کی بنیاد پر پیدا کردہ اشکالات بے بنیاد ٹھہرتے ہیں۔

مستشرقین نے متن قرآن کے بارے میں تشکیک کا حربہ اختیار کرتے ہوئے یہ اشکال بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ لوگوں کو وحی سناتے تھے تو شیطان بھی بعض اوقات آپ ﷺ کے ساتھ ہم آواز ہو کر وحی کے الفاظ میں ملاوٹ کر دیا کرتا تھا۔ اس باب میں واقعہ غرانیق کے حوالے سے اس اشکال کا عقلی و نقلی حوالے سے ردّ کیا گیا ہے۔

کتاب میں التزام کیا گیا ہے کہ قرآن مجید، احادیثِ نبویہ، کتبِ سیرت، کتبِ تاریخ اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی دیگر کتب سے مستند دلائل و شواہد کے ساتھ قرآن مجید کی محفوظیت ثابت کی جائے اور مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات کی وضاحت کی جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان مذکورہ بالا مآخذ کو تو مستشرقین تسلیم ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ تو غیر مسلم ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مستشرقین نے بھی انہی مآخذ میں سے جہاں سے انہیں اپنے مطلب کی کوئی بات ملی ہے، اپنے حق میں پیش کر دی ہے۔ یہ لوگ کسی تحریر میں سے اپنے مطلب کا ٹکڑا سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کر دیتے ہیں یا کسی تحریر کی تشریح اپنی مرضی اور مقصد کے مطابق کر لیتے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا مآخذ سے مستشرقین کا اس اعتبار سے جواب دیا ہے کہ مستشرقین کی اپنے نقطہ نگاہ کے حق میں پیش کردہ عبارات کو پورے سیاق و سباق سے پیش کیا جائے، ان کے پیش کردہ مواد کو مسلمان مصنف نے جس عنوان کے تحت بیان کیا ہے، اس کی نشاندہی کی جائے، اگر انہوں نے کسی عبارت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے تو عبارت کا حقیقی مفہوم واضح کیا جائے۔ تحقیق کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی عنوان کے تحت پیش کردہ کسی مصنف یا مؤلف کے مواد کو مجموعی طور پر پڑھا اور سمجھا جائے پھر اس مطالعے کے بعد اس مواد سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ کسی تحریر کے محض چند فقروں کو پڑھ کر اس تحریر کا ملخص یا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا جبکہ مستشرقین کے ہاں یہ رویہ بالعموم دکھائی دیتا ہے (خصوصاً نسخ فی القرآن کے باب میں علامہ جلال الدین کی الاتقان سے مستشرقین کے حاصل کردہ نتائج اس کی واضح مثال ہیں۔ (کتاب کے باب نمبر 7 میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں)۔

اس کتاب کا مقصد تحریر جہاں مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات کی وضاحت ہے وہاں اس کے مخاطب وہ لاتعداد مسلمان بھی ہیں جن کے ذہنوں میں یہ تاثر کسی نہ کسی انداز سے موجود ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات اعلیٰ تحقیقی اصولوں اور اعلیٰ نقد (Higher Criticism) کا نمونہ ہیں اور مسلمان مستشرقین کی تحقیق کے رعب تلے دبے ہوئے ہیں۔ اور وہ قرآن، حدیث اور سیرت طیبہ کے بارے میں بہت سے ذہنی اشکالات میں مبتلا ہیں۔ یہ نوجوان اس مرعوبیت کی وجہ سے اگرچہ اپنی زبان سے تو اپنے دینی عقیدہ کی بنا پر کچھ نہیں کہتے لیکن اسلام، اسلامی مآخذ اور اسلامی تہذیب کے بارے میں کئی اشکالات اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ ان مسلمان نوجوانوں کے لئے کتاب میں معقول شواہد پیش کئے گئے ہیں کہ وہ مستشرقین کی تحقیقات میں استعمال ہونے والے مآخذ، ان کے ذہنی پس منظر، ان کے تحقیقی اصولوں کو پڑھ کر خود اندازہ کرلیں کہ ان کے اعتراضات محض مفروضوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن مجید کے متن کی حفاظت کے حق میں جو دلائل موجود ہیں ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں لکھا ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات کو بڑا بلند تحقیق سمجھتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد اسلام کے بارے میں بدگمانیوں کا شکار ہو گئی ہے نوجوان عموماً اپنے دین کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتے جبکہ مستشرقین کے پیش کردہ اشکالات بڑے مؤثر انداز سے پیش کئے جاتے ہیں تو یہ نوجوان اپنے مذہب اور دینی مسلمات و حقائق کے بارے میں تذبذب اور تردد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہمیں مستشرقین کو جواب دینے سے پہلے اپنے ان متذبذب نوجوانوں کے عقائد کی حفاظت کا اہتمام بھی کرنا ہے۔ کتاب میں مقدور بھر کوشش کی گئی ہے مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات کو عقلی و نقلی دونوں طرح کے دلائل سے دور کیا جائے۔

قرآن، حدیث، کتب سیرت اور کتب تاریخ سے ہی شواہد کی روشنی میں محفوظیت قرآن کو ثابت نہیں کیا گیا بلکہ خالص عقلی اور واقعاتی شواہد سے بھی ان کے اشکالات کا جواب دیا گیا ہے۔ دوسرے باب سے لے کر آٹھویں باب تک بالالتزام عقلی و مشاہداتی دلائل پیش کئے گئے ہیں تاکہ اتمام حجت ہو جائے کہ اگر کوئی شخص اسلامی مآخذ سے حاصل شدہ دلائل کو تسلیم نہیں کرتا تو عقلی اور مشاہداتی دلائل سے تو انکار کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مستشرقین کے پیش کردہ اشکالات کا یہ کمزور پہلو بھی کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں بالخصوص اور اسلام کے بارے میں بالعموم وہ کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی اسے پہلی کتابوں سے نقل شدہ کہتا ہے تو دوسرا گروہ اسے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی

غور و فکر کا نتیجہ کہتا ہے۔ایک گروہ کہتا ہے کہ جس چیز کو وحی کہا گیا ہے وہ کوئی باہر سے آنے والی چیز نہ تھی بلکہ آپ کے اندر کے خیالات تھے۔دوسرا گروہ وحی کی تاویل کسی اور انداز سے کرتا ہے۔یہ باھمی تضادات ترتیب قرآن مجید کے باب میں مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔متعدد مستشرقین نے قرآن کو نزولی ترتیب سے مرتب کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے لیکن یہ ترتیب دیتے ہوئے ہر ایک کا معیار اور اصول دوسرے سے مختلف ہے۔ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن کبھی لکھا ہی نہیں گیا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ابتداء میں تو لکھا گیا لیکن حضرت ابو بکر صدیق سے کچھ آیات لکھے جانے سے رہ گئیں۔ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت عثمان تک تو قرآن اصل حالت میں موجود تھا لیکن حضرت عثمان نے اس میں سے بہت سی آیات نکال دیں۔

اسلام کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقات کی عملی و تحقیقی وقعت واضح کرتے ہوئے کتاب میں یہ بات اجاگر کی گئی ہے کہ ان کے اشکالات ظن و تخمین اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں وہ قرآن مجید پر بڑے سے بڑا اعتراض کرتے ہوئے اکثر و بیشتر کوئی تاریخی یا بنیادی شواہد پیش کرنے کی بجائے may be, Might be perhaps وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔کسی بھی علمی شعبہ میں تحقیق کا مسئلہ ہو یا کوئی عدالتی اور قانونی نکتہ ہو، وہاں دعویٰ دائر کرنے والے یا نظریہ پیش کرنے والے فریق کیلئے لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کے حق میں ٹھوس دلائل پیش کرے۔اہل علم و عقل اس کے دلائل سنیں گے، پھر دیکھیں گے کہ اس کے پیش کردہ دلائل کس حد تک معتبر اور ثقہ ہیں۔اگر دلائل معتبر اور ثقہ نہ ہوں تو دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے۔ کوئی نظریہ پیش کرنے والا اپنے نظریہ کے حق میں اپنے وہم و گمان ہی پیش کرتا ہو تو اس کا نظریہ اور دعویٰ مسترد کر دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اگر عدالتی کیس ہو تو عدالت مدعی پر جرمانہ بھی عائد کر دے اور اگر کوئی علمی نظریہ پیش کرنے والا اس طرح کا انداز اختیار کرے تو اس کی علمی حیثیت لوگوں میں مذاق اور ندامت کا باعث بن جاتی ہے۔

لیکن مستشرقین "ہو سکتا ہے"، "شاید"، "ممکن ہے ایسا ہوا ہو" کے الفاظ قرآن مجید کے متن کو مشکوک ثابت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔جبکہ متن قرآن کی محفوظیت پر ہر طرح کے عقلی، نقلی اور واقعاتی شواہد موجود ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں۔انہیں اپنا نقطہ نگاہ ثابت کرنے کیلئے اسی پائے کے عقلی نقلی اور واقعاتی شواہد پیش کرنے چاہییں جس طرح کے دلائل قرآن کی محفوظیت کے حق میں دئے جاتے ہیں۔

مستشرقین اور حفاظت قرآن کے حوالے سے جو بات قابل توجہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید کو اپنی کتابوں پر قیاس کرتے ہیں۔کتب سابقہ کی اپنی تاریخ یہ ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں ان کی اصلیت کے باقی نہ ہونے سے قطع نظر ان کے اندر موجود مواد اور مندرجات اور خود غیر مسلموں کے اپنے اعترافات کی روشنی میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہ کتابیں اصل حالت میں موجود نہیں رہیں۔کتب سابقہ کی تاریخ بتاتی

ہے کہ اس کا ایک ایک صفحہ ان لوگوں کو اکٹھا کرنا پڑا اور جب کبھی کہیں سے انہیں کچھ اوراق ملتے ہیں تو وہ انہیں پاکر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمیں کتاب مل گئی ہے وہ قرآن کو بھی ایسی ہی کتاب سمجھتے ہیں یا اس کے بارے میں بھی یہ تاثر بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں پختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کو اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا ہی نہیں پڑا کہ یہ تاریخ کے کسی بدترین دور میں بھی مفقود ہوا ہو انہیں اپنی کتاب کے اوراق اکٹھے کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ ان کی کتاب منتشر ہوئی ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید تو نزول کے ساتھ ہی حفظ بھی کر لیا جاتا تھا۔ یہاں تو لوگوں کو اس بات کا بھی پورے وثوق کے ساتھ علم تھا کہ کون کون سی آیات دن میں نازل ہوئیں کون سی رات کو، کون سی سفر میں، کون سی حضر میں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں مجھے کوئی پوچھے کہ کون سی آیت کس جگہ اور کس وقت نازل ہوئی۔ رات کو نازل یا دن کو، سفر میں نازل ہوئی یا حضر میں۔ کتب حدیث میں ابواب موجود ہیں جن میں الفاظ قرآن کی ادائیگی کے طریقے بیان کئے گئے ہیں کہ نبی کریمؐ فلاں لفظ کس انداز سے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بخاری اور دیگر کتب حدیث کے ابواب "فضائل القرآن" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں ان عوامل کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو دراصل قرآن مجید کے متن کی محفوظیت کے واقعاتی شواہد ہیں۔ اس باب میں قرآن کی زبان کے تسلسل، کہ قرآن کی زبان یعنی عربی آج بھی اسی شکل میں موجود ہے جو نزول قرآن مجید کے وقت تھی، موجود ہے۔ ان خارجی شواہد میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں نے ہر دور میں اسے حفظ کیا۔ اس کا رسم الخط وہی ہے جس میں حضرت عثمان غنیؓ نے اس لکھوایا تھا اور اس رسم الخط کے علاوہ کسی اور خط میں لکھنا حرام ہے۔ عربی متن کے بغیر صرف ترجمہ کی صورت میں قرآن چھاپنا بالاتفاق سخت ممنوع ہے۔

صحت متن قرآن کے حوالے سے اگر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اعتراضات اپنے مرکزی نقاط، مقاصد اور دائرہ کے اعتبار سے تعداد میں کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن ایک ہی اعتراض کو اس قدر مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ہی پہلو پر اعتراضات کی تعداد بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے حالانکہ ان سب اعتراضات کا بنیادی نقطہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مستشرق کہتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کا متن جمع کرنے کی طرف دو سو سال تک ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کوئی کہتا ہے کہ قرآن کی حفاظت تو کی گئی لیکن محض حفظ کے ذریعے کی گئی۔ کچھ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن عہد نبوی میں لکھا تو گیا لیکن جزوی طور پر لکھا گیا۔ ایک اور گروہ کہہ دیتا ہے کہ قرآن لکھا تو گیا لیکن جن چیزوں پر لکھا گیا وہ ناقابل اعتماد اور ضائع ہو جانے والی تھیں کچھ مستشرقین کا خیال ہے کہ عہد نبوی میں قرآن لکھا گیا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے اس میں گڑبڑ کر دی۔ آخر میں ایک گروہ کہہ دیتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک تھا حضرت عثمان نے اس

کے بہت سے حصے نکال دیئے۔ ان متعدد نقطہ ہائے نگاہ کا بنیادی نقطہ ایک ہی سامنے آتا ہے کہ قرآن جو اس وقت ہمارے پاس ہے یہ مکمل نہیں ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے کو حق حاصل ہے کہ وہ موجود حقائق و شواہد سے جو چاہے نتائج اخذ کرے۔ کسی کو پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ وہی نتائج حاصل کرے جو مسلمان اخذ کرتے ہیں۔ فکری مباحثات میں ہر شخص کو فکری آزادی ہوتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ جو نتائج اخذ کئے جائیں وہ پہلے سے طے شدہ نہ ہوں۔ تحقیق خواہ طبعی علوم میں ہو یا سماجی علوم میں، محقق غیر جانبدار ہونا چاہیے وہ جس چیز کا مشاہدہ کرے وہی لوگوں کے سامنے بیان کرے لیکن مستشرقین کا معاملہ اس سے مختلف بیان کیا گیا ہے۔

کتاب میں مستشرقین کا نقطہ نگاہ ان کے اقتباسات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ محض ان کا نقطہ نگاہ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی عبارتیں بھی پیش کی گئی ہیں تاکہ قارئین پر یہ بات واضح ہو سکے کہ مستشرقین کا رویہ اور انداز تحریر کس قدر جارحانہ ہے اور وہ کس طرح اکثر و بیشتر قرآن اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں غیر روادارانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے نمونے پیش کرنے کا ضمنی مقصد یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتوں میں استعمال شدہ الفاظ اور لب و لہجہ سے بھی اندازہ کیا جا سکے کہ وہ علمی و تحقیقی مقصد کے تحت یہ سب کچھ نہیں لکھتے بلکہ دوسرے کے نظریات و عقائد، دینی شخصیات اور دوسرے کے مذہب کے بارے میں اپنے دلوں میں کس قدر احترام کے منافی جذبات رکھتے ہیں۔ ان کا رویہ نہایت ہتک آمیز ہے۔ حالانکہ تحقیق کا بنیادی اصول ہے کہ دوسرے کے عقائد و نظریات کا احترام کیا جائے۔ ہر بات کو حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے۔ تحقیق سے قبل کوئی فیصلہ صادر نہ کر دیا جائے۔ جبکہ مستشرقین کے ہاں ان میں سے کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔

پہلے باب میں مستشرقین کی تحقیقات کا فکری، سیاسی اور مذہبی پسِ منظر اسلام کے بارے میں ان کی تحقیقات کی نوعیت، ان کے مآخذِ تحقیق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ اسلام کے بارے میں ان کا رویہ جارحانہ ہی ہوتا ہے اس لئے قارئین کرام کو مذکورہ بالا پہلوؤں سے متعارف کروانا ناگزیر ہے کہ وہ اس پسِ منظر اور اندازِ تحقیق کو جان سکیں جس پر مستشرقین عمل پیرا ہیں۔ اسی باب میں ان کی علمی و تحقیقی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو تحقیق کے کمزور مآخذ کو بنیاد بنانے اور کسی تحقیقی معیار کی مکمل پیروی نہ کرنے کی وجہ سے سامنے آئی ہیں۔ اس باب میں قارئین کرام کو استشراقی تحقیقات کے معیار کی چند جھلکیاں دکھائی گئی ہیں تاکہ وہ اندازہ کر لیں کہ معاندانہ ذہنی پسِ منظر، کمزور مآخذ سے استفادہ اور مسلمہ تحقیقی اصول و ضوابط کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے مستشرقین جگہ جگہ غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔

پہلے باب میں مستشرقین کی اسلام کے بارے میں تحقیقات کا یہ پہلو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کے زیرِ استعمال مآخذ کی علمی و تحقیقی حیثیت و مقام کیا ہے۔ واضح کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو ان کے ہاں معتبر اور غیر معتبر مآخذ کا کوئی تصور نہیں، دوسرے یہ بات کہ معتبر یا غیر معتبر مآخذ سے وہ وہی روایت لیتے ہیں جو ان کے مزعومہ پیشگی طے شدہ نقطہ نگاہ کی تائید کرتی ہو۔

اسی باب میں مسلمانوں کا معیار تحقیق اور اصول تحقیق بیان کئے ہیں تاکہ موازنہ ہو جائے کہ مسلمانوں کے ہاں کس قدر سخت قسم کے معیارات موجود ہیں۔ اس سے قارئین کرام اسلامی معیاراتِ تحقیق اور مغربی معیاراتِ تحقیق کو ساتھ ساتھ رکھ کر اندازہ کر لیں کہ مستشرقین کی تحقیقات کی کیا وقعت اور حیثیت ہے۔ خاص طور پر جب وہ متنِ قرآن جیسے اہم اور حساس موضوع پر پورے شدو مد کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں تو پھر انہیں اپنا معیار تحقیق کم از کم قابلِ قبول اور تحقیق کے مسلمہ بین الاقوامی معیارات تک تو بلند کرنا چاہیے۔

دوسرے باب میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ مستشرقین قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں نبی کریم ﷺ اس وقت کے حالات اور ماحول سے پریشان رہتے تھے اور تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اس کیلئے وہ غارِ حرا میں الگ بیٹھ کر سوچ و بچار کرتے۔ مستشرقین یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا معاشرتی زندگی سے الگ تھلگ ہو کر غور و فکر میں مشغول رہنے کا طریقہ آپ نے پہلے مذاہب کے مطالعہ سے سیکھا ہے۔ آپ کا دیگر مذاہب کے علماء سے رابطہ تھا۔ آپ پہلے مذاہب کی کتابوں کی تعلیمات سے بھی کسی نہ کسی طریقے سے آگاہ ہو رہے تھے مختلف ذرائع سے آپ کے متعین کردہ لوگ آپ کو معلومات فراہم کر رہے تھے۔ آپ نے ان تمام ذرائع سے حاصل ہونے والے مواد کے ساتھ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو ملا کر قرآن مجید تیار کر لیا۔ اس نقطہ نگاہ کے ردّ کے لئے صرف قرآن و حدیث سے ہی دلائل نہیں دیئے گئے بلکہ عقلی و واقعاتی شواہد سے بھی ان کے نقطہ نگاہ کا رڈ کیا گیا ہے۔ اس باب میں خصوصی طور پر قرآن مجید کے منزل ہونے پر عقلی دلائل دیئے گئے ہیں۔

قرآن مجید کا متن کسی تحریف سے بالکل مبرّا ہے۔ یہ بات محض مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہی نہیں بلکہ دلائل و شواہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری کے باوجود مسلمانوں نے عالمِ اسباب میں حفظِ قرآن، کتابتِ قرآن، تسلسل سے اس کی تلاوت اور اس پر عمل کرتے ہوئے اس کی حفاظت کی عظیم اور مقدس ذمہ داری پوری کی۔ اس کتاب میں حفاظتِ قرآن کو مندرجہ ذیل ترتیب سے دلائل پیش کر کے واضح کیا گیا ہے۔

☆ قرآن مجید کا اعلان کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ کے سپرد ہے۔

☆ نزول قرآن مجید کے ساتھ ہی اس کی کتابت اور حفظ کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ ثقہ روایات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نازل شدہ وحی کو لکھوانے کو سب کاموں پر ترجیح دیتے تھے۔ نہ صرف وحی کو فوری طور پر لکھوانے کا اہتمام تھا بلکہ نزول وحی کے ساتھ ہی آیات کی ترتیب بھی متعین کر دی گئی تھی اور صحابہؓ روزانہ کی تلاوت اور نمازوں میں اسی ترتیب سے پڑھتے تھے۔ ترتیبِ قرآن سے سبھی لوگ مکمل طور پر آگاہ تھے اور اس سلسلے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس موضوع پر تفصیلات تیسرے باب میں موجود ہیں۔ یہاں بھی عقلی، نقلی اور واقعاتی شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

☆ عہدِ صدیق اکبرؓ میں ایک متفقہ نسخہ کس احتیاط اور اہتمام سے تیار کیا گیا اس کی تمام تفصیلات چوتھے باب میں بیان کی گئی ہیں۔ مستشرقین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ جب مسلمانوں نے عہدِ صدیق اکبرؓ میں قرآن کا نسخہ تیار کرنے کی کوشش کی تو وہ اس وقت بھی مکمل قرآن اکٹھا نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں اشکالات کا ازالہ کیا گیا ہے۔

☆ پانچویں باب میں عہد عثمانِ غنیؓ میں جمع قرآن کی کاروائی پورے سیاق وسباق کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے۔ تمام تفصیلات مستشرقین کے اشکالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بیان کی گئی ہیں اور جہاں ضروری ہوا ہے وہاں ان کی عبارات بھی پیش کی گئی ہیں۔ ہر باب میں مسلمانوں کے مستند مآخذ کی روشنی میں حقائق پیش کرنے کے ساتھ ساتھ واقعاتی اور عقلی دلائل سے بھی واضح کیا گیا ہے کہ مستشرقین کا نقطہ نگاہ ان میں سے کسی بھی معیار پر پورا نہیں اترتا۔

☆ قرآن مجید کے متن میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے مستشرقین نے ترتیب قرآن کو بھی بنیاد بنایا ہے۔ کتاب کے چھٹے باب میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ کتاب کی ترتیب و تشکیل میں اختیار کردہ اصول کے مطابق پہلے مستشرقین کا موقف ان کی عبارات کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قرآن کی توقیفی ترتیب پر دلائل وشواہد بیان کئے گئے ہیں۔ عہد نبوی سے واقعاتی شواہد کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ ترتیب توقیفی سے صحابہ کرامؓ پہلے دن سے ہی واقف تھے اور اس کے خلاف پڑھنے کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد عہدِ نبوی میں قرآن کے مرتب شکل میں موجود ہونے پر عقلی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ نظم قرآن، عہدِ نبوی میں قرآن کے مرتب ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس پہلو پر چھٹے باب کے اختتام میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے ساتویں باب میں نسخ فی القرآن کے موضوع پر بات کی گئی ہے۔ نسخ فی القرآن مستشرقین کا بنیادی ہدف ہے ان لوگوں نے کچھ عبارات کے بارے میں بڑے شد ومد سے تاثر پیدا کیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آیات تھیں جو اب موجودہ قرآن میں شامل نہیں ہیں گویا موجودہ قرآن مکمل نہیں ہے۔ اس موضوع

پر ان روایات اور ان کی اسناد کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے جن میں اس طرح کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مستشرقین نے الاتقان فی علوم القرآن میں موجود روایات کو سیاق و سباق اور علامہ سیوطی کی بیان کردہ تفصیلات سے آنکھیں بند کر کے مغالطہ آرائی کیلئے استعمال کیا ہے۔ وہ یہ تو لکھتے ہیں کہ یہ عبارات علامہ سیوطی نے الاتقان میں بیان کی ہیں کہ یہ قرآن کا حصہ تھیں لیکن اس کی جو تفصیل سیوطی نے بیان کی ہے، اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اگر وہ تفصیل بھی بیان کر دی جائے تو مسئلہ "الاتقان" ہی کے مطالعہ سے حل ہو جاتا ہے کہ علامہ سیوطی نے ان عبارات کو " منسوخ التلاوۃ" آیات کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس باب میں مستشرقین کی طرف سے پیدا کردہ علمی مغالطوں کو معتبر شواہد اور دلائل سے ردّ کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا موجودہ متن محکم اور مکمل ہے۔

آٹھویں باب میں سبعہ احرف اور اختلافِ قرأت کا موضوع زیرِ بحث آیا ہے۔ اس پہلو سے بھی مستشرقین نے حقائق کو اپنے مقصد کے تحت توڑ موڑ کر بیان کرتے ہوئے قرآن مجید کے متن کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ سبعہ احرف کی وجہ سے قرآن مجید کا متن عہدِ نبوی میں ہی مختلف فیہ تھا۔ وہ ایک طرف کہتے ہیں کہ پہلے دن سے لوگ قرآن ایک دوسرے سے مختلف طریقوں سے پڑھتے رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے سات قرأتوں میں سے چھ قرأتیں ختم کر دیں اور لوگوں کو ایک ہی قرأت پر جمع کر دیا۔ اس طرح گویا (ان کے بقول) حضرت عثمان نے قرآن 6/7 ختم کر دیا اور اب موجودہ قرآن اصل قرآن کا 1/6 ہے۔ اس باب میں پہلے سبعہ احرف کے بارے میں مستشرقین کا نقطہ نگاہ بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد سبعہ احرف کی حقیقت، جواز اور ضرورت کی وضاحت کی گئی ہے، اس کے بعد واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عثمانِ غنیؓ کا مصحف ان تمام قرأتوں جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں اور جو تواتر سے ثابت بھی ہیں، پر مشتمل ہے اور اسی طرح مصحفِ عثمانی سبعہ احرف کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

نویں باب میں اختلافِ مصاحف کے عنوان کے تحت، مستشرقین کے پیدا کردہ ان اشکالات کا ازالہ کیا گیا ہے جو اس پہلو کو بنیاد بنا کر پیش کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر پیش کی گئی تمام روایات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لے کر واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے منسوب مصحف میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو موجودہ قرآن سے مختلف ہو اور اس سلسلے میں موجود روایات صحت کے اعتبار سے ناقابلِ اعتماد ہیں۔

کتاب کے دسویں باب کا عنوان "صحت قرآن مجید پر مستشرقین کے متفرق اعتراضات" ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر منگانا کے وہ اعتراضات زیرِ بحث آئے ہیں جو اس نے ایک کتاب "Leaves from Three Ancient Qurans" کی بنیاد پر اٹھائے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر منگانا کی اس کوشش کا شواہد کی بنیاد پر جائزہ لیا گیا ہے کہ منگانا کے پیدا کردہ اشکالات عقلی اعتبار سے بھی ثابت نہیں ہوتے اور تحقیق کے

مسلمہ اصولوں کی روشنی میں بھی اگر دیکھا جائے تو ایک طرف قرآن کے متن کی محفوظیت پر موجود ٹھوس دلائل ہوں اور دوسری طرف ایک ایسی کتاب جس کی کوئی اصل نہیں ہے، اس کی بنیاد پر پیدا کردہ اشکالات بے بنیاد ٹھہرتے ہیں۔

مستشرقین نے متن قرآن کے بارے میں تشکیک کا حربہ اختیار کرتے ہوئے یہ اشکال بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ لوگوں کو وحی سناتے تھے تو شیطان بھی بعض اوقات آپ ﷺ کے ساتھ ہم آواز ہو کر وحی کے الفاظ میں ملاوٹ کر دیا کرتا تھا۔ اس باب میں واقعہ غرانیق کے حوالے سے اس اشکال کا عقلی و نقلی حوالے سے ردّ کیا گیا ہے۔

کتاب میں التزام کیا گیا ہے کہ قرآن مجید، احادیثِ نبویہ، کتبِ سیرت، کتبِ تاریخ اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی دیگر کتب سے مستند دلائل و شواہد کے ساتھ قرآن مجید کی محفوظیت ثابت کی جائے اور مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات کی وضاحت کی جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان مذکورہ بالا ماٰخذ کو تو مستشرقین تسلیم ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ تو غیر مسلم ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مستشرقین نے بھی انہی ماٰخذ میں سے جہاں سے انہیں اپنے مطلب کی کوئی بات ملی ہے، اپنے حق میں پیش کر دی ہے۔ یہ لوگ کسی تحریر میں سے اپنے مطلب کا ٹکڑا سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کر دیتے ہیں یا کسی تحریر کی تشریح اپنی مرضی اور مقصد کے مطابق کر لیتے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا ماٰخذ سے مستشرقین کا اس اعتبار سے جواب دیا ہے کہ مستشرقین کی اپنے نقطہ نگاہ کے حق میں پیش کردہ عبارات کو پورے سیاق وسباق سے پیش کیا جائے، ان کے پیش کردہ مواد کو مسلمان مصنف نے جس عنوان کے تحت بیان کیا ہے، اس کی نشاندہی کی جائے، اگر انہوں نے کسی عبارت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے تو عبارت کا حقیقی مفہوم واضح کیا جائے۔ تحقیق کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی عنوان کے تحت پیش کردہ کسی مصنف یا مؤلف کے مواد کو مجموعی طور پر پڑھا اور سمجھا جائے پھر اس مطالعے کے بعد اس مواد سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ کسی تحریر کے محض چند فقروں کو پڑھ کر اس تحریر کا ملخص یا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا جبکہ مستشرقین کے ہاں یہ رویہ بالعموم دکھائی دیتا ہے (خصوصاً نسخ فی القرآن کے باب میں علامہ جلال الدین کی الاتقان سے مستشرقین کے حاصل کردہ نتائج اس کی واضح مثال ہیں۔ کتاب کے باب نمبر 7 میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں)۔

اس کتاب کا مقصد تحریر جہاں مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات کی وضاحت ہے وہاں اس کے مخاطب وہ لاتعداد مسلمان بھی ہیں جن کے ذہنوں میں یہ تاثر کسی نہ کسی انداز سے موجود ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات اعلیٰ تحقیقی اصولوں اور اعلیٰ نقد (Higher Criticism) کا نمونہ ہیں اور مسلمان مستشرقین کی تحقیق کے رعب تلے دبے ہوئے ہیں۔ اور وہ قرآن، حدیث اور سیرت طیبہ کے بارے میں بہت سے

ذہنی اشکالات میں مبتلا ہیں۔ یہ نوجوان اس مرعوبیت کی وجہ سے اگرچہ اپنی زبان سے تو اپنے دینی عقیدہ کی بنا پر کچھ نہیں کہتے لیکن اسلام، اسلامی مآخذ اور اسلامی تہذیب کے بارے میں کئی اشکالات اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ ان مسلمان نوجوانوں کے لئے کتاب میں معقول شواہد پیش کئے گئے ہیں کہ وہ مستشرقین کی تحقیقات میں استعمال ہونے والے مآخذ، ان کے ذہنی پس منظر، ان کے تحقیقی اصولوں کو پڑھ کر خود اندازہ کرلیں کہ ان کے اعتراضات محض مفروضوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن مجید کے متن کی حفاظت کے حق میں جو دلائل موجود ہیں ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں لکھا ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات کو بڑا بلند پایا یہ تحقیق سمجھتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد اسلام کے بارے میں بدگمانیوں کا شکار ہوگئی ہے نوجوان عموماً اپنے دین کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتے جبکہ مستشرقین کے پیش کردہ اشکالات بڑے مئوثر انداز سے پیش کئے جاتے ہیں تو یہ نوجوان اپنے مذہب اور دینی مسلمات وحقائق کے بارے میں تذبذب اور تردد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہمیں مستشرقین کو جواب دینے سے پہلے اپنے ان متذبذب نوجوانوں کے عقائد کی حفاظت کا اہتمام بھی کرنا ہے۔ کتاب میں مقدور بھر کوشش کی گئی ہے مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات کو عقلی و نقلی دونوں طرح کے دلائل سے دور کیا جائے۔

قرآن، حدیث، کتب سیرت اور کتب تاریخ سے ہی شواہد کی روشنی میں محفوظیت قرآن کو ثابت نہیں کیا گیا بلکہ خالص عقلی اور واقعاتی شواہد سے بھی ان کے اشکالات کا جواب دیا گیا ہے۔ دوسرے باب سے لے کر آٹھویں باب تک بالالتزام عقلی و مشاہداتی دلائل پیش کئے گئے ہیں تا کہ اتمام حجت ہو جائے کہ اگر کوئی شخص اسلامی مآخذ سے حاصل شدہ دلائل کو تسلیم نہیں کرتا تو عقلی اور مشاہداتی دلائل سے تو انکار کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مستشرقین کے پیش کردہ اشکالات کا یہ کمزور پہلو بھی کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں بالخصوص اور اسلام کے بارے میں بالعموم وہ کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی اسے پہلی کتابوں سے نقل شدہ کہتا ہے تو دوسرا گروہ اسے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ کہتا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس چیز کو وحی کہا گیا ہے وہ کوئی باہر سے آنے والی چیز نہ تھی بلکہ آپ کے اندر کے خیالات تھے۔ دوسرا گروہ وحی کی تاویل کسی اور انداز سے کرتا ہے۔ یہ باہمی تضادات ترتیب قرآن مجید کے باب میں مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ متعدد مستشرقین نے قرآن کو نزولی ترتیب سے مرتب کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے لیکن یہ ترتیب دیتے ہوئے ہر ایک کا معیار اور اصول دوسرے سے

مختلف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن کبھی لکھا ہی نہیں گیا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ابتداء میں تو لکھا گیا لیکن حضرت ابو بکر صدیق سے کچھ آیات لکھے جانے سے رہ گئیں۔ ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت عثمان تک تو قرآن اصل حالت میں موجود تھا لیکن حضرت عثمان نے اس میں سے بہت سی آیات نکال دیں۔

اسلام کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقات کی عملی و تحقیقی وقعت واضح کرتے ہوئے کتاب میں یہ بات اجاگر کی گئی ہے کہ ان کے اشکالات ظن و تخمین اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں وہ قرآن مجید پر بڑے سے بڑا اعتراض کرتے ہوئے اکثر و بیشتر کوئی تاریخی یا بنیادی شواہد پیش کرنے کی بجائے may be, Might be perhaps وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کسی بھی علمی شعبہ میں تحقیق کا مسئلہ ہو یا کوئی عدالتی اور قانونی نکتہ ہو، وہاں دعویٰ دائر کرنے والے یا نظریہ پیش کرنے والے فریق کیلئے لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کے حق میں ٹھوس دلائل پیش کرے۔ اہل علم و عقل اس کے دلائل سنیں گے، پھر دیکھیں گے کہ اس کے پیش کردہ دلائل کس حد تک معتبر اور ثقہ ہیں۔ اگر دلائل معتبر اور ثقہ نہ ہوں تو دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے۔ کوئی نظریہ پیش کرنے والا اپنے نظریہ کے حق میں اپنے وہم و گمان ہی پیش کرتا ہو تو اس کا نظریہ اور دعویٰ مسترد کر دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اگر عدالتی کیس ہو تو عدالت مدعی پر جرمانہ بھی عائد کر دے اور اگر کوئی علمی نظریہ پیش کرنے والا اس طرح کا انداز اختیار کرے تو اس کی علمی حیثیت لوگوں میں مذاق اور ندامت کا باعث بن جاتی ہے۔

لیکن مستشرقین "ہو سکتا ہے"، "شاید"، "ممکن ہے ایسا ہوا ہو" کے الفاظ قرآن مجید کے متن کو مشکوک ثابت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ متن قرآن کی محفوظیت پر ہر طرح کے عقلی، نقلی اور واقعاتی شواہد موجود ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں۔ انہیں اپنا نقطہ نگاہ ثابت کرنے کیلئے اسی پائے کے عقلی نقلی اور واقعاتی شواہد پیش کرنے چاہییں جس طرح کے دلائل قرآن کی محفوظیت کے حق میں دئے جاتے ہیں۔

مستشرقین اور حفاظت قرآن کے حوالے سے جو بات قابل توجہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید کو اپنی کتابوں پر قیاس کرتے ہیں۔ کتب سابقہ کی اپنی تاریخ یہ ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں ان کی اصلیت کے باقی نہ ہونے سے قطع نظر ان کے اندر موجود مواد اور مندرجات اور خود غیر مسلموں کے اپنے اعترافات کی روشنی میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہ کتابیں اصل حالت میں موجود نہیں رہیں۔ کتب سابقہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا ایک ایک صفحہ ان لوگوں کو اکٹھا کرنا پڑا اور جب کبھی کہیں سے انہیں کچھ اوراق ملتے ہیں تو وہ انہیں پا کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمیں کتاب مل گئی ہے وہ قرآن کو بھی ایسی ہی کتاب سمجھتے ہیں یا اس کے بارے میں بھی یہ تاثر بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں پختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کو اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا ہی نہیں پڑا کہ یہ تاریخ کے کسی بدترین دور میں بھی

مفقود ہوا ہو انہیں اپنی کتاب کے اوراق اکٹھے کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ ان کی کتاب منتشر ہوئی ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید تو نزول کے ساتھ ہی حفظ بھی کر لیا جاتا تھا۔ یہاں تو لوگوں کو اس بات کا بھی پورے وثوق کے ساتھ علم تھا کہ کون کون سی آیات دن میں نازل ہوئیں کون سی رات کو، کون سی سفر میں، کون سی حضر میں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں مجھے کوئی پوچھے کہ کون سی آیت کس جگہ اور کس وقت نازل ہوئی۔ رات کو نازل یا دن کو، سفر میں نازل ہوئی یا حضر میں۔ کتب حدیث میں ابواب موجود ہیں جن میں الفاظ قرآن کی ادائیگی کے طریقے بیان کئے گئے ہیں کہ نبی کریمؐ فلاں لفظ کس انداز سے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بخاری اور دیگر کتب حدیث کے ابواب "فضائل القرآن" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں ان عوامل کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو دراصل قرآن مجید کے متن کی محفوظیت کے واقعاتی شواہد ہیں۔ اس باب میں قرآن کی زبان کے تسلسل، کہ قرآن کی زبان یعنی عربی آج بھی اسی شکل میں موجود ہے جو نزول قرآن مجید کے وقت تھی، موجود ہے۔ ان خارجی شواہد میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں نے ہر دور میں اسے حفظ کیا۔ اس کا رسم الخط وہی ہے جس میں حضرت عثمان غنیؓ نے اس لکھوایا تھا اور اس رسم الخط کے علاوہ کسی اور خط میں لکھنا حرام ہے۔ عربی متن کے بغیر صرف ترجمہ کی صورت میں قرآن چھاپنا بالاتفاق سخت ممنوع ہے۔

صحت متن قرآن کے حوالے سے اگر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اعتراضات اپنے مرکزی نقاط، مقاصد اور دائرہ کے اعتبار سے تعداد میں کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن ایک ہی اعتراض کو اس قدر مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ہی پہلو پر اعتراضات کی تعداد بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے حالانکہ ان سب اعتراضات کا بنیادی نقطہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مستشرق کہتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کا متن جمع کرنے کی طرف دو سو سال تک ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کوئی کہتا ہے کہ قرآن کی حفاظت تو کی گئی لیکن محض حفظ کے ذریعے کی گئی۔ کچھ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن عہد نبوی میں لکھا تو گیا لیکن جزوی طور پر لکھا گیا۔ ایک اور گروہ کہہ دیتا ہے کہ قرآن لکھا تو گیا لیکن جن چیزوں پر لکھا گیا وہ ناقابل اعتماد اور ضائع ہو جانے والی تھیں کچھ مستشرقین کا خیال ہے کہ عہد نبوی میں قرآن لکھا گیا لیکن حضرت ابو بکر صدیق نے اس میں گڑبڑ کر دی۔ آخر میں ایک گروہ کہہ دیتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک تھا حضرت عثمان نے اس کے بہت سے حصے نکال دیئے۔ ان متعدد نقطہ ہائے نگاہ کا بنیادی نقطہ ایک ہی سامنے آتا ہے کہ قرآن جو اس وقت ہمارے پاس ہے یہ مکمل نہیں ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے کو حق حاصل ہے کہ وہ موجود حقائق و شواہد سے جو چاہے نتائج اخذ کرے۔ کسی کو پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ وہی نتائج حاصل کرے جو مسلمان اخذ کرتے ہیں۔

فکری مباحثات میں ہر شخص کو فکری آزادی ہوتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ جو نتائج اخذ کئے جائیں وہ پہلے سے طے شدہ نہ ہوں۔ تحقیق خواہ طبعی علوم میں ہو یا سماجی علوم میں، محقق غیر جانبدار ہونا چاہیے وہ جس چیز کا مشاہدہ کرے وہی لوگوں کے سامنے بیان کرے لیکن مستشرقین کا معاملہ اس سے مختلف بیان کیا گیا ہے۔

کتاب میں مستشرقین کا نقطہ نگاہ ان کے اقتباسات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ محض ان کا نقطہ نگاہ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی عبارتیں بھی پیش کی گئی ہیں تاکہ قارئین پر یہ بات واضح ہو سکے کہ مستشرقین کا رویہ اور انداز تحریر کس قدر جارحانہ ہے اور وہ کس طرح اکثر و بیشتر قرآن اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں غیر روادارانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے نمونے پیش کرنے کا ضمنی مقصد یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتوں میں استعمال شدہ الفاظ اور لب ولہجہ سے بھی اندازہ کیا جا سکے کہ وہ علمی و تحقیقی مقصد کے تحت یہ سب کچھ نہیں لکھتے بلکہ دوسرے کے نظریات و عقائد، دینی شخصیات اور دوسرے کے مذہب کے بارے میں اپنے دلوں میں کس قدر احترام کے منافی جذبات رکھتے ہیں۔ ان کا رویہ نہایت ہتک آمیز ہے۔ حالانکہ تحقیق کا بنیادی اصول ہے کہ دوسرے کے عقائد و نظریات کا احترام کیا جائے۔ ہر بات کو حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے۔ تحقیق سے قبل کوئی فیصلہ صادر نہ کر دیا جائے۔ جبکہ مستشرقین کے ہاں ان میں سے کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو حقیقت جاننے والوں کے لئے مفید بنائے۔

حافظ محمود اختر

پہلا باب

تحریک استشراق کا تعارف و تجزیہ

۱۔ مستشرق اور استشراق کا مفہوم

۲۔ اسلام کے بارے میں مستشرقین کے اندازِ فکر کا پس منظر

۳۔ قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقات کے مآخذ

ضعیف اور موضوع روایات سے استفادہ

۵۔ مستشرقین کا تحقیق کے مسلمہ اصولوں سے انحراف

ا۔ اسلامی کتب کا بالواسطہ مطالعہ

ب۔ قرآن مجید کا بالواسطہ مطالعہ

مستشرقین کا شیعہ مکتبِ فکر کی روایات سے استدلال

صحت قرآن کے بارے میں شیعہ نقطہ نگاہ

اس موضوع پر روایات کا تحقیقی جائزہ

عدم تحریف قرآن پر علما شیعہ کے اقوال

۶۔ قرآن مجید پر اعتراضات کے حوالہ سے مستشرقین کے اہداف

۷۔ اسلام کے بارے میں تحقیقات میں اہل مغرب کی غلطیاں

***

ا۔ مستشرق اور استشراق کا مفہوم

مستشرق اور استشراق کا لفظ ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر مستعمل ہے۔ انگریزی زبان میں اس کیلئے Orientalist اور Orientalism کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

Oxford Dictionary میں استشراق (Orientalism) کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ Orientalism اور (Orientalist) Orient سے بنا ہے جس کا معنیٰ ہے مشرق اور وہ ممالک جو بحیرہ روم کے مشرق میں ہیں خصوصاً مشرقی ایشیاء اور oriental کا معنیٰ ہے وہ جس کا تعلق مشرق سے ہو یا وہ جس کا تعلق مشرقی ایشیاء کے ممالک یا اس کی تہذیب سے ہو یا مشرق کا رہنے والا شخص۔ (1)

Webster's Third New International Dictionary میں Orientalism کے یہ معانی بیان کئے گئے ہیں:

(i) A Trait, custom or habit or expression charactristic of oriental peoples.

یعنی ایسی امتیازی خصوصیت رواج، عادت کا اظہار کا طریقہ جو مشرقی اقوام کے ساتھ مخصوص ہو۔

(ii) Learning in oriental subjects. یعنی مشرقی علوم کا مطالعہ

(iii) An oriental turn of thought adopted by a western thinker.

یعنی مشرقی اندازِ فکر جو کہ مغربی مفکر نے اپنایا ہو۔

(iv) Charactistic of oriental art or culture appearing in western practice.(2)

مشرقی فن یا کلچر کا وہ وصف جو اہلِ مغرب کے زیرِ عمل ہو۔

---

(1) H.W.Fowler, Oxford Dictonary of English, VII/200, Clarendon Press. Oxford ,1995.

(2) Merriam webster, The Merriam Webster Dictionary, 1046, Merriam Webster

اس اصطلاح کا استعمال زیادہ قدیم نہیں ہے، اسی لیے قدیم عربی لغات میں استشراق کا مادہ مذکور نہیں ہے۔ یہ اصطلاح دراصل انگریزی لفظ "Orientalism" کے مفہوم کو عربی زبان میں ادا کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ لفظ "اوری اینٹ" بمعنی "مشرق" اور "اوری اینٹل ازم" کے معنی شرق شناسی یا مشرقی علوم و فنون اور ادب میں مہارت حاصل کرنے کے ہیں۔ مستشرق، استشرق کے فعل سے اسم فاعل سے مراد ایک ایسا شخص ہے جو بہ تکلف مشرقی بنتا ہو۔[1] جدید ماہرین لغات نے اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ "Hans Wehr" نے عربی، انگریزی ڈکشنری میں استشراق کے معنی مشرقی علوم اور مستشرق کے معنی مشرقی آداب سے آگاہ یا مشرقی علوم کے ماہر کے بتائے ہیں۔[2] اور مستشرق ایک ایسے غیر مشرقی عالم کو کہتے ہیں، جو مشرقی علوم اور ادب اور معاشرت وغیرہ میں دلچسپی رکھتا ہو۔ تاہم زلفو مدینہ کے دیئے گیے معانی اور لفظ کے عام استعمال کی روشنی میں مستشرق کے مفہوم کی مزید تحدید بھی ہو سکتی ہے جس کے پیش نظر مستشرق، مغرب کے ایسے عالم کو کہا جاتا ہے جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت اور اسلامی زبانوں میں دلچسپی رکھتا ہو۔[3] ڈاکٹر عمر فروغ نے نجیب عقیقی پر تنقید کی ہے کہ اس نے اپنی کتاب المستشرقون، میں عبدالکریم جرمانوس الھنغازی، علی محمد وف، عثمانوف، الحسن الوزانی المعروف بہ لیون الافریقی، کامل الصباح اور محمد عیاد الطنطاوی جیسے علماء کو بھی مستشرقین میں شامل کیا ہے، حالانکہ یہ سارے مسلمان علماء ہیں اور ان کو مستشرقین میں شامل کرنے کا سبب صرف یہ ہے کہ یہ مختلف اوقات میں بلاد مغرب کے مختلف اداروں میں پڑھاتے رہے ہیں، حالانکہ "مستشرق وہ مغربی (یورپین یا امریکی) سکالر ہوتا ہے جو غیر مسلم ہو"۔[4]

استشراق کی تحریک کب شروع ہوئی؟ مغرب کے وہ علماء اور محققین جو اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں کیا انہوں نے خود ہی اپنے لیے مستشرق کا نام تجویز کیا یا مسلمانوں نے انہیں یہ نام دیا؟ ان سوالات کا ہمارے پاس کوئی حتمی جواب نہیں ہے، جس طرح پہلے بیان کیا

---

(1) شرف الدین اصلاحی: مستشرقین، استشراق اور اسلام، در معارف، ج ۱۱، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۶ء ص ۴۸۔۵۰

(2) Wehr, Hans, and J.Milton Cowan. A Dictionary of Modern Written Arabic. London: Harrap [etc.], 1976

(3) محمد یوسف رامپوری، تحریک استشراق، در مجلہ دار العلوم دیوبند، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۳۴۔۳۵

(4) عمر فروغ، "الاستشراق، مالہ۔۔۔وما علیہ" در، مجلۃ المنھل، عدد، ۴: ۱۷ اپریل۔ مئی ۱۹۸۹ئ، ص ۱۵

جا چکا ہے کہ قدیم عربی لغات میں مستشرق کی اصطلاح ناپید ہے، اسی طرح ادیان عالم کے مابین آویزش اور عقائد کی بحثوں میں کسی پرانے تذکرے میں اسلام کے خلاف کسی بھی لکھنے والے کو مستشرق کا نام نہیں دیا گیا۔[1] البتہ اسلامی علوم پر آج کے مغربی محققین اور دور قدیم کے مغربی تذکرہ نگاروں کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہم صدر اسلام کے یہود و نصاریٰ، جنہوں نے اسلام کے خلاف اعتراضات کے انبار لگا دیے، کو بھی مستشرق قرار دے سکتے ہیں۔

Oxford Dictionary میں بھی یہی معانی بیان ہوئے ہیں۔ اس لغات میں لکھا ہے کہ Oriental اپنے تمام معانی میں مغربی (Occidendal) کی ضد ہے جبکہ Orientalism کا معنی ہو گا مشرقیت مشرقی خصوصیت، مشرقی طرزِ ادا، مشرقی اقدار، مشرقی علوم و آداب اور فنون و ثقافت وغیرہ سے واقفیت و مہارت۔

اسی کے تحت Oriental Scholarship کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔

مشرقی زبانوں سے واقفیت۔ اسی سے Orientalist کا معنی ہو گا وہ شخص جو مشرقی زبانوں علوم وفنون، آداب و ثقافت اور تہذیب و تمدن وغیرہ میں مہارت رکھتا ہو۔[2] ڈاکٹر فاروق عمر فوزی (3) اور ڈاکٹر عمر بن ابراہیم النوان[4] نے بھی اس کی یہی تعریف کی ہے۔ مالک بن نبی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔[5]

English Arabic Lexicon میں اس سلسلے میں لکھا ہے Orientalism کا معنی ہے: من المتضلعين باللغات الشرقية وأدابها[6] یعنی مشرقی زبانوں اور آداب و معاشرت میں مہارت رکھنا۔

Encyclopaedia of Religion and Ethics میں Orientalism کو Syncretism

---

(1) حسین نصار، الاستشراق بین المصطلح والمفہوم، بحوالہ کتاب مذکور، ص ۱۲

(2) Oxford Dictonary: VII/ 200

(3) فوزی، فاروق عمر، الدکتور، الاستشراق التاریخ الاسلامی، ص:30، الاھلیة النشر و التوزیع، المملکة الاردنیة، الطبع الاول، 1998

(4) عمر بن ابراهيم رضوان، الدكتور، آراء المستشرقين حول القرآن الكريم و تفسير، دراسة و نقد، ص23، دار طيبه، الرياض

(5) مالك بن نبی، انتاج المستشرقین واثرہ فی الفکر الاسلامی الحدیث، ص6،5، دار ارشاد

(6) Lane, William ,Edward, Arabic-English Lexicon , 700, Williams & Norgate, London

کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔[1] ڈاکٹر اسماعیل محمد بن علی کا خیال ہے کہ اس پر تقریباً اتفاق رائے ہے کہ مستشرقین کا اطلاق ہر اس مغربی اہل علم پر ہوتا ہے جو خواہ مسلمان ہو خواہ غیر مسلم۔ لیکن نجیب العقیقی نے بعض مشرقی علماء کو بھی مستشرقین میں شمار کیا ہے۔[2] ڈاکٹر علی بن ابراہیم نملہ کا خیال ہے کہ مستشرق کو مغرب سے مخصوص کر دینا درست نہیں بلکہ مشرق میں مقیم مشرقی علوم میں کام کرنے والے یہود و نصاریٰ بھی مستشرقین میں شامل ہیں۔[3]

مستشرقین کی اصطلاح اگرچہ زیادہ تر ان غیر مسلم مصنفین کیلئے استعمال کی جاتی ہے جن کا تعلق مغربی ممالک سے ہے اور ان لوگوں نے اسلام اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ اصطلاح وسیع تر معنوں میں استعمال ہو جاتی ہے اور ان لوگوں پر بھی اس کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جو غیر مسلم ہوتے ہوئے اسلام پر تحقیقات کرتے ہیں خواہ وہ مغرب میں ہی قیام پذیر کیوں نہ ہوں۔

مستشرق اور استشراق کا مادہ ش، ر، ق اور یہ باب استفعال ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب کے جملہ خصائص و لوازمات یعنی کوئی چیز حاصل کرنے کی طلب کرنا، تکلف اور محنت کے ساتھ کوئی کیفیت طاری کرنا، مستشرقین کے حالات و شخصیات اور ان کی تحقیقات و تخلیقات میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ یہ اصطلاح اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام تر علم مخصوص مقصد کے تحت، بکمال تکلف، ایک مخصوص انداز کی جستجو سے حاصل ہوا ہے۔ حالانکہ بظاہر اس علم کو حاصل کرنے کی نہ تو انہیں ضرورت تھی اور نہ ہی انہیں آسانی سے یہ حاصل ہوا۔[4]

اسی طرح مستشرقین، اہل علم کا وہ گروہ ہو گا جس نے مشرقی علوم مشرقی زبانوں، مشرقی تہذیبوں اور مشرقی اقوام کے حالات اور ان کے عروج و زوال کی تاریخ کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا۔[5]

---

(1) James Hastings, Encyclopaedia of Religion and Ethics. xII/115, Charles Scribner's Sons, 1908

(2) اسماعیل محمد بن علی، الاستشراقیین الحقیقة والتضلیل، ص13، الکلمة للنشر والتوزیع، مصر، الطبة الثالثة

(3) النملہ، علی بن ابراهیم، الاستشراق والدراسات الاسلامیه، ص:124، الطبة الاولی، مکتبة التوبة، 1998

(4) شرف الدین: ۲۶_۲۸

(5) شرف الدین: ۲۶_۲۸

فرہنگ عامرہ میں اس لفظ کا معنی ہے وہ فرنگی یا امریکی شخص جس نے مشرقی علوم یا زبان میں مہارت حاصل کی ہو۔[1]

مستشرق اور استشراق کی اصطلاح زیادہ پرانی نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان و ادب میں ان اصطلاحات کا استعمال اپنے مخصوص معنوں میں اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔[2]

عربی فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا بنیادی مادہ ش ر ق تو موجود ہے لیکن باب استفعال میں اس کا معنی و مفہوم یا بطور فعل، ان لغات میں بحث موجود نہیں ہے البتہ جدید کتبِ لغت میں یہ لفظ موجود ہے۔

اُردو کی اہم کتب لغت میں اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو۔"[3]

Edward Wadie Said (1935 –2003) نے اپنی کتاب Orientalism میں اس سلسلے میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> The Orient is an integral part of European material civilization and culture. Orientalism expresses and represents that part culturally and even ideologically as a mode of discourse with supporting institutions, vocabulary, scholarship, imagery, doctrines, even colonial bureaucracies and colonial styles.[4]

مستشرق، مغرب کی مادہ پرست تہذیب و ثقافت کا ایک جزو لاینفک ہے۔ مستشرقیت، مغرب کے اس پہلو کی صحیح عکاسی اور اظہار کا نام ہے۔ یہ اظہار چاہے ثقافت کے روپ میں ہو یا نظریاتی رنگ میں۔

Edward Said مزید لکھتے ہیں:

> By Orientalism I mean several things, all of them, in my opinion, interdependent. The most readily accepted

---

(1) خویشگی، محمد عبداللہ، فرہنگ عامرہ، کراچی، ۱۹۵۷ء: ۵۷۷

(2) Oxford Dictonary: vII/ 200

(3) فیروز اللغات: ۲/ ۹۷۶؛ قائد اللغات: ۸۷۵؛ علمی اردو لغت: ۱۳۸۵

(4) Said, Edward, orientalism: 2, Knopf Doubleday Publishing Group, 2014

designation for Orientalism is an academic one, and indeed the label still serves in a number of academic institutions. Anyone who teaches, writes about, or researches the Orient—and this applies whether the person is an anthropologist, sociologist, historian, or philologist—either in its specific or its general aspects, is an Orientalist, and what he or she does is Orientalism.(1)

"مستشرقیت سے میری مراد بہت سی چیزیں ہیں اور میری رائے میں وہ سب باہم مربوط اور ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ مستشرقیت کی جس حیثیت کو ہر کوئی فوراً تسلیم کر لیتا ہے وہ اس کی علمی و نظری حیثیت ہے۔ یہ اصطلاح تعلیمی اداروں پر ایک لیبل کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ وہ شخص جو مشرقی تہذیب و تمدن کے بارے میں پڑھاتا ہو، اس پر لکھتا ہو یا اس کے بارے میں تحقیقات کرتا ہو، مستشرق کہلاتا ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ ماہر عمرانیات، ماہر تاریخ اور قدیم نسل انسانی کے ارتقاء اور اس کے عقائد و رسوم کے ماہر کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور ان شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں کے افکار و اعمال کو مستشرقیت کا نام دیا جاتا ہے۔" یہ مصنف مزید لکھتے ہیں:

Orientalism is a style of thought based upon an ontological and epistemological distinction made between "the Orient" and (most of the time) "the Occident."(2)

مستشرقیت ایک اندازِ فکر کا نام ہے جس کی بنیادیں انسانی علوم کی اساس اور دوسرے مابعد الطبیعیاتی نظریات کے بارے میں مشرقی اور مغربی مفکرین کی آراء کے تفاوت پر قائم ہوتی ہیں۔
مستشرق اور استشراق کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہی مصنف مزید لکھتے ہیں:

Orientalism can be discussed and analyzed as the corporate institution for dealing with the Orient—dealing with it by making statements about it, authorizing views of it,

---

(1) IBID,2

(2) IBID,3

describing it, by teaching it, settling it, ruling over it: in short, Orientalism as a Western style for dominating, restructuring, and having authority over the Orient(1) .

استشراق کے تجزیہ اور اس پر بحث و تمحیص کے بعد اس کا جو تصور ذھن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ استشراق مشرق کے بارے میں مغرب والوں کے افکار کے اظہار کا نام ہے۔ جس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مشرق کے بارے میں رائے زنی کرنا۔ مشرقی اندازِ فکر کی تعبیر و تائید کرنا۔ اس کی ترتیبِ نو کا خاکہ بنانا اور مشرق پر اپنا ذہنی تسلط برقرار رکھنا۔ غرض مشرق پر اپنی بالادستی قائم رکھنے اس کے موجودہ ڈھانچے کو اپنی ذہنی اپج کے مطابق تبدیل کرنے اور اس پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنے کیلئے اہلِ مغرب جو طریقہ اپناتے ہیں، اس کا نام مستشرقیت ہے۔

عہدِ حاضر کے ایک نامور مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

" مستشرقین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا تعلق مغرب سے ہے اور جنہوں نے اسلامیات کے مطالعے کیلئے زندگیاں وقف کر دیں۔ یہ لوگ مشرقی علوم میں دلچسپی رکھنے کی بنا پر مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں شہرت کے مالک ہیں۔ اس گروہ نے مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے، اسلام کے ماضی کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کرنے، اسلام کے حال کی طرف سے بیزاری اور اس کے مستقبل سے مایوسی، اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور اصلاحِ مذہب" (تجدّد و جدیدیت)، اصلاحِ قانون اسلامی کے بارے میں اس گروہ نے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔" (2)

ایک اور مفکر ڈاکٹر مصطفٰی السباعی تحریکِ استشراق کا تعارف یوں کرواتے ہیں:

"صلیبی جنگوں میں شکستِ فاش اور سیاسی میدان میں ناکامی کے بعد سے یورپ کا یہی فکر و ذہن اب دوسرے طریقوں سے اسلام اور مسلمانوں سے اس شکست کا بدلہ لینے کی تدابیر سوچتا رہا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی ایمانی قوت اور دینی صلابت کو کمزور کرنے اور اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے تمام تر اسلامی عقائد و تعلیمات کو علمی تحقیق کے عنوان سے بحث و نظر

1IBID, (1)

(2) ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۷۶ء: ص ۲۵۶

اور جرح و تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اسی کو تحریک اِستشراق کا نام دیا گیا۔" (1)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کا وہ مطالعہ و تحقیق جس کا آغاز مغرب کے یہودی اور عیسائی علماء نے محض ایک میکانکی عمل کے طور پر کیا اور جس کے پس منظر میں اسلام سے محبت، اس کا کامیاب تتبع کرنے کی خواہش کار فرمانہ تھی اور نہ ہی ان لوگوں کا اسلام کی صداقت پر ایمان و یقین تھا۔ اس میکانکی تحقیق کا دائرہ کار یہ تھا کہ ماضی میں عربی، فارسی، سنسکرت، چینی، انڈونیشی اور ترکی ایسی زبانوں میں تاریخ، مذہب، فلسفہ، لغت یا سائنس و ادب وغیرہ کے موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کا حاشیہ یا ترجمہ یا اختصار یا اشاریہ تیار کیا جائے یا اس کی تشریح و توسیع یا تنقید بہم پہنچائی جائے۔" (2)

تحریکِ استشراق محض مشرقی زبانوں سے واقفیت اور اسلامی علوم و آداب کے مطالعے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس تحریک نے ایک قدم آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے بغض و عناد کو اپنا لازمی جزو بنالیا۔ ابتدا میں تو استشراق محض اسلام کے خلاف مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہا لیکن بعد میں اس نے اپنے مقاصد متعین کیے اور بظاہر علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور اب گویا دوسرے مرحلہ پر استشراق نے باقاعدہ ایک تحریک ایک رویہ اور اندازِ فکر کی شکل اختیار کرلی۔ اس رویہ اور اندازِ فکر کی روشنی میں مختلف موضوعات کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس اندازِ فکر کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ اسلامی تعلیمات، اسلامی تہذیب، اسلامی شخصیات اور اسلامی ورثے کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔ اسلام کی عالمگیریت اور دائمیت کی خصوصیات کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کرنے کیلئے مسلمانوں میں علاقائی تہذیبوں کو اچھالا جائے۔ مقامی زبانوں اور مردہ لغات کو زندہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط میں تبدیل کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ ان لوگوں نے اسلام کے مسلمات کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں تشکیک کے بیج بونے کیلئے مربوط کوششیں کیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعمیر وارتقاء میں بیرونی عناصر کی کار فرمائی ثابت کی تاکہ اسلامی تہذیب کو خرافات کا مجموعہ ثابت کیا جاسکے۔ (3)

ڈاکٹر احمد ابراہیم السایح کا بھی یہی خیال ہے کہ استشراق کا مقصد اسلام سے کسی طرح کا علمی استفادہ

---

(1) السباعی، مصطفیٰ، ڈاکٹر، السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی، مکتبہ دار العروبیہ، قاہرہ، ۱۹۶۱ء: ۱/ ۱۲۵

(2) رفیع الدین، ڈاکٹر، اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریقہ کار، دار الاشاعت الاسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء: ص ۸

(3) ابو الحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش: ۲۰۷

نہیں بلکہ اسلام کے بارے میں پہلے سے طے شدہ مخصوص تصورات کو رائج اور عام کرنا ہے۔[1]

آئندہ سطور میں ہم مستشرقین کے ذہنی پس منظر سے پردہ اٹھائیں گے تاکہ واضح ہو جائے کہ ان کی یہ تحریک کس تاریخی پس منظر میں پروان چڑھی اور پھر یہ تحریک کن کن ادوار سے گزرتی رہی اور اس کے مقاصد اور حکمتِ عملی میں کس کس طرح تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔

۲۔ اسلام کے بارے میں مستشرقین کے اندازِ فکر کا پس منظر

یہودی اور عیسائی ہمیشہ سے ہی اسلام اور اہل اسلام کے خلاف برسر پیکار رہے ہیں ان دونوں مذاہب کے لوگوں نے اسلام او مسلمانوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ دشمنی مختلف رنگ اختیار کرتی رہی کبھی میدانِ جنگ میں کشت وخون کا بازار گرم رہا تو کبھی یہ معاندانہ ذہنیت سرد جنگ کی شکل اختیار کرتی رہی ہے۔ اسی ذہنیت نے صلیبی جنگوں کا طویل سلسلہ جاری کیا جس میں لاتعداد انسان موت کی نیند سو گئے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی اہل مغرب نے مسلمانوں کے خلاف ایک نئی جنگ کا آغاز کیا۔ یہ نئی جنگ قلم کے ذریعے شروع کی گئی۔ مغربی اہل قلم نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کیلئے نئے حالات کو بہترین موقع سمجھا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں اور اسلام سے اپنی دشمنی کے جذبات کو خوب اچھالا۔ حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا تاکہ مسلمانوں کو بھی اسلام سے بدگمان کیا جائے اور اپنے اہل مذھب کے سامنے بھی اسلام کی ایک گھناؤنی تصویر پیش کر کے انہیں اس کے خلاف سرگرم عمل رکھا جا سکے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام کے خلاف اکسانے کیلئے ہر حربہ اختیار کیا گیا یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ پیغمبرِ سلام ﷺ کی ولادت باسعادت کے ساتھ ہی عیسائیت کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑنے لگا تھا۔ چنانچہ Early Christianity in Arabia کا مصنف Thomas Wright (1810-1877) لکھتا ہے۔

اسی سال وہ واقعہ رونما ہوا جب عرب میں عیسائیت کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعے کے دو برس بعد عرب نے ایک ایسے شخص کو جنم دیا جو ان کا بدترین دشمن تھا۔ اس جیسا دشمن قریش نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔[2]

مشہور مستشرق John Joseph Saunders (1910 -1972) نے اظہار خیال کرتے

---

(1) السایح، احمد ابراهيم، الدكتور، الاستشراق فی میزان نقد الفكر الاسلامی، ص15، الدار المصریه، القاهرہ، الطبعة الاولی، 1996۔

(2) Wright, Thomas, Early Christianity in Arabia, 152, Bernard quaritch, London,

ہوئے لکھا ہے کہ جنگِ مُوتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کشمکش کا نقطہ آغاز تھا۔ ان لوگوں نے حضور ﷺ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اس جنگ کا آغاز کر کے کشمکش شروع کی تھی۔ ان کے الفاظ میں

"He fired the opening shot in the conflict between chirstendom and Islam which was to rage through the Centuries"

(جنگ موتہ کی شکل میں حضرت محمد ﷺ نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس کشمکش میں پہلا وار کیا جو صدیوں تک جاری رہا۔)

گبن Edward Gibbon (1895-1971) اور بہت سے دیگر مستشرقین کے خیال میں موتہ کی فوجی مہم کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین پر حملے کیلئے کوئی بہانہ تلاش کیا جاسکے۔ (1)

چارلس مل Charles Mills (1788-1826) کے خیال میں جنگ موتہ انتقام لینے کی ایک خواہش تھی تاکہ شام جیسے امیر ملک سے لوٹ گھسوٹ کی جاسکے۔ (2)

بُہل (Frants Peder William Meyer Buhl) (1850-1932) کے نزدیک جنگ موتہ کا مقصد عیسائیوں کو حضرت محمد ﷺ کے زیر نگیں لانا تھا۔ (3)

بروکلمان (1868 -1956) Carl Brockelmann کے خیال میں یہ واقعہ اس وقت کے سیاسی حالات کا غلط طور پر اندازہ لگانے کا نتیجہ تھا۔ (4)

ولیم میور (1819 -1905) William Muir, کہتا ہے کہ اس غزوے یعنی جنگ موتہ کا مقصد شام کی سرحد کے قریب جاسوسی کرنا تھا۔ (5)

فلپ ھٹی (1886- 1978) Philip Khuri Hitti کے نزدیک اس غزوے کا مقصد

---

(1) Gibbon, Decline and Fall of Roman Empire, London, 1954 v/216

(2) Mills, History of The Crusades I/256-62, Kessinger Publishing, Jul 2006 - 280 pages

(3) Buhl, (Article on Koran) Encyclopaedia of Islam. III.773, Second Edition, Edited by: P. Bearman

(4) Brockelmann, History of Islamic Peoples: p.49, Capricorn Books, 1960

(5) Muir, Life of Mahomet: IV/ 94-96, Hansebooks, 2016.

دشمنوں کا اسلحہ اکٹھا کرنا تھا۔ (1)

حالانکہ ان لوگوں کے اس نظریے میں قطعاً صداقت نہیں ہے کہ جنگ (موتہ) کا آغاز حضور ﷺ کی جانب سے ہوا تھا۔ بلکہ اس کا سبب خود عیسائی بنے تھے۔ عیسائی سردار شرجیل ابن عمرو نے حضور ﷺ کے قاصد کو قتل کر دیا۔ جبکہ وہ بصرہ کے گورنر کے پاس حضور ﷺ کا یہ پیغام لے کر جا رہا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ اس بات کو خود مستشرقین کے ایک گروہ نے تسلیم کیا ہے۔

یہ قتل دنیا کے تمام قوانین کی خلاف ورزی تھی۔ اس کے مقابلے میں حضور ﷺ نے 3000 آدمیوں کو بھیجا اور زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس مہم کا کمانڈر مقرر کیا۔ ان کا مقابلہ بازنطینی لشکروں سے ہوا جن کی تعداد ہزاروں کو پہنچی ہوئی تھی اور خوفناک طور پر مسلح تھے۔ اسے عربوں کی امداد بھی حاصل تھی۔ خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ نے سخت مقابلہ کیا۔ عیسائیوں کا وسیع علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ (2)

اس واقعے سے عیسائیوں کے دلوں میں نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوئے۔ حالانکہ اس ساری صورت حال کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے کو شہید کر کے خود عیسائیوں نے کیا تھا۔

ہم نے شروع میں Thomas Wright (1810-1877) کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ بقول اس کے پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت باسعادت کے ساتھ ہی عیسائیوں کی ناکامیوں کا آغاز (واقعہ فیل کی شکل میں) ہو گیا تھا۔

اس سلسلے میں Zucker لکھتے ہیں:

> The foundor of the religion binding together the huge empire which almost brought about the destruction of christion Europe on several occasions was Mohammad. (3)

"اس مذہب کے بانی جس نے ایک بڑی ریاست قائم کی اور وہ مسیحی یورپ کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا سبب بنا وہ محمد ﷺ ہی ہیں۔" اس موضوع پر لاتعداد مستشرقین کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

غرض جب سے تحریک استشراق نے جنم لیا ہے عیسائی اور یہودی اہل علم نے اپنے ہم مذہب لوگوں کو اسلام کے خلاف اکسانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ تاریخی حقائق کو مسخ کر کے یہ ثابت کرنے

---

(1) Hitti, Islam and The West, Van Nostrand, New York, 1962, P: 47

(2) طبری، محمد بن جریر، ابو جعفر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۵۷ء، جلد ۳، ص: ۳۹-۴۱

(3) Zucker, Western Literature, The Commercial Press, Shanghai, 1925 II/ 320

کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اسلام شروع دن سے ہی یہودیوں اور عیسائیوں کا دشمن ہے اور مسلمان ہمیشہ سے ان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں مستشرقین نے باقاعدہ کوششیں کی ہیں کہ تاریخی حقائق کو توڑ موڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ بھی ہمیشہ عیسائیوں کو کھٹکتا رہا۔ اس قبضے کے دوران اگرچہ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی بھی طرح کا کوئی جبر یا پابندی روا نہیں رکھی اور عیسائیوں کو ایسا تحفظ مہیا کیا جس کا عیسائی تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اس تمام عدل واحسان اور رواداری کے باوجود عیسائی مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرتے رہے۔

مسلمانوں نے چار سو برس تک عیسائیوں کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن عیسائی قیادت ہمیشہ مسلمانوں کو غاصب اور ظالم کہتی رہی۔ ظلم و جبر کے من گھڑت قصے مشہور کئے گئے۔ یورپ والوں کو اپنی مظلومیت کی کہانیاں سنا سنا کر انہیں مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے اس طرح پوپ دوم نے مسلمانوں پر جنگ مسلط کر دی جس کا مقصد یہ تھا کہ بیت المقدس مسلمانوں سے چھینا جا سکے۔ کتب تاریخ ان تفاصیل سے بھری پڑی ہیں کہ بیت المقدس چھیننے کیلئے عیسائی قیادت نے کتنے کتنے جتن کئے اور مظلومیت کے کس قدر قصے اختراع کئے اور بدگمانیوں کے طوفان کھڑے کئے گئے۔

اس سلسلے میں Kirby Page (1890–1957) لکھتا ہے:

> It is almost impossible for modern Christians to appreciate the depth of emotion which swept over medieaval Christendom at the thought of the tomb of Christ being in the hands of Mohammadans. The vilest of calumnies against the Moslems were blindly received by the credulous members of the church. No tale of inhumanity was too horrible to be accepted[1] .

Tomb of christ کے مسلمانوں کے قبضہ میں ہونے کی وجہ سے قرون وسطی کے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جذبات کی شدت اور گہرائی کو جدید دور کے عیسائی محسوس نہیں کر سکتے۔ اس وقت چرچ کے نمائندوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف کوئی انسانیت سوز کوئی کہانی ان الزامات اور افترا

(1) Kirby page, Jesus or Christianity, New York: 91

پروازیوں سے زیادہ رسوا کن اور خوفناک نہ ہوگی۔

مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے غم و غصے کے اسباب میں سب سے بڑا سبب مذہبی تعصب اور حلیفانہ انداز فکر تھا۔ جو عیسائی علاقوں پر مسلمانوں کے قبضے کی وجہ سے پیدا ہوا اس سلسلے میں پروفیسر ظفر علی قریشی نے بڑے جامع انداز میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

The capture by muslims of the fairest provinces of the byzantine Empire like syria, Egypt etc __ which were the strongholds of the eastern church___ the conquest of north Africa, Spain and Sicily by the Arabs and their victorious advance up to the very gates of Rome; the rise of the Turks, their brilliant conquest in Eastern and central Europe__ threatening at the very heart of christendom, the launching of crusades by the west and their dismal failure, the new phase of western imperialism and colonialism, its onward march, rout and retrogression, there all have combined together to engender, foster, and leave behind a legacy of bitterness, hatred and enmity in the hearts of the west against Islam and its prophet.[1]

"عیسائیوں نے اتنے زیادہ علاقوں کے ہاتھ سے نکل جانے کو کبھی بھی بھلایا نہیں اور نہ ہی مسلمانوں کو کبھی معاف کیا۔ اسکے بعد بھی ایسے محرکات سامنے آتے رہے جن سے مغرب والوں کا غیظ و غضب بڑھتا ہی رہا۔ سپین اور سسلی سے مسلمانوں کو مکمل طور پر نکالنے میں ناکامی مغربی شہنشاہیت کے مرکزی علاقوں میں مسلمانوں کا مغرب کے خلاف مزاحمت پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا۔ مغرب کی غلامی سے آزادی کیلئے مسلمانوں کی غیر متزلزل ہمیشہ ثابت قدمی، اور مسلسل اور کبھی ختم نہ ہونے والی جدوجہد، اہل مشرق سے بدلہ لینے میں اہل مغرب کی مایوسی سے بھری ہوئی ناکامی اور اہل مغرب کی اجارہ داری کی ہتھکڑیوں کو اتار کر

(1) Zafar Ali Qureshi, Prophet Mohammad and his western critics, ilmi Kitab Khana Lahore, 1984:1,2

پھینکنے کی موجودہ جدوجہد، ان سب محرکات نے اہل مغرب کے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے جذبات کو مزید برانگیختہ کر دیا ہے۔ یہ تلخی اور دشمنی بڑھتی ہی چلی گئی، چنانچہ انہوں نے اسی غصے میں انتقام کی یہ راہ اختیار کی کہ اسلام اور بانی اسلام کے بارے میں حقائق کو اپنے مقصد کیلئے غلط رنگ میں رنگ دیا۔"

اس طرح یہ قومیں کبھی بھی پر امن اور خیر سگالی کے ماحول میں نہیں رہیں کبھی کھلی جنگ ہوئی تو کبھی سرد جنگ میں مصروف ہو گئیں۔ نفرت اور خوف وہراس مسلمانوں کے ساتھ اس طرح منسوب کر دیا گیا کہ مسلمان جبر و تشدد کی علامت کے طور پر مشہور کر دیئے گئے۔

Gibbon (1895-1971) لکھتے ہیں:

> From Arabia to Euphrates the Arabian tribes are confounded by the Greeks and Latins under the general appeletion of saracenes, a name which every Christian has been taught to pronounce with terror and abhorrence[1].

اس پس منظر کے اثرات عیسائیوں پر اس قدر گہرے مرتب ہوئے کہ جذباتی اشتعال کے دوران عیسائی لشکر بیت المقدس کی فتح کیلئے آگے بڑھا۔ راستے میں وہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کو قتل کرتا چلا گیا۔ عورتوں اور بچوں کا لحاظ کئے بغیر اس لشکر نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ان مشتعل عیسائیوں نے 70000 مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس بات کا اعتراف مستشرقین نے بھی کیا ہے۔[2]

یہ ذہنی اشتعال اس قدر گہرا اور دیرپا تھا کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کا اثر ختم نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ عیسائیوں نے مسلمان دشمنی کو زندہ و تازہ رکھنے کیلئے یہ موقف اختیار کر لیا کہ صلیبی جنگیں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے خلاف ہر اقدام کو انہوں نے صلیبی جنگوں کے تسلسل کا نام دیا۔ اس طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک کبھی نہ ختم ہونے والی سرد جنگ کا آغاز کر دیا۔ پہلی عالمگیر جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو اسے بھی صلیبی جنگوں کا بدلہ شمار کیا گیا اور اسے "Crusades won by all and sundry in the west"[3] قرار دیا۔

اس سلسلے میں Hendrik Willem van Loon (1882 -1944) اپنی کتاب Tolerance میں لکھتے ہیں:

---

(1) History of the Decline and Fall of Roman Empire, London, 1961 VI/ 35

(2) ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۸ھ: جلد 10، ص: ۲۸۳۔۸۴

(3) Van Loan, Hendrik, Tolerance, 114

The followers of the two great teachers who were such close relatives have always recognised each other with bitter scorn and have fought a war which has lasted more than twelve centuries and which has not yet come to an end.[1]

دیگر مستشرقین جن میں Pringle Kennedy [2] (1855–1925) اور[3] Philip Khuri Hitti (1886-1978) جیسے لوگ شامل ہیں، اس نقطہ نگاہ کے حامل ہیں کہ صلیبی جنگیں اب بھی جاری ہیں۔ اس ذہنی پس منظر میں تحریک استشراق کا آغاز ہوا۔

پروفیسر ظفر علی قریشی اس سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ مستشرقین اپنے ذہن میں ایک نقطہ نگاہ ایک مخصوص مقصد کیلئے تیار کرتے ہیں۔ پھر اس نقطہ نگاہ کو ثابت کرنے کیلئے وہ مسلمہ تاریخی حقائق وروایات کو توڑ موڑ کر محض اپنی قیاس آرائیوں اور ظن و تخمین کی بنیاد پر نئے معانی پہنا دیتے ہیں۔ پروفیسر قریشی نے اس سلسلے میں واقدی کی ایک روایت کی مثال پیش کی ہے۔ جو جنگ موتہ کے بارے میں ہے۔ مختلف مستشرقین نے اس روایت سے اپنے اپنے ذاتی میلان کے مطابق نتائج اخذ کیے ہیں ہے۔

پروفیسر موصوف بیان کرتے ہیں کہ ہر مستشرق نے اس روایت کو من وعن اپنے صحیح مفہوم میں اختیار کرنے کی بجائے اسے اپنے ایک مخصوص مقصد کے تحت نئے معانی پہنا دئے ہیں۔ مستشرقین اس روایت اور اس واقعے سے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ کاروائی محض حضورؐ کی انتقامی ذہنیت کی غمازی اور دلیل ہے۔

پروفیسر قریشی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر یہ لوگ واقدی کی روایت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں جبکہ دوسرے مقامات پر وہ اسی واقدی کے قول ورائے کو انجیل مقدس کا مقام دیتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے مختلف مستشرقین کی بیان کردہ اس واقعے کے بارے میں رائے اور نقطہ نگاہ بیان کیا ہے اور ثابت کرتے ہیں کہ ایک ہی روایت کے بارے میں ہر مستشرق الگ الگ مفہوم مراد لیتا ہے۔[4]

---

(1) IBID,P114

(2) *Kennedy,Pringle,186*

(3) Hitti,P.K,Islam and the West, New york, 1962:48-49

(4) Prophet Mohammad and his western critics,P,4,5

پروفیسر قریشی لکھتے ہیں:

"اس جنگ کے صحیح اسباب جاننے کے باوجود ہر مستشرق اپنے اپنے طور پر پوری پوری کوشش کرتا ہے کہ اصل معاملہ اور جنگ کے اصل اسباب کو خلط ملط کر دیا جائے۔ اس مقصد کیلئے وہ باریک اور پیچیدہ قسم کے دلائل اور قیاس آرائیاں پیش کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ اس واقعے کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھال لیا جائے۔" (1)

اسلام کے بارے میں اہلِ مغرب کی تحقیقات کے پس منظر میں مادّہ پرستانہ ذہنیت بھی کار فرما ہے۔ اس ذہنیت نے ان کے اندازِ تحقیق اور فکری زاویوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس ذہنی پس منظر نے ان کے قلب و نظر پر جو اثرات مرتب کئے ان کی موجودگی میں مغرب کے خیر و شر، اچھائی اور برائی، مفید اور غیر مفید کے پیمانے ہی بدل گئے۔ اب ان کے نزدیک اچھا، خوب، مفید اور نافع وہ چیز یا اصول نہیں رہا جس میں کسی اخلاقی پہلو پر کوئی ہدایت دی گئی ہو یا روحانی اصلاح کا کوئی اصول بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ ان کے نزدیک نافع وہ چیز ہے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتی ہے۔ انہوں نے تغیر و ارتقاء کا اطلاق محض سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہی نہیں کیا بلکہ اس کا اطلاق انہوں نے مذہب، اخلاق اور معاشرتی ضوابط پر بھی کیا۔ مریم جمیلہ کے الفاظ میں، اب مغرب کا معیار یہ ہو گیا کہ

The west thinks that constant change and innovation is not only inevitable but the highest of all ideals. (2)

ترجمہ: "اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ مسلسل تبدیلی اور تخلیقی ارتقاء نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ یہ بلند ترین نصب العین ہے۔"

اس اصول پر کار بند ہو کر اہلِ مغرب یہاں تک پہنچے کہ اخلاق بھی اب Relative اور Subjective چیز ہے۔ غلط اور صحیح کا مفہوم زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ غلط اور درست، سچا اور جھوٹا، خوبصورت اور بدصورت کا اپنا کوئی مخصوص مفہوم نہیں ہوتا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی مخصوص تبدیلی درست ہے یا نقصان دہ، کیونکہ درست وہی ہو گی جو جدید ہو گی۔ نئی ایجاد و اختراع اپنے آپ بذاتِ خود بلند ترین اچھائی ہوتی ہے۔ (3)

---

(1) IBID

(2) Maryam Jamila, Orietalism, p 110

(3) IBID, P.110

مریم جمیلہ نے مستشرقین کے اندازِ فکر کو سمجھانے کیلئے ایک شخص Freeland Abbott کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ مذکورہ بالا اندازِ فکر کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں کہ یہ شخص قدیم زمانے کے آخرت کے عقیدے اور آخرت کی بھلائی پر زور دینے کے نظریے کی تضحیک اڑاتا ہے۔ گویا مستشرقین قدیم کو محض اس لئے فضول اور بے معنٰی سمجھتے ہیں کہ وہ قدیم ہے اور اب زمانہ بدل گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں۔ Freeland Abbott مشہور مسلمان سائنس دان ابو بکر زکریا رازی (606ھ) کے بارے میں یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ اس نے بہت سی خدمات سرانجام دیں۔ لیکن بہت سے دوسرے مسلمانوں کی طرح اس نے بھی اپنے زمانے کو متاثر نہیں کیا۔ مزید یہ کہ وہ روایت پسند تھا۔ اس کی بہت سی دریافتیں غیر ضروری اور غیر مفید تھیں۔[1]

اسلام کے بارے میں مستشرقین کے متعصبانہ اندازِ فکر کے اسباب کا کھوج لگاتے ہوئے مریم جمیلہ نے ایک سبب یہ قرار دیا کہ اہلِ مغرب اپنی تہذیب کے بارے میں احساس برتری کا شکار ہیں اور کسی اور مذہب یا تہذیب کے بارے میں سوچنے کیلئے تیار ہی نہیں ہیں کہ وہ ان کی تہذیب کے ہم پلہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً لارڈ میکالے نے ہندوستان میں نظام تعلیم مسلط کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ

Western learning was the seat of all civilized knowledge.[2]

"مغربی علوم مہذب علوم ہی کی سند ہیں۔ گویا تہذیب و شائستگی کے علوم مغرب ہی کی علمی مسندوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔"

مریم جمیلہ لکھتی ہیں:

I have never found among the orientalists any who could deny that a single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia.[3]

ترجمہ: "میں نے مستشرقین میں سے کوئی ایسا شخص نہیں پایا جو اس بات کو جھٹلاتا ہو کہ کسی الماری کی شیلف جس پر مغربی کتب پڑی ہوں وہ ہندوستان اور عربوں کی سب کی سب مقامی کتابوں سے افضل نہیں ہے۔"

---

(1) IBID, P.111

(2) IBID, P.111

(3) IBID, P.111

مذکورہ بالا اقتباس میں محض المباری کی کتابیں ہی مراد نہیں بلکہ 'المباری کی کتابیں' اشارہ ہیں ان لوگوں کی طرف جنہوں نے یہ کتب لکھی تھیں۔ یعنی ایک یورپی مصنف ایک ہندوستانی اور عربی مصنف سے کہیں زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ذہنی و فکری تکبّر، کسی دوسری قوم کی فکر، مذہب یا تہذیب کو کچھ وقعت دینا گوارا نہیں کرے گا بلکہ اس کی ساری کوشش ہی یہ ہو گی کہ دوسری قوموں کی اعلیٰ ترا قدار کی بھی تنقیص کی جائے اور اپنے اشخاص و افکار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ اس فکری تکبّر نے انہیں حقائق تسلیم کرنے سے عاری کر دیا۔ انہیں دوسری قوموں کی صفات اور خوبیاں، ان کے عیب نظر آنے لگیں اور اپنے معائب آنکھوں سے اوجل ہو گئے۔ اس طرح مغرب والے حقائق تسلیم کرنے کی صلاحیت سے تہی دست ہو گئے۔ [1]

چنانچہ اسی احساس کے زیر اثر وہ اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اسلام کی بہت عمدہ اقدار ہیں۔ مریم جمیلہ نے ایک مستشرق کو ذہن میں رکھ کر مغرب کے فکری میلانات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ شخص اس بات کا انکار کرتا ہے کہ تہذیب کی تشکیل کے سلسلے میں اسلام نے اپنی کوئی الگ تعلیمات بھی دی ہیں۔ یہ شخص کہتا ہے کہ: آج سے ایک صدی قبل جب مغرب آج سے مضبوط عیسائی تھا، اس وقت کسی بھی شخص کے ذہن میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاتا تھا کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ اور زمانے کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اس کے پاس کیا ہے؟ [2]

اس احساس کے نتیجے میں ان کے اندر اعتماد کا پہلو بھی پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف مسلمان اب محکوم بن چکے تھے۔ وہ حکمرانوں کے نظریات سے مرعوب ہو گئے اور حکمرانوں کے نظریات کو قبول کرنے لگے۔ حاکموں نے بھی اپنے نظریات مسلط کرنے کیلئے تمام وسائل استعمال کئے۔ اس کے ساتھ ہی حکمرانوں کے اندر احساسِ برتری بھی پیدا ہو چکا تھا۔ انہیں تکنیکی، سائنسی اور معاشی تفاوت بھی حاصل تھا۔

چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے افکار و نظریات کا حامی بنانے کیلئے تمام وسائل صرف کر دیے۔ اس بات کا تذکرہ مشہور مغربی محقق Arnold J Toynbee یوں کرتے ہیں:

Islam is once more facing the west with her back to the wall, but this time odds are more heavily against her than they were at the most critical moment of the crusades, for modern west is superior

---

(1) IBID, p 111

(2) IBID, p 115

to her not only in arms but also in the technique of economic life on which military science ultimately depends and above all in spiritual culture the inward before which alone creats and sustains the onward manifestation of what is called civilization.(1)

ترجمہ: "اسلام ایک مرتبہ پھر اس طرح مغرب کے مد مقابل ہے کہ گویا وہ جان بچانے کے لیے لڑ رہا ہو لیکن اس مرتبہ اس کے برتری حاصل کرنے کے امکانات شدید حد تک اس کے خلاف ہیں جیسا کہ صلیبی جنگوں میں اس کے حق میں تھے کیونکہ جدید مغرب اب اس سے ہتھیاروں کے اعتبار سے برتر ہے بلکہ معاشی زندگی کی مہارت میں بھی برتری ہے جس پر کہ عسکری سائنس کا دارومدار ہوتا ہے اور برتری کے ان تمام پہلوؤں سے بڑھ کر مغرب کے پاس وہ فکری کلچر بھی ہے جو اس صلاحیت کو پیدا کرنے اور اسے قائم و دائم رکھنے میں باطنی قوت کی حیثیت رکھتی ہے، جسے تہذیب کہا جاتا ہے۔"

مستشرقین کے ان اقوال کی روشنی میں یہ بات بڑی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ جس ذہنی پس منظر میں انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ لکھا ہے، ان سے یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ اعتدال اور انصاف پر مبنی رویہ اختیار کریں گے۔ اگر مسلمان کہیں کہ مستشرقین نے ان کے بارے میں لکھتے ہوئے انصاف نہیں کیا تو شاید اس میں اتنا وزن نہ ہو گا لیکن جب خود مستشرقین "تحقیقی بے اعتدالی" کا اعتراف کرتے ہیں تو پھر قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں ان تحقیقات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

---

(1) Toynbee, A.J Civilization on Trail, Oxford University Press. Oxford, 1957, p 189

۳۔ قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقات کے ماخذ

قرآن مجید کے متن کی صحت، ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ لیکن مستشرقین نے اس اہم شعبہ میں صحت متن قرآن پر اعتراضات کرتے ہوئے تحقیق کے مسلمہ بین الاقوامی اصولوں سے واضح طور پر انحراف کیا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم اس موضوع پر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی عملی و تحقیقی حیثیت متعین کرنے کے لئے ان کی تحقیق کے ماخذ اور اصولوں کا جائزہ مندرجہ ذیل پہلوؤں سے لیں گے۔

vi. ناقابل اعتبار ماخذ سے استفادہ

الف: روایات کے ردو قبول کے کسی معیار کی عدم موجودگی۔

ب: ضعیف اور موضوع روایات سے استفادہ۔

vii. ردو قبولِ روایات میں مسلمانوں کے معیارات

viii. مستشرقین کا تحقیق کے مسلمہ اصولوں سے انحراف

ا۔ اسلامی کتب کا بالواسطہ مطالعہ

ب۔ قرآن مجید کا بالواسطہ مطالعہ

ج۔ تراجم پر قناعت

د۔ بالواسطہ حوالہ دینا

ہ۔ پہلے سے طے شدہ عزائم کے لئے حوالہ حاصل کرنا اور عبارات کے مفاہیم کو مسخ کرنا۔

ix. مستشرقین کا شیعی روایات سے استدلال اور

x. صحتِ متن قرآن کے حوالہ سے شیعہ کا حقیقی موقف

اسلام کے بارے میں تحقیقات کے دوران مستشرقین نے جن مآخذ سے استفادہ کیا، ان کا جائزہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا۔ ان کا طرز استدلال اور ان کے مقاصد مخصوص تھے۔ اس صورت حال میں اس بات کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے کہ وہ کسی صحیح فیصلے تک پہنچ سکیں۔ وہ اس طرح کے مطالعے سے ایسے نتائج سامنے لائے جنہیں عقل، انصاف اور حقائق کبھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے صحیح، مستند اور قابل اعتبار روایات کو اپنی تحقیقات کی بنیاد بنانے کی بجائے ضعیف اور محدثین کے نزدیک مسترد شدہ

روایات کو اس انداز سے اچھالا کہ گویا یہ کمزور روایات مسلّمات کی حیثیت رکھتی ہیں اور مستند روایات کو جو ان کے مقاصد کی تائید نہیں کرتیں اس طرح نظر انداز کیا کہ گویا ان کا کہیں وجود ہی نہ ہو۔ وہ صحیح و سقیم، حقیقی و موضوع روایات میں فرق کرنے کی صلاحیت ہی سے عاری نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے مقصد کے تحت مخصوص نتائج حاصل کرنے کیلئے مستند روایت کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن ادب (Literature) کی کسی کتاب سے اسلام اور اسلامی تعلیمات یا اسلامی تہذیب و ثقافت کے کسی پہلو کی تشریح کیلئے مواد حاصل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں اخذِ روایت کے کڑے اصول موجود ہیں خصوصاً قرآن حکیم کی تاریخِ تدوین تو بنیادی مسئلہ ہے اس سلسلے میں تو تحقیق کے ان اصولوں کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا جانا چاہیے اور وہی روایات مانی جانی چاہیئں جو مستند اور قابل اعتبار ہیں۔ اور جو اعلیٰ طبقہ کتبِ حدیث میں منقول ہیں۔ لیکن مستشرقین کا طریق کار اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی غالب اکثریت اصل کتب سے استفادہ کرنے کی بجائے، کتب کے تراجم اور دوسرے لوگوں کی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس طرح نسل در نسل وہ غلطیوں کے مرتکب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس تقلیدی انداز کی بناء پر وہ صدیوں سے غلطیوں کے مرتکب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ (آئندہ صفحات میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔)

ضعیف اور موضوع روایات سے استفادہ:

حفاظتِ قرآن مجید پر مستشرقین کے اعتراضات میں سے بہت سے اعتراض مسلمانوں کی کتابوں میں موجود موضوع اور ضعیف روایات کی بنیاد پر کیے گئے ہیں۔ انکا طریق کار یہ ہے کسی کتاب میں موجود کسی روایت کو پکڑ کر اسے اپنے مخصوص مقاصد کیلئے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی پرواہ ہی نہیں کرتے کہ اس روایت کو مصنّف یا مؤلّفِ کتاب نے کس سیاق و سباق اور کس عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ مستشرقین جو نتائج ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ احادیث اور روایات کی مجموعی شہادت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ جہاں انہیں اعتراض کرنا ہوتا ہے وہاں پہلے ہی وہ اپنے ذہن میں اعتراض کی ایک بلند عمارت تعمیر کر لیتے ہیں اور اس کی تائید کیلئے کمزور سے کمزور اور موضوع روایت تلاش کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اس بات کی چنداں پرواہ نہیں کرتے کہ اس روایت کی نفی کرنے والی درجنوں روایات جو اس کمزور روایت سے کہیں زیادہ معتبر بھی ہیں، انہی صفحات میں موجود ہیں۔ وہ جو نتائج پیش کر رہے ہوتے ہیں ان کے بارے میں انہیں کوئی

فکر نہیں ہوتی کہ احادیث وروایات کی مجموعی شہادت اور معتبر ذرائع سے ثابت شدہ دلائل کی روشنی میں کس قدر لغو ثابت ہوں گے۔

دور حاضر میں تحقیق کرنے والے ہر محقق کیلئے اس بنیادی حقیقت کا جاننا نہایت ضروری ہے کہ محدثین نے سخت محنت کے بعد معتبر اور غیر معتبر روایات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں درج شدہ روایات کے بارے میں واضح کر دیا ہوا ہے کہ کون سی روایت صحت و قبولیت کے اعتبار سے کس درجہ کی ہے حتیٰ کہ موضوع (بعد میں گھڑی ہوئی) روایات کو الگ کتابوں میں یکجا کر دیا ہے تاکہ بعد کے لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ من گھڑت روایات کون کون سی ہیں۔ (1)

قرن اول میں مسلمانوں کا ایک انداز یہ تھا کہ وہ کسی بھی موضوع پر اس زمانے میں موجود تمام مواد پیش کر دیتے تھے اور اس میں نشاندہی کر دیتے تھے کہ ان کی فلاں روایت کا صحت کے اعتبار سے کیا مقام ہے۔

اس سے ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ ان کے زیرِ بحث مسئلہ میں اس وقت تک پائی جانے والی تمام آراء سے اگلی نسل واقف ہو سکے۔ اور وہ اصل اور الحاقی روایات سے آگاہ ہو جائیں۔ ایسی کتب میں کسی روایت کا موجود ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ بات لازمی طور پر معتبر اور ثقہ بھی ہو گی۔ اصل حقیقت (جسے ہم نے ابتداء میں "حدیث کی مجموعی شہادت" کے الفاظ دیے ہیں) تو ان تمام روایات پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے ہی حاصل ہو گی۔

کچھ یہی کیفیت علامہ جلال الدین کی الاتقان کی ہے۔ اگر مثال کے طور پر جمع و تدوینِ قرآن مجید کے تحت ان کی بحث مدنظر رکھی جائے تو ہر شخص اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے جمع قرآن کے بارے میں ایک یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ "حضور اکرم ﷺ کا انتقال ہو گیا درانحالیکہ قرآن مجید جمع نہیں

---

(1) اس شعبہ میں لکھی گئی چند کتب یہ ہیں: کتاب الموضوعات از ابن جوزی (۵۹۷ھ) اللآلی المصنوعہ فی احادیث الموضوعۃ از علامہ جلال الدین سیوطی، المغنی عن الحفظ والکتاب اَبو عمرو بن بدر موصلی (م ۶۲۳) الدرر الملتقط فی تبیین الغلط از علامہ رضی الدین ابو الفضل حسن ابن محمد بن حسین (م ۶۵۰ھ) تذکرۃ الموضوعات از ابن طاہر مقدسی، موضوعات از علامہ علی القاری (م ۱۰۱۴ھ) تذکرۃ الموضوعات محمد بن طاہر پٹنی، الفوائد المجموعۃ فی اَحادیث الموضوعۃ از علامہ شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) رسالۃ از امام صنعانی (م ۱۳۰۵ھ) اللؤلو المرصوع از محمد بن خلیل بن ابراہیم المشیشی الطرابلسی م ۱۳۰۵ھ)

ہوا تھا۔"(1)

انہوں نے ایک روایت یہ بھی بیان کی ہے حضور ﷺ کی وفات تک صرف چار صحابہؓ کرام نے قرآن مجید جمع کر رکھا تھا اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہ روایات بھی بیان کی ہیں جن میں ان متعدد صحابہ کرامؓ کے نام مذکور ہیں جنہوں نے حضورؐ کے سامنے قرآن مجید حفظ بھی کیا تھا اور لکھ کر محفوظ بھی کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ "قرآن مجید تین مرتبہ جمع ہوا، ایک عہد نبویؐ میں، پھر عہد صدیق اکبرؓ میں اور تیسری مرتبہ عہد عثمان غنیؓ میں"۔ یہی صورت ناسخ و منسوخ والی فصل میں موجود ہے انہوں نے نسخ فی القرآن کے عنوان کے تحت ایک فصل کا نام ہی "منسوخ التلاوۃ و موجود الحکم" یعنی وہ چیزیں جو پہلے قرآن میں پڑھی جاتی تھیں لیکن ان کی تلاوت ختم کر دی گئی اور حکم اب بھی باقی رکھا ہے۔(2)

قرآن کی ان سابقہ آیات کا ذکر الاتقان میں دیکھ کر مستشرقین یہ باور کرواتے ہیں کہ گویا یہ ٹکڑے اب قرآن میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور موجودہ قرآن ادھورا ہے۔ حالانکہ ان منسوخ التلاوۃ ٹکڑوں کا الاتقان میں موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ علامہ سیوطی (911ھ) انہیں قرآن کا حصہ سمجھتے ہیں۔

ایک محقق کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس طرح کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بات ملحوظ رکھے کہ مصنف نے اس روایت کا ذکر کس سیاق وسباق میں کیا ہے۔ لازم ہے کہ وہ معتبر اور غیر معتبر روایت میں فرق کی بنیادی حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرے۔ کسی محقق کیلئے کسی طرح بھی یہ درست نہیں کہ وہ احادیث کے اس طرح کے ذخیرہ میں سے ایک حدیث لے کر اپنی مرضی کے نتائج اخذ کر لے۔ وہ جو نتائج اخذ کرتا ہے اسے پہلے بہت سے امور کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔ اگر کسی جگہ احادیث سے ملنے والے شواہد آپس میں بظاہر متعارض ہوں تو اس صورت میں بھی محدثین نے واضح اصول مقرر کر رکھے ہیں۔ کسی مسئلے کے بارے میں باہم متعارض روایات میں کسی روایت کو ترجیح دینے کے واضح اُصول مسلمانوں میں صدیوں سے رائج ہیں۔(3)

---

(1) السیوطی، جلال الدین (م ۹۱۱ھ) : الاتقان فی علوم القرآن، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ: مجمع ملک فھد، تحقیق مرکز الدراسات القرآنیۃ، ص ۳۷۷ (النوع الثامن عشر فی جمعہ وترتیبہ)

(2) ایضاً

(3) العینی، بدرالدین، ابو محمد محمود بن احمد (م ۸۵۵ھ) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۱ء، ۲۴/۱؛ الخطیب البغدادی، ابوبکر احمد بن علی بن ثابت (م ۴۶۳ھ)، الکفایۃ فی معرفۃ أصول علم الروایۃ، مصر: دار الھدی، ۱۴۲۳ھ، ۳۳۳/۱ ؛ العسقلانی، ابن حجر (م ۸۵۲ھ)، نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر فی مصطلح أھلِ الأثر، دہلی، مکتبہ علمیہ، ۱۹۴۶ء، ص ۴۷

اسی طرح اگر معتبر روایات کے بیان میں باہم تصادم ہو رہا ہو تو معتبر میں سے کس روایت کو اختیار اور کس کو چھوڑا جائے گا، اس کے اصول بھی محدثین نے متعین کر رکھے ہیں۔ کسی بھی زمانے میں ان اصولوں کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہے اور نہ ہی عملاً ایسا ممکن تھا۔ روایات کی ثقاہت اور اعتبار کی بنیاد پر ہی محدثین نے کتب حدیث کے طبقات متعین کئے ہیں۔ مختلف کتبِ اصولِ حدیث میں ان طبقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ہم شاہ عبدالعزیز (1239ھ) محدّث دہلویؒ کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مذکورہ بالا بنیاد پر کتب حدیث کے چار طبقات نقل کئے ہیں:

طبقہ اوّل: اس طبقے میں موطأ امام مالکؒ صحیح البخاری اور صحیح مسلم شامل ہیں۔ یہ طبقہ اور اس کی روایات معتبر ترین روایات ہیں۔

طبقہ دوم: اس میں سنن اربعہ (سنن ابی داؤد۔ جامع الترمذی۔ سنن النسائی۔ سنن ابنِ ماجہ) شامل ہیں۔ اس طبقے کی روایات اگرچہ معتبر ہیں، تاہم طبقہ اوّل سے کم درجہ میں ہیں۔

طبقہ سوم: اس طبقہ میں انہوں نے ان کتب کو رکھا ہے جنہیں پہلے دو طبقات کے بارے میں کم معتبر سمجھا گیا ہے۔ ان کتب میں بیان شدہ روایات کے بہت سے راویوں پر سخت تنقید اور جرح کی گئی ہے۔ اس طبقہ میں معجم طبرانی، مستدرکِ حاکم، سنن بیہقی، سنن دارمی وغیرہ شامل ہیں۔

طبقہ چہارم: اس طبقہ کے بارے میں شاہ عبدالعزیزؒ (1239ھ) فرماتے ہیں:

چوتھے طبقے کی کتب حدیث وہ ہیں جن کا نام و نشان پہلے زمانے میں نہیں تھا اور متاخرین نے ہی یہ روایات بیان کی ہیں۔ پس ایسی احادیث دو حال سے خالی نہیں ہیں یا تو پہلے لوگوں نے تحقیق کی اور ان روایات کی کوئی اصل نہ ملی؛ اس لئے ان کی آگے روایت نہیں کی۔ یا اگر انہیں پا تو لیا لیکن ان میں ایسی قدح اور علّت دیکھی کہ ان تمام لوگوں نے ان روایات کو چھوڑ دیا۔ دونوں صورتوں میں یہ روایات قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ (911ھ) کی تصانیف کا ایک بڑا حصہ اپنے رسائل اور نوادر میں اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ (1)

لیکن جب ہم مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں قرآن کے بارے میں مستشرقین کے اعتراضات کے ماخذ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آرتھر جیفری ہو یا جان برٹن، ولیم میور (1905ء) ہو یا نولڈیکے ہر

---

(1) عبدالحق، شیخ، دہلوی: عجالہ نافعہ، لاہور: مطبع محمدی، ۱۳۹۹ھ، ص: ۵

مستشرق کے اعتراضات میں بیشتر اعتراضات کا بنیادی ماخذ نچلے درجہ کی کتب یا ان سے بھی نچلے درجہ کی کتب کی روایات ہیں۔ ولیم میور (1905ء) کا اہم ماخذ واقدی ہے۔ آرتھر جیفری کی ساری جدّوجہد ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف اور جان برٹن کی زہر افشانیوں کی بنیاد ناسخ و منسوخ آیات ہیں جن کا تذکرہ علامہ سیوطی (911ھ) وغیرہ نے کیا ہے۔ یہی حال کم و بیش تمام مستشرقین کا ہے۔

مستشرقین نے ہر جگہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے وہ روایات اپنائیں بلکہ اچھالی ہیں جن کا تعلق مذکورہ بالا قسم کی روایات سے ہے۔ یہ بات اخلاقی اعتبار سے بھی درست نہیں کہ حقائق کو چھپایا جائے اور اپنے مقصد کی خاطر آدھی بات کر دی جائے اور آدھی کا کتمان کر دیا جائے۔ اسی طرح ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کا واحد سہارا وہی روایات ہیں جنہیں مسلمان محققین نے اپنی کتابوں میں کمزور قرار دیا یا کسی نہ کسی طرح ردّ کر دیا ہو۔ آخر یہ بات توجہ طلب ہے کہ مسلمانوں کے معتبر ذرائع اور احادیث کے عظیم الشان ذخیرے میں سے مستشرقین کو صرف وہی روایات کیوں ملی ہیں جنہیں مسلمانوں نے ردّ کر دیا ہے اور جو طبقہ چہارم سے بھی نچلے درجہ کی کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں۔

ان کتب سے حاصل شدہ روایات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان سے مستشرقین نے تدوین قرآن کی ایک من پسند تعبیر گھڑی ہے، جسے اختیار کرتے ہوئے بظاہر ان کا مقصد تو بزعم خویش پورا ہوتا ہے لیکن جب ان روایات کو تحقیق و تنقید کے پیمانوں سے جانچا جاتا ہے تو ان کا بنایا ہوا دلائل کا انبار ریت کا پہاڑ ثابت ہوتا ہے۔

مشہور مصنف حسین ہیکل اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مستشرقین نے مسلمانوں کی کتابوں سے جو روایات لے کر قرآن کی صحت کے بارے میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ سب کی سب خبر واحد ہیں خبر واحد سے استنباط مسائل اور اصول اخذ کرنے کے بارے میں خود مسلمان علماء میں یہ نقطہ نگاہ موجود ہے کہ بنیادی مسائل میں خبرِ واحد کو مدارِ حکم نہیں بنایا جاسکتا۔ پھر جب قرآن کی محفوظیت جیسے اہم مسئلہ میں خبرِ واحد جو معتبر ترین اور متفقہ روایات سے صاف طور پر متصادم ہوں، انہیں کوئی نقطہ نگاہ اختیار کرنے میں بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ مستشرقین اخبارِ آحاد میں بیان شدہ بات کو بنیاد بناتے اور کثیر تعداد میں موجود ثقہ روایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔"

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

"مستشرقین نے اپنی تحقیقات کی بنیاد ان کتابوں کو بنایا ہے جو رطب و یابس سے آلودہ ہیں۔ مزید خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ لوگ لکھتے وقت صحیح اور غیر صحیح روایت میں فرق کیے بغیر دلائل اور شواہد حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط اور کمزور بنیادوں پر تعمیر ہونے والی عمارت میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں"۔ (1)

زیر بحث موضوع کی ایک مثال گولڈ زیہر ہے جب وہ کہتا ہے کہ "امام ابو حنیفہؒ (150ھ) کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جنگِ بدر، جنگِ اُحد سے پہلے ہوئی تھی یا بعد میں"۔ (2)

لیکن ستم کی بات یہ ہے کہ یہ بات اس نے "دمیری" کی "کتاب الحیوان" سے حاصل کی ہے۔ (3)

کیا اس مستشرق کو کوئی بھی مستند روایت نہ ملی جس سے حقیقت کا علم ہو سکتا کہ اس قدر وسعتِ علمی اور نظر کی گہرائی والے شخص کو اتنی بنیادی بات بھی معلوم نہ تھی کہ مذکورہ بالا جنگوں میں سے کون سی جنگ پہلے ہوئی تھی؟ ڈاکٹر مصطفٰی السباعی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

مستشرقین کی تحقیقات کا اگر بغور مطالعہ کریں اور ان میں ان کے اصولِ تحقیق کا جائزہ لیں تو ان کے حسبِ ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

ہر گری پڑی روایت کی تلاش اور جستجو میں رہنا۔

صریح اور قطعی عبارات کو غلط معانی پہنانا۔

خوبیوں کو برائیوں کے قالب میں ڈھالنا۔

مسلمانوں کی طرف سے جو بھی خیر اور خوبی ظہور میں آئی ہو اس میں شک و شبہ پیدا کرنا۔ (4)

اس معیار کے مآخذ کے ساتھ جب یہ عنصر بھی شامل ہو جائے کہ مستشرقین ان مآخذ کو اپنی ذہنی اختراعات اور مخصوص فیصلوں کو ثابت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں تو ان تحقیقات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ حسین ہیکل نے اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مستشرقین کی غلطیوں کے اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے خیال میں ان کی غلطیوں کے اسباب یہ ہیں:

---

(1) ہیکل، حسین: حیاۃ محمد، القاہرۃ: مکتبۃ النہضۃ العربیۃ، ۱۹۴۷ء، ص ۲۸

(2) السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، القاہرۃ: مکتبۃ دار العروبۃ ۱۹۶۱ئ، ص ۷۰

(3) ایضاً

(4) السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی: ص 446

مستشرقین کی عربی لغت میں عدم دسترس ان کی علمی لغزشوں کا ایک سبب ہے یہ لوگ عربی زبان کے اسرار ورموز کے ادراک سے قاصر ہیں۔

اہلِ یورپ اسلام کے خلاف مسیحی تعصب میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے کسی بھی مذہب کے خلاف بات کرنے سے وہ چوکتے نہیں ہیں۔

جدید علوم میں دسترس حاصل کرنے کے بعد یورپی اقوام کو مذہب سے نفرت ہوگئی ہے۔ یورپی اہلِ قلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسلام پر قلم اٹھاتے ہوئے ان کی عصبیت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حقیقت اور ان کے نقطہ نگاہ میں بعد المشرقین پیدا ہو جاتا ہے۔

حسین ہیکل لکھتے ہیں: ''مستشرقین میں اسلام سے متعلق اگر بعض اہلِ علم کی نیت نیک بھی ہو تو ان کا علم ناقص ہوتا ہے۔ جو لوگ عربی لغت پر حاوی نہ ہونے کی وجہ سے لکھنا کچھ چاہتے ہیں لیکن قلم سے نکل کچھ اور جاتا ہے۔''(1) ہیکل مزید لکھتے ہیں:

مستشرقین جس پسِ منظر کے تحت تحقیقات کرتے ہیں اس میں وہ کبھی تو کامیاب ہو جاتے ہیں اور کبھی حقیقت تک پہنچنے کی بجائے ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور اسی دوران وہ اپنا نشانِ منزل ہی بھول جاتے ہیں۔ ان کے بھٹکنے کے اسباب کے بارے میں ہیکل لکھتے ہیں کہ

''ہر محقق کا فرض ہوتا ہے کہ وہ دقت نظر اور حسن نیّت کے ساتھ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ہر قسم کے اغراض ومقاصد سے قطع تعلق ہو کر وہ ایک ایسی راہ اختیار کرے کہ کوئی بھی خارجی اثر اس کو متاثر کر کے غیر جانبدارانہ اور دیانتدارانہ تحقیق کی راہ سے ہٹا نہ سکے۔ کسی محقق کو خود کسی بحث میں نفی یا اثبات کے دوران کسی بھی اعتبار سے اپنے آپ کو فریق نہیں بنانا چاہیے۔ اسے جہاں کہیں کوئی نقص یا سقم نظر آئے اس کے اظہار یا اعتراف میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے جو چیز سچی حقیقی اور درست ہو اس کی تصدیق بلا تامّل کرے۔ مصنف کے خیال کے مطابق مستشرقین کے ہاں یہ بات موجود ہے کہ وہ اپنے عقائد کے اثر سے اپنی تحقیقات کو مبرّا نہیں رکھ سکے۔ ان کے ذاتی رجحانات ان کی تحقیقات میں دخل انداز ہوئے ہیں۔''(2)

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی لکھتے ہیں کہ

''وہ اصول جو مستشرقین نے مسلمانوں کے علوم کی تنقید کیلئے استعمال کئے ہیں خود ان کی تحقیقات پر

---

(1) حیاۃ محمد: ص 60-61

(2) ایضاً

استعمال کریں تو یقیناً یہ مغربی تہذیب و تمدّن اور اس کے سربر آوردہ رجال کی ایک ایسی مضحکہ خیز صورت اور ذلّت آمیز شکل میں سامنے آئیں گے کہ غیروں سے پہلے خود یہ مستشرقین اپنی تحقیقات کا انکار کرنے لگیں گے اور وہ اپنی آنکھوں سے اپنی تصویر دیکھ لیں گے، اور اس کے بعد شاید وہ محسوس کرلیں کہ یہ طریق جرح و تعدیل جس سے وہ ہماری تاریخ و تمدّن اور ہمارے دین و مذہب کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے استعمال کرنے کے مدّعی ہیں وہ کس طرح خود ان کے لئے وبالِ جان بن گیا۔ تب جا کر ممکن ہے کہ یہ مستشرقین اس مسخ و تحریف کرنے، ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنے اور کسی تہذیب و تمدن کی عمارت کو منہدم کرنے کی جسارت کرنے میں کچھ عار محسوس کریں۔"(1)

قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین میں سے بعض نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے کہ کوئی سے دو تین نسخے لے کر ان میں کھینچ تان کر موازنہ کرتے ہیں اور بعض جگہوں پر قرآن مجید میں اختلاف ثابت کرتے ہیں۔ وہ اس سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے متن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جس قسم کا اختلاف نکال کر یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل متن کا اختلاف ہوتا ہی نہیں وہ اختلافِ قرأت اور اختلاف مصاحف کو متنِ قرآن کا اختلاف منوانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اس پر اختلاف کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہی نہیں۔ (2)

اس کی ایک مثال ڈاکٹر منگانا کی کتاب Leaves from Three Ancient Korans ہے۔ اس کی تفصیلی جائزہ اس کتاب کے باب "متفرق اعتراضات" میں پیش کیا ہے۔

مستشرقین کا اندازِ تحقیق غیر جانبداری کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ (اس سلسلے میں ان کے اپنے اعترافات کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔) وہ ناقص دلائل اور کمزور ماخذ سے تعصب کے ساتھ اپنے مطلب کے نتائج حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ذاتی رجحانات غیر جانبدارانہ تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ ایک نسل کی علمی غلطی اگلی تمام نسلوں نے اصول کے طور پر اپنالی اور حقائق آنکھوں سے اوجھل ہی رہے۔ (اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔)

اہل یورپ تحقیقات کے دوران عام طور پر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کی وجوہات کا ذکر کرتے

---

(1) السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي، ص ۷۰

(2) حیاۃ محمد، ص: 60-61

ہوئے علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"کوئی روایت بیان کرنے کے حوالہ سے یورپ کے اصولِ تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اہلِ یورپ اس بات کو قطعاً نہیں دیکھتے کہ راوی سچا ہے یا جھوٹا؟ اس کے اخلاق و اطوار کیسے ہیں؟ اس کا حافظہ کیسا ہے؟ اہلِ مغرب کے نزدیک اس قسم کی تحقیق و تدقیق نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ضروری۔ وہ صرف یہی دیکھتے ہیں کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ فرض کریں ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو موجودہ قرائن اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کا بیان مسلسل ہے اور کہیں سے یہ تسلسل اکھڑتا نہیں ہے تو یورپ کے مزاج کے اعتبار سے اس واقعہ کو درست تسلیم کر لیا جائے گا۔"[1]

اس کے برعکس مسلمان مؤرخین اور خصوصاً محدثین اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ خود روایت کی حالت کیا ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی بات بیان کرنے والے کا نام "اسمائے رجال" میں ثقہ راویوں میں شامل ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کے برخلاف اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا ہو تو روایت کے مضمون کو مزید معیارات پر پرکھنے کے بعد ہی قبول کیا جائے گا۔ اس اختلاف نے یورپی تصانیف پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ مثلاً اہلِ یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کے بیان میں تسلسل اور ربط پایا جاتا ہے۔ جزئیات کی کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا۔ جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بناتی ہیں وہ سب اس میں موجود ہوتی ہیں۔[2]

اہلِ مغرب کے مآخذ و مصادر پر تنقید کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانیؒ مزید لکھتے ہیں:

"عام تحقیقات کے ضمن میں ان کا سارا دارومدار کتبِ سیرت و مغازی کی ایسی روایات پر ہوتا ہے جن میں رُواۃ اکثر و بیشتر قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔ اس طرح کی روایات سے حاصل ہونے والی شہادت کسی معمولی واقعہ کیلئے تو قبول کی جا سکتی ہے لیکن کسی فیصلہ کن اہم مسئلہ میں ان کی رائے پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔"[3]

---

(1) شبلی نعمانی، مولانا، سیرت النبی ﷺ: جلد 1، ص: 69-70

(2) ایضا

(3) ایضا

مستشرقین اکثر و بیشتر مسلمانوں کے ماخذ میں بیان شدہ بات کا بڑی آسانی سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کی بجائے اپنے ظن و گمان اور کمزور ماخذ سے حاصل شدہ نتائج پیش کرتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اخذ روایت کے سلسلے میں مسلمانوں کے اصول و ضوابط کا ذکر کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان ماخذ کا تحقیقی اعتبار سے کیا مقام ہے۔

اخذ و قبول روایات میں مسلمانوں کے معیارات:

مسلمانوں کے ہاں مستند اور فیصلہ کن حیثیت انہی روایات کو حاصل ہے جو کتب حدیث میں صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہیں۔ [(1)]

اخذ روایت کے سلسلے میں مسلمان کس قدر محتاط رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ملّا علی القاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں:

قلت و من القواعد الكلية أن نقل الأحاديث النبوية والمسائل الفقهية والتفاسير القرآنية لا يجوز إلّامن الكتب المتداولة لعدم الإعتماد على غيرها من وضع الزنادقة وإلحاق الملاحدة بخلاف الكتب المحفوظة فإنّ نسخها تكون صحيحة متعددة [(2)]

”میں کہتا ہوں یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ احادیث نبویہ، مسائل فقہیہ اور قرآن کی تفسیر میں صرف انہی کتابوں سے نقل کرنا جائز ہے جو متداول اور رائج ہوں کیونکہ جو کتابیں رائج اور متداول نہیں ہیں ان پر اعتماد نہیں رہا؛ اس لیے کہ زندیقوں نے باتیں گھڑلی ہیں اور ملاحدہ نے اپنی طرف سے اضافے کر دیے ہیں۔ محفوظ اور متداول کتابوں میں یہ شبہ نہیں رہتا؛ کیونکہ اس کے متعدد صحیح نسخے موجود رہتے ہیں۔“

مسلمانوں کا مزاج ہی تحقیقی ہے، ان کے دین نے انہیں یہ بات سکھائی ہے کہ کوئی بات اس وقت تک قبول نہ کی جائے جب تک اس کی صحت محقق نہ ہو جائے۔ اپنے دینی سرمائے میں اس وقت تک کسی بات کو شامل نہیں ہونے دیتے جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس کی اصل کیا ہے اور کن کن ذرائع سے وہ بات ان تک پہنچی ہے۔

---

(1) ایضاً: جلد1، ص69

(2) علی القاری، الاسرار المرفوعة: ص394

مسلمانوں نے اپنے دینی ذخیرے میں صحیح و سقیم کی تمیز کیلئے بہت سی تدابیر اختیار کیں، ان احتیاطی تدابیر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب حدیث اور آثار کے بارے میں مسلمانوں کی احتیاط کا یہ عالم تھا تو قرآن، جس کے بارے میں مسلمانوں کو علم تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ اللہ کا کلام ہے۔ اس کی حفاظت کا کس طرح اہتمام کیا ہوگا۔ آئندہ سطور میں ہم تاریخ اسلام کے چند مستند واقعات بیان کرتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مسلمان ایسی قوم نہیں کہ ہر گری پڑی چیز کو اٹھا کر اپنے دینی سرمائے میں شامل کرلیں۔

فن جرح و تعدیل کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ بڑا گہرا اور دقیق علم ہے۔ محدثین کسی روایت میں معمولی سا عیب دیکھتے ہیں تو اس کی روایت کو ترک کر دیتے ہیں۔ واقدی بہت بڑے متبحر عالم ہیں لیکن مسلمان محققین نے ہر جگہ ان پر اعتماد نہیں کیا۔ واقدی نے مغازی و سیرت پر روایات کا انبار لگا دیا اور واقعات کو اس تفصیل و تسلسل سے بیان کیا کہ خود جو شخص ان واقعات میں موجود ہو تا وہ بھی جزئیات کو اس تفصیل سے یاد نہ رکھ سکتا۔ واقدی کی ان تفصیلات کی وجہ سے محدثین متفق ہوگئے کہ واقدی اور اس کی روایات قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ اور واقدی باتفاق محدثین متروک ہیں لیکن متروک ہونے کے باوجود شاید سیرت، مغازی اور رجال کی کوئی کتاب ایسی موجود نہیں ہے جو واقدی کی روایات سے خالی ہو۔ اس کے علم اور واقفیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے تفصیلی بیانات سب مشتبہ ہیں۔ (1)

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں: محمد بن عمر بن واقد الاسلمی الواقدی (م ۲۰۷ھ) مدینہ کے رہنے والے اور قاضی تھے بغداد میں قیام کر لیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا یہ متروک ہیں۔ (2)

جو شخص مباحات کا بھی ارتکاب کرتا ہو اس کی روایت کے بارے میں محدثین نے خاص احتیاط سے کام لیا ہے۔ مثلاً بازار میں کھاتے پھرنا۔ سڑکوں پر بے مقصد پھرنا۔ ہنسی مذاق میں حد سے بڑھ جانا۔ شعبہ بن حجاج کہتے ہیں: ''میں ناجیہ سے ملا جس سے ابو اسحاق حدیث روایت کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ شطرنج کھیل رہا ہے چنانچہ میں نے اس سے روایت کرنی ترک کر دی۔'' (3)

(1) داناپوری، عبدالرؤف، مولانا، اصح السیر: ص 14

(2) ابن حجر العسقلانی، تقریب التھذیب: ص 6175، شاملہ، ص 882

(3) خطیب بغدادی، الکفایۃ: ص: 345

امام محمد بن سیرینؒ (م ۱۱۰ھ) کہتے ہیں:

"روایت حدیث کا معاملہ دین ہے۔ پہلے یہ دیکھ لو کہ تم اپنا دین کس سے لے رہے ہو۔"[1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

یا ابن عمر دینك دینك، إنما هو لحمك ودمك فانظر عمن تأخذ، خذ عن الذین استقاموا، ولا تأخذ عن الذین مالوا[2]

"اے ابن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ)! دین کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یہ تمھارا گوشت اور خون ہے۔ اس لئے یہ دیکھتے رہو کہ تم یہ دین کس سے لے رہے ہو۔ یہ ان لوگوں سے لو جو دین پر ثابت قدم رہے اور ان سے نہ لو جو دین سے منحرف ہوئے اور برگشتہ ہو گئے۔"

ڈاکٹر صبحی صالح اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"قبولیت حدیث میں محدثین کا انتہائی تشدّد، حد درجہ ورع و تقویٰ اور باریک بینی اس بات کی شاہد عادل ہے کہ صرافانِ حدیثِ نبوی ﷺ اس کی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ تھے۔"[3]

ان ہدایات کے پیشِ نظر جب اساتذہ حدیث کے اوصاف و فضائل یکساں نہ ہوتے تو طالبانِ حدیث صرف انہی شیوخ سے سماع کرتے جو سیرت و کردار کے اعتبار سے ان میں سے مقابلۃً بہتر ہوتے اس سلسلے میں مسلمانوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اصحابِ دیانت و امانت سے ہی حدیثیں سنتے اور ضعفاء کو نظر انداز کر دیتے۔[4]

محدثین تو روایتِ حدیث میں اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ انہوں نے روایت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے معیارِ کردار اور حفظ و ضبط اور ان کی ثقاہت کی بنیاد پر کمالِ احتیاط سے درجہ بندی کر دی ہے؛ لہٰذا وہ قرآن مجید کے بارے میں کس طرح غیر ذمہ دارانہ انداز اختیار کر سکتے تھے۔ ایک محدث کے بارے میں واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک شخص کے پاس پہنچے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا تھا کہ اس کے پاس حضور ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ جب اس شخص کے پاس

---

(1) الکفایۃ، ص: 121

(2) ایضاً

(3) صبحی صالح، ڈاکٹر: مباحث فی علوم القران، بیروت، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۳۴

(4) ایضاً

پہنچے تو وہ شخص خالی توبرہ دکھا کر اونٹ کو بلا رہا تھا۔ حالانکہ اس کا توبرہ تو خالی تھا۔ انہوں نے اس شخص سے روایت نہیں لی اور واپس آ گئے کہ جو شخص جانور کو خالی توبرہ دکھا کر دھوکا دے رہا ہے۔ حدیث کے بارے میں اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ [1]

اخذِ روایت کے سلسلے میں مسلمانوں کی احتیاط کی مثالیں دینے کیلئے ہم صحاح ستہ میں سے صرف دو حضرات، شیخین کے اصولِ اخذ حدیث بیان کریں گے۔ امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"ماوضعت في كتاب الصحيح حديثا إلّا اغتسلت قبل ذلك وصلّيت ركعتين وتيقنت صحته" [2]

"میں نے کتاب الصحیح میں کوئی حدیث اس وقت تک درج نہیں کی جب تک کہ لکھنے سے قبل غسل کر کے دوگانہ ادا نہ کر لیا ہو، اور اس کی صحت کا یقین حاصل نہ کر لیا ہو۔"

اس سلسلے میں امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"ليس كلّ شيءٍ عندي صحيح وضعته ههنا إنّما وضعت ههنا ما أجمعوا عليه" [3]

"ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کر دیا میں نے تو صرف ان احادیث کو درج کیا ہے جن کی صحت پر شیوخ وقت کا اجماع ہے۔"

جب احادیث کی تدوین کا کام ہوا اس وقت محدثین نے درایت کے اصول منضبط کئے ان اصولوں کا تذکرہ امام ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"فكل حديث رأيته يخالف المعقول أويباين المنقول أويناقض الأصول فاعلم أنّه موضوع فلا تتكلف اعتباره" [4]

---

(1) المعلمی العتمی الیمانی، عبد الرحمٰن بن یحییٰ: التنکیل بما فی تأنیب الکوثری من الأباطیل، تحقیق و تعلیق: محمد ناصر الألبانی، ۱/۱۱۲؛ الأنوار الکاشفة لما فی کتاب أضواء علی السنة من الزلل والتضلیل والمجازفة، المطبعة السلفیة و مکتبہا، بیروت، ۱۴۰۲ھ، ص: ۹۵

(2) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری: جلد 2، ص: 490

(3) مسلم، الجامع الصحیح لمسلم (مقدمہ)

(4) ابن الجوزی، الموضوعات، کتاب التوحید: ج 1 ص 106-107

"جس حدیث میں دیکھو کہ عقل کے مسلّمہ اصول کے خلاف ہے یا منقول کے خلاف ہے، یا مسلمہ اصول کے خلاف ہے، تو جان لو کہ یہ حدیث مصنوعی ہے اس کے اعتبار کا تکلف نہ کرو۔"

امام سخاوی (م ۹۰۲ھ) ابن الجوزی کی مذکورہ عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أي لا تعتبر رواته ولا تنظر في جرحهم أو يكون مما يدفعه الحس والمشاهدة أومباينا لنصّ الكتاب أو السنة المتواترة أو الا جماع القطعی حيث لا يقبل شئ من ذلك التاويل. أو يتضمن الإفراط بالوعيد الشديد على الأمراليسير أو بالوعد العظيم على الفعل اليسير وهذا الأخير كثير موجود في حديث القصاص والطرقية. ومن ركة المعنى لا تأكلوا القرعة حتى تذبحوها وكذا جعل بعضهم ذلك دليلاً على كذب راويه، و كل هذا من القرائن في المروي وقد تكون في الراوی كقصة غياث مع المهدي ... أوانفراده عمن لم يدركه بما لم يوجد عند غيرهما، أوانفراده بشئ مع كونه مما يلزم المكلفين علمه وقطع العذر فيه كما قرره الخطيب في أول الكفاية، أو بأمر جسيم تتوفرالدواعي على نقله كحصر العدو للحاج عن البيت'' (1)

یعنی وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات و مشاہدات کے خلاف ہو۔ تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا گیا ہو یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جاتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ کدوّ کو ذبح کئے بغیر نہ کھاؤ۔ اس لئے کہ بعض محدثین نے لغویت کو راوی کی کذب بیانی کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً غیاث بن ابراہیم کا واقعہ جو خلیفہ مہدی (م ۱۶۹ھ) کے ساتھ پیش آیا۔ غیاث بن ابراہیم ایک شخص تھا اس نے خلیفہ مہدی کو کبوتروں سے کھیلتے دیکھا تو اسے خوش کرنے کے لیے اس نے حضور اکرم ﷺ کی حدیث لا سبق إلا في خف أو حافر.... میں اضافہ کر کے اس میں کبوتر بازی کو شامل کر دیا۔ (2)

یا جبکہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو کسی اور نے بیان نہ کی ہو، اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملاقات نہ ہو یا وہ روایت جسے ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ وہ بات ایسی ہے کہ اس سے

---

(1) السخاوی، فتح المغیث: ج 2 ص 315

(2) ابن حجر العسقلانی، شرح نخبۃ الفکر: ص 43

اوروں کو بھی مطلع ہونا چاہیے تھا جیسا کہ خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۲ھ) نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا ایسی روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہو کہ اگر وہ واقعہ رونما ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اسے بیان کرتے مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ میں حج کرنے سے روک دیا۔

ملا علی القاریؒ (م ۱۰۱۴ھ) نے اس سلسلے میں اصول بیان کیے ہیں کہ ہر وہ حدیث موضوع (من گھڑت) ہو گی جس میں مندرجہ ذیل باتیں پائی جائیں:

فضول باتیں بیان کی گئی ہوں۔

وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً بینگن کا کھانا ہر مرض کا علاج ہے۔

وہ حدیث جو صریح احادیث کے مخالف ہو۔

جو خلاف واقع ہو۔

وہ حدیث جو انبیاء کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو۔

وہ حدیث جس میں کسی پیشن گوئی کا ذکر تاریخ اور وقت کے تعین کے ساتھ کیا گیا ہو۔

وہ حدیث جو اطباء کے کلام سے مشابہ ہو۔

وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔

وہ حدیث جو قرآن مجید کی کسی بات کے خلاف ہو۔

وہ حدیث جو خضرؑ سے متعلق ہو۔

وہ حدیث جس کے الفاظ رکیک ہو۔

وہ احادیث جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں حالانکہ یہ احادیث تفسیر بیضاوی اور کشّاف وغیرہ میں منقول ہیں۔[1]

مستشرقین کا تحقیق کے مسلمہ اصولوں سے انحراف

یہ تفصیلات اس لیے پیش کی گئی ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ مستشرقین کے ہاں نہ تو روایت کو جانچنے کا کوئی معیار مقرر ہے اور نہ ہی ان کے ہاں کسی ماخذ سے حاصل کرنے کا کوئی ضابطہ ہے۔ جبکہ مسلمان ایک قابل رشک نظام تحقیق کے حامل ہیں۔ ان کا بلا جھجک مسلمانوں کی تحقیق کی چھلنی سے نکلنے والی روایات کے بارے میں کہہ دینا کہ ساری روایات ناقابل اعتبار ہیں اور اپنے موقف کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہ کرنا

---

(1) شرح نخبۃ الفکر، ص: 43-44

تحقیق کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ مسلمانوں کی بیان کردہ معتبر روایات کو نہ ماننا اور ان کے برعکس غیر معتبر روایات پر تحقیق کی بنیادیں رکھنا، اصول تحقیق سے بھی انحراف کے مترادف ہے۔

ا۔ اسلامی کتب کا بالواسطہ مطالعہ

زیرِ نظر پہلو کی مناسبت سے علامہ شبلی نعمانی نے مستشرقین کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:
وہ مصنفین جو عربی مآخذ اور عربی زبان سے واقف نہیں۔ ان کا سرمایہ معلومات دوسروں کی تصانیف اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے مطابق ڈھال کر دکھائیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو عربی زبان اور علم وادب، تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا اسلام پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام اور شارعِ اسلام کے متعلق نہایت دلیری کے ساتھ جو کچھ چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں۔

مستشرقین کا تیسرا گروہ وہ ہے جس نے خالص مذہبی لٹریچر کا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً پالمر (Palmer) اور مارگولیتھ (Margolouth) (1858-1940) نے اسلام کا خاصا مطالعہ کیا۔ مارگولیتھ نے مسند احمد پر وہ کام کیا کہ کوئی ہمعصر اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ لیکن حضورؐ کی سوانح لکھتے ہوئے اس نے کذب بیانی اور افتراء سے کام لیا کہ اس سے زیادہ بدتر مثال شاید کہیں نہ مل سکے۔ اسی طرح Spranger (1893-1813) نے الإصابة فی تمییز الصحابة کی تصحیح کر کے کلکتہ سے چھپوائی۔ لیکن حضور ﷺ کی سوانح لکھتے وقت اس کے تعصب کو دیکھ کر دنیا حیران رہ گئی۔ (1)

مستشرقین نے قرآن، اسلام یا حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں جس قدر کتب لکھی ہیں ان میں اکثریت ایسی تصانیف کی ہے جن کی بنیاد ان کی زبانوں میں کئے گئے اس سے پہلے کے تراجم پر ہے ان کتب میں ان کے مصنفین کی آراء اور ذاتی تحقیقات کو دخل نہیں ہے۔ بیشتر مستشرقین کا عربی زبان میں مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان میں سے بہت تھوڑے لوگوں نے کسی یونیورسٹی سے باقاعدہ عربی کی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مزاج، طرزِ فکر، آدابِ معاشرت سے معمولی واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ کسی قوم کی زبان، اس کی تہذیب، آدابِ معاشرت اور مخصوص مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جب تک ان عوامل کا مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک وہ زبان محض گرائمر کی موشگافیاں جاننے تک محدود رہتی ہے۔ خصوصاً

(1) شبلی، سیرت النبی ﷺ: جلد 1، ص: 95-96

قرآن کریم کا تو معاملہ ہی ایسا ہے کہ محض عربی دانی قرآن کو سمجھنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ قرآن کریم کی تاریخ اس بات پر شہادت مہیا کرتی ہے کہ محض عربی دانی کی بجائے ایک صاف اور حق شناس فطرت بھی قرآن فہمی کیلئے لازم ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کے مضامین کو سمجھنے کے لئے حدیث بھی ایک اہم ذریعہ ہے لیکن یہ لوگ حدیث کی حقیقت اور قرآن اور حدیث کے باہمی تعلق کو نہ تو سمجھتے ہیں نہ ہی ان کا ذہنی پس منظر انہیں یہ تعلق سمجھنے کے قریب بھی کرتا ہے۔ بلکہ مستشرقین کے مطالعہ کے انداز اور اسلوب کو دکھا جائے تو وہ تو اس تعلق کو سمجھنے کی ذہنی صلاحیت رکھتے ہی نہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ قرآن کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھ پائے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی: فہم قرآن کے سلسلے میں دوسری بڑی ضرورت حدیث نبویؐ ہے۔ یہ فن اس قدر دقیق ہے کہ کسی مستشرق کی قسمت میں ہی یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ وہ اس کی صحیح واقفیت کیلئے کوشش ہی کرے۔ کیونکہ مستشرقین تو محض طبع آزمائی کرتے ہیں۔ کسی بات کی تہہ میں جا کر اصل گوہر حاصل کرنے سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ اکثر مستشرقین محض چند مفروضات کی بناء پر قرآن کریم اور اسلام کا ایک اجمالی اور تخریبی خاکہ پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اس کی مثال کیلئے کسی بھی مستشرق کا نام لیا جاسکتا ہے۔ آرتھر جیفری جیسے بیسیوں افراد اسی زمرے میں آتے ہیں۔[1]

مستشرقین، مشرکین مکّہ کی پرانی روایات کو سامنے رکھ کر انہیں ہی معیار قرار دے کر ان پر تحقیقات کا محل تعمیر کرتے ہیں۔ ہم مستشرقین کا گہرا مطالعہ کریں تو ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ وہی ہے جو کفار مکہ اور یہود مدینہ کا تھا ان کی سوچ کی نہج بھی وہی ہے۔ انہیں اس بات کی بھی پرواہ نہیں رہتی کہ تاریخی روایات اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔

مثال کے طور پر نولڈیکے کو مستشرقین میں بلند مرتبہ ومقام حاصل ہے۔ لیکن اس نے تاریخ قرآن پر جو کتاب (Sketches From Eastern History) لکھی اس میں اس نے ولیم میور (1905ء) اور ویل (Weil) ہی کا سہارا لیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے پیش رووں کی تقلید میں اُس نے اتنی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ قرآن کے بارے میں بنیادی حقائق جان لے۔ یہی حال ولیم میور (1905ء) کا ہے۔ وہ ثانوی مآخذ پر اعتماد کرتے ہوئے بلاجواز کہہ دیتا ہے کہ ابتدائی آیات ضائع ہو گئیں۔[2]

---

(1) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش: ص 258-262 (ملخصا)

(2) اجمل، ڈاکٹر، ترتیب نزول قرآن مجید، کتب خانہ عزیزیہ، دہلی، 1941: ص: 24

ان کے اس مغالطے کی وجہ ان کے مطالعے اور اس کے انداز کا نقص ہے۔ وہ نقص یہی ہے کہ ان میں سے بہت کم لوگوں نے قرآن مجید پر براہ راست تحقیقات کی ہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس انہوں نے تقلید ہی کا پہلو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اور براہِ راست قرآن مجید کے متن پر تحقیقات کرنے کی بجائے اپنے ہی ہم مسلک لوگوں کی تحقیقات اور مفروضوں کو بنیاد بنا کر غلط فہمیوں اور اوہام کی عمارت تعمیر کر دی۔

مغرب میں ایسا ہوا ہے کہ ایک شخص نے قرآن مجید کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ پھر بعد والوں نے اس لاطینی ترجمے کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کر لیا۔ ظاہر ہے ایسا کرتے ہوئے وہ قرآن کی اثر پذیری، اس کی جامعیت، معانی کی گہرائی و گیرائی، فصاحت و بلاغت وغیرہ کا تو تصور نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی مستشرق کہتا ہے کہ قرآن مجید کے مضامین میں بے ربطی ہے، اس کی زبان غیر معیاری ہے، اس کی ترتیب اور مضامین میں کوئی گہرائی و گیرائی نہیں ہے یا قرآن کی زبان اور اسلوب مغربی طلبائے قرآن کیلئے ایک کھلا موضوع ہے تو پھر، اس میں قصور ان کے مبلغ علم کا ہے قرآن کا نہیں ہے۔ (1)

محمد خلیفہ اپنی کتاب The Sublime Quran and Orientalism میں مستشرقین کی قرآن مجید کے بارے میں کوتاہ علمی کو ان نکات میں پیش کرتے ہیں:

1. Nescience of the Arabic word's exact meaning.
2. Knowing only one shade of the meaning.
3. Confusion between different Arabic words.
4. Limited knowledge of Arabic eked out with figments of imagination.
5. Mistaking Arabic for Hebrew or Syriac.
6. Some confusion with Hebrew tradition. (2)

یعنی وہ یہ نہیں جان پاتے کہ قرآن میں ایک جگہ جو عربی لفظ استعمال ہوا ہے اس جگہ اس کا کون سا معنی مراد ہے۔ عربی زبان میں مضامین کی ادائیگی اور معانی میں چھوٹے چھوٹے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے الگ

---

(1) Muhammad Khalifa, The Sublime Quran and orientalism, London, 1983, p.66-67

(2) IBID. p.66-69

الگ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بات عربی زبان اور دیگر علوم کا ماہر ہی طے کر سکتا ہے کہ کسی جگہ پر ان مختلف معانی میں کون سا معنی زیادہ مناسب ہے۔ مستشرقین ان علوم سے محروم ہیں اس لئے وہ اپنے محدود علم کے مطابق ایک معنیٰ مراد لیتے ہیں اور اصل معانی جاننے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو تو اپنے محدود علم کی بنا پر ایک ہی معنی کا علم ہوتا ہے۔ قرآن میں کسی جگہ کسی لفظ کے مختلف معانی میں سے کسی معنیٰ کا تعین بعض اوقات بڑا نازک اور حساس ہوتا ہے۔ امکان ہو سکتا ہے غلط معنیٰ مراد لے کر قرآن کا مفہوم بالکل الٹ دیا جائے اور مضمون کیا سے کیا بن جائے۔ محمد خلیفہ لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس عربی کا علم بڑا محدود ہوتا ہے اور عربی الفاظ کے معانی جھوٹ اور اپنی ذہنی اختراعات کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

ب۔ قرآن مجید کا بالواسطہ مطالعہ

اہلِ مغرب نے قرآن مجید کو براہِ راست کم ہی پڑھا ہے۔ مغربی زبانوں میں سب سے پہلے لاطینی میں قرآن کا ترجمہ ہوا۔ یہ مترجم Robertus Rotensis اور Harmannus تھے۔ انہوں نے لاطینی میں ترجمہ تو ۱۱۴۳ء میں کیا لیکن یہ ۱۵۴۳ء میں طبع ہوا۔ اسی ترجمے کو ۱۶۴۷ء میں (Andre du Ryer) جو کہ مصر میں فرانس کا کونسل تھا۔ اس نے فرانسیسی میں تبدیل کیا۔

اسی ترجمے کے بارے میں جارج سیل نے کہا کہ اس کے ہر صفحہ پر اغلاط موجود ہیں۔ مزید یہ کہ اس میں ترتیب کے اعتبار سے تغیر و تبدّل اضافے اور فروگزاشتیں ہیں۔ اس کے اسی فرانسیسی ترجمے کو الیگزینڈر اس (Alexander Ross) نے ۱۶۸۸ء میں انگریزی میں تبدیل کیا۔ اگرچہ اسے انگریزی زبان میں قرآن مجید کا اولین ترجمہ کہا گیا تاہم Savary نے اس ترجمے کو حقیر اور قابلِ نفرت قرار دیا۔ جارج سیل نے بھی اسے ناقص ترجمہ کہا۔ بعد میں انگریزی زبان میں جو تراجم وجود میں آئے ان کی اصل بنیاد ایک اور لاطینی ترجمہ ہے جو Luovic Maracci نے ۱۶۹۸ء میں کیا تھا۔ ۱۷۳۴ء میں جارج سیل نے اسی ترجمے کی مدد سے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ بعد میں مستشرقین نے اسی ترجمے کو معیار قرار دیا اور اسی کو تحقیقات میں معیار اور بنیاد بنایا۔ لیکن یہ ترجمہ بھی اغلاط سے بھرا پڑا ہے۔ [1]

چنانچہ مختلف لوگوں نے اس پر تنقید کی ہے۔ مثلاً E. Dennison Ross کے حوالہ سے میر احمد علی

---

(1) IBID. p. 66-69

لکھتے ہیں:

It is difficult to decide to what extent Mr. Sale's citation in the notes represents first hand use of the Arabic commentators but I fear that the result of a close inquiry only points to very bitter original research on his part.(1)

"یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مسٹر سیل نے کس حد تک عربی دان مفسرین سے استفادہ کیا ہو گا۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر بڑے قریب سے جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس ترجمے میں اس کی ذاتی ریسرچ کو بہت کم عمل دخل ہے۔"

قرآن مجید کے بارے میں تحقیق کرتے اور اس کے بارے میں کوئی رائے دیتے ہوئے قرآن کی زبان کا گہرا علم رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید کی زبان، فصاحت و بلاغت، اس کا اسلوب، اس کے معانی کی گہرائی اور گیرائی کے کمالات پر اہل علم اظہار خیال کرتے چلے آرہے ہیں اور ان پہلوؤں پر سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کی حقیقت کو ہر کس وناکس نہیں سمجھ سکتا۔ جس طرح کسی ہیرے اور موتی کی قیمت کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا اس کی قیمت کو جاننے کے لئے جوہری ہونا ضروری ہے۔ کوئی قیمتی ہیرا اور جوہر کسی لاعلم کے لئے ایک پتھر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جوہری، پتھر اور جوہر کے درمیان فرق کرلیتا ہے اسی طرح قرآن کی زبان کی بلندیوں کو جاننے کے لئے اس کی زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اتنی بات تو بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عربی زبان جانے بغیر قرآن کے اسلوبِ بیان پر اعتراض کرنا اور کہنا کہ قرآن کے اسلوب میں معائب موجود ہیں، کس حد تک بلاجواز ہے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر زبان، کسی قوم کی تہذیب، آداب معاشرت اور مخصوص مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جب تک ان عوامل کا مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک وہ زبان محض گرامر کے بارے میں چند باتیں جان لینے تک ہی محدود رہتی ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ تو خاص طور پر ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کو محض عربی دانی سے سمجھنا ناممکن ہے۔ مستشرقین کی ایک تعداد تو عربی سے واقف نہیں ہے جو عربی جانتے ہیں وہ بھی محض زبان جاننے تک محدود ہیں۔

---

(1) Ahmad Ali Mir, Preface of the Holy Quran, Starling Karachi, 1964. P.20 (a)

قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے حدیث نبوی ﷺ کا جاننا بھی ضروری ہے۔ قرآن اجمال ہے اور حدیث اس اجمال کی شرح و تفصیل ہے۔ جس طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے بہت سے علوم کا علم ضروری ہے ورنہ معاملہ صرف قرآن کی عربی کا ترجمہ اور گرامر سمجھنے تک ہی محدود رہے گا اسی طرح قرآن کی تشریح کے لئے محض حدیث کی عربی عبارت کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہو گا بلکہ اس کے لئے درجن بھر علوم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مستشرقین سے یہ بات کہاں تک متوقع ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کا علم تمام لوازمات و تقاضوں کے ساتھ سیکھیں پھر حدیث کو سمجھنے کے لئے علم جرح و تعدیل، علم اسماء الرجال وغیرہ کو جاننے کی کوشش ہی کریں گے یہ علوم ان کی قسمت میں کہاں لکھے ہیں؟ ان علوم کو جاننے کے لئے حدیث کے ساتھ خصوصی محبت و شفقت کی ضرورت ہے جس کا امکان مستشرقین سے نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کی حقیقت کو حدیث کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔[1]

قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے کئی ایک لوازمات کی ضرورت ہے، مستشرقین ان سے تہی دامن ہیں اور انہیں قرآن سمجھنے میں جا بجا غلطیاں لگی ہیں۔ احمد علی میر ترجمہ قرآن مجید کے مقدمہ میں جارج سیل کی کوتاہ علمی اور غلطیوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

His refutations, which swell the work to a large volume, are of little use or none at all, being often unsatisfactory and sometimes impertinent.[2]

"اگرچہ قرآن (کی صحت اور مقام) کے بارے میں جو تنقیصی اور تردیدی باتیں لکھی گئی ہیں، ان سے کتاب کی ایک بڑی جلد بن جاتی ہے، لیکن اس طرح لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے؛ کیونکہ بعض اوقات یہ باتیں غیر اطمینان بخش ہیں اور بعض اوقات یہ غیر متعلق (Irrelevant) ہوتی ہیں۔"

محمد خلیفہ لکھتے ہیں:

I do not wish to imply that sale did not know Arabic but I do maintain that his work as it stands gives a misleading estimate of his original

---

(1) IBID, P.20 (a)

(2) IBID

researches, and that his tributes to Marraci falls far short of his actual undebatedness.[1]

"میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ سیل عربی زبان نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہ بات ضرور وثوق سے کہوں گا کہ اس کا یہ کام اس کی ذاتی تحقیق کا ایک گمراہ کن انداز پیش کرتا ہے اور مراکی کو اس کا خراجِ تحسین پیش کرنا اس کے اصل زیرِ احسان ہونے کے حوالے سے بہت ہی ناکافی ہے۔ گویا اس نے مراکی سے بہت استفادہ کیا ہے اور اس کی ذاتی تحقیقات کا عمل دخل بہت تھوڑا ہے۔"

Palmer اس سلسلے میں لکھتا ہے:

From the large amount of exegetical matter which has been incorporated in his (Mr. Sale's) text and from the style of language employed which differs widely from narrow energy and the rugged simplicity of the original his (Sales) work can scarcely be regarded as a fair representation of the Quran.[2]

ترجمہ: "بہت سارے مبالغہ امیز مواد میں سے جو کہ سیل کے ترجمہ میں شامل کر دیا گیا ہے اور جو زبان سیل کے ترجمہ میں استعمال کی گئی ہے اس کے اسلوب و انداز کے کھردرے پن اور غیر ہموار سادگی کی بنیاد پر اسے قرآن کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔"

اس کے علاوہ بہت سے لوگوں کی تحریرات سے یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ سیل کے ترجمے میں بہت سے معائب تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ بیشتر مستشرقین کی تحقیقات اسی ترجمے کی بنیاد پر ہیں۔ اس کا دیباچہ بڑا تفصیلی ہے اور اس میں اس نے دل کھول کر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ کارلائل جیسے لوگوں نے اسی ترجمہ کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کے بارے میں رائے قائم کی۔ اس وقت تک اس کے تیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی ترجمے کو بعد میں ۱۷۴۲ء میں ڈچ میں ۱۷۴۶ء میں جرمنی میں ۱۷۵۰ء میں فرانسیسی میں، ۱۷۹۲ء میں روسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اسی ترجمے سے ۱۸۱۴ء میں سویڈش زبان میں اور

(1) The Sublime Quran and orientalism, P: 66-67

(2) Preface of the Holy Quran, Starling Karachi, 1964. P.20 (a)

۱۹۰۲ء میں بلغارین زبان میں ترجمہ کیا گیا۔اس کے بعد بھی بہت سے انگریزی تراجم ظہور میں آئے جو زیادہ ترسیل یا غیر عربی متون کی بنیاد پر کیے گئے۔[1]

مستشرقین کی تحقیقات کا علمی مقام و مرتبہ عموماً کیا ہوتا ہے، اس سلسلے میں Staneley Lane Poole نے بھی ایک تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جارج سیل کے ترجمے کو اہلِ مغرب میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور اسی کی بنیاد پر بعد والوں نے تحقیقات جاری رکھی ہیں۔ دوسری طرف بہت سے مستشرقین نے اس ترجمے پر سخت تنقید کی ہے۔اس تنقید کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ اس ترجمہ میں اس قدر غلط معلومات پیش کی ہیں کہ اس ترجمے کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ جب تحقیقات کی بنیاد بننے والے اس اصل ماخذ کی حالت یہ ہے تو پھر آگے کی جانے والی تحقیقات کی حیثیت کیا ہو گی۔

Lane poole لکھتے ہیں:

Sale's translation has hitherto been practically the sole source of our knowledge or ignorance of the Koran in England.[2]

ترجمہ:''سیل کا ترجمہ اب تک انگلستان میں قرآن کے بارے میں جو معلومات پائی جاتی ہیں ان کا بھی بنیادی ماخذ ہے اور اسی طرح جو غلط فہمیاں اس ترجمے نے پھیلائی ہیں ان کی بنیاد پر قرآن کے بارے میں پائی جانے والی جہالت ولاعلمی کا بھی بنیادی ذریعہ ہے۔Lane Poole کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ چونکہ باقی تراجم سے ایک سو برس پہلے کا ہے، اس لئے اسے دیگر تراجم پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے۔'' آگے لکھتے ہیں:

But it is an insufferably dull one...It is difficult to read and impossible to understand Sale's Koran, if to understand is to grasp the drift and character of a book, and Sale's well meaning but prosaic work must be laid much of the responsibility for the prevailing distaste for the Koran.[3]

ترجمہ:''لیکن یہ ترجمہ بڑا ناقابلِ برداشت حد تک نفرت دلانے والا، بے کیف اور پھیکا ہے۔اسے پڑھنا

---

(1) IBID

(2) Lane Pool, Stanly, Studies in Mosque, khyat, Beruit 1966, p.116

(3) IBID. p116

مشکل، اور اسے سمجھانا ممکن ہے۔ سیل کے ترجمے کی حقیقت کو یوں سمجھیں کہ ایک کتاب کے رخ اور اس کے کردار کو سمجھنے کے لئے ہے لیکن ترجمہ بے کیف ہے اور اسے قرآن کے بارے میں مغرب والوں کی بے ذوقی کا سبب سمجھا جاسکتا ہے۔"

Lane Poole کا مذکورہ بالا بیان مستشرقین کی تحقیقات کا معیار متعین کرنے کیلئے خود ایک مستشرق کا بیان ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

Sir E.Dennison Ross اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

For many centuries the acquaintance which the majority of Europeans possessed of Muhammadanism was based almost entirely reports of fanatical Christians which led to the dissemination of a multitude of gross calumnies. What was good in Muhammadanism was entirely ignored, and what was not good in the eyes of Europe, was exaggerated or misinterpreted.(1)

"کئی صدیوں سے اسلام کے بارے میں اہلِ یورپ کی اکثریت کی معلومات کی بنیاد تقریباً مکمل طور پر ان مسخ شدہ رپورٹوں پر تھی جو متعصب عیسائی تیار کرتے تھے۔ یہ رپورٹیں اسلام کے بارے میں اختراع کردہ گمراہ کن افواہوں کے مجموعے کی طرف راہنمائی کرتی ہیں (جو اسلام کے بارے میں گمراہ کن افواہوں کا مجموعہ تھیں) جو چیز اسلام میں اچھی تھی اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا اور مغرب کی نگاہ میں جو چیز اچھی نہ تھی اسے خوب مبالغہ آرائی سے پیش کیا گیا یا اس کی تشریح و توضیح غلط کر دی گئی۔"

۵۔ مستشرقین کا شیعہ مکتبِ فکر کی روایات سے استدلال:

مستشرقین نے قرآن مجید کی صحت پر اعتراض کرتے ہوئے شیعہ مکتبِ فکر کی کتب میں موجود چند روایات، جن سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ قرآن مجید اپنی اصل حالت میں موجود نہیں ہے، کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان روایات میں سے اہم اور قابلِ ذکر روایات یہ ہیں:

(1) Preface of the Holy Quran, Starling Karachi P.20 (a)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ قرآن مجید کی کچھ آیات حضور ﷺ کے بستر تلے پڑی تھیں جنہیں بکری کھا گئی۔[1]

مناقبِ حضرت علیؓ (40ھ) و حضراتِ اہل بیتؓ قرآن مجید سے نکال دیے گئے۔[2]

حضرت علیؓ (40ھ) کے پاس ایک مصحف تھا جو ترتیب نزولی میں تھا۔[3]

موجودہ قرآن مجید مکمل نہیں۔ اصل قرآن چالیس پاروں پر مشتمل تھا۔[4]

ان تمام روایات کا خلاصہ یہی ہے کہ موجودہ قرآن نامکمل ہے۔ یہ شیعہ روایات بہت سے مستشرقین کا ہتھیار ہیں۔ لیکن یہاں بھی یہ بات اہم ہے کہ مستشرقین کا طریقِ کار وہی ہے جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے کہ یہ لوگ یکطرفہ روایات ہی بیان کرتے ہیں۔ وہ ان روایات سے صرف نظر کر جاتے ہیں جن میں مذکورہ بالا روایات پر شدید تنقید کرتے ہوئے انہیں غیر معتبر قرار دیا ہے۔ ہم نے شیعہ علماء کے وہ اقوال نقل کئے ہیں جن میں مذکورہ بالا روایات کو غلط اور غیر معتبر قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ موجودہ قرآن ہی وہ قرآن ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ (آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔)

ظاہر ہے کہ اگر علمائے شیعہ اس بات کا اعلان کر دیں کہ ہم ایسی روایات کو غیر معتبر سمجھتے ہیں تو پھر معاملہ "مدعی سست اور گواہ چست" والا ہی ہو جاتا ہے۔ اس طرح مستشرقین کے استدلال کا ایک ستون خود بخود ہی منہدم ہو جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم نے شیعہ مکتبِ فکر کی روایات کا انفرادی اعتبار سے بھی تحقیقی جائزہ لیا ہے اور مجموعی طور پر موجودہ قرآن مجید کے بارے میں جیّد علمائے شیعہ کے نقطہ نگاہ کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ قرآن مجید میں کبھی بھی سر مو تبدیلی نہیں آسکی۔

صحت قرآن کے بارے میں شیعہ نقطۂ نگاہ

مستشرقین نے قرآن مجید کے متن کی حفاظت پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کی ایک بنیاد وہ روایات ہیں

(1) Jeffery, Arthur, Material for the History of The text of the Quran, p.6

(2) صافی: ج1 ص14، 17، 24

(3) صافی: ج1 ص25

(4) کرپالوی، طالب، مسئلہ تحریف القرآن: ص420، 455، جعفریہ دار التبلیغ، لاہور 1982

جو کتب شیعہ کی بعض قدیم کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان روایات میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے متن میں وقتاً فوقتاً تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور قرآن کا متن اپنی اصلیت کھو چکا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے شیعہ علماء اور محققین کے ہاں اس سلسلے میں واضح نقطہ نگاہ موجود ہے کہ قرآن مجید کے متن میں کسی بھی دور میں سر مو انحراف نہیں کیا گیا اور جن روایات میں تحریف قرآن کا ذکر کیا گیا ہے وہ خود شیعہ محققین کے نزدیک مکمل طور نا قابل اعتبار اور مردود ہیں۔ چونکہ مستشرقین کی ایک بہت بڑی بنیاد یہی شیعہ روایات ہیں اس لئے اگر یہ بات ثابت کر دی جائے کہ یہ روایات نا قابل اعتبار ہیں تو گویا مستشرقین کے اعتراضات کی بنیاد مسمار ہو جائے گی اور معاملہ یوں ہو جائے گا کہ مدعی سست اور گواہ چست یعنی شیعہ محققین تو کہیں کہ ہمارے ہاں ان روایات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور مستشرقین ان روایات سے قرآن پر اعتراضات کی عمارت تعمیر کرتے پھریں۔

اس موضوع پر ہم مندرجہ ذیل پہلوؤں سے بحث کریں گے :

سب سے پہلے ان روایات کا تحقیقی جائزہ پیش کریں گے جن میں تحریف قرآن کا ذکر کیا گیا ہے ان تحقیقات سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شیعہ مکتب فکر میں ان روایات کی کیا حیثیت ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کے بارے میں محققین کے اقوال و آراء پیش کریں گے جنہوں نے تحریف قرآن کی روایات اپنی کتب میں نقل کی ہیں اور جو خود تحریف قرآن مجید کے عقیدے کے حامل ہیں۔

حضرت علیؓ (40ھ)، امام جعفر صادقؒ، امام نقیؒ اور دیگر آئمہ شیعہ کے اقوال پیش کرنے کے بعد یہ واضح کیا جائے گا کہ ان حضرات گرامی کا بھی عقیدہ تھا کہ قرآن مجید میں کسی بھی عہد میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں ہم نے یہ طریق کار اختیار کیا ہے کہ مذکور بالا موضوع پر روایات و شخصیات اور کتب کا تحقیقی جائزہ علمائے شیعہ ہی کے اقوال سے لیا جائے گویا ہم کسی شیعہ کتاب، شخصیت یا راوی کے بارے میں علمائے شیعہ ہی کے افکار و تحقیقات کی روشنی میں کوئی فیصلہ کریں گے۔

اس موضوع پر روایات کا تحقیقی جائزہ

1۔ تفسیر صافی میں روایت ہے:

عن ابی جعفر ان القرآن قد طرح منه ای کثیره لم یزد فیه الاحروف

"ابو جعفر فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سے بہت سی آیات نکال بھی دی گئی ہیں اور زیادہ بھی کی گئی

ہیں۔"[1]

اس روایت کے بارے میں ایک شیعہ عالم علامہ طالب کرپالوی لکھتے ہیں:

1۔اس روایت میں "قد طرح" کے الفاظ ہیں "نقص" کے الفاظ نہیں ہیں اس لفظ کا اطلاق ان آیات پر بھی ہو سکتا ہے جو منسوخ ہو جانے کی وجہ سے قرآن مجید کا حصہ نہیں رہیں۔ ظاہر ہے منسوخ آیات کے قرآن سے نکال دیئے جانے سے قرآن کے اصل متن پر کوئی حرف نہیں آتا۔[2]

2۔صاحب تفسیر صافی قرآن مجید میں عدم تحریف کے قائل ہیں۔ اگر یہ روایت (ان کے نزدیک) درست ہوتی تو وہ عدم تحریف کے قائل کیوں ہوتے۔[3]

3۔ اس سے مراد تفسیر اور تادیل کی کمی ہے۔ یعنی تفسیر اور تاویل پر مشتمل جو تشریحی نوٹ لوگوں نے لکھ رکھے تھے۔ چونکہ وہ قرآن کا حصہ نہ تھے اس لئے اصل متن سے جدا کر دیئے گئے۔

4۔اگر اس روایت میں تحریف قرآن ثابت ہو بھی رہی ہو تو قرآن مجید کے ساتھ عدم مطابقت کی بنا پر مردود ہو گی۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [4]

"بے شک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا اور بے شک ہم ہی اسکے محافظ ہیں۔"

﴿ لا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴾ [5]

"نہیں آسکتا باطل اس کے آگے سے اور نہ ہی پیچھے سے۔"

اعتراض: تفسیر صافی میں روایت ہے:

إن في القرآن مامضى ومايحدث وما هو كائن كانت فيه أسماء الرجال فالقيت[6]

---

(1) صافی، ۲۵/۱

(2) مسئلہ تحریف القرآن، ص: ۴۵۵

(3) تفصیلات کے لیے، صافی ۹/۱۔۱۱ (المقدمۃ الاولیٰ)

(4) الحجر: ۹

(5) حم السجدۃ: ۴۲

(6) صافی، ۲۵/۱

"بے شک جو کچھ گزر چکا، جو کچھ پیدا کیا جائے گا اور جو کچھ پیدا ہو رہا ہے سب کچھ قرآن مجید میں ہے۔ اسی قرآن میں لوگوں کے نام تھے جو اس میں سے ساقط کر دیئے گئے۔"

جواب: اس روایت میں دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے:

پہلے کچھ نام اس میں موجود تھے جواب نہیں ہیں۔

اعتراض کا جواب بالکل واضح ہے کہ نسخ فی القرآن کا سلسلہ جاری رہا ہے شیعہ اور اہل سنت سبھی اس کے قائل ہیں۔ نسخ کی صورت میں کسی نام یا الفاظ کا نکال دیا جانا، قرآن کا نقصان نہیں۔ اگر نقصان یا کمزوری کا پہلو ہوتا تو کم از کم مسلمان تو اس کا تذکرہ ہرگز نہ کرتے اور اسے چھپاتے۔

اعتراض: اصول کافی میں روایت ہے:

عن أبي عبد الله ان القرآن الذی جاء به جبرائیل إلى محمد ﷺ سبعة ألف آية[1]

"ابو عبداللہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ جبریل جو قرآن مجید حضرت محمد ﷺ کے پاس لائے تھے وہ ستر ہزار آیات پر مشتمل تھا۔"

جواب: اس اعتراض کے بارے میں طالب کرپالوی لکھتے ہیں:

1۔ جس روایت سے یہ استدلال کیا گیا ہے وہ ہارون بن مسلمہ کی موضوعہ روایت ہے[2]

2۔ اس روایت کی سند احمد بن سیاری تک پہنچتی ہے جو کہ ضعیف الحدیث غالی، کذاب معروف ہے۔ وہ کثیر المراسیل بھی ہے۔[3]

3۔ آیات کی تعداد میں اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے آیت کی تعریف میں اختلاف کیا ہے اور یہ اختلاف بھی اس طرح کا ہو گا۔[4]

4۔ اس اشکال کا ازالہ درحقیقت ناسخ و منسوخ کی حقیقت کو سمجھنے سے ہو سکتا ہے روایت زیر نظر میں دراصل ناسخ و منسوخ تمام آیات کو ملا کر کل آیات کا ذکر کیا گیا۔ شیخ صدوق کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے کہ تمام

---

(1) الکلینی، ابو جعفر محمد بن یعقوب، اصول من الکافی، مکتبۃ العرف، تہران، ۱۳۸۱ھ، جلد ۱، ص: ۶۷۱

(2) مسئلہ تحریف القرآن، ۲۰۔۲۱۔۴۴

(3) اس شخص کے بارے میں محققین شیعہ کی آراء صفحہ ۱۸۴۔۱۸۵ پر پیش کی گئی ہیں۔

(4) علی نقی، سید، مقدمہ تفسیر القران، ادارہ علمیہ، لاہور، ۱۳۸۰ء، ص: ۶۸

نازل ہونے والی آیات کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد ستر ہزار بنتی ہے[1]

5۔اصول کافی کے مترجم سید ظفر حسن لکھتے ہیں کہ یہ اختلاف آیات کی حد معین کرنے کی بنا پر ہوا ہے۔[2]

6۔علامہ مجلسی نے مرأۃ العقول میں لکھا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ ستر ہزار میں احادیث قدسیہ بھی شامل ہوں۔[3]

اعتراض: اصول کافی میں ہے۔

عن أحمد بن نصر قال دفع إلى أبو الحسن عليه السلام مصحفا فقال لا تنظر فيه ففحته وقرأت فيه لم يكن الذين كفروا فوجدت اسم سبعين رجلا من قريش باسمائهم واسماء ابائهم[4]

احمد بن ابو نصر نے بیان کیا کہ مجھے ایک قرآن مجید حضرت علیؓ (40ھ) نے دیا اور ساتھ حکم دیا کہ اسے پڑھنا نہیں۔ سو میں نے کھولا تو لم یکن الذین کفروا (سورۃ البینۃ) کی تلاوت کی تو اس میں بہتر 72 قریشیوں اور ان کے آباء کے نام تھے۔

جواب: اس اعتراض کے بارے میں طالب کرپالوی لکھتے ہیں:

۱۔ یہ روایت مجہول، معضل اور منقطع ہے[5]

۲۔ روایت کا متن دلالت کرتا ہے کہ یہ روایت درست نہیں ہے کیونکہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) کسی کو قرآن مجید دیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیں کہ اس کی تلاوت نہ کرنا۔

۳۔ پھر راوی بھی کس قدر نافرمان ہے کہ منع کرنے کے باوجود اس نے اس کی تلاوت کر لی۔

۴۔ یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس نسخہ کو دیکھا تو ان کے سامنے بھی سورۃ البینۃ ہی آئی اور اس شخص نے کھولا تو اس کے سامنے بھی یہی سورت آئی۔ اصول کافی میں جہاں اس روایت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں

---

(1) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۲۱

(2) شافی، ادیب اعظم، ظفر حسن، الشافی، اردو ترجمہ اصول کافی، جلد ۲، ص: ۶۳۲

(3) ایضاً

(4) کافی، ۶۷۰/۲

(5) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۲۹

حاشیے پر اس کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نام محض تفسیر کے طور پر حاشیے پر لکھے ہوئے ہوں گے اور اس طرح کی بات کہ اب یہ نام قرآن مجید سے نکال دیئے گئے ہیں اس کی آیت لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ سے متصادم ہے اس لئے مردود ہے۔[1]

اعتراض: شیعہ حضرات کا نقط نگاہ ہے کہ ہمارا قرآن نوے پاروں پر مشتمل ہے اور ستر گز لمبا ہے۔[2]

جواب: اس اعتراض اور نقطہ نگاہ کے بارے میں طالب کرپالوی نے بڑی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔[3] انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ موجودہ قرآن مجید ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ انہوں نے دوسرے مقام پر[4] اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شیعہ علماء کے مطابق امام مہدی کے قرآن اور موجودہ قرآن میں اصل متن کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں ہے۔

شیعہ کے ستر گز لمبے قرآن کے بارے میں طالب کرپالوی لکھتے ہیں:

روایت میں ذراع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ذراع انگلیوں سے کہنیوں تک کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ستر ذراع تقریباً ۳۵ گز بنتے ہیں۔ ایسے کاغذات اب بھی ملتے ہیں جو تھان کی شکل لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت تو پریس کا انتظام موجود نہ تھا۔ لوگ چمڑے وغیرہ پر لکھتے تھے اوراق کو باہم جوڑا جاتا تھا اور ان سب کو جوڑ کر ایک رول (Role) کی شکل بنا لیتے ہوں گے۔ اس طرح سے اگر ان اوراق کو جوڑا جائے تو یہ ستر سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔[5]

اس روایت کی ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے۔

ستر گز لمبائی قرآن مجید کی لمبائی نہیں ہے بلکہ "جامع" کی ہے جو قرآن اور اہل بیت کی تفسیر کے مجموعے کا نام ہے۔ گویا قرآن اور جامع دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن مجید تو ان کے نزدیک وہی ہے جو دیگر مسلمانوں کا ہے لیکن تفسیر کی تفصیلات میں فرق ہے۔[6]

---

(1) کافی، ۶۳۱/۲

(2) مسئلہ تحریف القرآن، ۱۱۱

(3) ایضاً ۱۱۱۔۱۳۰

(4) ایضاً، ۱۸۸۔۱۹۸

(5) ایضاً، ۱۳۱

(6) ایضاً، ۱۳۱

اعتراض : یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا نسخہ بہت بڑا تھا جو موجودہ قرآن مجید سے بہت زیادہ ضخیم تھا۔(1)

جواب: اس اعتراض کے بارے میں مولانا طالب کرپالوی نے اظہار خیال کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس مصحف کی موجودگی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ کوئی الگ قرآن مجید تھا۔(2)

اس مصحف کے بارے میں شیخ جواد البلاغی لکھتے ہیں:

حضرت فاطمہؓ کا مصحف قرآن مجید نہ تھا بلکہ وہ ایک کتاب جس میں قرآن مجید کے علمی اسرار ورموز کا تذکرہ تھا جیسا کہ اصول کافی کی متعدد روایات سے جو صحیفہ مصحف اور جامعہ کے باب میں درج ہیں ثابت ہوتا ہے۔ ان میں امام جعفر صادقؒ کا یہ قول بھی ہے کہ مصحف فاطمہؓ میں تمھارے قرآن کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ کسی جگہ یوں ہے کہ میں نہیں کہتا کہ اس میں قرآن ہے۔(3)

جب ہم اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ اس عہد میں صرف حضرت فاطمہؓ کا ہی مصحف موجود نہ تھا بلکہ ان کے علاوہ بھی کئی ایک حضرات صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کے نسخے موجود تھے مثلاً مصحف ابن مسعودؓ (32ھ)، مصحف ابی بن کعبؓ، مصحف ابن عباسؓ، مصحف حضرت علیؓ (40ھ) مصحف عائشہ صدیقہؓ، مصحف حفصہؓ وغیرہ۔ تو اس صورت میں حضرت فاطمہؓ کے مصحف کا تذکرہ چنداں عجیب بات نہیں ہے۔ ان مصاحف میں صحابہ کرامؓ نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق تشریحی نوٹ لکھ رکھتے تھے۔ کسی نے مختصر لکھے تھے کسی نے تفصیلاً۔ اسی مناسبت سے ان مصاحف کی ضخامت بھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ احادیث بھی لکھ رکھی تھیں۔ عہد نبوی میں اس طرح کے کئی ایک نسخوں کا تذکرہ کتب حدیث میں موجود ہے۔(4)

اعتراض: شیعہ عالم احمد بن محمد بن سیاری نے تحریف قرآن کے اثبات میں کتاب لکھی ہے۔(5)

---

(1) ایضاً، ۴۱۶۔۴۱۷؛ کافی ۲۳۹/۱

(2) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۳۱

(3) آلاء الرحمٰن فی تفسیر القرآن، مطبع العرفان، تہران، ۲۷/۱

(4) مباحث فی علوم القرآن، بیروت، ۱۹۷۹ء، ۱۲/۲۔۱۴

(5) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۲۸

جواب: اس شیعہ عالم کے مقام و مرتبے کے بارے میں ہم خود شیعہ کتب اسماء الرجال کی روشنی میں جائزہ پیش کرتے ہیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ یہ شخص کس حد تک قابل اعتماد ہے۔

شیعہ عالم ابو القاسم موسوی الخوئی نے اپنی کتاب "معجم رجال الحدیث و تفصیل طبقات الرواۃ" میں اس شخص کے بارے میں دیگر علمائے شیعہ کے اقوال نقل کیے ہیں ان میں سے چند آراء یوں ہیں۔

نجاشی اور زرکشی (794ھ) لکھتے ہیں: [1] [2]

احمد بن محمد سیاری حضرت ابو محمد کے عہد میں آل طاہر کے کاتبوں میں سے تھا اس کی حدیث ضعیف اور مذہب فاسد تھا۔

حسین بن عبید اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ مراسیل کی کثرت سے روایت کرتا ہے اس کی روایات قابل اعتبار نہیں ہیں۔ [3]

وہ روایات میں غلو اور عبارات میں خلط ملط کرتا ہے۔ [4]

الخوئی کا اپنا تبصرہ یوں ہے: سیاری کے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ وہ فاسد المذہب ہے۔ [5]

علامہ الخوئی نے اس شخص کے بارے میں شیعہ علما کے جو اقوال نقل کیے ہیں اور ان میں اس کیلئے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں اہم الفاظ یہ ہیں:

ضعیف الحدیث فاسد المذہب، کثیر المراسیل، غالی، اختلاط کرنے والا، محرف نہ اس کی بات پر عمل کیا جائے اور نہ اس کی بات پر فتویٰ دیا جائے۔ [6]

مندرجہ بالا آراء سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خود شیعہ علماء جس شخص کے بارے میں اس طرح کے الفاظ استعمال کریں اس کی رائے یا اس کی کتابوں کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے۔

---

(1) الخوئی، ابو القاسم موسوی، معجم رجال الحدیث، تفصیل طبقات الرواۃ، لبنان، دوسرا ایڈیشن، ۲/۲۸۲

(2) ایضاً، ۲/۲۸۴

(3) ایضاً، ۲/۲۸۲

(4) ایضاً، ۲/۲۸۳

(5) ایضاً، ۲/۲۸۳

(6) ایضاً، ۲/۲۸۲-۲۸۴

اعتراض: شیعہ عالم علی بن احمد ابو القاسم بھی قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں۔[1]

جواب: اس شخص کے بارے میں بھی ابو القاسم الخوئی لکھتے ہیں۔ علماء نے ذکر کیا ہے کہ یہ شخص جھوٹا اور فاسد المذہب ہے۔[2]

شیعہ عالم طالب کرپالوی نے اپنی کتاب مسئلہ تحریف القرآن میں اس طرح کی کئی ایک مزید روایات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان تمام روایات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ روایات موضوع۔ اخبار احاد۔ اور مخالف قرآن ہیں اس لئے ان سب کا رد کرنا لازم ہے۔[3]

اس طرح کی روایات کے بارے میں علامہ حسن فیض الکاشانی لکھتے ہیں کہ:

وہ روایات جن میں قرآن مجید میں تحریف کا ذکر کیا گیا ہے وہ قرآن مجید کی نصوص کے خلاف ہیں اور قرآن مجید کی تکذیب کا شبہ ڈالتی ہیں لہٰذا ان کا رد کرنا بہتر اور اولیٰ ہے۔[4]

علامہ سید مرتضٰی حسن ان روایات کے بارے میں لکھتے ہیں:

تحریف قرآن مجید کا قول ناقلین حدیث کی طرف سے ایک جماعت کی طرف منسوب ہے جہنوں نے ضعیف روایات واخبار کو صحیح سمجھتے ہوئے یہ عقیدہ وضع کر لیا۔ لیکن یہ اخبار ان یقینی اور غیر مشکوک وجوہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ہمارے موقف کی صحت کو واضح کرتے ہیں۔[5]

علامہ جواد البلاغی لکھتے ہیں:

بے شک علمائے رجال نے ان (تحریف والی روایات بیان کرنے والوں) میں سے ہر ایک کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی احادیث ضعیف اور کمزور ہیں۔ وہ فاسد المذھب ہے۔ اس کا مذھب اور روایات دونوں مشکوک ہیں۔ اس کی طرف غلو منسوب ہے۔[6]

---

(1) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۵۸۔۴۵۹

(2) معجم رجال الحدیث، تفصیل طبقات الرواۃ، لبنان، دوسرا ایڈیشن، ۲۴۶/۹

(3) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۱۶

(4) صافی، ۳۶/۱

(5) مقدمہ تفسیر القران، ادارہ علیمیہ، لاہور، ۱۳۸۰ء، ۷۶؛ البلاغی، ۲۶/۱

(6) البلاغی، ۲۶/۱

سید محسن بغدادی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

ہمارے علماء میں جو قول مشہور ہے کہ وہ جس پر اجماع کا دعویٰ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ قرآن مجید میں کمی واقع نہیں ہوئی اور علی ابن عبد العالی نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی واقع نہ ہونے کے متعلق تحریر کیا ہے۔(1)

شیخ صدوق کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے۔ انہوں نے بطور اعتراض ان احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے جن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے جواب دیا ہے کہ حدیث جب قرآن مجید، احادیث متواتر یا اجماع کے خلاف ہو اس کی تاویل ممکن نہ ہو تو اسے ساقط کر دینا چاہیے۔(2)

طالب کرپالوی لکھتے ہیں کہ:

تحریف کا شک پیدا کرنے والی تمام روایات ضعیف ہیں۔ اس کے برعکس عدم تحریف والی روایات صحیح اور قوی ہیں۔(3)

قرآن مجید میں تحریف والی روایات زیادہ تر شیعہ عالم نوری کی کتاب "فصل الخطاب" میں پائی جاتی ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ خود علمائے شیعہ اس کتاب کو غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں مشہور شیعہ مفسر محمد جواد البلاغی لکھتے ہیں:

"نوری" نے "فصل الخطاب" میں کوشش کے ساتھ ان روایات کو جمع کر دیا ہے جن سے وہ قرآن مجید میں کمی واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ روایات بہت سی اسناد کے ساتھ پیش کی ہیں۔ یہ اسناد انہوں نے ان روایات سے لی ہیں جو مرسل طریقہ پر تفسیر عیاشی اور فرات بن ابراہیم وغیرہ میں مذکور ہیں۔ حالانکہ جو شخص تحقیق کرے اور تحقیق کا ذوق رکھتا ہو وہ یقین کرے گا کہ یہ مرسل روایات انہی چند کتب میں موجود ہیں۔ پھر ان روایات میں سے کچھ تو ایسی ہیں جو کسی طرح بھی صحیح ہو ہی نہیں سکتیں اور بعض آپس میں اس قدر اختلاف رکھتی ہیں کہ وہ خود ہی متعارض ہو جاتی ہیں۔(4)

---

(1) مقدمہ تفسیر القران، ادارہ علمیہ، لاہور، ۱۳۸۰ھ، ۷۷

(2) ایضاً، ۷۷

(3) مسئلہ تحریف القرآن، جعفریہ دار التبلیغ، لاہور 1982، ۱۳۲

(4) ایضاً، ۲۶

علامہ جواد البلاغی لکھتے ہیں کہ

"یہ روایات بیان کرنے والے راویوں میں سے ہر کسی پر غالی، کذاب مفتری، فاسد المذہب اور دیگر بہت سے الزامات ہیں جن کی بنا پر ان لوگوں کی روایات مردود ٹھہرتی ہیں۔"(1)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

اگر ہم ان الزامات سے چشم پوشی کر کے اس اہم مسئلے (صحت قرآن مجید) کے بارے میں ان کی روایات قبول کر بھی لیں تو ان سے متصادم دیگر متعدد روایات کی موجودگی میں ہم یہی کہیں گے کہ ان روایات میں جن حذف شدہ آیات یا الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے وہ تفسیر یا تاویل کی حیثیت رکھتے تھے۔(2)

"فصل الخطاب" کے بارے میں طالب کرپالوی لکھتے ہیں:

"فصل الخطاب" کے مصنف نہ ہمارے امام ہیں نہ جید عالم بلکہ عام مولوی ہیں اور مولوی بھی معتمد نہیں بلکہ کمزور اور مفسد۔ (3)"فصل الخطاب" ہمارے شیخ طوسی کی امالی کی تقطیع پر ایران سے چھپی ہے۔ انہوں نے کاش یہ کتاب تالیف نہ کی ہوتی۔ حقیقت کے متلاشی علماء نے اس کتاب کی تردید میں کئی رسائل تحریر کئے ہیں جن میں انہوں نے حق واضح کر دیا ہے اور اس زمانے کے علماء نے اس کتاب پر خوب طعن و تشنیع کی ہے۔(4)

ان تمام آراء و افکار سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ:

وہ روایات جن میں تحریف قرآن مجید کا ذکر ملتا ہے وہ سب کی سب شیعہ محققین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں۔

جن کتابوں میں اسی طرح کی روایات پائی جاتی ہیں ان کے مؤلفین غیر معتبر شخصیات ہیں۔ لہٰذا ان کی روایات کی کوئی مستند حیثیت نہیں۔

عدم تحریف قرآن پر علما شیعہ کے اقوال

تحریفِ قرآن کے بارے میں روایات کے تحقیقی جائزہ کے بعد اب ہم اس مسئلے کی مزید وضاحت کیلئے

---

(1) ایضاً، ۲٦

(2) ایضاً

(3) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۵٦

(4) ایضاً، ۴۵٦۔۴۵۷

اکابر علماء شیعہ کے وہ اقوال نقل کریں گے جن میں انہوں نے واضح طور پر اعلان کیا ہے موجودہ قرآن مجید وہی ہے جو حضور اکرم ﷺ طور پر جبریل علیہ اسلام کے ذریعے نازل ہوا تھا۔ شیخ صدوق لکھتے ہیں:

واعتقادنا ان القرآن الذی أنزل الله علی نبیه هو مابین الدفتین و ما في ایدی الناس لیس أكثر من ذالك ومن نسب إلینا إنا نقول إنه أكثر من ذلك فهو كاذب[1]

"ہمارہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مجید اللہ تعالی نے اپنے نبی ﷺ پر اتارا ہے بعینہ وہی قرآن ہے جو بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن مجید اس سے ایک حرف زیادہ نہیں تھا۔ اور جو شخص ہماری طرف یہ بات منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں وہ شخص جھوٹا ہے۔"

سید مرتضی حسن لکھتے ہیں:

ان ہمن خالف في ذالك (إنه كان مجموعاً مرتبا غیر مثبورة ولا مثبوت) من الامبالیة والحشویة لا یعتد بخلافهم فإن الخلاف في ذالك مضاف إلى قوم ومن أصحاب الحدیث نقلو اخبار خعصیفه ظنو صحتها لا یر جع بمثلها من المعلوم المقطوع علی صحته[2]

"امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے (کہ قرآن مجید غیر محرف ہے اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوئی) ان کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے خلاف جو قول ہے اس کا سارا دارو مدار اصحاب روایت کی چند ضعیف روایات پر ہے جنہیں ان لوگوں نے صحیح سمجھ لیا حالانکہ ان روایات کو یہ حیثیت حاصل نہیں کہ ان کی بنیاد پر ایسی بات سے انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت کے ساتھ معلوم ہے۔"

شیخ محمد جواد البلاغی لکھتے ہیں:

"شیخ طوسی کی کتاب تفسیر تبیان کے آغاز میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق زیادتی یا کمی کے سوال کا اٹھایا جانا بھی مناسب نہیں کیونکہ قرآن مجید میں زیادتی نہ ہونے پر تو اجماع ہے اور کمی کے

(1) صدوق، ۲۸

(2) البلاغی، ۲۶/۱

متعلق بھی تمام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ زیادتی بھی نہیں ہوئی خصوصیت سے ہمارے مذہب میں صحیح قول یہی ہے اور اسی کی حمایت سید مرتضی حسن نے کی ہے اور احادیث سے بھی یہی ظاہر ہے۔"(1)

مجمع البیان میں ہے:

"یقیناً قرآن مجید نقص کے عیب سے پاک ہے خدا کی غیبی حفاظت کے ساتھ جس پر قرآن کی واضح آیت دلیل دے رہی ہیں اور ہر زمانے کے علماء کا اجماع بھی اسی کے مطابق ہیں اور شاذونادر بعض لوگوں کا قول قابل توجہ نہیں ہے کہ قرآن مجید میں تحریف ہو چکی ہے۔ اور جو روایات ایسی ہیں کہ ان سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے ان کی تاویل کی جانی چاہئے۔ ان روایات پر ظاہر پر عمل سے مذہب مانع ہے اور صحیح یہی ہے کہ قرآن مجید ہر طرح کی زیادتی و کمی سے محفوظ ہے اور انا لہ لحفظون اس کی دلیل ہے۔"(2)

علامہ علی نقی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ" مقدمہ تفسیر قرآن" میں اور بھی بہت سے شیعہ علماء کے اقوال نقل کئے ہیں جن میں قرآن مجید ہر طرح کی کمی زیادتی سے محفوظ ہے اور اس کی دلیل انا نحن نزلنا الذکر ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ حضرت علیؓ (40ھ) کا نام حذف ہو گیا جیسے یأیھا الرسول بلغ ما أنزل إلیك إلیك فی علی یہ بالکل غیر معتبر ہے، (3)

شیخ بہائی لکھتے ہیں:

"قرآن مجید ہر طرح کی کمی یا زیادتی سے محفوظ ہے او اس کی دلیل انا نحن نزلنا الذکر ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ حضرت علیؓ (40ھ) کا نام حذف ہو گیا جسے یایھا الرسول بلغ ما انزل الیك فی علی، یہ غیر معتبر ہے۔"(4)

---

(1) بحوالہ علی نقی، ۲۵، مکمل عبارت یوں ہے: "وفی اول "التبیان" للشیخ الطوسی قدہ امام الکلام فی زیادۃ ونقصہ فھما لایلیق بہ ایضاً لان الزیادۃ فیہ مجمع علی بطلانھا والنقصان فالظاھر ایضاً من مذھب المسلمین فلانہ وھو الالیق بالصحیح من مذھبنا وھو الذی نصرۃ المرتضی وھو الظاھر فی الروایات

(2) طبرسی، ۱/۵

(3) مقدمہ تفسیر القران، ۷۱-۸۷

(4) جواد البلاغی، 27/1

محمد جواد البلاغی لکھتے ہیں:

"بے شک شیعہ اور سنی طرق سے بہت سی ایسی روایات وارد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات گم ہو گیئں اور بعض اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ چلی گئیں۔ لیکن یہ روایات بطریق احاد منقول ہیں جن پر نہ علم کی بنیاد ہو سکتی ہے نہ عمل کی۔ اور بہتر یہ ہے کہ ان روایات سے کنارہ کشی کی جائے۔" (1)

قاضی نور اللہ شوستری لکھتے ہیں:

مانسب إلى شيعة الإمامية بوقوع التغير في القرآن ليس من ما قال به جمهور الإمامية انها قال به شر ذمة قليلة لا اعتداد بهم فيما بينهم (2)

شیعہ امامیہ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں تغیر ہوا ہے۔ جمہور امامیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا قائل ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو کسی شمار میں نہیں۔

الاصول من الکافی میں صفحہ ۵۹۶ سے ۶۰۰ تک قرآن مجید کی صحت اور اس کے مقام و فضلیت کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں۔ حضرت علیؓ (40ھ) کے اقوال جو نہج البلاغۃ کے مختلف مقامات پر موجود ہیں تحریف قرآن کی نفی کرتے ہیں۔ ان میں چند مقامات یہ ہیں۔

جلد اول: صفحہ ۴۳، ۷۷، ۸۳، ۱۰۳، ۱۲۱، ۱۲۳ جلد دوم: صفحہ ۱۲، ۲۷۰

اصول کافی میں قرآن مجید کے فضائل کے باب میں "النوادر" کے عنوان کے تحت امام جعفر صادق کے حوالے سے حضرت علیؓ (40ھ) کے اقوال نقل کیے گئے ہیں کہ آپؓ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ (3)

اس موضوع پر طالب کرپالوی نے اپنی کتاب مسئلہ تحریف القران میں حضرت علیؓ (40ھ)، امام جعفر صادقؒ، حضرت علی نقی اور دیگر شیعہ آئمہ و علماء کے اقوال بڑی تفصیل سے نقل کیے ہیں (4)

---

(1) البلاغی، ۱/ ۲۷

(2) شوستری، ۱۰۵

(3) صافی، ۱/ ۳۴؛ ایضاً/ ۱۰، ۹، ۲۶

(4) مسئلہ تحریف القرآن، ۴۴۔ ۱۰۸

علامہ طبرسی کا بیان اس سے قبل بھی پیش کیا گیا ہے جس میں انہوں نے موجودہ قرآن مجید کو حقیقی قرآن قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں:

ومن ذلك الكلام في زيادة القرآن و نقصانه انه يتعلق بالتفسير فاما لزيادة فجمع على بطلا نه[1]

ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی زیادتی یا کمی ہوئی یا نہیں؟ یہ بحث فن تفسیر سے متعلق ہے۔ یہ بات کہ قرآن میں کچھ زیادتی ہوئی ہے سب کے نزدیک باطل ہے۔

شیخ حر عاملی رسالہ تواتر قران میں لکھتے ہیں:

من تبتع الاخبار في تصحح الآثا رمن كتب الأحاديث والتواريخ وغير ذالك فإنه يعلم قطعا ان القرآن كان في غاية الكثرة نقله من النا قلين أكثر منهم وانه مازال يزيد وقد تقدم في كلام المرتضى انه كان مجموعاً مر تبا على محمد ﷺ ويأتي كثير يما يدل على ذالك قطعر انه بلغ حد المتواتر[2]

آثار واخبار اور تاریخ وحدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآن حکیم کثرت سے نقل ہوتا رہا ہے اور حضرت مرتضی کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآن، حضورؐ کے زمانے میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا۔

عہد نبوی ہی میں قرآن مجید کے مرتب شکل میں موجود ہونے کے بارے میں شیخ حر عاملی حضرت علیؓ (40ھ) کا قول نقل کرتے ہیں:

إن القرآن على محمد ﷺ مجمو عاً مو لفاً على ما هو عليه الآن وكان يدرس ويحظ جمعيه في ذالك الزمان وانه يعر ض على النبى ﷺ ويتلى عليه وإن جما عة من الصحا بة كعبد الله ابن مسعود وأبي ابن كعب وغيرهم ختم القرآن على النبى ﷺ عدة ختمات وكل ذالك بادنى تامل يدل على انه كان مجموعه مرتباً غير متشور لا منثوك[3]

---

(1) طبرسی، مجمع البیان ۱/۵ مقدمہ نمبر ۵

(2) شرح کافی، ۸۲/۲

(3) ایضاً، ۷۶/۲

"بے شک قرآن مجید نبی کریم ﷺ کے عہد میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا جیسا کہ وہ آج کل ہے اور اس زمانے میں سب اسے پڑھتے اور حفظ کرتے تھے جس طرح اب یاد کرتے ہیں اور مشہور صحابہ کرام مثلاً عبداللہ ابن مسعود (32ھ) اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہ، حضور ﷺ کے سامنے تلاوت فرماتے تھے اور قرآن پورے کا پورا ختم فرماتے تھے اور یہ بات ادنیٰ تامل کے بغیر ثابت کرتی ہے کہ قرآن مجید کا متن متواتر کے درجے پہنچا ہوا ہے۔"

سید مرتضیٰ حسن کا یہ قول بھی بڑا واضح ہے کہ

ان لعلم بصحة القرآن كالعلم بالبلدان والوقائع الكبار [1]

موجودہ قرآن کی صحت اس طرح یقینی ہے جیسے مشہور شہروں کی موجودگی کا علم اور بڑے بڑے تاریخی واقعات کا علم۔

s.v Mir Ahmad Ali شیعہ عالم ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کے آغاز میں انہوں نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے مشہور شیعہ عالم حجتہ الاسلام آیت اللہ الحاج علامہ آغا مرزا مہدی پویا، جو ان کے نزدیک بہت بڑے عالم ہیں، ان کے نوٹس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے نوٹس کی روشنی میں انہوں نے قرآن حکیم کے بارے میں شیعہ نقطہ نگاہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ مترجم قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

- قرآن شب قدر کو پورے کا پورا حضور ﷺ پر نازل ہوا
- جب وحی نازل ہوتی، حضور ﷺ فوراً اسے اس کے اصل مقام پر لکھوا دیا کرتے۔
- حضور کے عہد ہی میں کم از کم مندرجہ ذیل لوگوں نے قرآن مجید مکمل طور پر لکھ لیا ہوا تھا۔
- حضرت علیؓ (40ھ) رضی اللہ عنہم، عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم (32ھ)، معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہم (18ھ)، ابی بن کعب رضی اللہ عنہم
- حضور ﷺ کی وفات کے وقت مکمل قرآن لکھا ہوا موجود تھا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما

---

(1) بحوالہ صافی، ۱/۳۴

یعنی میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں تم ان کو جب تک مضبوطی سے تھامے رکھو گے، اس وقت تک گمراہ نہیں ہو گے۔

اگر سارا قرآن کتابی شکل میں لکھا ہوا نہیں تھا تو حضرت عمرؓ نے جب فرمایا تھا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے تو اس وقت پھر کون سی کتاب مراد تھی؟ (1)

یہ نکات بیان کرنے کے بعد مترجم لکھتے ہیں:

With all this unchallengeable evidence of History, if any fuss is made about its collection by any one also or about it's Tahreef, it will be betraying either the determination not to know the truth or inability to understand the matter in its true perspective.... (2)

Thus be it know that any talk against the genuineness and the completeness, of the matter therein is an anti -Shia i.e an anti Islamic move (3)

قرآن مجید کے اسی ترجمے کے Introduction میں مرزا مہدی پویا کا ایک طویل مضمون موجود ہے۔ جس کا عنوان ہے:

"Originality and genuiness of Holy Quran in its Test and its Arrangement" (4)

اس طویل مضمون میں موصوف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت اس حقیقت پر متفق ہے کہ قرآن حکیم جیسا کہ آج ہمارے ہاتھوں میں ہے، حضورؐ کی ذاتی زیر نگرانی لکھا گیا تھا اور اس میں کوئی اضافہ کوئی کمی یا کوئی تغیر نہیں ہو پایا۔ لیکن شیعہ اور سنی فرقے کے کچھ لوگوں کی چند روایات کے الفاظ کی بنیاد پر

---

(1) AHMAD ALI , MIR, Translation of The Holy Quran, , 24 (a)

(2) IBID

(3) IBID

(4) IBID 25(a)

تاریخی روایات کی وجہ سے، کچھ مختلف نقطہ نگاہ اختیار کیا گیا ہے کہ خلیفہ سوم کے موجودہ مصحف تیار کرنے سے پہلے اور حضورؐ کے بعد اس میں کچھ کمی بیشی واقع ہوگئی ہے لیکن اس نظریے کے حامیوں کے پاس کچھ بھی دلائل نہیں ہیں کہ وہ اپنے اس موقف کو درست ثابت کر سکیں۔ ان کا نقطہ نگاہ ایک فرد ہی کی رائے رہ جاتی ہے۔ (1)

اسی طویل مضمون میں موصوف نے قرآن حکیم کے امتیازی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب قرآن حکیم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ احادیث سے بالکل ممتاز ہے پہلے دن سے لوگ اسے پڑھتے اور زبانی یاد کرتے چلے آرہے ہیں۔ جبکہ دنیا کی کسی کتاب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہے کہ بچے بوڑھے اس کے حافظ ہوں۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو ترغیب فرمائی کہ وہ اسے زبانی یاد کریں۔ اسے لکھنے اور زبانی یاد کروانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس کی صحت کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی پائے کے کسی بھی مسلمان عالم نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ اس کا کوئی لفظ، کوئی حرف، یا شوشہ ایسا نہیں جو حضورؐ نے قرآن کی صورت میں ہمارے سامنے پیش نہ کیا ہو۔ (2)

مرزا مہدی پویا قرآن میں کسی طرح کے تغیر و تبدل کے بارے میں لکھتے ہیں قرآن میں اضافے کا کبھی سوال ہی کھڑا نہیں ہوا اور امت کا یہ اجماعی فیصلہ ہے یہ قرآن باقی تمام مذاہب کی صحت کو پرکھنے کا معیار ہے۔ (3)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو خلیفہ ثالث نے سرکاری طور پر سلطنت میں پھیلایا تھا۔ (4)

مرزا مہدی پویا لکھتے ہیں:

"جو اختلاف پایا گیا ہے وہ صرف قرآن حکیم کی ترتیب الفاظ و حروف اور ترتیب آیات سے متعلق ہے اور اس اختلاف کا تعلق حضورؐ کے وصال کے بعد اور حضرت عثمانؓ کے بعد قرآن لکھوانے

---

(1) IBID

(2) IBID

(3) IBID, 26(a)

(4) IBID

سے پہلے سے ہے۔"(1)

وہ مزید لکھتے ہیں:

"حضور ﷺ نے لوگوں کو مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ جیسے ہی کوئی حصۂ قرآن نازل ہو، فوراً اس وقت اسے اس کی مخصوص جگہ پر لکھ لیں۔"(2)

عہد نبوی ﷺ میں حفاظت قرآن کے باب میں شیعہ علماء کے مزید اقوال بھی پیش کیے گئے ہیں۔ انہوں نے وہ سارا نقشہ پیش کیا ہے کہ صحابہ کس طرح قرآن کو حفظ کرنے اور لکھنے میں مشتاق تھے۔ وہ عہدی نبوی میں حفاظ صحابہؓ کی تعداد کی کثرت کا اندازہ اس سے پیش کرتے ہیں کہ حضورؐ کے وصال سے چھ ماہ بعد ہونے والی جنگ، جنگ یمامہ میں سات سو حفاظ شہید ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس فرمان نبوی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن حضور ﷺ نے خود ہی مرتب فرمادیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید ایک مرتب کتاب ہے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنی اصل کی ترتیب کے مطابق ہو جبکہ قرآن مجید کی اصل لوح محفوظ میں موجود ہے۔(3)

گزشتہ صفحات میں ہم نے شیعہ علماء و محققین کے اقوال کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ ان کے نزدیک ان روایات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اہل سنت کے اقوال بھی اس سلسلے میں پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شیعہ نے قرآن مجید کے بارے میں ان روایات کو کبھی بھی اپنے عقائد کی بنیاد نہیں بنایا بلکہ وہ موجودہ قرآن مجید کو مکمل اور اصل قرآن سمجھتے آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا قاسم نانوتوی (1297ھ) لکھتے ہیں کہ شیعہ کا عمل وعقیدہ دونوں موجودہ قرآن مجید کے مطابق رہے ہیں۔ اور عملی و نظری طور پر وہ بھی اسی قرآن کو حقیقی قرآن سمجھتے ہیں:

- شیعہ میں بھی اور کوئی کتاب اس درجے کہ نہیں جس درجے کا قرآن۔
- تمام امامیہ اہل بیت، اسی قرآن سے استدلال کرتے تھے۔ بچوں کو پڑھاتے تھے۔
- امام حسن عسکری سے جو تفسیر منسوب کی جاتی ہے وہ بھی اسی قرآن کی ہے۔
- مشرف بہ اسلام ہونے والے اسی قرآن کو پڑھتے ہیں۔
- اسی قرآن کی تلاوت نمازوں میں کی جاتی ہے۔

---

(1) IBID, 27 (a)

(2) IBID

(3) IBID

- اگر کسی نے قرآن گھٹایا یا بڑھایا تو لاکھوں حفاظ قرآن موجود تھے اور اب بھی حفاظ کے تسلسل میں انقطاع نہیں ہوا۔
- اگر شیعہ کی ان روایات کو مان لیا جائے۔ تو پھر حفاظت قرآن کے وعدہ الٰہی کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔
- اگر ان روایات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو خدا تعالیٰ کے وعدہ حفاظت پر حرف آتا ہے۔
- نعوذ باللہ یہ لازم آتا ہے کہ قران کی حفاظت کے وعدے سے اللہ تعالیٰ نے انحراف کر دیا۔
- قرآن مجید کی فوقیت باقی نہیں رہ جاتی۔ (1)

۶۔ قرآن مجید پر اعتراضات کے حوالہ سے مستشرقین کے اہداف

مستشرقین نے قرآن مجید پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں ان کے ہدف مندرجہ ذیل ہیں:

1. قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے سے انکار
2. محفوظیت قرآن سے انکار
3. ترتیب قرآن کی بنیاد پر الجھاؤ پیدا کرنا
4. نسخ فی القرآن کی بنیاد پر اعتراضات
5. اختلاف مصاحف کی بنیاد پر اعتراضات
6. سبعہ احرف کی بنیاد پر اعتراضات
7. قرآن مجید کا اسلوب

1. قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا انکار۔ ان کے خیال میں قرآن مجید پہلی آسمانی کتابوں سے اخذ کر لیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ عیسائی راہبوں سے ملتے تھے۔ آپ ﷺ نے کارندے رکھے ہوئے تھے، وہ قرآن کا مواد گھوم پھر کر حاصل کرتے اور حضور ﷺ اس مواد کو قرآن کا حصہ قرار دیدیتے۔ اس سلسلہ میں ان کے نقطہ نگاہ کی تفصیل "مستشرقین کے نزدیک قرآن کے ماخذ" والے باب میں پیش کی گئی ہے۔

---

(1) نانوتوی، قاسم، محمد، انتصار الاسلام، کتب خانہ امدادیہ، دیوبند، ۱۹۴۰ء، ۲۵۔۳۰

2. اس کی صحت، حیثیت، محفوظیت پر اعتراض اور یہ موقف کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ حقیقی قرآن نہیں۔

قرآن مجید کی عدم محفوظیت کو ثابت کرنے کیلئے مستشرقین نے اس کے مندرجہ ذیل پہلوؤں کو استعمال کیا ہے:

i. عہد نبوی میں ایک قرآن کا باقاعدہ مکمل نسخہ موجود نہ تھا۔

ii. عہد صدیقی میں مصحف کی تیاری کے باوجود مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس ذاتی مصاحف کی موجودگی سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن میں اس دور میں ہی اختلافات موجود تھے۔

iii. مصحف عثمانی کے سوا دیگر مصاحف کے جلائے جانے سے ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔

iv. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ بیان کہ ان کے مصحف میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، ان کے خیال میں یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ عہد عثمان تک بھی قرآن کا متن متعین نہیں ہوا تھا۔

v. بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مصحف عثمانی سے اختلاف (ان کے خیال کے مطابق) ظاہر کرتا ہے کہ قرآن کا موجودہ متن مکمل قرآن پر مشتمل نہیں ہے۔

3۔ ترتیب قرآن مجید (ان کے خیال میں قرآن مجید غیر مرتب ہے اور مختلف لوگوں نے اس میں تصرفات کئے اس لئے اس کی ترتیب درہم برہم ہوتی رہی ہے۔ (اس پہلو سے ان کے اعتراضات کا جواب کتاب کے متعلقہ باب میں دیا گیا ہے)

4۔ نسخ فی القرآن: (ان کے خیال میں قرآن مجید میں کئی ایک ایسی آیات اب موجود نہیں جو پہلے موجود تھیں گویا اصل قرآن ختم ہو چکا ہے) اس موضوع پر تفصیلی بحث کتاب کے باب نسخ فی القرآن میں کی گئی ہے۔

5۔ قرآن مجید کے مختلف مصاحف (اختلاف مصاحف) مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ (32ھ) وغیرہ سے بھی وہ قرآن میں اختلافات ثابت کرتے ہیں۔ تفصیلی بحث متعلقہ باب میں موجود ہے۔

6۔ اختلاف قراءات اور سبعہ احرف کی بنیاد پر بھی یہ ابہام پیدا کرتے ہیں کہ (ان کے خیال میں قرآن مجید کا متن کبھی متعین شکل اختیار نہ کر سکا بلکہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔

7۔ قرآن مجید کا اسلوب:

قرآن مجید ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے عام انسانی تصانیف سے بالکل مختلف اور جداگانہ انداز کا حامل ہے۔ اس میں انسانی تصانیف کی طرح نہ عنوانات کا ذکر ہے اور نہ ابواب بندی۔ مستشرقین کے ذہن چونکہ صرف اسی انداز سے مانوس ہیں کہ کتاب میں باقاعدہ عنوان کے تحت ابواب بندی کے ساتھ بحث کی جائے، لہٰذا وہ قرآن مجید میں نقائص نکالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابواب کے تحت تقسیم نہ ہونا، اس کا ایک نقص ہے۔ اس کا (بظاہر) مرتب نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی معجز کلام نہیں۔ اور مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے اس کی ترتیب و متن میں گڑبڑ کر ڈالی ہے۔

مستشرقین ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے ترتیب قرآن مجید کی بنیاد پر اس کی عدم محفوظیت پر دلیل قائم کرتے ہیں۔ اور ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے یہ ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا ہے جس کا مطالعہ اگر ہم کرنا چاہیں بھی تو اس کی بے ترتیبی اور بے ہنگم پن ہمیں اس سے دور لے جاتا ہے۔ (1)

جارج سیل کہتا ہے کہ مغربی طلبہ کے قرآن مجید سے دور ہو جانے کا سبب ہی یہ ہے کہ اس کے مضامین کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ (2)

مارگولیتھ کہتا ہے کہ قرآن مجید کے اور اوصاف تو ہوں گے لیکن جب مغربی طلبہ اسے مغربی تنقید کے جدید اصولوں پر پرکھتے ہیں تو اس کی قدر و منزلت کہیں کم ہو جاتی ہے۔ (3)

8۔ قرآن مجید کی تعلیمات، اس کے فلسفہ حیات اور اس کے احکام پر اعتراضات۔

ے۔ اسلام کے بارے میں تحقیقات میں اہل مغرب کی غلطیاں:

گزشتہ صفحات میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ مستشرقین نے اسلام کے بارے میں حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئندہ سطور ان لوگوں کی کتابوں سے ان کی دانستہ اور نادانستہ غلطیوں کی چند مثالیں پیش کریں گے تاکہ ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہو سکے۔

---

(1) Nicholson, Introduction of the Translation of the Quran by Palmer, p xvi

(2) Sale, George: The Quran, commonly called Al-Quran with a Preliminary discourse, Fredrick Press 1899, p.48

(3) Margoliouth: Ix Introduction of the Translation of the Quran by Rodwell.

ا۔ فلوگل ایک معروف مستشرق ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کا ایک انڈکس تیار کیا ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۴۲ء میں قرآن مجید کی ایک لغت چھاپی اس لغت میں انہوں نے ۳۹ الفاظ کے مادے بھی غلط لکھے اور ان مادوں کی بنیاد پر ان الفاظ کے معانی ہی بدل ڈالے۔ ان میں سے چند مثالیں:

اثرن۔ اس کا مادہ "اثر" قرار دیا حالانکہ اس کا مادہ "ث ور" ہے۔

مخاض۔ اس کا مادہ "خ وض" قرار دیا حالانکہ صحیح مادہ "م خ ض" ہے۔

استبقوا کا مادہ "ب ق ی" قرار دیا حالانکہ صحیح مادہ "س ب ق" ہے۔

قرن کا مادہ "ق ر ن" قرار دیا حالانکہ صحیح مادہ" وق ر" ہے۔

مقیلا کا مادہ "ق و ل" قرار دیا حالانکہ صحیح مادہ "ق ی ل" ہے۔[1]

ان مقامات پر مستشرق کی مذکورہ بالا قسم کی انتالیس غلطیوں کی نشاندھی کی گئی ہے۔ ان مقامات پر مستشرق مذکور کو مغالطہ لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے ۳۹ الفاظ کے مادے غلط طور پر بیان کرنا، اس کی عربی دانی کا پول کھولنے کے مترادف ہے۔ اور عربی میں مادوں کے بدلنے سے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ مستشرقین کی ایسی اغلاط کی نشاندھی کی جاسکتی ہے جو محض اغلاط اور فروگذاشتیں ہی نہیں بلکہ ایسی غلطیاں ہیں جن سے قرآن کے معانی پر گہرا اثر پڑتا ہے اور یا پھر کسی مقام پر قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کے معجزانہ اسلوب پر زد پڑتی ہے۔ مستشرقین بعض جگہوں پر قرآن مجید کے الفاظ، دوسرے الفاظ کے ساتھ بدل کر پیش کرتے ہیں۔ جو لوگ قرآن مجید کے حافظ یا ماہر نہیں ہوتے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہاں تحریف ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ اس کی ایک مثال سورۃ الاعراف کی آیت میں "اقرب الموارد" کے مؤلف سعید الخوری کی تحریف ہے۔

سورۃ الاعراف میں ہے:

"ولا یدخلون الجنۃ حتیٰ یلج الجمل فی سم الخیاط"

پادری مذکورہ نے "یلج" کی جگہ "یدخل" اپنی طرف سے داخل کر دیا ہے۔

بادی النظر میں یہ تبدیلی شاید زیادہ بڑی نظر نہ آئے۔ لیکن ایک تو اس سے قرآن کے لفظ میں تبدیلی

---

(1) لوئس، معلوف الیسوعی، المنجد، صفحہ و۔ز

واقع ہوئی جو کسی بھی طرح روا نہیں۔ دوسرے یہ کہ یلج کے لفظ میں یہ معنٰی تھا "تنگ جگہ میں داخل ہونا" اسی لئے جنت کی وسعت میں داخل ہونے کیلئے سوئی کے ناکے کی تنگی سے "یلج" کا لفظ آیا۔ جبکہ "یدخل" میں کوئی معنوی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ (1)

ہمارے موضوعِ زیرِ بحث کی ایک مثال یہ ہے کہ مستشرق بروکلمان جو "تاریخ الشعوب الاسلامیہ" کے مصنف ہیں۔ عربی مسلمانوں کو عربوں کے مقابلے میں مختلف گوشوں سے "رعیہ" میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس کا معنٰی عربی لغت میں "بکری کے ریوڑ" ہے۔ یہ معنٰی کرنے کا مقصد اس کے ذہن میں یہ ہے کہ مستشرق عربوں کی افضلیت اور برتری کے مقابلے میں عجمی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتا ہے کہ عرب، غیر عربوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ رعیّہ کے لفظ سے اس نے استنباط کیا ہے کہ عرب، عجمی مسلمانوں کو ریوڑ کی حیثیت دیتے ہیں۔ (2)

یہ لفظ دراصل احادیث میں استعمال ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا:

اَلَا کُلُّکم راعٍ و کلّکم مسئولٌ عن رعیته (3)

"تم میں سے ہر شخص محافظ ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں پوچھا جائے گا لوگوں پر امام بھی ذمہ دار ہیں وہ اپنی نگہبانی کے بارے میں مسئول ہیں۔ مرد اپنی بیوی اور اہل خانہ کا نگہبان ہے اور اس کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ عورت اپنے گھر والوں کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس ذمہ داری کے بارے میں سوال ہو گا۔"

مستشرق نے "راع" کا معنٰی صرف "ریوڑ" ہی بیان کیا ہے۔ حالانکہ اگر لغت کا سہارا لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ "راع" کا معنٰی "ذمہ دار" اور "پرسان حال" بھی ہوتے ہیں۔ کلام عرب میں "الراعی" کا لفظ "رئیس القوم" کیلئے بھی مستعمل رہا ہے۔ اس لفظ کے معنٰی کے ساتھ حفاظت و نگہبانی کا بھی مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلام نے اِس کا اطلاق قوم پر کیا ہے۔ بڑی حد تک اس لفظ کا اطلاق "عوامی اور شعبی زندگی" پر کیا گیا ہے۔ کسی لغت، تاریخ یا حدیث کی کتاب میں یہ معنٰی نہیں کیا گیا کہ "راع" کا معنٰی عجمی لوگ ہیں۔ معلوم

(1) سعید الخوری، اقرب الموارد، جلد اول، ص 139، زیر مادہ ج م ل

(2) Brockelmann, Calr, History of the Islamic Peoples, (EN, TR), Joel Carmickel, London, 1949, p 165-166. 165، بروکلمان، تاریخ الشعوب الاسلامیہ، 166

(3) مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ والقضا، 320

نہیں کس بنیاد پر عجمی لوگوں کا استثناء اور تخصّص بنالیا۔ [1]

بروکلمان اس بات پر مصر ہے کہ عرب مسلمانوں نے عجمی لوگوں کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح دیکھا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں کہ اس لفظ کا اطلاق بکریوں کے گلہ پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیسے متعین ہوسکتا ہے کہ لغت میں درج شدہ معانی کی طویل فہرست میں کسی ایک لفظ کا تعین کرلیا جائے جبکہ کوئی ایک تاریخی قرینہ بھی اس کے حق میں نہ ہو۔

پادری ہاوا الفرائد الدریہ "میں ع ن و" مادہ کے تحت العوان (اسیر عورتیں) کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: Muslism Woman , captive woman [2]

حالانکہ "عوان" کا لفظ عام ہے یعنی اسیر عورتیں ان کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب سے ہو۔ لیکن اس نے غلط فہمی پیدا کرنے کیلئے اس کا معنی "مسلمان عورتیں " کردیا۔

اس نے یہ معنی ایک حدیث مبارکہ

" اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہا کرو کیونکہ وہ تمہارے نکاح کی قید میں آچکی ہیں۔ "[3] قید نکاح کا لفظ تو درحقیقت احساس ذمہ داری پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا۔

اسی طرح "ج ن ب" کا معنی پادری ہاوا نے " Polluted Muslim " کیا ہے۔ [4] یہ ایک مفہوم ہے۔ جو مسلم اور غیر مسلم کیلئے بلا تخصیص بولا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اسے مسلمان کے ساتھ مخصوص کردیا۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

اسی پادری نے "اھل الصفۃ" کا معنی " Housless people, Vagrant "[5]

---

(1) حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد تیرہ، صفحہ 96 پر اس سلسلے میں لکھا ہے" راعی ایسا امانت دار مخلص محافظ ہوتا ہے جو پوری ایمان داری سے اپنی ذمہ داری محسوس کرے۔ وہ عدل اور مصلحتوں کا بھی خیال رکھے۔ لویس معلوف المنجد صفحہ 287 پر لکھتے ہیں، راعی کا معنی ہے ڈرانا، گھبرانا، متعجب کردینا، لوٹنا، خوش کن، سمجھدار، چرواہے کا بکریوں کو ڈانٹنا، بہادری سے دوسروں کو متعجب کردینا۔

(2) ہاوا، 505

(3) مسند احمد 20695

(4) ہاوا، 100

(5) ایضاً، 398

کیا ہے یعنی بے گھر اور آوارہ لوگ۔ پادری مذکور نے شر کا پہلو پیدا کرنے کیلئے آوارہ لوگ بھی معنی کر دیا۔ اہل الصفہ تو وہ حضرات گرامی ہیں جو گھر بار چھوڑ کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہ کر علم دین حاصل کیا کرتے تھے۔

المنجد میں "ط ل ق" کے تحت الطلقاء کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ الطلقاء الذین ادخلوافی الاسلام کرھاً [1] یعنی طلقاء وہ لوگ ہیں جنہیں جبراً اسلام میں داخل کیا گیا۔ حالانکہ یہ لفظ حضورؐ نے اس وقت استعمال فرمایا تھا جب فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے اپنے دشمنوں کو معاف فرما دیا تھا۔

آپؐ نے فرمایا تھا: "اذھبوا أنتم الطلقاء"

"جاؤ تم سب آزاد ہو۔" [2]

اس سلسلے میں بہت سی احادیث کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ طلقاء آزاد کردہ لوگ ہیں۔ خود صاحب المنجد نے طلیق کا معنی غیر المقید لکھا ہے جو طلقاء کی جمع ہے۔ [3]

مستشرقین کی کتب سے بیسیوں ایسی مثالیں حاصل کی جاسکتی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسلام، حضورؐ اور قرآن کی اصل تصویر کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔

Religions of the World کے مصنف G.L. Berry لکھتے ہیں۔

☆ "محمد ﷺ ہجرت کر کے طائف چلے گئے۔ جب وھاں بھی کوئی شخص مسلمان نہ ہوا تو آپ ﷺ واپس آنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے واپس مکہ آنے کی درخواست کی۔ یہ درخواست اس شرط پر قبول کی گئی کہ آپ آئندہ اسلام کی تبلیغ نہیں کیا کریں گے۔ لیکن پہلے شرط مان لینے کے باوجود آپ ﷺ نے بعد میں اس شرط پر عمل نہیں کیا۔" [4]

یہی مستشرق کہتا ہے کہ

☆ ابتداء میں محمد ﷺ نے اس امید سے کہ یہودی مسلمان ہو جائیں گے ان کے ساتھ سازگاری کی

---

(1) لوئس معلوف، 488

(2) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، جلد دوم، صفحہ 144

(3) لوئس معلوف، 488

(4) Berry, G.L, Religion of the world, Barnes and Noble, New York. 1964, P 61

پالیسی اپنائی۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ تو قریب نہیں آرہے تو آپ اپنی پالیسی فوراً بدل لی اور لوگوں سے کہہ دیا کہ بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرو۔[1]

☆ یہی مستشرق آگے چل کر لکھتا ہے۔ محمدؐ کو فنڈز کی ضرورت تھی۔ ان کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی زراعت وغیرہ میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تجارتی قافلوں کو لوٹنے کیلئے چھاپے مارنے شروع کردئے اور محترم مہینوں کا بھی احترام کئے بغیر اپنے مخالفین کو شہر سے باہر نکال دیا۔ اسکی وجہ سے عرب میں "مقدس جنگ" چھڑ گئی۔

☆ محمد ﷺ نے لوگوں کو جذباتی جنگ جو بنا دیا۔ انہیں لالچ دیا کہ اگر وہ جنگ میں مارے گئے تو انہیں جنت ملے گی۔[2]

☆ اس مستشرق کی معلومات کے نقص کی انتہاء ہے کہ وہ کہتا ہے کہ محمدؐ کی وفات مکہ میں ہوئی۔ اس کے الفاظ میں:

"He returned to Makkah as the Holy city and died there the following year".[3]

(1) IBID, 61-62

(2) IBID, 62

(3) IBID, 62

دوسرا باب

مستشرقین کے نزدیک قرآن مجید کے مآخذ

کیا قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی افکار وخیالات کا مجموعہ ہے؟

کیا قرآن پہلی کتابوں سے حاصل کر لیا گیا؟

پہلا حصہ: قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کے بارے میں اسلامی نقطہ نگاہ

دوسرا حصہ: مستشرقین کے اعتراضات کی وضاحت

قرآن مجید کے بارے میں مشرکین مکہ کا نقطہ نگاہ قرآن مجید کی زبانی

منزل من اللہ ہونے پر قرآن کی داخلی شہادت

قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر اس کے مضامین اور فصاحت وبلاغت کی بنیاد پر دلائل

منزل من اللہ ہونے پر قرآن کا عقلی استدلال

قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے کے انکار پر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا ردّ

قرآن مجید اور کتب سابقہ کا تعلق

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تردید خود مستشرقین کی زبانی

کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسائی راہبوں سے قرآن حاصل کیا تھا؟

مرگی وغیرہ کے اثرات کا تحقیقی جائزہ

کیا قرآن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہے؟

قرآن مجید کے کلام الٰہی نہ ہونے پر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا مزید ردّ

***

مستشرقین کے نزدیک قرآن مجید کے مآخذ

مستشرقین نے قرآن مجید کے بارے میں متفقہ طور پر یہ اندازِ فکر اختیار کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک انسانی کلام ثابت کیا جائے۔ اور جب یہ انسانی کلام ثابت ہو جائے گا تو پھر یہ بات بھی لازم آئے گی کہ جس طرح دیگر انسانی تصانیف میں نقائص پائے جاتے ہیں اسی طرح قرآن مجید بھی عیوب و نقائص سے مبرّا نہیں ہے۔

چنانچہ اہلِ مکہ ہوں یا اہلِ مغرب دونوں نے اس بات پر پورا زورِ قلم اور زورِ دلائل صرف کر دیا ہے کہ قرآن مجید انسانی کلام ہے۔ جدید مستشرقین بڑے موثر اور بظاہر منطقی انداز سے مختلف کڑیاں ملا ملا کر (بزعم خویش) دلائل کا انبار لگاتے ہیں کہ قرآن مجید حضور ﷺ کا کلام ہے۔ اپنے اس موقف کا اظہار وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ حقائق سے کماحقہ ناواقف شخص غیر شعوری طور پر ان کے نقطہ نگاہ کا حامی بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں محض مستشرقین کے زورِ بیان کی شعبدہ بازی ہیں۔

لیکن ایک بات حقیقت ہے کہ مستشرقین بھی مشرکین مکہ کی طرح قرآن کے بارے میں کوئی ایک موقف اختیار کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ قرآن مجید ہے کیا؟ مسلمانوں کے نزدیک تو اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے لیکن غیر مسلموں میں سے کسی نے اس کو شاعر کا کلام کہا تو کسی نے کاہن کی گفتگو، کسی نے ساحر کا کلام کہا تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ پہلی کتابوں سے اکٹھا کیا ہوا مواد ہے۔

کیا قرآن حضرت محمد ﷺ کے ذاتی افکار و خیالات کا مجموعہ ہے؟

اس سلسلے میں صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہو سکتا ہے کہ مستشرقین قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے تا کہ قرآن مجید کی کوئی امتیازی حیثیت ثابت نہ ہو سکے۔ بلکہ وہ اسے انسانی کلام قرار دیتے ہوئے اسے حضور ﷺ کی تصنیف کہتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی جارحانہ زبان، بیانات میں جگہ جگہ تضاد بیانی، ان کے باہمی تضادات اور عام اور سیدھی بات کو توڑ موڑ کر بیان کرنے کا قارئین کو مشاہدہ کروانے کے لئے چند مستشرقین کی عبارات نمونے کے طور پر آئندہ سطور میں پیش کی جائیں گی۔

George Sale (1697-1736) مستشرقین میں سے وہ شخص ہے جس کے ترجمے کو ہر جگہ

تحقیق کرتے ہوئے بنیادی ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس سلسلے میں لکھتا ہے:

That Muhammad was really the author and chief contriver of the Quran is beyond dispute, though it is highly probable that he had no small assistnace in his design from others [(1)]

"یہ بات کہ محمد ﷺ قرآن کے مصنف اور اصل تدبیر کنندہ تھے، اس پر تو کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بات بہت حد تک ممکن ہے کہ انہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے کسی اور سے مدد نہ لی ہو۔" [(2)]

J. L. Menezes لکھتا ہے۔

"nothing else but a pure creation and concoction of Mohammed and of his accomplice". [(3)]

"قرآن اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہ خالصتاً محمد ﷺ کا ایک منفی تدبیر کے تحت دوسروں کی مدد حاصل کر کے گھڑا ہوا کلام ہے۔"

سیل کہتا ہے کہ کسی سے مدد نہیں لی اور Menezes کہتا ہے کہ دوسروں سے مدد لی۔

G.M.Draycott لکھتا ہے:

Through it all runs the fire of his genius in the later Suras; it is the reflection of his energy that looks out from the passages. [(4)]

اس کے خیال میں گویا قرآن مجید کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کی ذہانت اور آپ کی فصاحت وبلاغت اور قوتِ بیان کا اظہار ہوتا ہے۔

---

(1) Sale, George: The Koran, Commonly called Al-Quran, with a Preliminary Discourse, P.50

(2) Khalifa, Mohammad: The sublime Quran and Orientalism, P.10

(3) Menezes, F.J.L.: The Life and Religion of Mohammed, The Prophet of Arabian Sands, P.158

(4) Draycott, G.M,Mahomet: Founder of Islam, Martin Secker, P.335

Norman Daniel(1942) نے بھی مستشرقین کا نقطہ نگاہ دہراتے ہوئے لکھا ہے:

" بہت سے لوگوں نے محمد ﷺ کو شاعر کہا ہے، بعض نے ایک مفکر یا بعض نے مرگی کا مریض یا سحر زدہ کہا ہے یا یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے کتاب لکھتے وقت یہودیوں اور عیسائیوں کا سہارا لیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ محمد ﷺ نے کتاب لکھنے کیلئے عیسائیوں اور یہودیوں کو مقرر کر رکھا تھا تاکہ وہ عام ضرورت کے مطابق قرآن کو بائبل سے ہم آہنگ کریں۔" (1)

James Norman Dalrymple Anderson(1908-1994) نے قرآن کے بارے میں کہا:

" ...the wishful thinking" (2)

یعنی " ایک مقصد و مقام حاصل کرنے کی من پسند سوچ یا اس کا ثمر۔"

ان لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کے الفاظ و خیالات، محمد ﷺ کے قلب مبارک پر موجود تھے۔ اور آپ ﷺ نے ان کا اظہار قرآن کی شکل میں کیا۔

۱۹۶۰ء کے دہائی میں Anderson(1908-1994) اور William Montgomery Watt (1909-2006) نے تو یہاں تک کہہ دیا:

that he have been mistaken in believing the Quran to be a divine "message.

"آپ کو یہ سمجھنے میں غلطی لگی کہ آپ نے (قرآن خود گھڑ لیا) اور اسے خدائی پیغام سمجھ لیا۔" (3)

وہ مزید کہتا ہے:

"What seen to a man to come from outside himself may actually come from his unconscious. (4)

---

(1) Danial, Norman, Islam and the west (The making of an Image), P.34, Oneworld, 1960

(2) Anderson, J.N.D., The World's Religions, Inter-versity press, P.78, 1976

(3) Watt, Montgomery: Mohammad at Mecca, Oxford University Press, 1953, P.15

(4) IBID

یعنی "جس چیز کو محمد ﷺ نے باہر سے آتے ہوئے محسوس کیا (کہ وحی ہے) وہ درحقیقت ان کے اپنے اندر کے خیالات اور ان کی ذاتی سوچ تھی۔"

قرآن مجید کے بارے میں پروفیسر مونٹگمری واٹ (1909-2006) لکھتے ہیں:

"---the product of creative imagination"[1]

"کہ (قرآن) تخلیقی تخیلات کی پیداوار ہے۔"

پروفیسر واٹ نے بہت تفصیل سے قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے خود بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے کہ حضور ﷺ کا دعوی نبوت خود ساختہ تھا یا آپ ﷺ پر حقیقت میں وحی نازل ہوتی تھی۔ پروفیسر موصوف نے صاف طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اہل مغرب کا یہ نظریہ معاندانہ ہے کہ آپ ﷺ (نعوذ باللہ) جھوٹے پیغمبر تھے۔ لیکن بایں ہمہ وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ قرآن خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ البتہ "وحی" کا لفظ استعمال کر کے وہ اس کا مفہوم اپنی مرضی سے متعین کرتے ہیں۔[2]

اس کے باوجود کہ پروفیسر واٹ نے قرآن مجید کو حضور ﷺ ہی کا کلام قرار دیا ہے انہوں نے مستشرقین کے اس بے بنیاد پروپیگنڈے کو رد کیا ہے جو بالعموم معاندانہ روش پر مبنی ہوتا ہے۔[3] لیکن جیسا کہ ابتدائی باب میں واضح کیا ہے کہ مستشرقین کا یہ عام فن اور انداز ہے کہ وہ ہر جگہ کوئی نئی بات اور تشکیک کا نیا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں۔ مونٹگمری واٹ (1909-2006) نے جہاں بڑے غیر متعصبانہ انداز میں "مرگی" وغیرہ کے الزام کو بے بنیاد قرار دیا ہے تو ساتھ ہی اپنی علمی دیانت کی دھاک کی آڑ میں نئے نئے الزامات عائد کیے ہیں۔[4]

Montgomery Watt (1909-2006) لکھتے ہیں:

More particularly there were times when he found in his heart certain words, constituting shorter or longer

---

(1) IBID

(2) IBID

(3) IBID

(4) IBID

passages...(1)

"خاص طور پر کئی ایسے اوقات ہوتے جب آپ ﷺ کے دل میں کچھ الفاظ آتے جن سے آپ یہ چھوٹی بڑی عبارت بنالیتے۔"

Richard Bell (1876-1952) لکھتے ہیں:

Only in a very few passage does Mohammad speakes in His own person, in xxii 93 ff. We must therefore be chary of asuming that passages in Quran are in Mohammad's own words. (2)

"صرف چند فقروں (آیات) میں محمد ﷺ اپنے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس سلسلے میں محتاط انداز ہی اختیار کرنا چاہیے کہ قرآن محمد ﷺ کے اپنے الفاظ میں ہے۔"

J.W. Stobart اپنی کتاب (Islam and its Founder) میں اسی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ قرآن مجید حضور ﷺ کا کلام ہے۔(3) Richard Bell (1876-1952) نے اپنی دوسری کتاب (The Origion of Islam in its Christian Environment) میں اس پہلو پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔(4)

راڈویل (J.M.Rodwell) (1808-1900) اور آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) (1892-1959) کہتے ہیں(5) کہ آزادانہ تنقید کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ﷺ عمر بھر وہ مواد اکٹھا کرتے رہے پھر اس پر نظر ثانی کر کے اس کی اصلاح کرتے رہے جسے آپ ﷺ کتاب کی شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔(6)

---

(1) IBID P.143

(2) Bell, Richard, The Origin of Islam in its Christian Environment, P.43

(3) Stobart, J.W., Islam and its founder, P.108

(4) Bell, Richard ,The origin of Islam in its Christan Environment, P.110-112

(5) Rodwell, J.M., The Koran, P.47, BiblioLife, 2016

(6) Jeffery, Arthur: Material for the History of the Text of the Quran, P.i,ii, Leiden E.J. Brill, 1937

کیا قرآن پہلی کتابوں سے حاصل کر لیا گیا؟

James Kritzeck (1930-2016) نے Peter The Venerable کی کتب کے تراجم انگریزی زبان میں کیے ہیں۔ ان کے مجموعے کو کتابی شکل دی گئی ہے۔ James Krinzeck لکھتا ہے:

Peter the venrable rejected Muhammad's Prophethood and asserted that the Koran has sources.[1]

"پیٹر وینی ریبل محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کرتا ہے اس نے اس پر زور دیا ہے کہ قرآن حاصل کرنے کے کچھ ذرائع تھے" وہ انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بحیرہ راہب نے آپ کو عہد نامہ قدیم و جدید پڑھا دیئے۔

اپنی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"سرجیس جو نسطوری مذہب کا راہب تھا اور جسے چرچ سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کی ملاقات اس پیغمبر سے ہوئی۔ اس نے آپ کو اپنے انداز کے مطابق عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی تعلیم دی، اس سے محمد ﷺ پر نسطوری اثرات مرتب ہوئے اس نے ہی عیسائیت کی بگڑی ہوئی تعلیمات پر مبنی کتابوں کی کمزوریوں سے آگاہ کیا اور اس طرح محمد ﷺ کو مکمل نسطوری بنا دیا۔"[2]

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اس Serguis راہب کے بارے میں کئی ایک قصے بیان کئے جاتے ہیں۔

---

(1) Kritzeck, James(ED): Peter the Venerable and Islam, P.129

(2) IBID

اس کے خیالات کی شدت جاننے کے لئے اس کے اپنے الفاظ ملاحظہ کریں۔

Satan gave success to the errors and sent the monk Serguis a follower of the heretical Nestorius who had been expelled from the church across to those regions of Arabia, he joined the heretical monk with the pseudo prophet. And so sergius joined with Mohammad, filled in what was lacking to Him and explaining Him also the sacred scriptures both the old Testament and the New (In part) according to the thinking of his master Nestor, who denied that our savious was God and inpart according to his own interpretation and likewise completely infecting him with the fales of the apocryphal writings he made him a Nestorian Christian.

ان واقعات کی اصل تو اسلامی کتب میں بھی موجود ہے اور اسے ایک خاص شکل عیسائیوں نے دی۔[1]

یہ مصنف مزید لکھتا ہے کہ عیسائی راہب سے ملاقات کا واقعہ یہ ہے کہ جب محمد ﷺ کی عمر بارہ برس کی تھی تو آپ ﷺ نے اپنے چچا کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران ایک بحیرہ راہب نامی شخص نے ایک قافلے کو دیکھا جس کے اوپر بادلوں نے سایہ کر رکھا تھا۔۔۔ بحیرہ نے قافلے والوں سے کہا کہ یہی آنے والے پیغمبر ہیں۔[2] اس نوعیت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ورقہ بن نوفل جو 'حنفاء' میں سے تھے، ان سے بھی محمد ﷺ نے ملاقات کی تھی اور ان کی اس وحی کی صداقت کی تائید کی تھی۔ اس طرح کا ایک واقعہ یہ ہے جو بخاری شریف میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک عیسائی شخص محمد ﷺ کیلئے قرآن لکھایا کرتا تھا۔ وہ شخص عیسائیت کی طرف لوٹ گیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ محمد ﷺ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوائے اس کے جو میں انہیں لکھ کر دیتا ہوں۔[3]

Peter کی کتاب کا مترجم James Kritzeck (1930-2016) لکھتا ہے کہ دیگر مآخذ میں اس راہب کو Nestorian, Arian, Nicholaite قرار دیا گیا ہے اگرچہ اس کو بعض جگہ Sergius اور بعض جگہ Nicholas یا بے نام کہا گیا ہے۔[4]

اسی بنیاد پر Peter کہتا ہے:

> "جدید محققین کا رجحان یہ ہے کہ محمد ﷺ پر عیسائیت کے اثرات کو کم سے کم کر کے دکھایا جائے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پیغام میں نسطورین Nestorian اثرات کا پتہ چلتا ہے۔"[5]

یہ سارا کچھ کہنے کے بعد وہ یہ لکھتا ہے:

> To say that Mohammad actually became a Nestorian however is to press the matter entirely too far.[6]

---

(1) IBID

(2) IBID, P.129-130

(3) IBID, P.130

(4) IBID

(5) IBID

(6) IBID, P.130,131

اس شخص نے قرآن پر کتب سابقہ کے اثرات ثابت کرنے کیلئے کچھ واقعات و امثال پیش کی ہیں جو قرآن اور کتب سابقہ دونوں میں پائی جاتی ہیں ان میں مٹی سے پرندے بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

The evidence for abundent and far-reaching Jewish influences on early Islam is overwhelming ..(1)

"اسلام پر یہودیت کے بکثرت اور غالب اثرات کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔"

Peter ایک طرف تو راہب کو قرآن کا منبع قرار دیتا ہے اور دوسری طرف قرآن کو یہودی بدعتیوں اور ناقابلِ اعتبار کتابوں سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> Thus Mohammad instructed by the best Jewish and heretical doctors, produced his Koran and move together in that barbarous fashion of his a diabolical scripture, put together both from Jewish fables and trifling songs of heretics. Lying that this collection was brought to him chapter by chapter by gabriel, whose name he already knew from sacred scripture, he poisoned with a deadly poison the people that did not know God and in the manner of such [poisoners] coating the rim of the golet with honey and letting the death dealing poison follow afterwards, he destroyed, also the souls and bodies of the wretched people.(2)

اسی کتاب کے صفحہ 132 پر اس نے انتہائی جارحانہ اور غیر اخلاقی انداز سے لکھا ہے کہ "محمد ﷺ نے بہترین یہودی انسٹرکٹرز اور منحرف مذہبی لوگوں کی زیر نگرانی اپنا کلام بڑے غیر مہذب انداز سے پیش کیا۔" (اس جگہ وہ قرآن کے لئے Diabolical Scripture کے الفاظ اور قرآن کے اسلوب کے لئے Barbarous fashion کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔) اس کے بعد اسی عبارت میں وہ لکھتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو جو بالکل جاہل اور خستہ حال تھے، ان کے جسموں اور

---

(1) IBID, P.131,132

(2) IBID P.132

روحوں کو زہر آلود کر دیا۔ وہ قرآن کو بھی زہر قرار دیتا ہے۔

James Kritzeck (1930-2016) نے Peter کا نقطہ نگاہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قرآن مجید کے ماخذ کا کھوج لگانا خاصا پیچیدہ کام ہے۔ بائبل کی بہت سی باتیں قرآن مجید میں شامل ہیں۔ اور انہیں آسانی سے قرآن مجید میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بائبل کی یہ باتیں کبھی من و عن لے لی گئی ہیں اور کبھی ان کو بائبل سے قدرے مختلف بنا کر پیش کیا گیا ہے، کبھی ان میں تحریف کی جاتی ہے۔ بعض اوقات تاریخ عرب سے بھی مدد لی گئی ہے۔"[1]

Richard Bell (1876-1952) نے کسی ایک رائے پر اکتفا نہیں کیا۔ کبھی وہ قرآن کو شاعر کا کلام کہتا ہے تو کبھی کہہ دیتا ہے کہ حضور ﷺ نے آدمی مقرر کر رکھے تھے جو آپ ﷺ کو اطلاعات فراہم کرتے تھے۔ گذشتہ سطور میں اس کے جن خیالات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ اس کے مزید اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں اس کے نظریات کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتا ہے:

> They point rather to his having made enquiries of people who happened to be available and were likely to have information to give. In fact the whole choice of material is much as to suggest that it came from memories of men and was communicated to him orally.[2]

> "بلکہ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے بندے متعین کر رکھے تھے جو ہمہ وقت میسر ہوتے تھے اور ان کے پاس محمد ﷺ کو دینے کے لئے کوئی خبر (قرآن کے لئے مواد) موجود ہوتی تھی۔ حقیقت میں ان لوگوں سے حاصل شدہ مواد کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں (جو انہوں نے متعین کر رکھے تھے) کے حافظوں سے ہی حاصل ہوا اور یہ زبانی طور پر ہی محمد ﷺ تک پہنچایا گیا۔"

راڈویل کے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ قرآن یہودی اور عیسائی ماخذ سے حاصل کر لیا گیا۔[3]

---

(1) IBID

(2) Bell, Richard, The origion of Islam in its Christian environment, p 110-112

(3) Margoliouth, D. S., Preface of Translation of the Koran by Rodwell, p.ii

Samuel Marinus Zwemer (1867-1952) لکھتا ہے کہ حضور ﷺ کے کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے جو اہلِ کتاب میں سے تھے۔ آپ ﷺ ان سے پہلی کتابوں کا علم سیکھا کرتے تھے۔[1] Menezes[2] اور William Henry Temple Gairdner (1873-1928)[3] نے حضور ﷺ کے ایک نئے استاد کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک کتاب لکھنے میں محمد ﷺ کی مدد کی تھی۔ سلمان پہلے مجوسی تھے، پھر عیسائیت قبول کی، شام سے مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔

اس سلسلے میں اینڈرسن Anderson (1908-1994)[4]، مارگولیتھ Margoliouth (1858-1940) DR.David Samuel[5] اور رابرٹس R.Roberts[6] کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

مستشرق Tor Anderea (1885-1947) نے Savary کا نقطہ نگاہ اپنی کتاب Mohammad-The Man and his Faith میں بیان کیا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے سفروں کے دوران محسوس کیا کہ کس طرح عیسائی فرقے باہم ایک دوسرے پر طعن کرتے ہیں اور یہودی کس طرح اپنے قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان سابقہ مذاہب کا جائزہ لینے کے بعد محمد ﷺ نے فیصلہ کیا کہ ایک نیا مذہب جاری کیا جائے۔۔۔ اس مذہب کو قابلِ قبول بنانے کیلئے انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ انہیں یہ راہنمائی خدا تعالیٰ کی طرف سے مل رہی ہے اور انہیں Divine Authority حاصل ہے۔ یہ مستشرق لکھتا ہے کہ Savary اسے ایک Pious Fraud قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہودی و عیسائی نظامِ اخلاق کو اپنایا۔ Tor Andrea (1885-1947) اپنے آپ کو اگرچہ معتدل شخص ظاہر کرتا ہے لیکن وہ مذکورہ بالا خیالات کا اظہار کرنے والے شخص Savary کے بارے میں کہتا ہے کہ اس نے بجا طور پر محمد ﷺ کو پیغمبر

---

(1) Zwemer, S.M،The Moslem Christ Oliphant, P.12

(2) Menezes, F.J.L,The Life and Religion of Mohammad, The Prophet of Arabian Sands, P.161

(3) Gairdner, W.: The Reproach of Islam, P.279

(4) Anderson,J.N.D.,The World's Religions, P.58,1975

(5) Margoliuth, D.S.: The Early Development of Mohammadanism, P.42

(6) R.RobertsP.40

تسلیم نہیں کیا۔[1]

Rodwell (1808-1900) نے بھی یہی نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید اور اسلام کا پس منظر اس کے نزدیک بعینہ وہی ہے جو Savary نے بیان کیا ہے۔ Rod Well کے افکار میں ایک تضاد صاف نظر آتا ہے۔ وہ حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور بھی نظر آتا ہے اور مخالفت کا طوفان بھی اس میں صاف نظر آتا ہے۔ اس نے قرآن مجید کو حضور ﷺ کا کلام قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آپ ﷺ کو پیش آنے والے حالات کے ساتھ ساتھ قرآن کے اسلوب میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی۔

Rodwell (1808-1900) کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے جن مآخذ سے قرآن حاصل کیا وہ زیادہ تر ان کے زمانے میں مشہور قصے کہانیاں ہیں۔ یہود کی تالمود ان کا خاص ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ عیسائیوں کی روایات کو غلط طور پر استعمال کر کے اور جنوبی شام کے قصّے کہانیوں کو بنیاد بناتے ہوئے آپ ﷺ نے قرآن گھڑ لیا۔ وہ اس بات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ مکہ میں لوگ آپ ﷺ کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ آپ ﷺ ایک شاعر ہیں۔ قرآن افسانوں کا مجموعہ ہے۔ وہ واضح جادو ہے۔ اور یہ کہ آپ ﷺ نے مختلف واقعات کو جمع کر لیا اور آپ ﷺ نے غیر ملکی اس مقصد کے لیے متعین کر رکھے تھے۔[2]

Rodwell (1808-1900) لکھتا ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک سلمان فارسی تھے جن کے ذمے آپ ﷺ نے یہ کام لگایا تھا کہ وہ ژند اوستا کی روشنی میں جنت اور دوزخ کا نقشہ تیار کریں اور دوسرا شخص Serguis (مسلمانوں کی روایت کے مطابق بحیرہ) تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ محمد ﷺ نے مکہ میں کچھ لوگوں کو شہری حقوق عطا کئے تھے اور یہ لوگ Apocryphal Gospels کی تعلیمات سے آگاہ تھے اور ان کے ذریعے آپ ﷺ نے ان کتابوں کا علم حاصل کیا۔ Rodwell(1808-1900) کہتا ہے کہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ، ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل اور آپ ﷺ کے قریبی دوست عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں سے واقف تھے۔

اس کا خیال ہے کہ مکہ کے ارد گرد عیسائی رہتے تھے بلکہ آپ ﷺ نے اپنے چچا کے ساتھ بصرہ کے سفر کیے۔ وہاں آپ ﷺ کو عیسائیوں کی تعلیمات کے مطالعے کا موقع ملا ہوگا۔ ان کی عبادات کے طریقوں سے واقفیت حاصل کی ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کے آغاز میں مکہ میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں سے نفرت کرتے تھے اور کسی بہتر راہ کی تلاش میں تھے۔

---

(1) Tor Andera: Muhammad, Man and His Faith, P.174

(2) Rodwell, J.M.: The Koran, P.14,15

آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بارہ ایسے لوگ تھے جو اسلام سے قبل 'حنفاء' میں شامل تھے ان لوگوں کے پاس نازل شدہ صحف موجود تھے اور سورۃ (IXXX VII:19) میں ان صحف کا ذکر ملتا ہے۔

راڈویل کے خیال کے مطابق یہ کتب محمد ﷺ نے ان 'حنفاء' سے حاصل کر لیں۔ اور ان سے پہلی امتوں کے حالات نقل کر دیے۔ وہ اس کو محمد ﷺ کی جعل سازی (Forgery) قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کے چوتھے سال کے بعد اس کا ذکر نہیں ملتا اور آپ ﷺ نے حنیفی کی بجائے مسلم کا لفظ اپنے لئے اپنالیا۔

Rodwell (1808-1900) کہتا ہے کہ ورقہ بن نوفل اس وقت تک محمد ﷺ کے ساتھ رہا جب تک آپ ﷺ اپنے آپ کو حنیفی کہتے رہے لیکن جب انہوں نے اس راہ کو چھوڑ دیا تو ورقہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی کے طور پر مرا۔[1] (حالانکہ ورقہ بن نوفل تو آغاز اسلام ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ تاریخ کی تمام معتبر کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے اعلان نبوت سے بہت قبل پہلی وحی کے تھوڑا عرصہ بعد فوت ہو گئے تھے۔)

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے Gnosticism سے بھی استفادہ کیا۔ اور مذہب کو گروہوں میں تقسیم کرنے کی بات آپ ﷺ نے وہیں سے اخذ کی۔ Gnosticism کے فرقے مر رہے تھے۔ اس طرح محمد ﷺ نے موقع غنیمت جانا کہ مرتے ہوئے فرقوں کی تعلیمات سے استفادہ کر لیں۔ کیونکہ یہ فرقے لوگوں میں معروف نہ تھے لہٰذا ان سے استفادہ کرتے ہوئے یہ امکان نہ تھا کہ کسی کو پتہ چلتا۔

پھر وہ لکھتا ہے: "یہ بات بالکل واضح ہے کہ محمد ﷺ نے لاتعداد پہلوؤں پر پہلی کتابوں سے بہت کچھ لیا۔"[2] وہ کچھ واقعات اور تعلیمات میں مماثلت کی بنیاد پر قرآن کو پہلی کتابوں سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ وہ قرآنی آیات کے حوالے بھی دیتا ہے۔ اس کے خیال میں لوگوں کے اسلام کی طرف زیادہ مائل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کا تعلق قدیم تہذیبوں سے تھا۔[3] یہ کتب حضور ﷺ کو کس طرح میسر ہوئیں؟ اس سلسلے میں وہ "ممکن ہے" کے الفاظ کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ حضرت خدیجہؓ یا ورقہ بن نوفل کے ذریعے آپ ﷺ کو مہیا ہو گئی ہوں۔ پھر ان سے جو کچھ حاصل ہوا اسے کچھ ترمیم کے ساتھ پیش کر دیا۔[4] اس نے

---

(1) IBID, P.8-10

(2) IBID, P.10

(3) IBID,P.10

(4) IBID,P.10

مختلف کڑیاں ملا کر قرآن پر کتبِ سابقہ کے اثرات کو ثابت کیا ہے اور کہتا ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ محمد ﷺ کے تعلقات یہودیوں کیساتھ بہت قریبی تھے اور آپ ﷺ کہا کرتے تھے کہ میں ان کو اس طرح جانتا ہوں جیسے اپنے بیٹوں کو۔ (حالانکہ نبی کریم ﷺ کا کوئی بیان کہیں بھی منقول نہیں ہے۔ اس کی بجائے قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ یہودی قرآن کو اللہ کے کلام کے طور پر اور نبی کریم ﷺ کو سچے نبی کے طور پر ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو۔ (البقرۃ146، الانعام21) وہ کہتا ہے کہ ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ محمد ﷺ نے ان سے کس طرح استفادہ کر لیا۔[1] یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ مستشرقین اتنے اہم اور نازک موضوع پر اپنا موقف اور دلائل پیش کرتے ہوئے ''ممکن ہے ایسا ہوا ہو گا۔'' جیسے الفاظ استعمال کریں اور یہ کہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ محمد ﷺ نے کس طرح یہودیوں سے قرآن حاصل کر لیا، اسی طرح کی باتیں تو کسی عام سے نقطہ نگاہ کے لئے بھی قابل اعتماد استدلال نہیں بن سکتیں۔ چہ جائیکہ مسلمانوں کے ایک ایسے نقطہ نگاہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور جس کی تائید میں قرآنی، واقعاتی، منطقی اور تاریخی شواہد موجود ہیں، کے مد مقابل پیش کی جائیں۔

راڈویل کہتا ہے کہ محمد ﷺ جو حاصل کرتے تھے اسے خوبصورت بنا کر وہ خود اپنے ہی لفظوں میں قرآن کی شکل دے دیتے تھے۔

راڈویل نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے ''کہ قرآن مجید، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آنے والی زیادتیوں، آپ کے ذہنی دباؤ اور پریشانیوں کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ ان لوگوں کے قریب دکھائی دیتا ہے جو قرآن کو مرگی کے دورے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔''[2]

راڈویل، چونکہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے خیالات کو لوگوں نے عموماً اختیار کیا ہے لہٰذا اسی مناسبت سے اس کے خیالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ John Bagot اپنی کتاب Life and Times of Muhammad میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> To the impartial observer, the deduction would possibly be that he had heard these stories from Jews and Christians but had failed to memories all the details correctly, In view of the fact that Muslims insist that the apostle of god could not

---

(1) IBID

(2) IBID

read or write this is not surprising.[1]

ایک غیر جانبدار تبصرہ نگار کے نزدیک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہودی اور عیسائی ماخذ سے جو کچھ حاصل کیا آپ اسے صحیح طور پر یاد نہ رکھ سکے (اس طرح ان چیزوں کو آگے اور انداز سے بیان کر دیا۔) اس بات کو اگر اس حقیقت کی روشنی میں دیکھیں کہ مسلمان اس بات پر مصر ہیں کہ پیغمبر ﷺ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے، یہ بات تعجب انگیز نہیں ہے۔

Michael Cook لکھتا ہے کہ محمد ﷺ اکثر و بیشتر تجارت کے قافلوں کے ساتھ جایا کرتے تھے:

> We might like to think of Muhammad as well travelled merchant acquanted with the same foms of the monotheists tradition as are familiar to us. or We might think of him as a man of more local horizons who was in contact with some arabians by ways of monotheism. .... The first view makes him a man of considerable doctrinal originality whereas on the second view he might have found much that to us is distinctively Islamic already present in his Arabian environment.[2]

"ہم محمد ﷺ کے بارے میں خیال کر سکتے ہیں کہ وہ تجارتی سفر کرنے والے شخص ہیں اور وحدانیت کی ان روایات کو اسی طرح جانتے تھے جیسے ہم ان سے مانوس اور واقف ہیں یا ہم ان کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ ایسے شخص ہیں جو صرف مقامی سطح کی حد تک معلومات رکھنے والے تھے اور ان کا عربوں کے ساتھ رابطہ تھا جو عربوں کی توحیدی روایات کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ پہلا نقطہ نگاہ آپ کو ایک ایسا شخص بنا دیتا ہے جن کے نظریات کی ایک بنیاد تھی یعنی انہوں نے عقائد کی خاصی بنیادیں ان تجارتی

---

(1) Bagot, Glubee, John,The Life and times of Muhammad,Cooper Square Press, P.116,1998

(2) Cook, Michael: Muhammad,Oxford University Press, P.77,1983

سفروں میں راہبوں سے حاصل کیں اور اگر دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو عرب کے ماحول میں پہلے سے موجود مواد سے انہوں نے خاصا کچھ حاصل کیا۔"

وہ قرآن مجید پر بائبل کے اثرات کے بارے میں لکھتا ہے:

As might be expected, Jewish influence is prominant. It can for example be seen in the way in which Biblical narratives in the Koran.(1)

"جیسا کہ اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ قرآن میں یہودی اثرات نمایاں ہیں اس کی مثالیں قرآن میں دیکھی جا سکتی ہیں کہ قرآن میں بائبل کے بیانات پائے جاتے ہیں۔"

اس مستشرق نے بھی قرآن اور بائبل کی کچھ اصطلاحات اور واقعات میں مماثلت کی بنیاد پر یہی کہا ہے کہ قرآن مجید پر بائبل کے اثرات بہت گہرے ہیں۔(2)

J.W. Stobart لکھتا ہے:

It could have been written by any Arab who is acquainted with general outline of the Jewish history and of the traditions of his own country and possessed of some poetic fire and fancy.(3)

"یہ (قرآن) ایک ایسا عرب بھی لکھ سکتا تھا جو یہودیت کی تاریخ، اپنے ملک کی روایات اور شاعری کی کچھ باتیں جانتا ہو۔"

Richard Bell (1876-1952) اس سلسلے میں نئے نئے شبہات پیدا کرتے ہوئے لکھتا ہے:

----of any intimate knowledge for the prophet of either these two religions or the Bible itself there is no convincing evidence. The Surah Al-Ikhlas of the Quran is sometimes qcuted an early rejection of one of the cardinal doctrines of

---

(1) IBID

(2) IBID

(3) Stobart, J.W.: Islam and its founder, P.113, New Delhi : B. S. Uppal, 1989

Christianity.[1]

ان دونوں مذاہب یا بائبل سے معلومات حاصل کرنے کے بارے میں کوئی بھی معتبر شہادت میسر نہیں ہے۔ بعض اوقات قرآن مجید کی سورۃ الاخلاص کو ابتدائی دور میں عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کے ردّ میں پیش کیا گیا۔

Bell کے اس نظریے کی تائید (1998-1920) Dr.Maurice Bucaille نے اپنی کتاب The Bible, The Quran and Science میں کی ہے۔ ڈاکٹر مذکور نے بہت سے دلائل اپنے اس نظریے کی تائید میں پیش کیے ہیں۔[2]

Richard Bell (1952-1876) اس سلسلے میں لکھتا ہے:

Mohammad was consciously producing a revelation similar to the revelation in the hands of previous monothiests. It is possible that he may have tried to imitate some of the writings in which these scrptures existed. In fact, in some of these combinations of letters it seems possible to see words written in Syriac or Hebrew which have been afterwards read as Arabic.[3]

"محمد ﷺ شعوری طور پر اسی طرح کی وحی پیش کر رہے تھے جیسی کہ قدیم موحّدین کے ہاں پائی جاتی تھی یہ ممکن ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہو گی۔ وہ حروف مقطعات کے بارے میں کہتا ہے کہ ان الفاظ (حروفِ مقطعات) کی ساخت سریانی اور عبرانی طرز پر تھی جو عربی میں پڑھے جانے لگے۔"

---

(1) Bell, Richard, Introduction to The Quran, p.113, Edinburgh University Press 22 Gorege Square, Edinburgh, 1970.

(2) Bucaille, M.: The Bible, The Quran and Science, P.205, Adam Publishers and distributors, 2003

(3) Bell, Richard, The Origin of Islam in its Christian Environment, Routledg, New York, P.139, 2012

گویا حروف مقطعات بھی اصلاً سریانی یا عبرانی حروف ہیں۔

اسی مستشرق نے مزید لکھا ہے:

"ایک اور سلسلہ جس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کہ جہاں سے محمد ﷺ نے قرآن اخذ کر لیا وہ "مانی" کا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کا منبع تو غیر واضح ہے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مانی یا مانک ہوگا جو 216 عیسوی میں پیدا ہوا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسے خدائی پیغام موصول ہوتا ہے اور اس کا ایک مذہبی مشن ہے۔"(1)

وہ مزید لکھتا ہے:

"ان شواہد سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کے پاس یہودی اور عیسائی ذرائع سے مواد میسر ہوا ہو۔ تالمود سے حاصل ہونے والے اس قدر مواد کی موجودگی میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ یہود کے ساتھ رابطے میں تھے۔"(2) یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ رچرڈ بل کسی واضح فیصلہ تک نہیں پہنچا۔

History of Religions کے مصنف (1851-1931) George Foot Moore نے اپنی کتاب کے سولھویں باب میں جس کا عنوان Mohammad ہے، اس میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ نے سب کچھ عیسائیت یا یہودیت سے حاصل کیا۔ حضور ﷺ کی سیرت کے حالات بیان کرتے وقت اس نے اختصار ہی سے کام لیا ہے لیکن صرف وہی واقعات بیان کئے ہیں جن سے ثابت کیا جاسکے کہ حضور ﷺ کے یہود و نصاریٰ کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ G.F. Moore لکھتا ہے:

"جونہی آپ ﷺ جوان ہوئے وہ مکہ کے قافلوں کے ساتھ شام اور یمن کے سفروں میں شریک ہوگئے اور اونٹوں کی پشت پر کچھ لاد کر لاتے پائے گئے۔"(3)

G.F.Moore نے مندرجہ ذیل مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ ﷺ یہود و نصاریٰ سے متاثر تھے:

1. غارِ حرا میں جا کر آپ ﷺ عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ عیسائیت میں ہے اور عرب سوسائٹی میں موجود

---

(1) IBID, P.145

(2) IBID

(3) Moore, G.F.: History of Religion, P.386, New york, Macmillan

نہیں ہے۔(1)

2. عقیدہ آخرت آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ سے اخذ کیا۔(2)

3. زید ابن ثابتؓ کو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے شام سے لائے تھے۔ وہ ایسے علاقے اور قبیلے سے آئے تھے (یعنی بنو کلب کے دومتہ الجندل) جس کا یہودیت اور عیسائیت سے بڑا پرانا تعلق تھا۔(3)

اس کے علاوہ تصورِ اللہ، لفظِ رحمٰن، شیطان یا ابلیس کے الفاظ سے بھی اس نے استدلال کیا ہے کہ یہ تمام الفاظ یہودیت اور عیسائیت سے آئے ہیں۔(4) وہ لکھتا ہے:

"اس تاثر کی تصدیق کا اس سے مضبوط ثبوت کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ دو عظیم مذاہب کے افکار اور کتاب نے محمد ﷺ (رسول امی) پر اثرات مرتب کئے۔" (5)

اس سلسلے میں Reynold Alleyne Nicholson (1868-1945) لکھتا ہے:

His journies with trading carvans of Makkah afforded oppertunities for conversatations with Jews and Christians of which the Quran preserved the results.(6)

"مکہ کے تجارتی قافلوں کے ساتھ تجارتی سفروں نے آپ ﷺ کو مواقع فراہم کر دئے کہ آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ گفتگو کریں ان گفتگوؤں کے اثرات قرآن میں محفوظ (چھپے ہوئے) ہیں۔"

مستشرق Basanta انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار کا ہم خیال ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں بائبل کے واقعات نقل کر دئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ نے بائبل کے متعلق معلومات زبانی حاصل کیں۔ لہٰذا واقعات کو سمجھنے میں انہیں غلطی لگ گئی۔ اس نے بھی وہی مثال پیش کی ہے جو مذکورہ بالا انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے کی ہے۔

---

(1) IBID

(2) IBID

(3) IBID, P.391

(4) IBID, P.395

(5) IBID, P.397

(6) Nicholson, R.A.Literary History of the Arabs, P.ix, T.Fisher Unwin 1907

لیکن ساتھ ہی Basanta کہتا ہے کہ اس وقت تک بائبل اور Apocryphal Gospels کا عربی ترجمہ عرب میں موجود نہیں تھا۔ ان کا عربی ترجمہ ۹۰۰ء میں ہوا۔ اس کا خیال یہ ہے کہ بائبل کے یہ واقعات آپ ﷺ نے سن سنا کر لکھ لیئے۔ اسی لئے اکثر اوقات غلط فہمی کی وجہ سے اور بعض اوقات حافظے کی غلطیوں کی وجہ سے آپ ﷺ سے سہو ہو گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ پیش کرتا ہے کہ آپ ﷺ چھٹی سورت میں کہتے ہیں کہ مجھ سے قبل چھ پیغمبر گزرے ہیں جبکہ گیارھویں سورت میں ان میں ایک اور یعنی ابراہیم علیہ السلام کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے کئی ایک رسوم کا ذکر کیا ہے جو یہودیت اور اسلام میں یکساں ہیں۔ گویا اسلام نے یہ سب کچھ یہودیت سے حاصل کر لیا۔[1] شہاب ثاقب میں مولانا عبدالحق حقانی (1052ھ) نے مستشرقین کا جو موقف نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

1. محمد ﷺ نے یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں سے مذہب کا مادّہ اور مواد حاصل کر لیا۔
2. چند قصص کو بار بار بیان کیا گیا ہے ان کے بیان میں توراۃ وغیرہ کی مخالفت کی گئی ہے۔
3. مضامینِ قرآن میں تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کے خلاف باتیں کی گئی ہیں۔
4. ایسے مضامین بھی ہیں جن میں خدا تعالیٰ کے تقدس پر حرف آتا ہے۔[2]

Encyclopaedia Britanica کے مقالہ نگار نے بھی اس سلسلے میں یہی روش اختیار کی ہے کہ قرآن مجید یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے نقل کر لیا گیا۔ وہ حضور ﷺ کے اُمّی ہونے کی بنیاد پر کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے صرف زبانی ہی لوگوں سے معلومات حاصل کر لیں۔ زبانی واقعات سننے کی وجہ سے واقعات ماضی کے بارے میں انہیں عام طور پر غلط فہمی (Misconception) ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کچھ مثالیں دی ہیں کہ ماضی کے واقعات و شخصیات کے تعیّن میں آپ ﷺ کو غلطی لگ گئی ہے۔ مقالہ نگار نے یہ بات قرآن مجید کے ایک نقص کے طور پر بیان کی ہے کہ اس میں تاریخی غلطیاں کی گئی ہیں۔ ان مثالوں میں اس نے مندرجہ ذیل کا ذکر کیا ہے:

1۔ ہامان کو فرعون کا وزیر بتایا گیا ہے حالانکہ وہ ازارس کا وزیر تھا۔

2۔ مریم کو جو موسیٰ کی بہن تھیں عیسیٰؑ کی ماں قرار دیا ہے۔

وہ بیان کرتا ہے کہ قرآن مجید کی زبان اور اسلوب سے بھی شواہد ملتے ہیں کہ محمّد ﷺ نسطوری چرچ کے مرہون منت تھے۔ عہد نامہ قدیم اور قرآن میں مماثلت موجود ہے۔ اس نے ذوالقرنین کے واقعے

---

(1) Basanta, Coomer Bose: Mohammadanism, P.15,16

(2) حقانی، عبدالحق: البیان فی علوم القرآن، دار الاشاعت، دہلی، ۱۹۳۲ء، ص ۶۸

کے بارے میں یہی کہا ہے کہ ساتویں صدی کے شام کے نسطوری نسخوں میں اس کا ذکر موجود تھا۔ اس کے علاوہ دیگر قوموں کے حالات مثلاً صالح اور ھود وغیرہ بھی کتبِ سابقہ سے لیے گئے ہیں۔ مقالہ نگار نے عہد نامہ قدیم اور قرآن کی مماثلت کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔(1)

مستشرق Anderson(1908-1994) بھی انہی لوگوں میں سے ہے جو قرآن کو یہودی اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> The long rambling accounts of Jewish patriarchs and prophets (in the Quran) correspond in so much detail with the Talmud that of their essentially jewadish origion there can be no doubt.(2)

یہودی سرداروں اور پیغمبروں کی بے ترتیب اور بے ربط باتوں اور قرآن کے انداز کی تالمود کے انداز سے اس حد تک مماثلت ہے کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا کہ قرآن کی اصل یہودی کتب ہی ہیں۔

مستشرقین میں سے اگرچہ ایک غالب اکثریت نے قرآن مجید کے بارے میں یہی رویّہ اختیار کیا ہے کہ یہ پہلی کتب سے نقل شدہ ہے۔ خواہ اسے نقل کر لیا گیا یا لوگوں سے واقعات سننے کے بعد انہیں لکھوا لیا گیا اور اس کا نام قرآن رکھ لیا گیا۔

کیا قرآن شاعروں اور کاہنوں کی نقل ہے:

اس کے علاوہ کئی ایک معروف مستشرقین اس طرف بھی گئے ہیں کہ قرآن مجید ایک شاعر کا کلام ہے اور اس میں عربی شاعری کی نقل اتاری گئی ہے۔

نکلسن Nicholson(1868-1945) اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

> Thus as regard its external features, the style of the Koran is moddled upon the saja or rhymed prose of pagan soothsayers but with such freedom that it may be

(1) Encyclopaedia Britannica,P.xiii/13

(2) Anderson,J.N.D.: The World Religions, P.57

described as original.(1)

”قرآن کے ظاہری خصائص کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ کفار کے کاہنوں کی مسجع اور قافیہ والی نثر کی طرز پر ہے لیکن یہ اسلوب اس آزادانہ طور پر اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن کا اسلوب بالکل اصلی لگتا ہے کسی کی نقل محسوس نہیں ہوتا۔“

نکلسن Nicholson(1868-1945) عرب کے شعراء کا ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتا ہے:

Mohammad was not of these although he was it unlike them as he pretended.(2)

”محمد ﷺ ان شعراء کی طرح نہ تھے اگرچہ وہ انہی میں سے تھے لیکن انہوں نے ظاہر کیا کہ وہ ایسے نہیں ہیں۔“

نکلسن Nicholson(1868-1945) ایک ایسی بات کرتا ہے جس کی کوئی بھی تاریخی روایت تائید نہیں کرتی بلکہ روایات کا تواتر کو پہنچتا ہوا سلسلہ اس کے بالکل برعکس خبر دیتا ہے۔ وہ بے بنیاد بات کرتا ہے جب یہ کہتا ہے:

It will not appear surprising that Mohammad at first believed himself to be possesed like a poet or sooth sayers. (3)

”یہ بات حیران کن نہ ہو گی کہ محمد ﷺ آغاز میں اپنے آپ کو کسی جن کی روح کے زیر اثر (ساحر) سمجھتے رہے جیسا کہ شاعر اور کاہن ہوتے ہیں۔“

Richard Bell (1876–1952) نے بھی بات تو یہی کی ہے لیکن کچھ تکلّف کرتے ہوئے لکھا ہے:

----but not of the ordinary Arab type because his theme of religion and rightenousness were hardly touched by other

---

(1) Nicholson, R.A,Literary History of the Arabs, P.159,1907

(2) IBID

(3) IBID

poets.[1]

"وہ شاعر تو تھے لیکن عام عربوں کے انداز کے شاعر نہ تھے کیونکہ ان کے مذہب اور نیکوکاری کا مرکزی خیال عام شاعروں کی طرح کا نہیں ہے۔"

دور حاضر میں اس بات کو Maxime Rodinson (1915-2004) نے بھی دہرایا ہے۔ اس نے اس بات کا ذکر Islam and Capitalism میں کیا ہے۔[2] آرتھر جیفری (Arthur jeffery) (1892-1959) قرآن کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں کاہنوں کا انداز بھی پایا جاتا ہے:

His early pronoucements rhymed prose were so like those sooth sayers a crazed poet ensorcelled or jinn possessed.[3]

"آپ کے ابتدائی دور کی عبارات مقفٰی تھیں جو کاہنوں، پاگل مجنون شاعر، سحر زدہ یا جنوں کے زیر سایہ شخص کی گفتگو کی مانند ہے" (اسے چاہیے تھا کہ پھر ان لوگوں کی گفتگو کی کچھ مثالیں پیش بھی کرتا۔ تاکہ لوگوں کو قرآن اور ان مذکورہ لوگوں کے کلام میں مماثلت نظر آجاتی۔ صرف الزام لگا دینا تو کوئی کام نہیں ہے۔)

San Pedro بھی ان لوگوں میں سے ہے جو کہتا ہے کہ حضور ﷺ پر جنّات کا سایہ تھا یا آپ ﷺ کو مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ اور اسی کے زیر اثر آپ ﷺ جو کچھ کہتے اسے قرآن قرار دے دیا گیا۔[4]

سپرینگر بھی لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ گوشہ نشینی کے دوران غور و خوض کیا کرتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ کی قوتِ متخیلہ بڑھ گئی۔ صرع اور مرگی کے دوروں کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسی کیفیت سے آپ ﷺ کو دھوکا اور غلطی لگ گئی۔ اور آپ ﷺ نے اس کو وحی و الہام سمجھ لیا۔[5]

نولڈیکے Theodor Noldeke (1836-1930) کا خیال یہ ہے:

---

(1) Bell, Richard, The Origin of Islam in its Christian Environment, P.23

(2) Rodinson, Maxime, Islam and Capitalism, P 25, Pantheon Books, 1973

(3) Jeffrey, Arthur, The Koran; A Scripture, P.47, R.F. Moore Company, 1952

(4) Danial, Norman,: Islam and the west (The making of an Image), P.77, Oneworld, 1960

(5) Spranger, S, Life of Mohammad, P.89

But by far the greatest part of the book is undoubtedly the result of deliberation touched more or less with emotions and animated by a certain thetorical rather than poetical reflection.(1)

"کتاب کا بہت بڑا حصہ بلاشبہ ایک ایسے غور و خوض کا نتیجہ ہے جو جذبات اور جوش کے زیر اثر کیا گیا تھا اس حصہ میں شاعرانہ تاثر کی بجائے ایک مخصوص فصاحت پائی جاتی ہے۔"

ان تمام اقتباسات سے یہ بات بالکل عیاں ہو رہی ہے کہ مستشرقین اور مشرکین مکّہ میں یہ بات مشترک طور پر موجود ہے کہ دونوں گروہ قرآن مجید کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر پائے گویا جس طرح مشرکین مکّہ قرآن مجید کے بارے میں ایسے موقف کے حامل تھے جس کی دلیل اور بنیاد موجود نہ تھی، مستشرقین بھی انہی کے نقش قدم پر چلے ہیں۔

گذشتہ صفحات میں قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا جو تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، اس کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصّہ: قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کے بارے میں اسلامی نقطہ نگاہ

1۔ منزل من اللہ ہونے پر قرآن مجید کی خود اپنی داخلی شہادت۔

2۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور اس کے علوم و مضامین کی بنیاد پر اس کے منزل من اللہ ہونے پر دلائل۔

3۔ منزل من اللہ ہونے پر قرآن مجید کا عقلی استدلال۔

دوسرا حصّہ: مستشرقین کے اعتراضات کی وضاحت:

1. کیا قرآن مجید کتبِ سابقہ سے حاصل کیا گیا ہے؟
2. کیا حضور ﷺ نے کارندے مقرر کر رکھے تھے؟
3. کیا حضور ﷺ کسی راہب یا یہودی و عیسائی علماء سے ملا کرتے تھے اور انہی سے آپ ﷺ نے قرآن حاصل کر لیا؟
4. کیا آپ ﷺ پر کوئی دورہ پڑتا تھا جس کے دوران آپ ﷺ جو کچھ فرماتے وہ قرآن سمجھ لیا گیا؟

---

(1) Noldeke, Sketches from Eastern History, P.25, Read Books, 2007

5. کیا قرآن مجید حضور ﷺ کی کسی نفسیاتی کیفیت میں آپ ﷺ کی باتوں کا مجموعہ ہے؟
6. کیا قرآن مجید، حضور ﷺ کا ذاتی کلام ہے؟

ان تمام پہلوؤں سے عقلی و نقلی دلائل کی بنیاد پر مستشرقین کے موقف کی تردید کی جائے گی اور مستشرقین میں سے کچھ لوگوں کے اقوال نقل کر کے واضح کیا جائے گا کہ خود ان لوگوں کے ہاں قرآن مجید کی حقیقت کے بارے میں (مشرکینِ مکّہ کی طرح) اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ لوگ ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کی خود ہی تردید کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ: اس حصے میں مستشرقین کے ان دلائل کو ردّ کیا جائے گا جن سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن میں ادب اور بلاغت کی ایسی غلطیاں ہیں جو اس کے نقائص ہیں اور اِس قسم کے نقائص کلامِ الٰہی میں نہیں ہو سکتے۔

لیکن ان تین پہلوؤں پر لکھنے سے قبل قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کے بارے میں مشرکینِ مکّہ کا نقطہ نگاہ قرآن کی زبانی بیان کریں گے تا کہ واضح ہو جائے کہ مستشرقین نے کوئی نئی بات نہیں کی بلکہ وہ وہی بات دہرا رہے ہیں جو مشرکین مکّہ نے کی تھی۔

قرآن مجید کے بارے میں مشرکین مکّہ کا نقطہ نگاہ قرآن مجید کی زبانی:

﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (1)

"جب اسے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتا ہے کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔"

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (2)

"جب ان ایمان نہ لانے والوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔"

﴿وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ (3)

"ان بے ایمان لوگوں نے کہا کہ قرآن تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو انہوں نے لکھوا رکھی ہیں اور وہ صبح شام انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔"

(1) التطفیف: ۱۳
(2) النحل: ۲۴
(3) الفرقان: ۵

﴿ بَلْ قَالُوْا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ (1)

"بلکہ ان لوگوں نے قرآن مجید کو پریشان خوابوں یا پریشان خیالات کا مجموعہ کہا۔ نہیں بلکہ کہا کہ اس نے اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ لیا ہے۔ نہیں، بلکہ یہ شخص شاعر ہے (اگر یہ سچا نبی ہے) تو جس طرح پہلے رسول نشانیاں دے کر بھیجے گئے تھے یہ بھی ہمارے مطالبے کے مطابق ہمارے پاس نشانی لے کر آئیں۔"

قرآن مجید، مشرکین کے طرزِ عمل کا ذکر یوں کرتا ہے:

﴿ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ. لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ (2)

"ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس کوئی نصیحت آتی ہے تو اس کو کھیل بنا کر سنتے ہیں ان کے دل کھیل میں مصروف ہیں اور یہ ظالم چپکے چپکے مشورہ کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے کیا؟ ایک آدمی ہی تو ہے تمھاری طرح (رسول تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا) کیا تم دیکھتے ہوئے جادو کے چکر میں آتے ہو۔"

﴿ اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ (3)

"جب یہ سر گوشیاں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم تو اس مرد کے کہنے پر چلتے ہو جس پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے۔"

﴿ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ (4)

"یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کی بات مانتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔"

﴿ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ. اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴾ (5)

---

(1) الانبیاء: ۵

(2) الانبیاء: ۳،۲

(3) بنی اسرائیل: ۴۷

(4) الفرقان: ۸

(5) المدثر: ۲۵،۲۴

”یہ شخص شیخی میں آ گیا کہنے لگا یہ قرآن ایک قسم کا جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے ہو نہو یہ ایک انسان کا بنایا ہوا کلام ہے۔“

﴿اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا﴾ (1)

”اور کافر لوگوں نے کہا کہ قرآن من گھڑت باتیں ہیں جو حضور ﷺ نے بنالی ہیں اور دیگر لوگوں نے اس کام میں ان کی مدد کی ہے یہ لوگ ایسا کہتے ہوئے ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔“

﴿وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (2)

”ہمیں معلوم ہے کہ یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر ﷺ کو ایک شخص سکھا جاتا ہے لیکن نبی کریم کو قرآن سکھانے کے حوالے سے جس شخص کی طرف کی نسبت کی جاتی ہے اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن تو صاف عربی زبان میں ہے۔“

مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ قرآن یکبار گی کیوں نہ نازل کر دیا گیا۔

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ (3)

”ان لوگوں نے کہا جو کافر ہیں کہ قرآن یکبار گی کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ اس کا جواب خود ہی قرآن نے یہ دیا ہے۔“

﴿كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (4)

”قرآن کو آہستہ آہستہ اس لئے نازل کیا گیا کہ آپ ﷺ کے دل کو قائم رکھیں اور اس واسطے کہ ہم اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔“

مشرکین مکہ کہتے تھے کہ قرآن مجید مکہ یا طائف کے کسی بڑے امیر آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ (5)

---

(1) الفرقان:۴

(2) النحل:۱۰۳

(3) الفرقان:۳۲

(4) الفرقان:۳۲

(5) الزخرف:۳۱

"کافر لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دو بستیوں یعنی مکّہ اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔"

ان کے علاوہ قرآن مجید نے ان کے نقطہ نگاہ اور اعتراضات کا تذکرہ ایک دوسرے انداز سے بھی کیا ہے کہ اعتراض کا ذکر تو نہیں کیا گیا لیکن صورت حال کی وضاحت کی گئی ہے۔

﴿فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ۝ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾[1]

"آپ ﷺ لوگوں کو نصیحت کرتے جائیں۔ اللہ کے فضل سے آپ ﷺ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون۔ کیا یہ آپ ﷺ کو شاعر کہتے ہیں اور کہتے ہیں ہم اس کیلئے زمانہ کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں کہہ دیجئے اچھا! انتظار کرتے رہو۔ میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔۔۔ یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔ نہیں بات یہ ہے کہ ان میں ایمان نہیں ہے اگر وہ سچے ہیں تو اس طرح کا کلام لے آئیں۔"

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾[2]

"یہ قرآن کریم فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے۔ جو صاحبِ قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا سردار اور امانت دار ہے۔ اے مکّہ والو! تمھارے رفیق یعنی محمد ﷺ دیوانے نہیں ہیں۔ بے شک انہوں نے اس فرشتے کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا ہے، وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں، یہ شیطان مردود کا کلام نہیں پھر تم کدھر جا رہے ہو۔ یہ تو جہان کے لوگوں کیلئے نصیحت ہے۔"

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ۝ وَلَا بِقَوْلِ

---

(1) الطور: ۲۹۔۳۳، ۳۱۔۳۴

(2) التکویر: ۱۹۔۲۷

كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ﴾ (1)

"یہ قرآن فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ نہ ہی یہ کسی کاہن کے خرافات ہیں لیکن تم بہت کم فکر کرتے ہو یہ تو پروردگارِ عالم کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی جھوٹ بات بنا لاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر ان کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے۔"

یہ لوگ کہتے تھے کہ قرآن، حضور ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے۔ قرآن نے انہیں چیلنج کیا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں وہ سب مل کر قرآن جیسی کتاب لا کر دکھا دیں۔

﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ﴾ (2)

"اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا کلام بنا تو لائیں۔ جب اس جیسا کلام نہ لا سکے تو پھر کہا کہ"

﴿قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ﴾ (3)

"انہیں کہیں کہ یہ اس قرآن کی مانند دس سورتیں بنا کر دکھا دیں۔ اگر دس سورتیں بھی نہ لا سکے تو پھر ان سے کہا۔"

﴿قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ﴾ (4)

"انہیں کہہ دیں کہ یہ اس قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر لائیں۔" جب ایک سورت بھی نہ لا سکے تو انہیں کہا کہ

﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (5)

"اگر تم اس کلام کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو اس کی مانند ایک سورت لا کر دو اگر سچے ہو۔ اور اس کے ساتھ اپنے جھوٹے معبودوں جن

(1) الحاقہ: ۴۱-۴۶

(2) الطور: ۳۴

(3) هود: ۱۳

(4) یونس: ۳۸

(5) البقرۃ: 23

سے تم مدد طلب کرتے ہو ان مددگاروں کو بھی اس میں شامل کر دیکھو۔“

اس کے بعد فرمایا:

﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (1)

”پھر اگر تم اس کلام کی مانند کلام نہ لاسکو اور یاد رکھو ایسا تم ہرگز نہ کر پاؤ گے تو تم اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔“

آخر میں فیصلہ کن انداز سے قرآن نے متنبہ کر دیا کہ

”ان لوگوں کو کہہ دیجئے کہ اگر تم اس قرآن کی مانند کتاب لانے کیلئے تمام انسانوں اور جنّوں کو اکٹھا کر لو تو تم اس کی مانند کلام نہیں لاسکتے اگرچہ تم سب ایک دوسرے کے مددگار بن جاؤ۔“ (2)

منزّل من اللہ ہونے پر قرآن کی داخلی شہادت:

قرآن میں بہت سے منصوص دلائل موجود ہیں کہ یہ انسانی کلام نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ آئندہ سطور میں قرآن مجید کے انہی مقامات کی نشاندہی کی جائے گی:

1. ﴿قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (3)

”آپ ان سے کہہ دیں کہ جو کوئی جبریلؑ سے عداوت رکھے تو اس نے تو اللہ کے حکم سے آپ پر قرآن اتارا۔“

2. ﴿وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ (4)

”بیشک یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا۔ روح الامین اسکے ساتھ اترا۔ آپ ﷺ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں سے ہو جائیں۔“

3. ﴿تَنزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ (5)

---

(1) البقرۃ:۲۴

(2) بنی اسرائیل:۸۸

(3) البقرۃ:۹۷

(4) الشعراء:۱۹۲۔۱۹۵

(5) الاحقاف:۲

"یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے وہ اللہ جو غالب حکمت والا ہے۔"

4. ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (1)

"یہ کتاب رحمن اور رحیم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔"

5. ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (2)

"یہ کتاب حکمت والے اور تعریف کی گئی ہستی کی طرف سے ہے۔"

6. ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (3)

"یہ کتاب نازل کی گئی ہے اس کی جانب سے جو تمام جہانوں کا مالک ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔"

7. ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا﴾ (4)

"بیشک ہم نے آپ ﷺ پر قرآن اتارا ہے آہستہ آہستہ اتارنا۔"

8. ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (5)

"بیشک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

9. ﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (6)

"یہ کتاب ہم نے ہی آپ ﷺ کی طرف نازل کی تاکہ لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف نکالیں۔"

10. ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (7)

"یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا۔"

11. ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ﴾ (8)

"یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔ کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک

---

(1) حم السجدۃ:۲

(2) حم السجدۃ:۴۲

(3) حم السجدۃ:۲

(4) الدھر:۲۳

(5) الحجر:۹

(6) ابراہیم:۲،۱

(7) یوسف:۱۔۳

(8) یونس:۱۔۳

بندے پر وحی نازل کی۔"

12. ﴿ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ ﴾[1]

"یہ نازل شدہ ہے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ۔"

سورۃ محمد میں قرآن مجید کو "الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ" قرار دینے کے بعد ارشاد فرمایا:

13. ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الۡبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الۡحَقَّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ﴾[2]

"یہ اس لئے کہ کافروں نے بیشک باطل راہ اختیار کی اور بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے انہوں نے اپنے رب کی جانب سے آنے والے حق کی پیروی کی۔"

14. ﴿ اَوَلَمۡ يَكۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ ﴾[3]

"کیا ان لوگوں کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ ہم نے آپ کو اپنی طرف سے کتاب نازل کی کہ اس کی تلاوت ان پر کی جائے۔"

15. ﴿ اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۙ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ اَفَبِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡهِنُوۡنَ ﴾[4]

"یہ عزت والا قرآن ہے جو کتابِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔ پروردگارِ عالم کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ کیا تم اس کلام سے انکار کرتے ہو؟"

16. ﴿ قُلۡ اَنۡزَلَهُ الَّذِىۡ يَعۡلَمُ السِّرَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾[5]

"کہہ دیجئے کہ اس کو اس نے اتارا جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔"

17. ﴿ وَبِالۡحَـقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَـقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۘ وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ وَّنَزَّلۡنٰهُ تَنۡزِيۡلًا ﴾[6]

"اور ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور سچائی کے ساتھ نازل ہوا۔ اور اے محمد ﷺ ہم نے

---

(1) الانعام: ۱۱۴

(2) محمد: ۳

(3) العنکبوت: ۵۱

(4) الواقعۃ: ۷۷۔۸۱

(5) الفرقان: ۶

(6) بنی اسرائیل: ۱۰۵۔۱۰۶

آپ کو صرف خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ نازل کیا ہے۔"

قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر اس کے مضامین اور فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر دلائل

(اگر تعصب سے قطع نظر ہو کر) پر غور کریں تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے منکشف ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم کسی انسان کا کلام نہیں ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں:

1. اپنی تاثیر اور اثر آفرینی کے اعتبار سے اس کتاب کی کوئی نظیر تاریخ عالم کے کسی بھی دور سے میسر نہیں آئی۔ اس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب، طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، گہرائی اور ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا کہ کوئی اور کتاب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ چودہ سو برس کے طویل دور سے اس کے اثرات روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ اس وقت کلام کے اعتبار سے بہترین شعراء کا بہترین کلام موجود تھا۔ سبعہ معلّقات اس وقت کے چوٹی کے شعراء کا کلام تھا۔ لیکن آج کسی کا کوئی اثر ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ قرآن جو سادگی کے اعتبار سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا چلا گیا۔ اسکی موجودگی میں سبعہ معلّقات لوگوں کو بھول گئے۔ قرآن نے جو انقلاب برپا کیا دشمن اس سے خائف ہو گئے اور اپنے اس سے انقلابی راہنمائی حاصل کرتے چلے گئے۔ قرآن کے پیدا کردہ اثرات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

2. قرآن کریم کا موضوع بڑا وسیع ہے۔ اس کی تعلیمات اور مضامین کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات کو حاوی ہے۔ وہ کائنات کے آغاز و انجام، کائنات کے پورے نظام میں ایک نظم، توازن، ربط اور ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ کائنات میں کارفرما اصول و ضوابط بیان کرتا ہے۔ وہ کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے مقصدِ تخلیق کو بیان کر کے اس کیلئے فکر و عمل کی راہیں متعین کرتا ہے۔ گمراہی کی راہوں کی نشاندہی کر کے لوگوں کو ان راہوں سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب بیان کرتا ہے۔ عقائد، اخلاق، معیشت، سیاست، عبادت، تہذیب و تمدن، عدالت، قانون، تزکیہ نفس اور حقوق و فرائض سب پر حاوی ایک ضابطہ حیات پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دنیا کے بعد اگلی دنیا کے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے کہ دوسرے جہاں کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جن حقائق کو اس نے علم کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان میں سے کوئی بھی جھٹلائی نہیں جاسکتی۔

کائنات کا جو تصور اس نے پیش کیا ہے۔ وہ مظاہر کائنات کی مکمل توجیہہ کرتا ہے۔ یہ ہر شعبہ میں تحقیق

کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ، سائنس اور عمرانی علوم کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل مربوط اور جامع نظام فکر قائم ہوتا ہے۔ اس نے عمل کے میدان میں جو راہنمائی کی، تجربے نے اس کو بہترین اور مفید ترین ثابت کیا ہے۔ کوئی انسانی تصنیف اس پائے کی موجود ہے نہ موجود رہی ہے جس نے انواع و اقسام کے ان لاتعداد مسائل پر اتنی معقول و موزوں راہنمائی پیش کی ہو۔ تاریخ بھی تو آخر کوئی چیز ہے اور وہ اسی لئے ہے کہ وہ حقائق کو آشکار کرے۔ تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ قرآن کی مثل کوئی کتاب کسی بھی دور میں موجود نہیں رہی۔

3. قرآن کریم میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو انسانی کلام میں موجود نہیں ہو سکتیں۔ ان میں ایک جدّت ہے۔ اس کا طرزِ بیان تمام انسانی کلاموں سے مختلف ہے۔ انسان ہمیشہ ماحول سے مواد اور موضوع حاصل کر کے لکھتا ہے۔ اس صورت میں قرآن کا مواد عرب کے ماحول سے ماخوذ ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ قرآن میں ایسا نہیں ہے۔ اس وقت عرب میں کلام کی جو اصناف مروّج تھیں ان میں شاعری اور کلامِ منثور، مسجع اور غیر مسجع شامل ہیں۔ لیکن قرآن میں ان سب میں سے کسی کا اسلوب موجود نہیں ہے۔ یہ بات مشرکینِ مکہ کے طرزِ عمل سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو اپنے مروّجہ اسالیب میں سے کسی میں شامل کرنے کا فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ آج کے مستشرقین کے ہاں بھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ قرآن شاعری ہے یا نثر۔ قرآن سبعہ معلّقات یا دیوان حماسہ کی طرح ردیف قافیہ اور اوزان کا پابند نہیں ہے۔ مقاماتِ حریری کی طرح منثور مسجّع بھی نہیں ہے اور عام مصنفین کے کلام کی طرح نثر غیر مسجّع بھی نہیں ہے دنیا جانتی ہے کہ روئے زمین پر اس جیسا طرزِ کلام نہ کبھی موجود تھا اور نہ موجود ہے۔

4. اسی طرح انسانی کلام میں متکلم کے جذبات کو دخل حاصل ہوتا ہے۔ انسان پر جب جذبہ قہر غالب ہوتا ہے تو رحم کا جذبہ مفقود و مغلوب ہوتا ہے اسی طرح جب اس پر رحم کے جذبات کا غلبہ ہو تو قہر کے جذبات مغلوب ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں متضاد و متصادم مضامین بیک وقت ذکر کیے گئے ہیں۔ ابشار و انذار جنت و دوزخ۔ قہر و رحم ایک ساتھ مذکور ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا متکلم انسان کی طرح جذبات سے مغلوب ہستی نہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر کی آیات دیکھیں:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيٓ أَنِّيٓ أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ﴾ (1)

ان آیات میں عذاب و مغفرت دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ ان دو متضاد چیزوں کو اعتدال کے ساتھ ایک ہی جگہ بیان کرے۔ اِس طرح کی درجنوں آیات کی مثال دی جاسکتی

(1) الحجر: ۴۹،۵۰

ہے۔

5. قرآن مجید کے موضوعات پر غور کریں تو نظر آتا ہے کہ یہ مضامین بڑے سنجیدہ اور حکمت ودانائی سے بھرپور ہیں۔ اس وجہ سے بعض اوقات ان کے بوجھل اور خشک ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے ان مضامین کو بیان کرتے ہوئے فصاحت کا پہلو کم ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی فقیہہ، فقہ کے نو دس مسائل قرآن کی طرز پر فصاحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرے تو جلد ہی اس کی ہمت جواب دے دے گی۔ مگر قرآن کے ان بھاری بھر کم اور نہایت سنجیدہ مضامین میں بھی کہیں فصاحت وبلاغت کا پہلو کمزور نہیں پڑتا۔ وراثت ہی کے موضوع کو لیجئے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ (1)

اس آیت میں ادبیت کا پہلو خاص انداز میں موجود ہے۔ (2)

اسی طرح کے چند دیگر موضوعات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہر جگہ فصاحت و بلاغت یکساں طور پر موجود ہے اس کی چند مثالیں:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (3)

کوئی شخص نہیں جانتا جو کچھ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے پوشیدہ کر رکھی ہے۔ میں ترغیب کا ذکر نہایت جامعیت اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ (4)

6. انسانی کلام، انسانی عقل ودماغ کی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے ہر میدان میں یکساں طور پر کمال کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ انسانی کلام کسی ایک شعبے یا اسلوب میں تو کمال دکھا سکتا ہے لیکن کسی دوسرے شعبے یا اسلوب میں اس میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ عرب شاعر ابو نواس، شراب کی تعریف میں تو کمال رکھتا تھا۔ ابو العتاہیہ، زہد وتقویٰ اور آخرت کے مضامین پر زور انداز میں کہہ سکتا تھا۔ فردوسی جنگی مضامین بیان کرنے میں دسترس رکھتا تھا۔ لیکن دوسرے موضوعات پر لکھتے ہوئے ان کا یہ امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ تمام شعراء اور بلغاء کے مضامین اور ان کے افکار کی پرواز مادیات اور محسوسات کے دائرہ سے باہر نہیں ہوتی۔ ان

(1) النساء:١١

(2) کیرانوی، رحمت اللہ، اظہار الحق (اردو ترجمہ بائبل سے قرآن تک) مکتبہ دار العلوم کراچی، ١٩٨٩ء، جلد دوم، صفحہ 306۔

(3) السجدۃ:١٧

(4) بائبل سے قرآن تک، جلد دوم، صفحہ 310۔

میں غیبیات اور مادیات سے ماوراء مضامین نہیں ہوتے۔ محسوسات میں شاعرانہ تخیلات کام دے سکتے ہیں لیکن غیبیات میں تخیل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شعراء سچائی اور واقعیت کے پابند نہیں ہوتے ان کے تخیل کی حدود نہیں ہوتیں۔ تخیل جو نقشہ تیار کرے اور جن الفاظ کا انتخاب کریں وہ شعراء کا کلام بن جاتا ہے۔

شعر کے بارے میں تو قدیم زمانے سے یہ مقولہ معروف چلا آرہا ہے کہ احسنہ اکذبہ۔ [1]لیکن اگر ہم قرآن حکیم کے مضامین میں غور کریں تو اس کے مضامین انواع واقسام پر مشتمل ہیں۔ اس کے مضامین اس قدر لطیف پہلوؤں تک وسیع ہیں کہ جہاں تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ اس میں عقائد، عبادات، معاملات، قوانین مملکت، اصول معاشرت، انفرادی زندگی سے بین الاقوامی زندگی تک کیلئے ہدایات سبھی کچھ موجود ہے۔ تاریخ عالم کے اہم حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے لیکن کہیں بھی صداقت و واقعیت سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود زور بلاغت، صدق و حقیقت کی شدید پابندی کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے۔ [2] یہ تمام حقائق اس امر کی دلیل ہیں کہ اس کلام کا سرچشمہ ایک طاقت ہے جو نہایت ہی لا محدود قوت ہے اور یہ قوت خالق کائنات کی ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلے میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 82 میں ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾[3]

"اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی کی جانب سے ہوتا تو آپ اس میں بہت سے اختلافات (تضادات) دیکھتے۔"

غیر اللہ کے کلام میں اختلاف تین صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ الفاظ میں اختلاف، معنیٰ میں اختلاف، ترتیب میں اختلاف۔ الفاظ میں اختلاف اس طرح ہو سکتا ہے کہ کچھ الفاظ تو فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہوں لیکن دوسری جگہ اس کے برعکس ہو۔ لیکن قرآن کا متن معجزہ ہے۔ معانی میں اختلاف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو غیب کی خبریں دی گئی ہیں ان میں سے کچھ درست ثابت ہو جائیں اور کچھ نہ ہوں۔ مبدء ومعاد کے بارے میں کچھ باتیں درست ثابت ہوں کچھ غلط۔ قرآن میں ایسا نہیں اس کی پیش گوئیاں ہر دور میں حرف بحرف درست ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ترتیب میں بھی کوئی جھول نہیں بلکہ اس کا نظم اور مناسبتِ آیات

---

(1) عسقلانی، ابن حجر، فتح الباری، جلد دہم، ص:538

(2) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکورہ 308/2

(3) النساء:82

ومضامین اس کا معجزہ ہیں۔ ترتیب قرآن کے باب میں ترتیب قرآن کے معجزہ اوراس کی اللہ کی جانب نسبت ہونے پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت مبارکہ کی تفسیر میں تفسیر ماجدی میں ہے کہ اس سے مراد ہے کہ اس کے بیان میں تناقص اور تناقص اور تضاد نہیں۔ اس میں معنوی وادبی یکسانی وہم آہنگی ہے۔ (1)

مولانا مودودی (1321ھ) لکھتے ہیں:

"کوئی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ سال ہاسال تک وہ مختلف حالات میں مختلف مواقع پر مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اوراول سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایساہموار، یک رنگ متناسب مجموعہ بن جائیں جن کا کوئی جزء دوسرے جزء سے متصادم نہ ہو۔" (2)

مولانا اصلاحی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب عزیز کی باتیں سازگاری وہم آہنگی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک ہی ہستی کی کتاب ہے۔ اس میں جن بشر کی مداخلت نہیں ہے۔ جس طرح اس کائنات کا نظام چلانے میں اگر ایک سے زیادہ شریک ہوتے تو اس کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا اسی طرح اس کتاب میں بھی کسی اور کی فکر شامل ہوتی تو یہ تناقضات واختلافات کا شکار ہو جاتا۔ (3)

تیسیر القرآن میں لکھا ہے کہ قرآن نبی اکرم ﷺ کا کلام نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو تو مختلف قسم کی صورت حال کا سامنا ہوا۔ انسانی زندگی میں تو تدریجاً ارتقاء ہوتا ہے لیکن قرآن کی فصاحت وبلاغت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے نظریات وعقائد، اقدار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ (4)

مولانا حقانی لکھتے ہیں کہ جمہور متکلمین لکھتے ہیں کہ قرآن ایک ضخیم کتاب ہے اس کے لاتعداد علوم ہیں، انبیاء کے واقعات ہیں، آخرت، طہارت، شریعت سب کچھ ہے۔ نبی اکرم ﷺ تو امی تھے انہوں نے کہاں سے یہ علوم سیکھ لئے۔ حضور ﷺ کو متضاد احوال پیش آئے۔ سورتوں میں موضوعات بار بار بیان ہوئے لیکن کوئی تضاد نہیں۔ (5)

یہ بات بھی قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے کی ایک واضح اور کھلی دلیل ہے کہ اس میں غیبی علوم کا

---

(1) دریابادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی: جلد 1، ص: 768

(2) تفہیم القرآن: جلد 1، ص: 377

(3) تدبر قرآن: ج2 ص347

(4) کیلانی، تیسیر القرآن: ج1 ص437

(5) حقانی، تفسیر حقانی: ص183

اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ کوئی انسان خواہ وہ کتنے ہی علوم کا جاننے والا ہو ان سب تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ کے بارے میں تو مشرکین مکہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ آپ ﷺ امی ہیں۔ ایک فلسفی اور عالم تو قرآن کے ان غیبی ذخائر تک رسائی حاصل نہ کر سکے اور ایک امی سے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی پیش گوئیاں کرے جو ماضی وحال اور مستقبل کے واقعات سے پردہ اٹھانے والی ہوں۔[1] قرآن کریم کے اندر گزشتہ اقوام اور انبیاء کی تاریخ، اس کے نتائج و ثمرات آنے والے واقعات کی حقیقت سے قبل از وقت مطلع کرنا ایسے ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس وقت اسباب کی بنیاد پر قابل یقین نہیں ہوتے، جب وہ بیان کئے گئے تھے۔"مابعد الموت اور مابعد الطبیعات" کے امور سے متعلق ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو فلاسفہ کی ایک عظیم جماعت مل کر بھی پیش نہ کر سکے۔ گزشتہ تاریخ کے جو واقعات اس نے پیش کئے ہیں جب انہیں تاریخ کے مستند ماخذ کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے تو قرآن کے حقائق مبنی بر حقیقت ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے وہ واقعات بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلافات میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب پہلو اس کے کلام انسانی ہونے کی نفی کرتے ہیں۔[2]

مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن نے ماضی کے واقعات یہود و نصاری کی کتب سے اخذ کر لئے ہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مستقبل کی پیش گوئیاں کہاں سے اخذ کی گئیں۔ اس صورت میں مستشرقین کا موقف کہ حضور ﷺ نے قرآن کتب سابقہ سے حاصل کر لیا، تو ایسے ہی ہے کہ جس کا گھر خود لڑائی جھگڑوں کا مرکز ہو وہ گھر دوسرے گھروں میں صلح کیوں کر کرو اسکتا ہے؟ مستقبل کی پیشن گوئیوں کی ایک مثال روم کی فتح کی پیشن گوئی ہے۔ یہ پیش گوئی اس وقت کی گئی جب ظاہری طور پر حالات و اسباب اس کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر فتح کی جو بشارت سنائی گئی، اس وقت کے حالات کی روشنی میں کس کو سمجھ آسکتی تھی۔ لیکن یہ فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی اور سب دنیا نے اس فتح کو آنکھوں سے دیکھا۔ قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ میں، قوموں کی زندگی کے مختلف مراحل، ان میں پیدا ہونے والی مختلف خرابیوں کے اثرات و ثمرات کی جو خبر قرآن نے دی ہے، اس پر اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ کسی انسان کے بس میں تھا ہی نہیں کہ وہ اس قدر صحیح طور پر ان سب باتوں کی نشاندھی کر سکتا۔

قرآن مجید کے وحی الہی ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن نے منافقین کی مخفی سازشوں کی قلعی کھول دی۔ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف اپنی خفیہ محفلوں میں سازشیں تیار کیا کرتے تھے۔ قرآن نے ہر

---

(1) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور

(2) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور 338/2

موقع پر انہیں بے نقاب کیا۔ تاریخ اسلام کا ہر طالب علم یہ بات جانتا ہے کہ حضور ﷺ کو ان کی سازشوں کا علم نہیں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کو اسی وقت پتہ چلتا جب وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو اطلاع دی جاتی۔ اس کی مثال سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ ہیں۔ (1)

علمائے اسلام نے قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اگر ہم کسی انسان کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس میں ضرور ایسے الفاظ ملیں گے جو کسی خارجی چیز کے دباؤ کا نتیجہ ہوتے ہیں اس کے علاوہ انسانی کلام میں معمولی قوت کا اظہار تو ہوتا ہے لیکن اس میں ایسی قوت کا اظہار نہیں ہو سکتا کہ جس سے زمین و آسمان پر حکومت کا ظہور ہوتا ہو۔ لیکن قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسی ہستی کا کلام نہیں جو کسی سے دبتی ہو بلکہ وہ ہستی تو بڑی عظیم ہے اور کائنات پر اس کا غلبہ و تصرف ہے۔ اس کی ایک مثال سورۃ ہود میں ملتی ہے:

﴿وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي﴾ (2)

"اے زمین نگل جا پانی کو اور اے آسمان! تھم جا برسنے سے۔"

کیا کوئی انسانی طاقت اس قدر اعتماد کے ساتھ حکم دیتی ہے؟

قرآن مجید کے مضامین اور اس کی آیات کا تکرار، اس کے کلام الٰہی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اگر ایک انسان ایک بات مکرر کرے تو اس تکرار میں بوریت اور بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی طبیعت میں گرانی ہوتی ہے۔ لیکن قرآن میں ایک واقعہ متعدد بار بیان ہوا ہے۔ لیکن ہرگز اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر جگہ ایک نئی حلاوت اور نئی شان پائی جاتی ہے ہر مقام پر اس کا ایک جداگانہ اسلوب ہے۔ (3)

اگر کلام کو ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی جانب منتقل کیا جائے تو اس صورت میں کلام کے اجزاء کے درمیان عمدہ قسم کا ربط اور جوڑ باقی نہیں رہتا۔ اس طرح کلام بلاغت کے معیار سے گر جاتا ہے قرآن متضاد قسم کے مضامین کی طرف بار بار مڑتا ہے۔ لیکن اس وقت اس میں کمال درجے کا ربط پایا جاتا ہے۔ یہاں بلاغت اس انداز سے پائی جاتی ہے کہ یہ کسی انسان کے بس میں نہیں۔ (4)

اسی طرح قرآن مجید میں جس انداز سے طویل مضامین کو چند الفاظ میں سمیٹ کر کمال جامعیت کے ساتھ کسی ابہام کے بغیر بیان کیا گیا ہے کہ کسی انسانی کلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یوں تو سارا قرآن

---

(1) ایضاً، 335/2

(2) ھود: ۴۴

(3) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور 327/2

(4) ایضاً، 314/2

اس کی مثال ہے لیکن اس سلسلے میں آیت قصاص کی ایک مثال دی جاسکتی ہے جس میں ایک بہت بڑا فلسفہ محض یوں بیان کر دیا گیا۔ (1)

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ (2)

"اور اے عقل والو! تمھارے لئے قصاص لینے میں زندگی ہے۔"

قرآن مجید کی اس پہلو سے جامعیت کی مثالیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی کتاب اظہار الحق میں صفحہ ۳۵۸ سے ۳۸۳ تک پیش کی ہیں۔

اسی جامعیت کو مصر کے عالم جوہری طنطاوی نے اپنی تفسیر میں ایک واقعے کے ذریعے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

۱۳ جون ۱۹۳۲ کو میری ملاقات، مصری ادیب استاذ کامل گیلانی سے ہوئی۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ میں امریکی مستشرق فنکل کے ساتھ تھا ایک روز انہوں نے میرے کان میں کہا 'کیا تم بھی ان لوگوں میں ہو جو قرآن کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔" مستشرق نے ایک مضحکہ خیز ہنسی ہسی۔ گویا اس کے نزدیک یہ ایک بے بنیاد عقیدہ تھا۔ میں نے کہا کہ قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے سے قبل ضروری ہے کہ ہم تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آیئے! ایک قرآنی تصور کو ہم عربی الفاظ میں مرتب کرتے ہیں وہ تصور ہے کہ جہنم بڑی وسیع ہے" مستشرق مذکور نے اس سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم لے کر بیٹھ گئے اور ہم نے مل کر بیس جملے تیار کئے۔ وہ جملے یہ تھے:

1. إن جهنم واسعة جداً
2. إن جهنم لاوسع مما تظنون
3. إن سعة جهنم لايتصورها عقل الانسان
4. إن جهنم لتسع لدنيا كلها
5. إن الجن والإنس إذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تقيض بهم
6. كل وصف في سعة جهنم لا يصل إلى تقريب شئ من حقيقتها
7. إن سعة جهنم لتصعر امامها سعة السماوات والأرض

---

(1) ایضاً، 314/2

(2) البقرۃ:۱۷۹

8. كل ماخطر ببالك في سعة جهنم فإنها لاحب منه واوسع
9. سترون من سعة جهنم مالم تكونوا لتحملوا به أو تتصوروه
10. مهما حاولت ان تتخيل سعة جهنم فانت مقصر ولن تصل إلى شيئ من حقيقتها
11. إن البلاغة المعجزة لتقصر و تعجز اشد العجزعن وصف سعة جهنم
12. إن امسكت جهنم قد تخطت احلام الحالمين و تصور المتصورين
13. متى اسكت بالقلم و تصديت لوصف سعة جهنم أحسست بقصورك وعجزك
14. إن سعة جهنم لا يصفها وصف ولا يتخيلها وهم ولا تدور بحسبان
15. كل وصف لسعة جهنم إنما هو فضول وهذيان

جب ہم یہ کوشش مکمل کر چکے تو فنکل نے پوچھا کہ کیا قرآن اس مضمون کو زیادہ بلیغ انداز سے بیان کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ فنکل نے حیرت سے پوچھا کہ قرآن اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔ میں نے سورۃ ق کی یہ آیت پڑھی:

﴿ يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ ﴾ (1)

یہ آیت کریمہ سن کر اس مستشرق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور کہنے لگا:

صدقت نعم وأنا أقر رلك ذالك منعتبطا من كل قلبي (2)

"یعنی آپ نے سچ کہا بالکل سچ۔ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں"

قرآن مجید میں مذکور علوم کے حصول کیلئے انواع و اقسام کے اساتذہ کی ضرورت ہوتی۔ اسی طرح ان علوم کے حصول میں ایک طویل مدت لگتی ہے۔ اس قدر علوم حاصل کرنے میں تو عمر کھپ جاتی ہے۔ لیکن تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ان علوم سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اس وقت عرب میں موجود نہیں تھا۔ اگر ان علوم کو جاننے والا کوئی شخص تھا تو اس کی آج تک نشاندھی کیوں نہیں کی گئی۔ پھر آپ ﷺ کو تو خود مستشرقین کی واضح تعداد اُمّی تسلیم کرتی ہے چہ جائیکہ آپ ﷺ نے علوم عقلیہ و نقلیہ میں دسترس حاصل کرلی۔ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی بلاغت تمام انواع واقسام پر مشتمل ہے مثلاً تاکید کی اقسام۔ تشبیہ و تمثیل کی اقسام، استعارہ حسن مقاطع اور مطالع و حسن مفاصل کی اقسام، تقدیم و تاخیر، فصل و وصل وغیرہ۔ قرآن ایسے شاذ الفاظ سے بالکل خالی ہے جو نحوی صرفی

---

(1) ق: ۳۰

(2) طنطاوی، جوہری، جواہر القرآن،

قواعد یا لغوی استعمال کے خلاف ہوں۔ بڑے بڑے بلغاء کے کلام میں ان مذکورہ بالا اقسام میں سے دو تین سے بڑھ کر کوئی صنف شامل نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن میں یہ تمام اصناف پوری صحت کے ساتھ جابجا موجود ہیں۔[1]

کلام کی شوکت اور شیرینی و حلاوت دو متضاد صنعتیں ہیں۔ طویل کلام میں ہر جزو کے اندر مناسب مقدار کے ساتھ عادتاً ادباء کے ہاں ان سب کا اجتماع نظر نہیں آتا۔ لیکن قرآن میں یہ متضاد صنعتیں بڑی خوبصورتی سے یکجا ہیں۔[2] اس کی مثال سورۃ الکورت کی آیات:

﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۔۔ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾

سے دی جا سکتی ہے۔[3]

مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے دلائل میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں عجیب تراکیب۔ نادر اسلوب، آیات کے آغاز و انتہا کا انداز، اس کے علم بیان کے دقائق اور عرفانی حقائق پر مشتمل انکشافات، حسن عبارت، پاکیزہ اشارے۔ سلیس تراکیب اور بہترینِ تراکیب موجود ہیں۔ ان تمام صنعات کو یکجا دیکھ کر انسان یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ خدا تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔ اس کا اعجاز اور فصاحت، بلاغت اس درجے تک پہنچا دی گئی ہے کہ کوئی بھی اس پر سرقہ کا اتہام نہ لگا سکے اور کوئی انسان اس اسلوب تک پہنچنے کے قریب نہ ہو سکے۔[4]

مولانا رحمت اللہ نے اپنی کتاب "اظہار الحق" میں مسلّمہ اور قادر الکلام شعراء کے کلام کے نمونے پیش کئے۔ یہ ایسے شعراء کا کلام ہیں جو اپنے اپنے زمانے میں شاعری کے امام تھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ بعد کے لوگوں نے ان شعراء کے کلام میں سے نقائص کی نشاندھی کی ہے۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام بھی عیوب سے پاک نہیں ہوتا اور کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام بھی تنقید سے بچ نہیں سکا۔ لیکن قرآن کریم کو تو ہر دور میں ایک معجزہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس کا اعتراف موافقین اور مخالفین سبھی نے کیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔[5]

---

(1) بائبل سے قرآن تک حوالہ مذکور، 306/2

(2) ایضاً، 306/2

(3) التکویر: ۱۵۔۲۰

(4) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور، 309-306

(5) ایضاً

بعض لوگوں نے اگرچہ اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ قرآن مجید کا بعض لوگوں نے جواب دیا ہے تاہم ان لوگوں کا کلام ایک تو کہیں موجود نہیں دوسرے یہ کہ اگر یہ اس پائے کا ہوتا کہ قرآن کا مقابلہ کر سکے تو مخالفین لازماً اسے محفوظ رکھتے۔ "اظہار الحق" کے مصنف مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے قرآن مجید کی پیش گوئیوں سے استدلال کیا ہے انہوں نے قرآن کی چند پیش گوئیوں کا ذکر کیا ہے ان میں مستقبل کے مندرجہ ذیل واقعات شامل ہیں:

1۔ مسجد حرام میں حضور ﷺ اور صحابہؓ کے داخل ہونے کی پیش گوئی۔

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ (1)

2۔ مسلمانوں کو اختیار و حکومت عطا کئے جانے کا وعدہ

﴿وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۔۔۔ لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ (2)

3۔ مسیلمہ کذاب سے آمنا سامنا ہونے کی پیش گوئی

﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (3)

4۔ غلبہ حق کی پیش گوئی

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللهِ شَهِيدًا﴾ (4)

5۔ خیبر اور فارس وغیرہ کی فتح کی بشارت

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ (5)

6۔ اسی طرح کی ایک اور مثال سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۶۰ بھی ہے جہاں فرمایا "آپ کے رب نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ بے شک آپ کا رب ان کا احاطہ کرنے والا ہے۔ ان کا عرصۂ حیات تنگ کرنے

---

(1) الفتح، 27

(2) النور: 55

(3) الفتح، 16

(4) الفتح، 28

(5) الفتح، 18

والا ہے۔"

انہوں نے جن دیگر پیش گوئیوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سورۃ النّصر میں مذکور فتح مکہ کی خبر سورۃ الرّوم میں مذکور غلبہ روم کی خبر المائدۃ میں حضور ﷺ کی ہر طرح سے حفاظت، سورۃ القمر میں مذکور حفاظتِ قرآن کی پیش گوئی ﴿ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ۔۔۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴾[1] میں مذکور پیش گوئی اور دیگر کئی پیش گوئیاں شامل ہیں۔ ایسی باتوں کی خبر آپ ﷺ لوگوں کو اتنے شدّ ومدّ کے ساتھ کس طرح دے سکتے تھے جب تک کہ آپ ﷺ کو کسی یقینی ذریعہ سے خبر نہ دی گئی ہوتی۔ خصوصاً جب کہ آپ ﷺ کا منصب ایسا تھا کہ آپ ایک بات ایسی کہتے جس کا بعد میں عملی ظہور اس کے الٹ ہوتا تو یہ بات آپ ﷺ کے مشن کیلئے بھی نقصان دہ ہوتی اور اس سے آپ ﷺ کی شہرت اور وقار کو بھی ٹھیس پہنچتی۔ اس بات کا خوف بھی تھا کہ اگر یہ باتیں پوری نہ ہوئیں تو مخالفت بڑھ جائے گی اور ماننے والوں میں بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے یہ تمام باتیں اتنے یقین کے ساتھ اسی لئے کیں کہ آپ کو ان کا علم وحی کے ذریعے دیا گیا اور ان باتوں کے اعلان کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا۔ اگر یہ واقعات غلط ثابت ہوتے تو آپ کی تحریک کو نقصان پہنچانے کیلئے صرف ایک یہی بات سب سے بڑا ہتھکنڈہ بن سکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی زبانوں سے موت کی تمنا کر کے یہ کہہ سکتے تھے اے اللہ ہمیں موت دے دے اور ان کی بات پوری نہ ہونے کی صورت میں شور مچاتے پھرتے۔ حضور ﷺ یہ کبھی نہ فرماتے کہ خدا کی قسم اگر کوئی یہودی اس قسم کی تمنا اپنی زبان سے کرے گا تو فوراً اس کو موت آجائے گی۔[2]

قرآن نے چیلنج دیا کہ اس کی مثل لا کر دکھاؤ کیا مخالفین کے پاس اس سے بہتر کوئی موقع ہو سکتا تھا کہ وہ اس چیلنج کا جواب دے دیتے اور قرآن کی مثل کتاب لے آتے۔ لیکن انہوں نے قرآن کا جواب نہیں دیا۔ حضور ﷺ اس قسم کا چیلنج اتنے شدّ ومدّ کے ساتھ نہیں دے سکتے تھے تاوقتیکہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے مخالفین کے عجز کی خبر وحی کے ذریعے نہ دی جاتی۔ مزید یہ کہ اپنے دعوے میں جھوٹا آدمی کبھی اس یقین کے ساتھ بات نہیں کر سکتا۔

منزّل من اللہ ہونے پر قرآن کا عقلی استدلال

قرآنِ کریم کے بارے میں مستشرقین کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا کلام ہے انہوں نے اپنا پورا زورِ استدلال یہ بات ثابت کرنے پر صرف کر دیا ہے کہ قرآن حکیم اللہ کا کلام نہیں۔ قرآن کے دیگر امتیازات میں سے ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا ایک ایک حرف خدا کا کلام ہے لیکن مستشرقین قرآن

---

(1) القمر، 45-44

(2) بائبل سے قرآن تک، ۲/۳۴۴۔۳۹۳، ۳۴۷

کے اس امتیازی پہلو کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں قرآن کا یہ امتیاز اگر ختم ہو جائے تو پھر یہ بھی ایک انسانی تصنیف کے درجے پر آجاتی ہے جس میں ہر قسم کی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ مستشرقین کے اس نقطہ نگاہ کے پس منظر میں کئی ٹھوس دلائل موجود ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم عقلی و نقلی دلائل و شواہد کی روشنی میں ثابت کریں گے کہ قرآن کریم اوّل تا آخر خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ سب سے پہلے ہم قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں اس نقطہ نگاہ کو واضح کریں گے۔

سورۂ یونس میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾(1)

آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر خدا چاہتا تو نہ تو میں ہی یہ کتاب تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ وہی تمھیں اس سے واقف کرتا میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں بھلا تم سمجھتے نہیں۔ اگر میں نے اس سے قبل کبھی غلط بیانی نہیں کی تو میں اب بھی تم سے سچ ہی کہہ رہا ہوں۔

اس آیتِ کریمہ اور دیگر آیات میں قرآن کریم نے دراصل تین دلائل پیش کئے ہیں:

1۔ قرآن کریم اپنی زبان، اسلوبِ بیان، طرزِ استدلال، تعلیمات اور اخبارِ غیب کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ تمھارا اگر یہ دعویٰ ہے کہ اسے محمد ﷺ نے تیار کر لیا ہے تو تم سب انسان اپنے ساتھ جنات کو ملا لو اور سب مل کر اس کی مثل کتاب پیش کر کے دکھا دو۔

2۔ دوسری بات یہ ہے کہ محمد ﷺ کہیں باہر سے تو یکایک تمھارے درمیان نمودار نہیں ہو گئے بلکہ قرآن کے نزول سے قبل بھی چالیس برس تمھارے درمیان گزار چکے ہیں کیا تم نہیں سمجھتے کہ دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اس طرز کا کلام اور ان مسائل اور مضامین پر مشتمل کلام سنا تھا؟ کیا یہ بات تمھاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرزِ فکر و بیان میں یکایک ایک عظیم تغیر واقع ہو سکتا ہے؟

3۔ تیسرا استدلال یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمھارے درمیان ہی رہتے ہیں۔ تم ان کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگو بھی۔ تم ان کی تقاریر بھی سنتے ہو۔ قرآن کے کلام اور آپ ﷺ کے کلام میں زبان اور اسلوبِ بیان کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف طرزِ کلام کبھی ہو نہیں سکتے۔ عربی زبان کا کوئی شناسا یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا

---

(1) یونس:۱۶

کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔
سورۃ ھود میں مشرکینِ مکّہ کے اس الزام کی نفی کی گئی ہے کہ قرآن حکیم محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہوا ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (1)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن ازخود تیار کر لیا ہے۔ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنالاؤ اور خدا کے سوا جس جس کو تم بلا سکتے ہو بلا بھی لو۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور توحید کی دلیل بھی۔ اس استدلال کا خلاصہ یوں ہے:

1۔ اگر تمھارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیئے۔ لہٰذا تمھارا یہ دعویٰ کہ میں نے خود اسے تصنیف کر لیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تم ایسی ہی کتاب تصنیف کر کے دکھا دو۔ اگر تم سب مل کر اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں اس کتاب کا مصنّف نہیں ہوں۔ بلکہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

2۔ اس کتاب میں تمھارے معبودوں کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔ اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ الوہیّت میں ان کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ تو ضروری ہے کہ تمھارے معبودوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعویٰ کو جھوٹا ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔ قرآن سے دشمنی اور میرے ساتھ اس مخالفت کے فیصلہ کن دور میں بھی وہ تمھاری مدد نہیں کرتے کہ تم میرے چیلنج کے جواب میں ایک کتاب مجھے تیار کر کے دکھا سکو تو اس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے ان کو خواہ مخواہ معبود بنالیا ہوا ہے۔ گویا بین السطور یہ مطلب ہے کہ جب کسی کی طاقت اور اختیار کو چیلنج کیا جائے تو اس کی غیرت جوش میں آجاتی ہے اور وہ اپنے اختیار کو ثابت کرنے کیلئے فیصلہ کن مرحلہ پر ثبوت پیش کرتا ہے۔ جب قرآن ان کی حیثیت کو اس حد تک چیلنج کرے کہ۔ ''اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ'' تو لازماً جوش میں آکر ایسی کتاب لکھنے میں تمھاری مدد کرنی چاہئے تھی اور تمھارے اندر ایک روح پھونکنی چاہئے تھی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو رہا کہ فریقِ مخالف کے معبود اپنی قوت اور طاقت کا ثبوت مہیا کریں تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ تمھارے معبود بھی جھوٹے ہیں اور تم بھی جھوٹے ہو۔ اسی طرح سیرت النبی ﷺ سے کئی ایک ایسے

---

(1) ھود: ۱۳

واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت محمد ﷺ ایک مفتری (Impostor) تھے۔ اس سلسلے میں ہم صرف انہی واقعات کے بیان پر اکتفا کریں گے جو مستشرقین نے بھی اپنی مختلف کتب میں نقل کیے ہیں۔ اس بات پر سب مستشرقین متفق ہیں کہ حضور ﷺ کو ایک پیغمبر، ایک معلّم سیاست دان، سربراہِ حکومت، سربراہِ عدالت جیسے مناصب بیک وقت حاصل تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ آپ ﷺ اپنے کپڑوں اور جوتوں کی مرمّت خود فرمالیا کرتے تھے۔ آپ گھر بار کے کام کاج میں ازواجِ مطہرات کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی سادگی اور تواضع کا نمونہ تھی۔ آپ کسی محافظ کے بغیر بازار میں چلتے پھرتے تھے۔ اگر رستے میں کھڑا کر کے بھی کوئی شخص آپ سے کوئی استفسار کرتا تو آپ ﷺ اس کا برا نہ مناتے۔ حضرت عائشہ؄ (57ھ) فرماتی ہیں کہ ہمارے گھر میں کئی کئی روز تک آگ نہ جلتی تھی۔ غرض آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہؐ سے ہزاروں ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ سادگی اور تواضع کو اپنا شعار بنایا۔ لیکن دوسری طرف آپ ﷺ کی پوری زندگی سے ایک بھی مثال ایسی پیش نہیں جاسکتی کہ آپ ﷺ نے جاہ طلبی یا قیادت کی خواہش بھی کی ہو۔ آغازِ وحی ہی کو لیجیے۔ آپ ﷺ کی ملاقات جبریل علیہ السّلام سے ہوئی تو آپ ﷺ خوفزدہ ہو گئے۔ حضرت خدیجہ؄ کے ساتھ آپ ﷺ کی جو گفتگو گھر تشریف لانے پر ہوئی اسے بیشتر مستشرقین نے بھی نقل کیا ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ آپ ﷺ اس واقعہ سے بہت خائف تھے۔ اسی خوف کے پس منظر میں حضرت خدیجہ؄، ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ جنہوں نے تسلّی دی کہ آپ ﷺ نے جس فرشتے کو دیکھا ہے، وہ اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر بھی نازل ہوتا رہا ہے اِن تمام تفصیلات سے قطع نظر ہر ذی ہوش انسان اتنی بات تو سمجھ سکتا ہے کہ اگر آپ ﷺ کے ذہن میں اس قسم کی خواہش موجود تھی جس کا ذکر مستشرقین کرتے ہیں تو پھر آپ ﷺ کو خوفزدہ ہونے کی بجائے خوشی سے پھولے نہیں سمانا چاہیے تھا کہ ان کی خواہش کی تکمیل ہو رہی تھی۔

ایک طویل تشدّد، جبر، دشمنی اور ظلم و بربریّت کے دور کے بعد حضور ﷺ کو ترغیبات بھی دی گئیں۔ آپ ﷺ کو بہترین عورت، اقتدار، مال و دولت، قیادت و سیادت، ہر چیز کی رغبت دی گئی۔ اگر آپ ﷺ کا مقصد جاہ طلبی اور ہوسِ اقتدار تھا، تو یہ پیش کش تو آپ ﷺ کی کامیابی تھی۔ لیکن حضور ﷺ نے اس تمام ترغیب کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا۔ ان پیش کشوں کو قبول کرنے کا تو یہاں سوال ہی نہ تھا۔

ظلم و تشدّد کی کون سی شکل تھی جس سے واسطہ حضور ﷺ کو نہ پڑا۔ آخر ایک جاہ طلب شخص کے صبر اور برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں استقامت سے ڈٹے رہنا ایک نبیٔ صادق کے سوا کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔

قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے کے انکار پر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا ردّ

کیا قرآنِ مجید کتبِ سابقہ کا چربہ و نقل ہے؟

اس سلسلے میں ہمارے نقطہ نگاہ کی تین بنیادیں ہیں اور ان ہی بنیادوں پر ہم مستشرقین کے اس موقف کی تردید کریں گے کہ قرآنِ مجید کتبِ سابقہ کی نقل اور چربہ ہے۔

ہمارے نقطہ نگاہ کی بنیادیں مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ قرآنِ مجید اور کتبِ سابقہ میں کچھ چیزوں کی مماثلت ہرگز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ قرآن مجید ان کا چربہ ہے۔ قرآن مجید تو اسی سلسلہ ہدایت کی آخری اور مکمل کڑی ہے جس سلسلے کے تحت پہلی کتب نازل ہوتی رہی ہیں۔ قرآن مجید تو خود کہتا ہے کہ وہ نئی چیز نہیں بلکہ پہلے سے جاری سلسلہ ہدایت کا تسلسل اور آخری کڑی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید اور شریعت اسلامیہ کی بنیاد ملت ابراہیمی کے شعائر ہی ہیں انہی کو بنیاد بنا کر شریعت محمدیہ کے احکام و فرامین مرتب ہوئے۔[1] چنانچہ مستشرقین کی وہ تمام کوششیں تحصیلِ حاصل کا درجہ رکھتی ہیں جن میں انہوں نے قرآن مجید کے احکام اور اصطلاحات اور کتب سابقہ کے درمیان مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

2۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، مضامین کی گہرائی و گیرائی اس کا صوتی اعجاز، اس کی اثر آفرینی کا مقابلہ ماضی کی کوئی کتاب نہیں کر سکی۔ اس اعتبار سے ان میں قرآن مجید کا مقابلہ کرنے کی چنداں صلاحیت نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے تو اس وقت کے مروّجہ عقائد اور رسومات قبیحیہ کی کھل کر مذمت کی ہے۔ کیا پہلی کتابیں انہی عقائد کی حامل تھیں جن کا اعلان قرآن مجید نے کیا تھا؟

3۔ ہم نے جن بنیادوں پر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تردید کی ہے ان میں تیسری بنیاد یہ ہے کہ خود مستشرقین اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ قرآن مجید پر یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے کہ پہلی کتب کا چربہ ہے۔ کیونکہ (بقول ان کے) یہ کتب نہ تو حضور ﷺ کو میسر تھیں اور نہ ہی عرب میں ان کا حاصل کرنا ممکن تھا اس وقت یہ کتب مفقود تھیں۔

(1) شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص: 3

قرآن مجید اور کتب سابقہ کا تعلق

قرآن مجید پر مستشرقین کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ اس کی بہت سی باتیں پہلی کتابوں توراۃ اور انجیل سے ملتی جلتی ہیں۔ مستشرقین نے زندگیاں محض ایسی باتیں تلاش کرتے ہوئے گزاردیں کہ قرآن اور کتبِ سابقہ میں کون کون سی باتیں مماثل ہیں۔ ہر ایک مستشرق نے کم از کم اس آسان سی بات کا ذکر ضرور کیا ہے کہ قرآن مجید پہلی کتابوں سے اخذ شدہ ہے۔ آئندہ سطور میں ہم یہ واضح کریں گے کہ مستشرقین کی وہ تمام کوششیں جو قرآن اور کتبِ سابقہ میں مماثلت تلاش کرنے کیلئے کی گئی ہیں درحقیقت تحصیلِ حاصل ہی ہے۔ کیونکہ قرآن نے ہمیشہ اس بات کا ذکر علی الاعلان کیا ہے کہ اس کا منبع بھی وہی ہے جو پہلی کتابوں کا تھا یعنی وحی الٰہی۔

قرآن ببانگ دہل بغیر کسی منطقی یا فلسفیانہ موشگافی کے اعلان کرتا ہے کہ اس نے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں کی بلکہ یہ اس ہدایت کا تسلسل ہے جس کا آغاز، آدم علیہ السّلام سے ہوا تھا۔ جو لاتعداد انبیاء و رسل تشریف لائے، ان سب کا تعلق اسی ہدایتِ ربّانی سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کیلئے جاری کی تھی۔ اسی ہدایت کے نزول کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (1)

"اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام سے فرمایا کہ تم زمین پر اتر جاؤ پس جب میری طرف سے ہدایت آئے تو، جس نے اس ہدایت کی پیروی کی اس کو کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا اور جنہوں نے اس ہدایت کو جھٹلا دیا اور اس کا انکار کیا تو یہی لوگ آگ میں ڈالے جائیں گے اور وہ ہمیشہ اسی آگ میں پڑے رہیں گے۔"

اسی ہدایت کے بارے میں قرآن بتلاتا ہے کہ ہم نے ہر قوم اور امّت کیلئے ھادی اور رسول مبعوث کیا ہے:

﴿لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (2)

"ہر قوم کیلئے ھادی بھیجا گیا ہے۔"

---

(1) البقرۃ:۳۸

(2) الرعد:۷

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ[1]

"ہر امت کیلئے رسول بھیجا گیا ہے۔"

اور ایک مقام پر ہے:

﴿وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾[2]

"کوئی امّت بھی ایسی نہیں گزری کہ اس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔"

ان تمام انبیاء کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کی گئی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہی بھیجا تھا گویا ان سب انبیاء کا مقصدِ بعثت اور منبع ہدایت ایک ہی ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اعلان کیا ہے کہ وہ نئی بات پیش نہیں کرتا بلکہ وہ پہلی کتابوں والی تعلیمات پیش کرتا ہے۔ ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ﴾[3] البتہ اس کی ہدایت کامل، جامع اور آخری ہے۔ اور اس نے تمام تحریف و تغیر کی نشاندہی کی ہے جو لوگوں نے اس میں کردی تھی۔ پہلی کتابوں کے ساتھ اپنے تعلق کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾[4]

"آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی گئی جو اس سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل بھی نازل کی اور حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب یعنی قرآن بھی نازل کیا۔"

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا﴾[5]

"بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے وحی بھیجی نوح اور ان کے بعد کے نبیوں کو

---

(1) یونس: ۴۷

(2) فاطر: ۲۴

(3) الاحقاف: ۹

(4) آل عمران: ۳، ۴

(5) النساء: ۱۶۳

اور ہم نے وحی کی ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کو اور عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان علیہم السلام کی طرف۔ اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔"

اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۸۵ سے ۸۸ تک بھی یہی بات بیان کی گئی ہے سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر ۴۶ میں کہا گیا ہے۔

﴿وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (1)

"انہی کے پیچھے قدموں پر ہم نے عیسٰی علیہ السلام کو بھیجا جو مریم کے بیٹے ہیں۔ تصدیق کرتے ہیں تورات کی جو ان سے پہلے تھی۔ اور انہیں انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور وہ توراۃ کی تصدیق کرنے والی ہے اس میں ہدایت اور متقی لوگوں کیلئے نصیحت ہے۔"

اس کے بعد آیت نمبر ۴۸ میں اسی کا اگلا مرحلہ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (2)

اور آپ پر ہم نے کتاب اتاری تحقیق وہ تصدیق کرتی ہے اس کی جو اس سے پہلے ہے اور سب پر شامل اور سب کی (صداقت و تعلیمات کی) محافظ ہے۔ پہلے مذاہب کے ساتھ اسلام کے تعلق ہی کے بارے میں سورۃ الشوریٰ میں ہے۔

﴿كَذَٰلِكَ يُوحِي إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (3)

"جس طرح آپ سے پہلے یہ کتابیں نازل کی گئیں اسی طرح آپ پر اللہ عزیز و حکیم کی طرف سے یہ کتاب نازل کیا گیا ہے۔"

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا ۔۔۔۔۔۔ تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن

(1) المائدۃ:۴۶

(2) المائدۃ:۴۸

(3) الشوریٰ :۳

يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ﴾[1]

"راہ ڈال دی دین میں تمھارے لئے۔ وہی جو کہا تھا نوح نے اور ان لوگوں نے جن کی طرف ہم نے وحی نازل کی اور جو کچھ ہم نے کہا تھا، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ کو کہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ نہ ڈالیں۔"

ان کتب کو قرآن مجید اپنے وقت کی سچی کتابیں قرار دیتا ہے اور ان سب کا منبع ایک ہی قرار دیتا ہے اور ان بنیادوں پر ان کے ساتھ تعلق کا اعلان کرتا ہے تو پھر مستشرقین کا قرآن اور پہلی کتب میں تعلق ثابت کرنے کیلئے اقدارِ مشترک تلاش کرنا محض تحصیل حاصل ہی ہے۔

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾[2]

"اور اسی طرح ہم نے آپ ﷺ کی طرف قرآن عربی میں وحی کی۔"

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا﴾[3]

"اور اسی طرح ہم نے آپ ﷺ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (وحی) بھیجی۔"

﴿وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[4]

"اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ کسی نے اسے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہو، اللہ نے نہ اتارا ہو بلکہ یہ وحی کی ان باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان سے پہلے آچکی ہیں اور اللہ نے جو باتیں لوح محفوظ میں لکھ رکھی ہیں، ان کی تفصیل بیان کرتا ہے اس میں ذرہ بھر بھی شک کی گنجائش نہیں ہے یہ اس ذات کی طرف سے ہے جو تمام جہانوں کی پرورش کرتی ہے۔"

سورۃ یوسف میں فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾[5]

"یقیناً ان واقعات میں عقل اور ہوش رکھنے والوں کے لئے بڑا عبرت کا سامان ہے یہ کوئی

---

(1) الشوریٰ:۱۳

(2) الشوری:۷

(3) الشوری:۵۲

(4) یونس :۳۷

(5) یوسف:۱۱۱

ایسی بات نہیں ہے جو جھوٹ موٹ گھڑلی گئی ہو، بلکہ اس سے پہلے جو کتابیں آچکی ہیں ان کی تصدیق ہے، اور ہر بات کی وضاحت اور جو لوگ ایمان لائیں ان کے لیئے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے۔"

سورۃ نمل میں فرمایا:

﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ (1)

"حقیقت یہ ہے کہ قرآن بنی اسرآئیل کے سامنے اکثر ان باتوں کی حقیقت واضح کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں (قرآن دوسرے مقامات پر نشاندہی کرتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنی کتابوں کے بارے میں ازراہ بغاوت اختلافات کا شکار ہو گئے تھے مثلا سورۃ شوریٰ آیت نمبر 14) ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید خود گزشتہ کتابوں سے اپنا تعلق توڑتا نہیں بلکہ جوڑتا ہے۔"

سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر 2 ﴿مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ﴾ اور سورۃ الشعراء کی آیت نمبر 5 ﴿وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ﴾ میں فرمایا گیا کہ قرآن کوئی نئی نصیحت نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی ایسی ہی نصیحت نازل ہوتی رہی ہے لیکن انکار کرنے والے لوگ اس نصیحت سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

قرآن مجید تو مختلف مقامات پر گزشتہ کتابوں کی تعریف و توصیف کرتا ہے اس سلسلے میں سورۃ الانعام آیت نمبر 154، سورۃ المائدہ آیت نمبر 46، 44 وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

مستشرقین کے اعتراض کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے توراۃ میں مذکورہ واقعات سے اختلاف کیا ہے اور ان اختلافات کو وہ قرآن کا نقص اور غلطی قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ جب خود عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد تسلیم کرتی ہے کہ توراۃ و انجیل میں لاتعداد تحریفات ہو چکی ہیں۔ (2) تو اس صورت میں اسلامی ماخذ یعنی قرآن کی بات کو اصولی طور پر

---

(1) نمل: ۷۶

(2) تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل حوالہ جات دیکھیں

(i) بائبل سے قرآن تک، دوسرا باب، ص: 13 تا 162

(ii) افغانی، شمس الحق، علوم القرآن، ص: 136-141

(iii) وھبہ زحیلی، تفسیر المنیر، جلد ششم، ص 126، دار الفکر، بیروت، 1411ھ

(iv) حقانی، عبدالحق، تفسیر حقانی، جلد اول، ص: 173-195، میر محمد کتب خان، کراچی

تسلیم کیا جائے گا۔

مستشرقین اور ان کے مشرقی ہمنواؤں نے یہ جو کہا ہے کہ قرآن مجید عموماً عیسائیوں کی ایسی کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو چکی تھیں آپ ﷺ نے ان کتابوں سے قرآن اس لئے اخذ کیا تا کہ لوگوں کیلئے اس کی اصل معلوم کرنا آسان نہ رہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں تو عام توراۃ وانجیل یا اس کا ترجمہ عرب میں مہیا نہ تھا تو یہ Apocryphal Books کہاں سے میسر آ گئیں۔ یہ کتابیں تو وہ لوگ بھی نہیں جانتے تھے جن کے بارے میں مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ آپ ﷺ کے معاون تھے۔

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تردید خود مستشرقین کی زبانی:

اس سلسلے میں راڈویل لکھتے ہیں کہ ہمارے پاس اس امر کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ ہماری کتبِ مقدسہ کبھی حضرت محمد ﷺ کو دستیاب ہو گئی ہوں۔ گویہ صرف ممکن ہے کہ عہد نامہ عتیق یا عہد عتیق کے ٹکڑے خدیجہؓ، ورقہ یا دیگر عیسائیوں کے ذریعے ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ ہمیں صاف طور پر کوئی سراغ اس سلسلے میں نہیں ملتا کہ کوئی عربی ترجمہ عہدِ عتیق یا جدید کا محمد ﷺ کے زمانے سے پہلے موجود تھا۔ Rodwell (1808-1900) کے الفاظ میں

" We have no evidence that Muhammad had access to the Christian Scriptures, though it is just possible that fragments of the Old or New Testament may have reached him through Chadijah or Waraka, or other Meccan Christians, possessing MSS. of the sacred volume."(1)

"ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی رسائی عیسائیوں کی کتابوں تک ہو سکی ہو گی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ عہد نامہ جدید کے کچھ ٹکڑے خدیجہ یا ورقہ یا مکہ کے دوسرے عیسائیوں کے ذریعے جن کے پاس عہد نامہ عتیق کے نسخے موجود ہوں گے، کے ذریعے آپ کو مل گئے ہوں۔"

راڈویل اگرچہ قرآن مجید کو خدا کا کلام نہیں کہتا تاہم وہ اس بات کی بھی نفی کرتا ہے کہ حضور ﷺ نے قرآن مجید یہود و نصاریٰ کی مشکوک کتب اور کچھ بدعتی فرقوں کی کتابوں سے اخذ کر لیا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

(1) Rodwell, J.M.: The Koran, P.10

It has been supposed that Muhammad derived many of his notions concerning Christianity from Gnosticism and that it is to the numerous gnostic sects the Koran allude when it reproaches the Christians with having "split up their religion into parties". But for Muhammad thus to have confounded Gnosticism with Christianity itself, its prevallence in Arabia must have been far more universal than we have any reason to believe it realy was.(1)

"یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ محمد نے عیسائیوں کے بارے میں نظریات ملحد لوگوں سے لیے ہوں گے۔ اس لیے کہ انہی گمراہ فرقوں کے بارے میں قرآن متعدد مقامات پر کہتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنے مذہب کو کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن محمد ﷺ نے عیسائیت کو ان ملحد عیسائی فرقوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔"

وہ لکھتے ہیں:

In fact we have no historical authority for supposing that the doctrines of these heretics were taught or professed in Arabia at all.(2)

ترجمہ: "درحقیقت ہمارے پاس کوئی ایسی تاریخی سند موجود نہیں ہے کہ ہم فرض کریں کہ تحریف شدہ فرقوں کی تعلیمات عرب میں کہیں پڑھائی جاتی ہوں گی۔"

بلکہ راڈویل (1808-1900) کے خیال میں تو:

It is certian, on the other hand, that the Basibidans, Valentinians and other gnostic sects had either died out or been absorbed in to the orthodox church, towards the middle of the fifth century and had disappeared from Egypt

(1) IBID

(2) IBID

before the sixth.[1]

ترجمہ: "دوسری طرف یہ بات یقینی ہے کہ یہ منحرف فرقے پانچویں صدی کے وسط تک یا تو ختم ہو چکے تھے یا قدیم چرچ میں جذب ہو چکے تھے اور مصر سے چھٹی صدی عیسوی تک غائب ہو چکے تھے۔"

اس سلسلے میں مولانا عبدالمنان لکھتے ہیں:

The majority of Jewish scholars adopted an antagonistic position which was far from the benevolent attitude of teachers. Those of the Israelite scholars who were impartial enthusi- astically welcomed the Prophet(S.A.W.W) in Madina and declare their conversion to Islam, thereafter as disciples recogniezing him as their master. Between the two categories of the hostile or the submassive, there was no place for a third group of friendly tutors.[2]

"یہودی علماء کی ایک بہت بڑی تعداد نے معاندانہ روش اختیار کی، جو حضور اکرم ﷺ کو کچھ فائدہ دینے والے رویہ سے بہت دور تھی۔ اسرائیلی علماء کے دوسرے طبقے نے جو حضور ﷺ کے بارے میں غیر جانبدار تھے انہوں نے حضور ﷺ کو پر جوش انداز سے خوش آمدید کہا اسلام قبول کیا۔ یہ حضور ﷺ کے پیروکار بنے۔ ان دو طبقات کے درمیان میں کوئی تیسرا طبقہ نہ تھا کہ آپ نے ان سے دوستانہ انداز سے ان کی کتب سیکھ لیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ہم مستشرقین کے اس قسم کے مفروضوں کو تسلیم کریں کہ حضور ﷺ نے مدینہ کے یہود سے کچھ حاصل کیا تھا۔ اور آپ کے یہودیوں کے ساتھ ابتدا میں بڑے گہرے تعلقات تھے۔

پادری جان فنڈر نے بھی میزان الحق کے تیسرے باب میں صاف طور پر کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ تورات وانجیل نہیں پڑھے ہوئے تھے۔ یعنی عبرانی یا یونانی زبان جن میں توراۃ وانجیل موجود تھیں، آپ ﷺ ان سے ناواقف تھے۔[3]

---

(1) IBID

(2) Mannan, The sublime Quran and orientalism, P.26

(3) فنڈر، میزان الحق، پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی، لاہور، ۱۸۹۲ء

بعض مستشرقین اوران کے ہم نوا مقامی مشنریوں نے اس طرح بھی شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ پہلے عیسائی تھیں اور انہیں پہلی کتابوں کا علم تھا۔ اسی طرح بعض کہتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل کے پاس سے حضور ﷺ نے قرآن اخذ کر لیا۔ حضرت خدیجہ یا ورقہ بن نوفل سے قرآن کی تیاری میں مدد لینے کے حوالے سے مستشرقین محض اپنے مخصوص قیاس ہی سے یہ سب کچھ کہتے ہیں۔ کسی عدالتی فیصلے یا کسی مسئلے میں حتمی فیصلے یا کسی مسئلے میں حتمی فیصلے اور اصولی موقف اختیار کرنے کے لئے ہر اعتبار سے ہر طرح کے شواہد کی مکمل چھان پھٹک کی جاتی ہے کسی شخص کو معمولی سزا دینے کے لئے بھی ماہرینِ قانون کے طے شدہ معیارات موجود ہیں ان کی روشنی میں بحث و تمحیص اور احقاق حق کے بعد ہی کوئی عدالت فیصلہ کرتی ہے لیکن کیا قرآن کے بارے میں مستشرقین کی ایک قیاس آرائی کافی ہو گی کہ قرآن ورقہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے حاصل کر لیا گیا۔ کوئی شواہد تو ہونے ضروری ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کا ذکر تو کیا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اخلاقی حوصلہ افزائی اور مالی اعانت نے میرا بڑا ساتھ دیا لیکن آپ نے اس طرح کی مدد حاصل کرنے کا ذکر نہیں کیا آپ صادق و امین تھے اگر مستشرقین کی بات کو درست مانیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا ضرور اعتراف کیا ہوتا۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ آپ اُمیّ تھے۔

ورقہ اگرچہ عیسائی تھے لیکن جو احتمالات پیش کئے گئے ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں اور محض شکوک وشبہات پر مبنی ہیں۔ ان شکوک وشبہات سے اس ثابت شدہ امر کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا کہ حضور ﷺ اُمّی تھے۔ اگر درحقیقت آپ ﷺ اُمّی نہ ہوتے تو آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ اور رفقاء اس امر میں کسی طرح سکوت نہ فرماتے۔ آپ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ اور عزیز و اقارب اور آپ ﷺ کے چچا جنہوں نے آپ ﷺ کو پالا تھا اس سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے اور نہ ہی اس نہایت درجہ کی اعلیٰ عقل کا جس کا اعتراف منکرین کو بھی ہے یہ مقتضاء ہو سکتا تھا کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کے سامنے خلافِ واقع اپنے آپ کو اُمّی کہتے۔ قرآن میں بھی آپ ﷺ کو اُمّی کہا ہے۔[1] اس ساری بات سے قطع نظر آپ ﷺ کو اس خفیف سی بات کو چھپانے کا فائدہ کیا ہو سکتا تھا؟ کیونکہ پڑھا لکھا ہونا منصبِ نبوت کے کسی طرح مخالف نہیں ہو سکتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پڑھے لکھے تھے۔ حضور ﷺ کے پڑھا لکھا ہونے سے بھی آپ ﷺ کی نبوت اور قرآن کے اعجاز پر کچھ حرف نہیں آتا تھا۔

کیا حضور ﷺ نے کچھ آدمی مقرر کر رکھے تھے جو آکر آپ ﷺ کو اطلاعات بہم پہنچاتے تھے اور قرآن کا ماٰخذ یہی لوگ تھے؟ قرآن مجید نے اس کا ردّ ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ جن لوگوں کی طرف

(1) الاعراف: ۱۵۷

قرآن لکھوانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو عجمی غلام ہیں اور قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس کی ایک سورت کی مثل تمام اہل عرب چیلنج کے باوجود نہیں لاسکے۔ فصاحت وبلاغت کا دعویٰ کرنے والے تو ایک سورت نہ لا سکے اور عجمی غلام پوری کتاب لے آئے۔ یہ بات عقل کے دائرے میں نہیں آتی۔ ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ یہود ونصاریٰ آپ کے دشمن تھے۔ ان میں سے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں نے محمد ﷺ کو یہ قرآن بنوانے میں مدد کی ہے۔ اگر لوگوں سے قصے کہانیاں اکھٹی کروائی جائیں تو جو قصے اکھٹے کرنے والے تھے وہ سارا راز فاش کردیتے۔

امام رازیؒ (1209م) نے اس جگہ جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ نقطہ بھی ہے کہ جب قرآن نے یہ چیلنج دیا کہ تم اس جیسا کلام لے آؤ، تو جو شخص نبی کریم ﷺ کو قرآن لکھا رہا تھا یا ایک سے زائد لوگ لکھوا رہے تھے، وہ فوراً سارا راز فاش کردیتے اور منظر پر آکر لوگوں کو بتادیتے کہ ہم آپ کو قرآن لکھوا رہے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ سے انہیں کیا مفادات مل سکتے تھے بلکہ وہ اس کے مقابلے میں یہ راز فاش کرکے اہل مکہ کے ہیرو بن سکتے تھے۔

قرآن مجید میں غیب کی خبریں، گزشتہ قوموں کے حالات، انسانی فلاح وکامرانی کے اصول، قوموں اور افراد کی تباہی کے اسباب، لوگوں کو سمجھانے کے لئے بلند پایہ مثالیں اور علم وحکمت کی باتیں موجود ہیں کہ جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن میں بیان شدہ حکمتوں پر قیامت تک اہل علم وحکمت غور کرتے رہیں گے وہ تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے، لیکن قرآن کے اسرار ختم نہ ہوں گے، اگر ان تمام خوبیوں کا مالک کوئی ایک بندہ تھا (جو قرآن لکھوا رہا تھا) تو اس کا تو چرچا عام ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ اس شخص کا نام بھی کسی کو معلوم نہ ہو پایا۔ اگر معلوم ہوا بھی تو حتمی طور پر معلوم نہیں ہوا۔ یا ان چند لوگوں کو بھی معلوم ہوا جنھوں نے اس سلسلے میں بہت تحقیق کی۔ (1)

جن لوگوں کا نام اس سلسلے میں لیا جاتا ہے ان کا تذکرہ علامہ ابن قیم نے زادالمسیر میں کیا ہے اس کا اختصار سے یوں ذکر کیا جاسکتا ہے۔

☆ عکرمہ سے ابن عباس نے روایت کیا ہے یہ شخص بنی مغیرہ کا غلام تھا۔
☆ یہ بن عامر بن لوئی کا غلام تھا۔
☆ یہ ملعام نامی عیسائی عجمی تھا۔ یہ روایت بھی ابن عباس سے ہے۔
☆ یہ ایک شخص تھا جو وحی لکھتا تھا۔ بعد میں مرتد ہو گیا۔

(1) مفاتیح الغیب، جلد چوبیس، ص: 44، زیر آیت نمبر 5 الفرقان

☆ جابر نامی شخص تھا۔[1]

اس سلسلے میں مولانا مودودی (1321ھ) فرماتے ہیں:

"حضور ﷺ کے بارے میں خیال یہ تھا کہ آپ اُمّی ہیں۔ خود مطالعہ کر کے تو معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ پہلے انہوں نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ چالیس برس کی عمر تک ان باتوں میں سے کوئی بات بھی آپ نہ جانتے تھے۔ جو اس وقت آپ کی زبان سے نکل رہی تھیں۔ اب آخر یہ معلومات کہاں سے آگئیں؟ اس کا سر چشمہ یقیناً کچھ پہلے لوگوں کی کتابیں ہیں۔ جن کے اقتباسات راتوں رات چپکے سے ترجمہ کروائے جاتے ہیں۔ انہیں یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے۔ پھر انہیں یاد کر کے دن کو ہمیں سنا دیتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند لوگوں کے نام بھی لیا کرتے تھے۔ ان میں عدّاس (جو حویطب بن عبد العزیٰ کا آزاد کردہ غلام تھا) یَسار (علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام) اور جبْر (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔"

یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو ردّ کرنے کیلئے، حضور ﷺ کے مآخذ علم کی نشاندہی کر دینے سے بڑھ کر اور کون سا اعتراض وزنی ہو سکتا تھا۔ لیکن اس استدلال میں کوئی وزن اور حقیقت نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے کوئی لمبا چوڑا استدلال نہیں کیا۔ بلکہ بات صرف اس قدر کہی ہے کہ فقد جاءو ظلماً و زوراً (یقیناً تم ایک ظلم اور زیادتی کی بات کر رہے ہو) گویا یہ کہہ کر تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو۔ صریح بے انصافی کی بات کر رہے ہو۔ سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو۔ یہ تو اس خدا کا کلام ہے جو آسمان وزمین کے بھید جانتا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ مخالفت کے شدید ماحول میں اس شد و مدّ کے ساتھ ایک اعتراض مخالفین کی طرف سے پیش کیا جائے اور اس کو یوں حقارت سے ردّ کر دیا جائے۔ پھر مزید حیرانی اس وقت ہوتی ہے جب اس مختصر جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیل اور وضاحت کا مطالبہ کیا اور نہ ہی نئے ایمان لانے والوں کے اذہان میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ نہ ہی کبھی مخالفین نے یہ کہا کہ دیکھو ہمارے اتنے بڑے الزام کا جواب ان سے بن نہیں پڑا اور ہمیں محض جھوٹا اور ظالم کہہ کر بات ٹال دی گئی ہے۔[2]

اس حیرت کا جواب اس ماحول سے مل جاتا ہے جس میں ان لوگوں نے یہ اعتراض اٹھایا تھا۔

☆ پہلی بات یہ تھی کہ مکّے کے وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ان کیلئے یہ بات مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی کتابوں کے ترجمے کر کے محمد ﷺ کو یاد کرواتے ہیں، ان لوگوں کے گھروں پر چھاپے مارتے اور وہ سارا مواد وذخیرہ برآمد کر کے عوام کے سامنے لا رکھتے جو ان کے خیال کے مطابق اس کام کیلئے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اس وقت چھاپا مار کر سب

---

(1) زاد المسیر، جلد چہارم، ص: 492-493، مکتب اسلامی، بیروت، 1407

(2) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، ۳، ص: ۴۳۵-۴۳۷

کو پکڑ کر عوام کے سامنے پیش کر سکتے تھے جب یہ کام جاری ہوتا اور لوگوں کو دکھا دیتے کہ دیکھو یہ قرآن گھڑا جا رہا تھا۔ حضرت بلالؓ کو تپتی ریت پر لٹانے والوں کو کوئی ضابطہ یا آئین مانع نہ تھا۔ وہ ایک ہی دن یہ کام کر کے سارا مسئلہ بے نقاب کر سکتے تھے اور نبوت محمدی کے خطرے کو مٹا سکتے تھے لیکن وہ تو محض زبانی اعتراض کر تے رہے اور ایک دن بھی فیصلہ کن قدم انہوں نے نہیں اٹھایا۔(1)

☆ دوسری بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہ جن لوگوں کے نام لیتے تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے مکہ ہی کے رہنے والے تھے۔ ان لوگوں کی صلاحیتیں اور قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکّہ کے لوگ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ حضور ﷺ جو کچھ پیش کر رہے تھے وہ کس پائے کا کلام تھا۔ اس کی زبان کی شان کیا تھی۔ اس کا زورِ کلام، اس کی ادبی حیثیت، اس کے خیالات کی بلندی اور مضامین کا تنوع اور رفعت کس درجے کی تھی اور جن لوگوں کا نام لیتے تھے وہ کس درجے کے ہیں، اسی وجہ سے مشرکین میں سے کسی نے بھی اس اعتراض کو محض اعتراض کے طور پر ہی پیش کیا اور اسے انہوں نے کوئی وزن نہیں دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس ان کے دل کے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں ورنہ اس قول میں کسی شبہے کے قابل بھی جان نہیں ہے جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو سوچ سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انہوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلا لیا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ اور وہ بھی چپکے چپکے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا بھی حصہ ان کو نہ ملے۔(2)

☆ تیسری بات یہ تھی کہ یہ سب لوگ جن کے نام لئے جا رہے تھے یہ تو بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقتور قبیلے کی حمایت کے بغیر جی نہ سکتا تھا۔ آزاد ہونے کے بعد بھی غلام اپنے سابق آقا کے وِلاء (سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کیلئے زندگی کا سہارا ہوتی تھی اب ظاہر بات تھی کہ اگر حضور ﷺ ان لوگوں کی بدولت قرآن پیش کر کے شہرت حاصل کر رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپ ﷺ کے شریک نہ ہو سکتے تھے آخر اس شخص کے وہ مخلص رفیق اور سچے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انہی سے باتیں سیکھتا ہو اور دن کو دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی اور غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

مگر کون صاحبِ عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بناء پر وہ ساری قوم کے مغضوب و مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی امید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بات بھی سوچنے کی تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کروالیں۔ اس موقع پر انہوں نے فائدہ کیوں نہ اٹھایا اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انہی سے یہ اعتراف کروالیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر نبوت کی یہ دکان چمکائی جارہی ہے۔ (1)

☆ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب حضور ﷺ پر ایمان لائے اور اس ضرب المثل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابہ کرامؓ، حضور ﷺ کے ساتھ رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ "بناوٹی اور سازشی نبوت" پر خود وہی لوگ گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لے آئیں جنہوں نے اس کے بنانے کی سازش میں حصہ لیا ہو۔ اگر بالفرض یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہل ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ضرور ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عدّاس، یسار اور جبر کے بل بوتے پر اور نبی کریم ﷺ کے دست راست بنیں ابو بکرؓ (13ھ) و عمرؓ و ابو عبیدہؓ؟ (2)

☆ اسی طرح یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جاتا تھا تو وہ حضرت زید ابن حارثہؓ، حضرت علی ابن ابی طالبؓ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) سے کس طرح مخفی رہ سکتا تھا جو شب و روز حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ کے درِ دولت پر لوگوں سے مخفی طور پر یہ کام جاری تھا تو اس بات کا علم ازواجِ مطہرات کو تو ضرور ہوتا۔ حضرت خدیجہؓ، حضور ﷺ کی صداقت و دیانت کی بناء پر ہی آپ ﷺ کے عقد میں آئی تھیں اور اسی صداقت و دیانت کی بنیاد پر وہ سب سے پہلے اسلام لائیں کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ سچ ہی کہا ہے کیا ایک ایسی بیوی جس کے سامنے گھر میں لوگوں سے خفیہ طور پر نبوت کا مواد تیار کیا جارہا ہو وہ کبھی حضور ﷺ کی صداقت کی گواہ بن سکتی تھی؟

اگر اس الزام میں صداقت کا برائے نام شائبہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

ساتھ حضور ﷺ پر ایمان لاتے اور آپ ﷺ کی حمایت میں اس قدر صعوبتیں برداشت کرتے۔ انہی وجوہ کی بناء پر ہر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض بالکل بے وزن تھا۔ اس لئے قرآن میں اس اعتراض کو ایک وزنی اعتراض کی حیثیت سے جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا بلکہ اس کا ذکر محض یہ دکھانے کیلئے کیا گیا کہ دیکھ لو! حق دشمنی میں یہ لوگ کس طرح اندھے ہوگئے ہیں کہ کس طرح صریح جھوٹ اور بے انصافی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔

کیا حضور ﷺ نے عیسائی راہبوں سے قرآن حاصل کیا تھا؟

مستشرقین نے پورا زورِ قلم صرف کرتے ہوئے قرآن مجید کی الہامی حیثیت کا انکار کرتے ہوئے طرح طرح کا نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے۔ ان میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پہلی امتوں کے حالات و واقعات، عرب کے یہود و نصاریٰ سے سیکھ لئے۔ اس سلسلے میں بحیرہ اور نسطورہ کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ راہب آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے جو توحید کا قائل تھا اس طرح آپ ﷺ نے اس سے مل کر توحید کا سبق حاصل کیا۔

جب ہم مستشرقین کے اس نقطہ نگاہ کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی اتنی بات تو سمجھ سکتا ہے کہ سفر شام کے دوران کیا ایک مختصر سی ملاقات میں ان راہبوں نے اپنے سینے کی تمام معلومات حضور ﷺ کے سامنے ظاہر کر دیں۔ آپ ﷺ نے بھی راتوں رات ان تمام باتوں کو اس طرح ذہن نشین کر لیا کہ آپ ﷺ وہ کبھی بھول نہ سکے۔ نہ صرف آپ ﷺ ان کو بھول نہ سکے بلکہ ان کی بنیاد پر ایک انقلابی دین کی بنیاد رکھ دی اور انقلاب برپا کر کے دکھا بھی دیا۔ اول تو یہ دعویٰ ہی بے دلیل اور بے بنیاد ہے کہ بحیرہ اور نسطورہ آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ ایسی روایت مل بھی کیسے سکتی تھی جبکہ آریوسی فرقے کو تو چوتھی صدی عیسوی میں ہی بدعتی اور ملحد Heretic قرار دے دیا گیا تھا اور اس وقت تو ان کا نام لینا بھی جرم تھا۔ Athanasius (اتھاناسئوس) نے اپنے ہم نواؤں کی مدد سے اس فرقے کا استیصال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس بے کس فرقے میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ساتویں صدی عیسوی تک سانس لے سکتا۔

مختلف مستشرقین کے ہاں اس نقطہ نگاہ کا ذکر ملتا ہے۔ رچرڈ بیل نے اس سلسلے میں مستشرقین کے اقوال تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ (1)

---

(1) Bell, Richard.: The Origin of Islam in its Christian Environment, P. 21

پھر یہ بات مزید محل نظر ہے کہ اس متروک و مبغوض فرقے کا ایک شخص بصریٰ جیسی اہم جگہ کی ایک خانقاہ کا سربراہ بنا بیٹھا ہو۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ ان ملاقاتوں کی مدت انتہائی مختصر تھی جن میں تعلیم و تعلم کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مزید یہ کہ ان ملاقاتوں کے موقع پر دیگر لوگ بھی موجود تھے۔ راہب نے کوئی خفیہ اور الگ ملاقات تو آپ ﷺ سے نہیں کی تھی۔

بحیرہ راہب سے ملاقات کے بارے میں جہاں جہاں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سب سے طویل روایت جہاں ملتی ہے اسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ اس سلسلے میں ساری وضاحت ہو جائے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) سے مروی ہے ایک مرتبہ ابو طالب قریش کے کچھ سرداروں کے ساتھ شام کے سفر کو گئے۔ شام میں جس جگہ جا کر اترے وہاں ایک شخص راہب تھا ان کا گزر اس سے پہلے بھی اس راہب کے پاس سے ہوتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ کبھی بھی قافلے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ اس مرتبہ قافلہ جب وہاں جا کر اترا تو راہب خلافِ معمول اپنی خانقاہ سے باہر نکل آیا اور متجسسانہ نظروں سے ایک ایک کو دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے حضور ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"هذا سيد العالمين هذا رسول رب العالمين يبعثه الله رحمة للعالمين"[1]

"یعنی یہی ہے تمام جہانوں کا سردار۔ یہی ہے پروردگارِ عالم کا رسول۔ جن کو اللہ نے کائنات کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

سردارانِ قریش نے راہب سے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ راہب نے کہا کہ جب آپ گھاٹی سے نکلے تو کوئی شجر و حجر ایسا نہیں تھا جس نے اس کو سجدہ نہ کیا ہو اور شجر و حجر نبی ہی کیلئے سجدہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ ﷺ کی مہر نبوت کو بھی پہچانتا ہوں جو سیب کی طرح آپ کے شانے کے نیچے ہے۔ راہب یہ کہہ کر واپس ہو گیا اور پورے قافلے کیلئے کھانا تیار کیا۔ جب سب لوگ کھانا کھانے کیلئے حاضر ہو گئے تو آپ ﷺ ان میں نہ تھے۔ راہب نے آپ ﷺ کے بارے میں پوچھا معلوم ہوا اونٹ چرانے گئے ہوئے ہیں۔ آدمی بھیج کر آپ ﷺ کو بلایا گیا۔ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو بادل آپ ﷺ پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ قوم کے قریب آئے تو دیکھا کہ لوگ آپ سے پہلے درخت کے سائے میں بیٹھ چکے تھے اور اب سایہ دار جگہ باقی نہ رہی تھی۔ آپ ایک جانب بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ کے بیٹھتے ہی درخت کا سایہ آپ ﷺ کی طرف جھک گیا۔ راہب نے کہا درخت کے سائے کو دیکھو وہ کس طرح آپ ﷺ کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اور پھر اس نے قریش کے سرداروں کو کھڑے ہو کر کہا کہ آپ انہیں روم کی طرف نہ

---

(1) ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی بدء نبوۃ النبی ﷺ، حدیث نمبر 3620 (کتب ستہ)

لے جائیں۔ رومی اگر آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی علامات سے پہچان لیں گے تو آپ ﷺ کو قتل کر ڈالیں گے۔ اسی گفتگو کے دوران راہب کی نگاہ اٹھی تو دیکھا کہ روم کے سات آدمی کسی کی تلاش میں ادھر آرہے ہیں۔ راہب نے پوچھا تم کس لئے نکلے ہو؟ رومیوں نے کہا ہم اس نبی کی تلاش میں نکلے ہیں جس کی بشارت توراۃ اور انجیل میں دی گئی ہے۔ جو اس مہینے میں سفر کیلئے نکلنے والا ہے۔ ہم نے اپنے آدمی ہر سمت میں روانہ کئے ہیں۔

راہب نے کہا! اچھا یہ بتاؤ کہ جس شے کا ارادہ اللہ نے فرمالیا ہے کیا اس کو کوئی ٹال سکتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس کے بعد رومیوں نے راہب سے عہد کیا کہ وہ اب اس نبی کے درپے نہیں ہوں گے اور وہیں راہب کے پاس ٹھہر گئے۔ راہب نے پھر قریش سے قسم دے کر پوچھا کہ تم میں سے اس کا ولی کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابو طالب ہیں۔ اس کے بعد راہب مسلسل ابو طالب کو قسمیں دیتا رہا کہ تم انہیں ہر صورت میں واپس بھیج دو۔ یہاں تک کہ ابو طالب نے انہیں واپس بھیج دیا۔ (1)

اس سفر کے بارے میں تین روایات ملتی ہیں:

1۔ ایک روایت کے مطابق اس سفر کے موقع پر آپ ﷺ کی عمر مبارک نو برس تھی۔ (2)

2۔ دوسری روایت کے مطابق اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک بارہ برس تھی۔ علامہ زرقانی (1122ھ) فرماتے ہیں اکثر علماء کا رجحان اسی طرف ہے کہ اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک بارہ برس تھی۔ (3)

3۔ علامہ ابن عبد البرّ (463ھ) فرماتے ہیں کہ اس سفر کے موقع پر آپ ﷺ کی عمر تیرہ برس تھی۔

ان تینوں میں سے کسی ایک روایت کو تسلیم کریں اور مذکورہ صدر طویل تفصیلی روایت کے بارے میں بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ صحیح روایت ہے، تب بھی اس بات کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ آپ ﷺ نے اس عمر میں اور اس ماحول میں ہونے والی ملاقات میں اس قدر قلیل وقت میں بحیرہ راہب سے کچھ سیکھ لیا ہو گا۔

نسطورہ راہب سے ملاقات تو بحیرہ والی ملاقات سے بھی مختصر تھی۔ ان مختصر سی ملاقاتوں کی بنیاد پر اگر کوئی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں سے پہلی امتوں کی پوری تاریخ حاصل کر لی تھی تو یہ بات نہ

---

(1) ترمذی، کتاب المناقب النبی، باب ما جاء فی بدء نبوۃ النبی، حدیث نمبر 3620

(2) السیرۃ الحلبیہ، جلد اول، ص: 130، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، 1382

(3) زرقانی، شرح مواہب اللدنیہ، جلد اول، صفحہ 193

صرف کوتاہ بینی کی دلیل ہے بلکہ حقائق کو نظر انداز کرنے کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ بعض روایات میں ایک سفر کے موقع پر آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس برس تھی۔ ہر صورت میں یہ واقعہ نبوت سے ایک طویل عرصہ قبل ہوا۔ کیا آپ ﷺ نے اس طویل عرصے میں یہ سب کچھ یاد رکھا؟ کسی کو کانوں کان خبر نہ دی کہ آپ ﷺ کے ذہن میں کیا کیا منصوبے موجیں مار رہے ہیں۔[1]

مستشرقین کس طرح رائی کا پہاڑ بناتے ہیں اس کا اندازہ مذکورہ بالا واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ محض دو یا تین واقعات کی روایت ملتی ہے۔ ان دو سفروں کی بنیاد پر حضور ﷺ کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ آپ ﷺ اکثر و بیشتر عیسائی علاقوں کے سفر کیا کرتے تھے، حقائق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ مستشرقین کو ان سفروں کی خبر تو اسلامی مآخذ ہی سے ہوئی اور اسلامی مآخذ میں تو صرف دو سفروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ آخر مستشرقین کس بنیاد پر یہی رٹ لگاتے چلے جاتے ہیں کہ حضور ﷺ اکثر عیسائی علاقوں کے سفر کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں باڈلے (Bodley) کے پاس اصولی طور پر کوئی دلیل نہیں کہ وہ کہیں کہ آپ ﷺ کی زندگی کا بیشتر حصہ سفروں میں گزرا۔[2]

مستشرقین کے اس نقطہ نگاہ کے بارے میں مولانا مودودی (1321ھ) لکھتے ہیں:

"مستشرقین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی ملاقات بچپن میں بحیرہ راہب سے ہوئی تھی اور اسی وقت یہ سارا قرآن آپ ﷺ نے اس سے سیکھ لیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مشرکین مکہ میں سے کسی نے بھی اس قسم کا الزام پیش نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ان لوگوں نے یہ کہا تھا کہ جوانی کے عہد میں آپ ﷺ عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں سے مل کر قرآن کا مواد اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو حضور ﷺ کے ان تمام سفروں کے حالات تفصیل سے معلوم تھے۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تو حضور ﷺ کے ساتھ قافلے والے بھی ہوا کرتے تھے۔ انہیں (مشرکین مکہ کو) اس بات کا احساس تھا کہ اگر ہم اس قسم کا الزام لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی زمانے کی سیکڑوں زبانیں ان الزامات کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکہ کا ہر شخص ان سے پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں بحیرہ سے حاصل ہو گئی تھیں یا پچیس برس کی عمر سے جب سے انہوں نے تجارتی سفر شروع کئے تھے، حاصل ہونی شروع ہو گئی تھیں تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا؟ ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک تو اس

---

(1) تقی عثمانی، مفتی، علوم القرآن، ص: 287-283 (ملخص) بحوالہ زرقانی، شرح المواھب اللدنیہ، جلد اول، ص: 193؛ اصح السیر میں پہلا سفر بارہ سال دو مہینے، دوسرا تئیس یا چوبیس برس میں ہوا، ص: 52،51۔

(2) Bodley, R.V.C.The Message, The Life of Muhammad,P.4-30

کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمازی کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کفار مکہ نے اتنے بڑے جھوٹ کی جرأت نہ کی۔ ان لوگوں کا قول تو یہ تھا کہ یہ شخص (نبی اکرم ﷺ) اُمی ہیں۔ خود مطالعہ کر کے تو معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ چالیس برس کی عمر تک ان باتوں میں سے کوئی بات بھی جانتا نہ تھا جو اس وقت ان کی زبان سے نکل رہی تھیں اب آخر یہ معلومات کہاں سے آ گئیں۔"(1)

اس نقطہ نگاہ پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد خلیفہ لکھتے ہیں:

"حضور ﷺ نے شام کے دو سفر کئے ہیں۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک تیرہ برس اور پچیس برس تھی۔ لیکن یہ تو حضور ﷺ کے مشن کے آغاز سے ایک طویل عرصہ قبل کی بات ہے۔"(2)

جارج سیل (G.Sale 1697-1736) لکھتے ہیں ان راہبوں کے ساتھ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ اس سے یہ گمان ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی طرح وحی کیلئے مددگار ثابت ہوئے ہوں گے۔(3)

مرگی وغیرہ کے اثرات کا تحقیقی جائزہ:

مستشرقین کے اس نہایت جارحانہ نقطہ نگاہ کا جائزہ خود مستشرقین کے اقوال کی روشنی میں لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود انہی کے ساتھیوں نے اس نقطہ نگاہ کو مردود ٹھہرایا ہے۔ Epilepsy کے بارے میں Denial لکھتے ہیں:

Epilepsy as applied to the Prophet was the explanation of those who sought to amuse rather than to instruct.(4)

"مرگی کے مرض کا نبی کریم ﷺ پر اطلاق ایسے لوگوں نے تفریح طبع کے لیے کیا ہے نہ کہ کسی مسئلے میں راہنمائی کے لیے۔"

اس سلسلے میں K.W.Morgan لکھتے ہیں:

The question may well be asked:

---

(1) تفہیم القرآن: 3/ 435

(2) Khalifa, Mohammad: The sublime Quran and Orientalism, P.45

(3) Sale, George,: The Koran, Commonly called Al-Quran, P.50

(4) Danial, Norman,: Islam and the west (The making of an Image), P.28, Oneworld, 1960

Has epilepsy- this sad and debilitating disease - ever enable its victim to become a Prophet or a law giver, or rise to a position of highest esteem and power.(1)

یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ مرگی جیسی افسوناک اور اعصاب کو ناکارہ بنا دینے والی بیماری نے کبھی اس مرض کے شکار کسی شخص کو پیغمبر، قانون دھندہ بنایا ہے یا عزت و احترام اور قوت و اختیار کے اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز کیا ہے؟۔

اس سلسلے میں جن مستشرقین نے اس بات کی تردید کی ہے کہ آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) کوئی نفسیاتی مرض لاحق تھا اور کوئی دورہ پڑتا تھا، ان سب کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے "محمد خلیفہ" لکھتے ہیں:

"یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جبکہ اس بیماری کے بارے میں سائنٹفک بنیادوں پر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ دماغ کو مفلوج اور حافظے کو ناقص بنا دیتی ہے۔ اس سے ذہانت اور قابلیت کم ہو جاتی ہے۔ اس بیماری سے مزاج میں بے قاعدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جسمانی اعتبار سے یہ بات مسلمہ ہے کہ بیماری کے شکار اور دیکھنے والے دونوں کیلئے یہ بیماری ہلا دینے والی (Shattering) ہوتی ہے۔"(2)

نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کی تفاصیل صدیوں سے ہم تک پہنچ رہی ہیں۔ لیکن کسی بھی زمانے میں اس قسم کی کوئی بات ہم تک نہیں پہنچی کہ کبھی آپ ﷺ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی ہو۔

پروفیسر منٹگمری واٹ نے اگرچہ قرآن کو حضور ﷺ کا کلام ہی قرار دیا ہے لیکن کسی نفسیاتی مرض یا مرگی کے دوروں کی تردید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

On the contrary, he was clearly in full posession of his faculties to the very end of his life.(3)

اس کے برعکس حضرت محمد ﷺ کو اپنے جذبات اور اپنی تمام صلاحیتوں پر اپنی زندگی کے اختتام تک مکمل کنٹرول رہا۔

محمد خلیفہ اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

---

(1) Morgan, P:56

2)The sublime Quran and Orientalism,P.13

(3) Watt, Montgomery: Companion to the Qur'an,P.18

Moreover, Muhammad was a man whose common sense never failed him nor his physical strength. Had he ever collapsed under the strain of battle or controversy or fainted away when strong action was called for, a case for epilepsy might have been made out.(1)

مزید بر آں محمد ﷺ تو ایسی ہستی تھے جن کے حواس کبھی بھی ناکام یا ناکارہ نہیں ہوئے نہ ہی آپ ﷺ کی جسمانی قوت کبھی ناکارہ ہوئی۔ یا کبھی جنگوں یا مخالفین کی مخالفت کے سبب آپ ﷺ کی صلاحیتوں نے جواب دیا ہو؟ یا مخالفت کی وجہ سے اس قدر گھبرائے ہوں کہ جب کبھی انہیں کوئی سخت اقدام کرنا پڑا تو وہ بے ہوش ہو گئے ہوں۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی کو غلط طور پر مرگی سمجھ لیا گیا ہے۔

مستشرق Alfred Guillaume (1888-1965) اس بارے میں لکھتے ہیں:

".....to base such a theory of epilepsy on a legend which on the face of it has no historical foundation is a sin against historical criticism"(2)

مرگی کی کہانی کے پیچھے کوئی تاریخی بنیاد موجود نہیں ہے۔ اس طرح کے واقعہ پر یقین رکھنا تاریخ پر نقد کے اصولوں کے حوالے سے ایک گناہ ہے۔

باڈلے (R.V.C. Bodley) (1892-1970) اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

Epilepsy never made any one into a Prophet or a law giver or raised anyone to a position of esteem and power in those days especially, such as a state would suggest some one possessed or insane. If there was a man who was clearly sane, it was Muhammad. (3)

(1) The sublime Quran and Orientalism, P.13

(2) Guillalume, A.: Islam, P.25

(3) Bodley, R.V.C, The Messager, The Life of Muhammad, Praeger, P.13,1970

مرگی نے کبھی بھی خصوصاً اُس (محمد ﷺ کے) زمانے میں کسی کو پیغمبر، قانون دھندہ، یا احترام اور اختیار کے اس عظیم منصب پر فائز نہیں کیا۔ اس حالت میں تو انسان اپنے ہوا س کھو دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اعصاب کی مضبوطی اور ہوش و حواش کے اعتبار سے اعتدال پسند اور ہوش مند کوئی ہو سکتا ہے تو وہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔

خود مستشرقین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضور ﷺ پر کسی قسم کا کوئی دورہ پڑتا تھا مستشرقین ہی کے بیسیوں مزید اقوال اس سلسلے میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ہم آخر میں پروفیسر خدا بخش کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں۔

He is no longer a neurotic patient suffering from epilepsy but a man of tremendous character and unyielding will.(1)

آپ ﷺ کسی اعصابی بیماری کے مریض نہ تھے بلکہ آپ ﷺ عظیم الشان اور مضبوط کردار اور کبھی کسی کے آگے نہ جھکنے والی قوتِ ارادی کے مالک تھے۔

Romauld Landau(1899-1974) نے اُس الزام کی نفی کی ہے کہ آپ ﷺ کو مرگی یا اس قسم کا کوئی دورہ پڑتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

Muhammad task was a formidable one, one that an impostor (as some early westerns claimed he was) prompted by selfish motives, could hardly pope to accomplish by his own effort. The allegation that his periods of revelation were in reality, epileptic seizures is palpably false, for in such an attack the viction is never coherent enough to voice passages as complex or as intellectually profound as are so many that form the Koran. The sincerity with which he undertook his task, the complete faith that his followers had in his revelations and the test of centuries make it unlikely that Muhammad was guilty of any kind of dilibirate deception. No delibirate religious concoction even of an

(1)- Vide Ata Muhuddin, The Arabian Prophet, P.118

impostor of genius has ever survived. Islam has no only survived for over thirteen hundred years, but keeps gaining new adherents from year to year. History shows not a single example of an impostor whose message was responsible for the creation of one of the world's greatest empires and one of the noblest civilizations.(1)

محمد ﷺ نے جو کام کیا وہ نہایت اثر افریں اور شاندار تھا۔ ایک ایسا شخص جو اپنی ذاتی خواہشات کی تسکین و تکمیل کیلئے یہ سب کچھ کر رہا ہو (جیسا کہ ابتدائی زمانے کے بعض مغربی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں) اس سے اس قدر عظیم کام اکیلے طور پر نہیں ہو سکتا۔ یہ الزام کہ آپ پر وحی کے اترنے کے دورانئے کو مرگی کا دورہ کہا جائے واضح طور پر بے بنیاد ہے۔ مرگی کے دورے کے دوران تو کوئی مریض ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ وہ قرآن مجید کی زبان جیسی پُر معانی اور حکمت سے بھرپور باتیں بتلائے۔ جس اخلاص کے ساتھ انہوں نے اپنا مشن مکمل کیا، وہ ایمان و یقین جو آپ ﷺ کے پیروکار آپ کی وحی پر رکھتے تھے، اور صدیوں سے اس ایمان و یقین کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مرگی کا کوئی مریض ایسا ہر گز کر نہیں سکتا۔ اس طرح سے کسی مذہب کی گھڑی ہوئی باتیں یا کسی گھڑنے والے کی باتیں کبھی زیادہ دیر تک آگے نہیں چلیں۔ اسلام نہ صرف تیرہ سو برس تک زندہ رہا ہے بلکہ سال بہ سال اس میں ترقی ہی ہوتی رہی ہے۔ تاریخ سے ہمیں ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ کسی جعل ساز کا پیغام دنیا کی عظیم ترین مملکت اور شاندار تہذیب کی تخلیق کا سبب بنا ہو۔

کارلائل Thomas Carlyle (1795-1881)(2) ، Washington Irving (1783-1859)(3) اور دیگر بہت سے مستشرقین واضح طور پر اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ حضور ﷺ Impostor تھے۔

---

(1) Landau, ROM. Islam and the Arabs, P.23, Routledge, 2007

(2) Carlyle, Thomas, On Hero and Hero worship and the heroic in History, P.73, 74

(3) Irving, Washington: Mahomet and his Successors, P.196, John F. Trow Printer and streotyper, New York.

کیا قرآن حضور ﷺ کی ایک نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہے؟

مستشرقین نے وحی کے بارے میں ایک عجیب و غریب تاویل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی در حقیقت کوئی خارجی چیز نہیں بلکہ یہ حضور ﷺ کی ایک داخلی اور اندرونی کیفیت تھی۔ جو آپ ﷺ کے طویل غور و فکر اور مشاہدات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ان کی ایک وجدانی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ مستشرق Tor Andrea نے اپنی کتاب "Muhammad - The Man and His Faith" میں اس پہلو پر کئی ایک طریقوں سے لکھا ہے۔ اس کی ساری کوشش یہی ہے کہ وحی کی اس کیفیت کا انکار کرے جو مسلمان بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے حالاتِ عرب دیکھے پھر الگ تھلگ بیٹھ جاتے اور غور کرتے۔ اس طرح (بقول اس کے) محمد ﷺ ایک Original شخص تھے۔ کبھی کہتا ہے کہ آپ ﷺ ان لوگوں میں سے تھے جن کی وجدانی طاقت بڑی مضبوط ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے اسی وجدانی کیفیت کی مدد سے ان کا تعلق جڑ جاتا۔ کبھی وہ آپ ﷺ کو Introvert کہتا ہے جو نفسیاتی مریض تھے۔ [1]

مستشرقین کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی قوم کے طور طریقوں سے بیزار تھے اور غار حرا میں جا کر الگ تھلگ عبادت کیا کرتے تھے۔ وہیں طویل غور و فکر کے نتیجے میں توحید پر ان کا اعتقاد پختہ ہوتا چلا گیا۔ (اس سلسلے میں مستشرقین کے اقتباسات اس سے قبل نقل کر دیے گئے ہیں) وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ پر پھر ایسی کیفیت طاری ہوتی گئی کہ آپ ﷺ کو اپنے دل کی آواز ایک خارجی آواز محسوس ہونے لگی اور آپ ﷺ نے اسے ایک فرشتے کی آواز سمجھ کر پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ [2]

بیسویں صدی کے مستشرقین نے نبوت محمدی اور قرآن کی یہی توجیہہ و توضیح کی ہے۔ حالانکہ اس نقطہ نگاہ کو بھی تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا تقی عثمانی اس نقطہ نگاہ کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

1۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ سرور عالم ﷺ جن کے بارے میں خود ان لوگوں کا اعتراف ہے کہ آپ ﷺ بہترین ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے مالامال تھے۔ تئیس برس تک مسلسل، اپنی ایک اندرونی کیفیت کو کسی فرشتے کی آواز سمجھتے رہے۔ آپ ﷺ آخر وقت تک یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ اس غیر معمولی کیفیت کی حقیقت کیا ہے؟ وحی کا نزول اس تئیس برس کے عرصے میں سینکڑوں مرتبہ نہیں ہزاروں مرتبہ ہوا ہو گا کیا اس پورے عرصے میں (معاذ اللہ) آپ ﷺ مسلسل اس مغالطے میں مبتلا رہے۔

(1) Tor Andrea, The Man and His Faith, P.175

(2) IBID P.185

2۔ پھر اگر آپ ﷺ پر یہ نام نہاد اندرونی کیفیت اپنی قوم کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کیفیت کے سبب سے پہلے تجربے میں ان کی گمراہیوں کی تردید اور عقیدہ توحید کا بیان ہوتا۔ حالانکہ پہلی وحی میں کہیں بھی نہ تو توحید کا ذکر ہے اور نہ ہی شرک کی تردید و مذمت۔ بلکہ سب کو معلوم ہے کہ پہلی وحی کے الفاظ یہ تھے: ﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ ﴾[1]

”پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا اکرم کرنے والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے لکھنا سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

3۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ یہ کیفیت ایک مرتبہ پیش آنے کے بعد ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور پھر تین برس تک آپ ﷺ کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس کیفیت کے انقطاع کی وجہ سے آپ پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ تین برس تک سقوط رہتا ہے اس کے بعد پھر وحی نازل ہوتی ہے تو پھر بھی اس میں شرک کے ردّ کا واضح ذکر موجود نہیں ہوتا۔ نہ ہی اہلِ عرب کے غلط عقائد اور ان کی تردید کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ پر یہ کیفیت اپنی قوم کی گمراہیوں پر سوچ وبچار کی وجہ سے تھی اور آپ ﷺ پر توحید کا غلبہ ہو گیا تھا تو وحی کے ابتدائی واقعات میں یہ تصورات کہاں چلے گئے تھے۔

4۔ اگر یہ آپ ﷺ کی اندرونی کیفیت تھی تو اسے پوری طرح حضور ﷺ کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تھا لیکن قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر آپ ﷺ کے ذاتی خیالات کے خلاف ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾[2]

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكَ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾[3]

---

(1) العلق ا۔۵

(2) الانفال: ۶۷ (جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کی کثرت کی رائے یہ تھی کہ فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے نبی کریم ﷺ نے بھی یہی فیصلہ دیا جبکہ اللہ کی مرضی تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کو آئے تھے اس لئے ان کا انجام بھی قتل ہی کی صورت میں ہونا چاہیے۔)

(3) التحریم: ا (نبی کریم ﷺ نے شہد استعمال نہ کرنے کی قسم کھالی۔ لیکن اللہ تعالی نے آپ کو یہ قسم توڑنے کا حکم دیا)

5 ۔اگر بالفرض مان لیا جائے کہ کسی تصور کا غلبہ انسان کو ایک خارجی آواز کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے کہ یہ خارجی آواز جو پیشین گوئی کر دے وہ ہمیشہ سچ ہی نکلے جو وہ حکم دے وہ انجام کار درست ثابت ہو۔ جو الفاظ وہ بول دے وہ ایسی پتھر پر لکیر ہو کہ دنیا بھر کے ادیب و خطیب اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ اس کی بنیاد پر دنیا میں ایک ایسا انقلاب رونما ہو جائے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔

6۔اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تصورات کے غلبے سے محسوس ہونے والی آواز کوئی حقیقت رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس شخص کے علم و تصور کا ایک عکس ہو سکتی ہے جسے وہ سنائی دے رہی ہے اور جو بات پہلے سے اس کے تصور و علم میں نہ ہو وہ اس آواز سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ لیکن قرآن کریم کی تلاوت سے بے شمار ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو وحی سے قبل آپ ﷺ کو معلوم نہ تھیں۔ وحی نے آپ ﷺ کو ان باتوں کا علم دیا۔ مثلاً

﴿مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾(1)

"آپ ﷺ اس وحی کے نزول سے قبل نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کی تفصیلات کیا ہیں؟ لیکن ہم نے وحی کو آپ ﷺ کیلئے روشنی بنایا۔ جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہنمائی کرتے ہیں۔"

7۔ خصوصاً پہلی امتوں کے اکثر واقعات ایسے ہیں جن کے بارے میں خود قرآن نے تصریح کی ہے کہ آپ ﷺ وحی کے نزول سے قبل ان سے واقف نہ تھے، تاریخی اعتبار سے بھی یہ بات ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کو ان واقعات کا علم وحی سے پہلے نہیں تھا۔ مثلاً سورۃ ھود میں حضرت نوحؑ کا واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

﴿تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا﴾(2)

"یہ غیب کی باتوں میں سے ہے جو آپ ﷺ کی طرف وحی کی گئی ہے آپ نہیں تھے کہ انہیں جانتے تھے اور آپ ﷺ کی قوم والے بھی انہیں نہیں جانتے تھے۔"

---

(1) الشوریٰ:۵۲

(2) ھود:۴۹

سورۃ یوسف کے اختتام پر فرمایا:

﴿ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ﴾ (1)

"یہ واقعہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی وحی ہم نے آپ ﷺ کی طرف نازل کی ہے اور آپ ﷺ تو ان کے پاس نہیں تھے جب انہوں نے مل کر ایک بات ٹھہرالی۔" بالکل اسی طرح کی مثال حضرت مریم علیہ السلام کے بارے میں سورۃ آل عمران آیت نمبر 44 میں اور سورۃ المومن کی آیت نمبر 78 میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں سورۃ مریم کے پہلے رکوع کا خصوصی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

مستشرقین میں سے بہت سے لوگ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ "حضور ﷺ صادق و امین تھے" اس صورت میں مستشرقین کے پاس کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ مذکورہ اعتراضات پیش کریں۔ (2)

Rom Landau (1899-1974) اپنی کتاب Islam and the Arabs میں حضور ﷺ پر مرگی وغیرہ کے دورے کی تو نفی کرتا ہے لیکن وہ یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ آپ ﷺ پر یہ کلام خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا۔ وہ حضور ﷺ کی زندگی کے احوال و واقعات کے پس منظر کے ساتھ آغازِ نزول قرآن کا ذکر کرتا ہے کہ ان حالات میں ایک حساس ذہن سوچ و بچار میں مصروف رہتا۔ وہ عرب کے حالات بھی پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ حالات بھی بڑا پریشان کرتے تھے ان حالات کی اصلاح کی بھی انہیں فکر لاحق ہوئی۔ حضور ﷺ کے ظاہری سہاروں کے چھن جانے کا ذکر کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے:

> "One can easily imagine the loneliness experienced by the sensitive youth, and the effect that this must have on his mental make up. His later revelations were not given to him as though in a vacum, but within an atmosphere of inevitable introspection and spiritual questioning- the concomitant of a boys existance without parents, brothers and sisters."(3)

"ایک حساس نوجوان کی تنہائی میں اس کے احساسات و جذبات کو ہر کوئی جان سکتا ہے کہ اس

---

(1) یوسف: ۱۰۲

(2) تقی عثمانی، مفتی ص: ۱۷۹۔۲۸۲

(3) Landau, ROM., Islam and the Arabs, P.22, Routledge, 2007

کیفیت نے اس نوجوان کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کئے ہوں گے۔ بعد میں نازل ہونے والی وحی بھی کسی خلاء میں نہیں دی گئی ہو گی یعنی بعد کے زمانے میں جو حالات درپیش ہو رہے تھے وہ ان کی اس وحی (یعنی ان کے اندر کے خیالات) کو متاثر کر رہے ہوں گے۔ وہ جو مشاہدہ نفس کر رہے تھے اس کے اثرات اس وحی کو متاثر کر رہے ہوں گے۔ جو روحانی سوالات جو ایسے نوجوان کے ذہن میں ناگزیر طور پر آ رہے ہوں گے جو بغیر والدین اور بھائیوں کے رہ رہا ہو وہ بھی وحی کو متاثر کرتے ہوں گے۔"

وہ مزید لکھتا ہے کہ آپ ﷺ کی طبیعت و مزاج روحانی اور مذہبی قسم کا تھا اور آپ ﷺ فطری طور پر ان صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ لکھتا ہے:

"Muhammad was religious by nature and was evidently predisposed to the message of reform that he received in his visions.[1]

"محمد ایک مذہبی نوجوان تھے اور بظاہر وہ ان کے اپنے اندر سے اٹھنے والے اصلاح کے پیغام پر عمل کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھے۔"

اس کے خیال میں اس کے علاوہ آپ ایک عملی انسان تھے اور جانتے تھے کہ عرب معاشرے کے کمزور پہلو کون کون سے ہیں۔ وہ عربوں کی خوبیوں سے واقف تھے۔ اس بنیاد پر وہ بدوی اور حضری، تمام عربوں کے بارے میں جانتے تھے کہ کس طرح بتدریج اور منظم طریقے سے ان میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔[2]

مذکورہ بالا نقطہ نگاہ کارڈ سابقہ اوراق کی تفصیلات میں موجود ہے۔

آئندہ سطور میں ہم مستشرقین میں سے بعض لوگوں کے بیانات نقل کریں گے جنہوں نے اس بات کی تردید کی ہے حضور ﷺ نے قرآن کی نسبت غلط طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی ہے اور یہ کہ آپ ﷺ Imposter تھے۔

اس سلسلے میں چند اہم مستشرقین کے اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:

As a result of inherited prejudice the principles of every religion always appear heterodox, and absured to sincere belivers in other forms of faith of all theological dogmas,

---

(1) IBID,P.23

(2) IBID

none have suffered more than those of Islamism. The name of its founder has for thirteen centuries been a synonym of Imposter. His character has been branded with every vice which degrade or afflicts mankind. The greatest absurdities, the greatest inhumanity, have been attributed to his teaching[1]

مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں جو مذہبی عصبیت پائی جاتی ہے اسکی وجہ سے تقلید یعنی اسلام کے بارے میں متعصبانہ رویہ سے نکلنے کی بات بڑی بے سروپا محسوس ہوتی ہے۔ اس کا سامنا اسلام سے زیادہ کسی اور مذہب کو نہیں ہوا۔ اس کے بانی کا نام ایک Imposter (جعل ساز) کے مترادف کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔ ان کا نام ہر برائی کے ساتھ ملایا جارہا ہے۔ جو انسانیت کی تذلیل اور اذیت کا باعث ہے۔ سب سے بڑی بے سروپا اور سب سے زیادہ غیر انسانی باتیں آپ ﷺ کے ساتھ منسوب کی جاتی رہی ہیں۔

ایک اور مستشرق Sydney Cave (1883-1953) اس سلسلہ میں لکھتا ہے:

No life has been so variously characterised as: Muhammad's, The menace of Islam for long made Christian writers ready to judge him not only harshly but unjustly. This man who endured ten years of hardships in the intrest of his mission was not a mere imposter. An entirely false man could not have become the founder of a religion. Carlyle was right there.[2]

ترجمہ: محمد ﷺ سے زیادہ کسی کی زندگی کو اس قدر زیادہ رخ نہیں دیئے گئے۔ ایک لمبے عرصے تک عیسائی قلمکاروں نے آپ ﷺ کو نہ صرف درشتی سے دیکھا بلکہ غیر منصفانہ انداز اختیار کیا۔ وہ شخص جو دس برس تک نہایت کٹھن حالات میں محض اپنے مشن کی خاطر زندگی گزارتے رہے، وہ محض ایک Impostor نہ تھے۔ ایک جھوٹا آدمی ایک مذہب کا بانی نہیں بن سکتا۔ اس سلسلے میں کارلائل نے بالکل

---

(1) Scott, S.P., History of Moorish Empire in Europe, P.59,

(2) Cave, Sydney, An Introduction to the Study of some living Religions, P.213,214

درست بات کی ہے کہ محمد ﷺ Imposter نہ تھے۔

مشہور فرانسیسی محقق گستاولی بان لکھتے ہیں:

"یہ کہنا کہ حضرت محمد ﷺ ایک دھوکے باز شخص تھے میرے نزدیک ایسا قول ہے جو ایک لمحہ کیلئے بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ وہی اوقاتِ جذبہ وولولہ تھے جن میں آپ ﷺ کو وہ تسکین اور تقویت آجاتی تھی جس وجہ سے آپ ﷺ اپنی ابتدائی مشکلات کا سامنا کر سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کے سوا کہ آپ ﷺ کو خود اپنے اوپر بھروسہ ہو، آپ ﷺ کیونکر دوسروں کی تشفی کر سکتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کو ہمیشہ اس بات کا یقین تھا کہ آپ ﷺ کو جنابِ باری کی پوری مدد ہے اور اس اعتقاد کے سامنے کل مشکلات جو آپ ﷺ کو پیش آتی تھیں، بالکل ناچیز تھیں۔" (1)

William Muir (1819-1905) اس سلسلے میں لکھتا ہے:

The growth in the mind of Muhammad of the conviction that he was appointed to be a Prophet and a reformer was intimately connected with his belief in a special providence embaracing the spirtual as well as the material world, and simultaneously with that conviction there arose and implicit confidence that the Almighty would crown his mission with success. The questionings and aspirations of inner soul were regarded by him as proceeding directly from God, the light which gradually illuminated his mind with a knowledge of the divine unity and perfections, and the duties and destiny of man, light amidst gross darkness - must have emanated from the same source had thus begun the work would surely carry it through to a successful ending; what was Muhammad himself but an instrument in the hand of the great worker.(2)

---

(1) لیبان: ص:۱۸۰

(2) Muir, William: Life of Mahomet and history of islam, P.529, London, 1861

R.V.C Bodley لکھتا ہے:

Could a man who was not inspired have brought such an International brother hood in to being? Does not the soffing of the anti Muslims rather reflect on themselves? Why should an impostor have left a creed which has grown ever since he died?(1)

کارلائل نے مستشرقین کے اس نقطہ نگاہ کو تسلیم نہیں کیا کہ قرآن مجید، آپ ﷺ نے خود ہی گھڑ لیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

One hundrad and eighty million human beings confess as the true religion. For countless people Muhammad's words have been the guiding star of their lives. Can it be possible that so many creatures, created by god, had lived and died for something which must be regarded as a tragic fraud? What are we to think of this world, if charlatanism realy has such power over the mind of men? This hypothesis is a sad creation of the age of scepticism and is more indicative of mental paralysis and spirtual death. A more godless theory has never been propounded.(2)

"ایک سواسی ملین لوگوں کا اقرار ہے کہ یہ ایک سچا مذہب ہے۔ لاتعداد لوگوں کے لئے محمد ﷺ کے فرامین ان کی زندگیوں کو راہنمائی دینے والا ستارہ ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی اتنی بڑی مخلوق جو محمد ﷺ کے فرامین کے لئے جیتی اور انہی کے لئے مرتی ہے۔ وہ ایک "المیاتی دھوکہ" ہے یعنی کیا ایک فراڈ اور دھوکے کے لئے لوگ زندگیاں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں کہ ہم دنیا کے بارے میں کچھ کہیں کہ اگر ایک جھوٹا مدعی اتنی قوت کا مالک ہو کہ لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرنے کی اس قدر قدرت رکھتا۔"

---

(1) Bodley, R.V.C.: The Message and The Life of Muhammad, P.239

(2) Carlyle,Thomas,On Hero and Hero worship and the heroic in History, P.100

قرآن مجید کے کلام الٰہی نہ ہونے پر مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا مزید ردّ:

قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہ مانتے ہوئے مستشرقین کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن کی بلاغت اس پائے کی نہیں کہ اسے معجزہ قرار دیتے ہوئے اللہ کا کلام تسلیم کیا جائے اس سلسلے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں[1]

"عیسائی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن بلاغت کے انتہائی معیار پر پہنچا ہوا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس کو مان بھی لیا جائے تب بھی یہ اعجاز کی ناقص دلیل ہے کیونکہ اس کی شناخت اور پہچان وہی شخص کر سکتا ہے جس کو عربی زبان ولغت میں مہارت حاصل ہو۔"

مولانا کیرانوی لکھتے ہیں کہ عیسائیوں کا خیال ہے کہ بلاغت کی وجہ سے اگر قرآن کو معجزہ کہا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ تمام کتابیں جو یونانی اور لاطینی زبانوں میں بلاغت کے اعلیٰ معیار پر پہنچی ہوئی ہیں وہ بھی کلام الٰہی مانی جائیں اگر بلاغت ہی کو کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل مانا جائے تو پھر باطل اور قبیح مضمون کو نہایت فصیح اور بلیغ انداز سے بیان کر دیا جائے تو کیا محض بلاغت کی موجودگی کی وجہ سے اس مضمون کو اللہ کا کلام کہا جا سکتا ہے۔[2]

ان نقطہ نگاہ کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک قرآن کے اعجاز کی بات ہے اس کے اثبات کیلئے اس قدر دلائل ہیں جن کا ایک دیانتدار شخص انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن کے اعجاز کا اثبات دلائل کے ساتھ مختلف اہلِ علم نے کیا ہے اور اب اعجاز قرآن کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قدر علمی اور کثیر تعداد میں دلائل، اعجاز قرآن پر علامہ باقلانی(403ھ) کی اعجاز القرآن، علامہ زرقانی(1122ھ) کی مناہل العرفان، علامہ سیوطی(911ھ) کی الاتقان فی علوم القرآن، علامہ زرکشی (794ھ) کی البرہان، شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق، اعجاز القرآن کے بیان اور وجوہِ اعجاز قرآن سے بھری پڑی ہیں۔ در حقیقت قرآن کے اعجاز کا تعلق صرف اہل علم سے ہے اور ماہر لسان ہی اسے سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ قران کا اعجاز، بلغاء و فصحاء کو عاجز و قاصر کرنے کے لیے تھا اور اس نے ان لوگوں کو متاثر اور عاجز کر کے دکھا دیا اور انہوں نے اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیا۔ جہان تک عوام کا تعلق ہے، وہ خواص کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ جب خواص نے اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیا تو عوام خود

---

(1) بائبل سے قرآن تک، جلد ۲، ص: ۳۶۵

(2) ایضاً

بخود متاثر ہو جاتے ہیں۔[1]

دوسری طرف قرآن نہ صرف خواص کیلئے بلکہ عوام کیلئے بھی معجزہ ہے۔ وہ صرف خواص کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہی نہیں بلکہ براہِ راست بھی قرآن سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا صوتی اعجاز ہر خاص و عام کو مسحور کرتا ہے۔[2] قرآن کے اعجاز کا اعتراف تو مکہ کے ان لوگوں نے اپنے عمل سے کر لیا تھا جب وہ راتوں کو چھپ چھپ کر قرآن کی تلاوت زبان نبوی سے سننے کے لئے آتے تھے۔

اس سلسلے میں کتب تاریخ میں واقعات موجود ہیں کہ سبعہ معلقات جو کعبہ میں عربوں کے شاہکار کے طور پر آویزاں تھے، جب ان کے ساتھ سورۃ الکوثر بھی لکھ کر کسی نے لٹکا دی تو ان کا شاعر کہہ اٹھا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا تو یہ دعوی ہی نہیں ہے کہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا سبب صرف اس کی بلاغت ہے بلکہ مسلمانوں کا تو دعویٰ یہ ہے کہ بلاغت بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے بے شمار اسباب میں سے ایک سبب ہے۔[3] مستشرقین کہتے ہیں کہ اگر قرآن کو اس کی فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر اللہ کا کلام تسلیم کیا جائے تو پھر تو وہ تمام کتب جو دوسری زبانوں میں معیاری بلاغت کی حامل ہیں ان کو بھی کلام الٰہی ماننا پڑے گا۔

مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے مضامین غیر مرتب ہونا فصاحت و بلاغت کے بھی منافی ہے۔

اس سلسلے میں اس کتاب کے ترتیب قرآن کے باب میں تفصیلی بات کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل نکات مزید وضاحت پیش کر سکتے ہیں:

شاہ ولی اللہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

1. قرآن کریم عام مصنفین کے انداز سے لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ عربوں کے قدیم دستور کے مطابق ہے جیسے سبعہ معلقات میں انواع واقسام کے مضامین ہر قصیدے کے اندر پائے جاتے ہیں۔
2. قرآن شاہی مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ بادشاہ انتظامی امور طے کرنے کیلئے مختلف احکام ایک ہی خط کے اندر

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً۔ اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لئے دیکھیں۔ حاکم، المستدرک، ذیل سورۃ المدثر، ابن جریر طبری، ذیل سورۃ المدثر، صفحہ 156، جلد 29، ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، صفحہ 293-300، جلد اول، ملخصاً

(3) ایضاً

لکھتا ہے۔اس میں ترتیب مطلوب ہی نہیں ہوتی۔

3. جدا جدا ابواب میں کسی کتاب کو مرتب نہ کرنا کوئی نقص نہیں ہوتا۔ یہ ایک جداگانہ اعجاز ہے۔ جب یہ کتاب انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں تو اس کا اسلوب بھی انسانوں کے اسالیب سے یکسر مختلف ہونا چاہئے۔ انسانی ترتیب کی نقل اس میں نہیں ہے۔

4. قرآن صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تعمیل بھی ہے۔ وہ جو کچھ بتاتا ہے اس پر عمل کرنے کا حکم بھی دیتا ہے۔ انسانی ذہن کو عمل کیلئے تیار کرتا ہے اس میں ترغیب و ترتیب پائی جاتی ہے اس لئے اس میں ترتیب کا عام انسانی انداز درست نہ تھا۔[(1)]

5. امام رازی (606ھ) لکھتے ہیں کہ قرآن کی عمیق ترتیب ایک الگ معجزہ ہے۔ امام صاحب قرآن کے ترتیبی اعجاز کو پورے قرآن میں بالالتزام پیش کرتے ہیں۔[(2)]

ان کے بعد علمائے امت کی ایک بڑی تعداد نے قرآن کی ترتیب اور آیات کے باہمی تعلق و مناسبت کو قرآن کا معجزہ قرار دیا ہے۔ ان میں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کے اقتباسات ترتیبِ قرآن والے باب میں پیش کئے گئے ہیں۔

قرآن مجید کے اعجاز اور اس کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے ہوئے مستشرقین کا خیال ہے کہ اس کا اعجاز کوئی انوکھا اعجاز نہیں ہے بلکہ اس قسم کی تصانیف تو اور بھی کئی ایک لوگوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہیں۔ مثلاً فیضی کی بے نقطہ تفسیر، مسیلمہ کذّاب، متنبّی، ابن الراوندی، ابوالعلاء المعرّی وغیرہ کے کارنامے۔

اس نقطہ نگاہ کا رڈ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں فیضی نے جو کام کیا وہ خود اس کی اپنی نگاہ میں معجزہ نہیں ہے۔ اسی طرح کی کتاب متنبی کے عہد میں فیضی سے چھ سو برس قبل موجود تھی۔ مقاماتِ حریری میں ایسی عبارات فیضی سے بہت پہلے موجود تھیں کہ بعض خالص حروفِ مہملہ میں بعض حروفِ معجمہ میں اور بعض عبارات کا ایک لفظ مہملہ حروف یعنی غیر نقطہ دار حروف سے مرکب ہے اور دوسرا لفظ معجمہ سے یعنی نقطہ دار حروف سے۔ اس کے علاوہ فیضی نے اس کام کو قرآن کا توڑ نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اس قسم کا دعویٰ اس نے کیا تھا۔[(3)]

---

(1) ولی اللہ شاہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، (اردو ترجمہ، مترجم رشید احمد انصاری) تیسرا باب، اسلوب بدیع قرآن، نذیر سنز، لاہور؛ فراہی، حمید الدین، مولانا، مجموعہ تفاسیر فراہی، (اردو)، مقدمہ مکتبہ مرکزی جماعت اسلامی، لاہور، ۱۹۵۵ء

(2) ایضاً: ص 52

(3) فراہی، حمید الدین، مولانا، مجموعہ تفاسیر فراہی

یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ کوئی انسانی کلام بھی بلاغت کے اس مقام پر پہنچ سکتا ہے جس پر قرآن مجید ہے نہ ہی ان کتب کے مصنفین نے ان کے بارے میں اس قسم کا دعوی کیا ہے نہ ہی اس زبان کے فصحاء ان سے معارضے سے عاجز ہوئے کسی کتاب کے بارے میں کسی کا یہ کہہ دینا کہ یہ قرآن کی بلاغت کا مقابلہ کرتی ہے، ثبوت اعجاز کیلئے کافی نہیں ہے۔ عیسائی خود اہلِ زبان نہیں ہیں۔ ان کے اہلِ لغت تو بعض اوقات ایسی ایسی عجیب وغریب باتیں کر جاتے ہیں کہ ان کی ساری زبان دانی اور ان کے علم کا بھرم کھل جاتا ہے۔ چہ جائیکہ بلیغ اور غیر بلیغ عبارات وکتب میں فرق وامتیاز کر سکیں۔ محض لغت کے بارے میں کچھ الفاظ و معلومات حاصل کر کے انہیں ماہرینِ لغت نہیں کہا جاسکتا اس سلسلے میں ان کے مقام کو مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ایک مثال کے ذریعے بیان کیا ہے۔ پادری سارکیس مارونی نے اسقف اعظم اربانوس ہشتم (1644-1623) کی اجازت سے بہت سے پادریوں، راہبوں، علماء اور عبرانی و یونانی اور عربی زبان پڑھانے والے اساتذہ کو اس غرض سے اکٹھا کیا کہ یہ لوگ اس عربی ترجمہ کی اصلاح کریں جو بے شمار اغلاط سے بھرا ہوا اور بہت سے مضامین سے خالی ہے۔ ان لوگوں نے 1625ء میں اس سلسلے میں بڑی جانفشانی کے بعد اس میں اصلاح کی۔ لیکن ان کی کوشش کے باوجود اس میں بہت سی اغلاط باقی رہ گئیں۔ اس لئے انہوں نے ترجمے کے مقدمے میں معذرت پیش کی ہے۔ اس معذرت کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"تم اس نقل میں بہت سی ایسی چیزیں پاؤ گے جو عام قوانینِ لغت کے خلاف ہوں گی۔ مثلاً مذکر کی جگہ مؤنث اور جمع کی جگہ مفرد۔ تثنیہ کی جگہ جمع اور زیر کی جگہ پیش اور اسم میں نصب اور فعل میں جزم۔ حرکات کی جگہ حروف کی زیادتی وغیرہ۔"(1)

قرآن مجید اور سابقہ کتب میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اسے مستشرقین نے دوہرے اعتراض کے طور پر استعمال کیا ہے، ایک طرف وہ کہتے ہیں کہ مماثلت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پہلی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ قرآن بہت سے بنیادی پہلوؤں سے سابقہ کتب سے مختلف ہے تو وہ کہتے ہیں کہ قرآن منزل من اللہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ اللہ تعالی کی کتاب ہوتی تو اسے پہلی کتابوں سے بالکل مطابقت رکھنی چاہیے تھی۔

مسلمانوں کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے اس لیے منزل من اللہ ہونے کا معیار (Parameter) پہلی کتابیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کتابوں کے محرف ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ ان کتابوں میں متعدد ایسی باتیں شامل ہو چکی ہیں جو کسی الہامی کتاب کا حصہ ہو ہی نہیں سکتیں، اس کی چند مثالیں یہ

---

(1) بائبل سے قرآن تک، جلد 2، ص: 367

ہیں:

بائبل کی کتاب پیدائش باب 9 جملہ 20 تا 25 میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے شراب پی، اس سے مدہوش ہو گئے۔ لباس سے بے نیاز ہو گئے۔ اس حالت میں ان کے بیٹے نے انہیں دیکھ لیا، بجائے اپنے اس عمل پر ندامت محسوس کرنے کے نوح نے سارا غصہ بیٹے پر نکالا، اسے بد دعا دی کہ اس کی اولاد دوسرے بیٹے کی غلام بنی رہے گی۔

حضرت لوط علیہ السلام پر بیٹیوں سے بدکاری کا ذکر کتاب پیدائش باب 19 جملہ 30 تا 38 میں کیا گیا ہے۔ ان کی بیٹیوں سے جو اولاد ہوئی اس کے بارے میں ایسی خرافات درج کی گئی ہیں کہ اس کا بیان تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔

کتاب پیدائش باب 22 جملہ 2 تا 8 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ایسی باتیں لکھی ہیں کہ ایک اولوالعزم نبی تو درکنار ایک باکردار عام آدمی سے بھی اس طرح کی باتیں منسوب نہیں کی جاسکتیں۔

اسی طرح کی خرافات جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے کردار و اخلاق کے بارے میں کتاب پیدائش باب جملہ 22 تا 30 درج ہے کہ حضرت یعقوب نے خدا سے کشتی لڑی اور خدا کو اس کشتی میں پچھاڑ دیا۔ اللہ کا انسانی جسم میں آکر کشتی لڑنا تصور خدا کے ہی منافی ہے، پھر کیا ایک انسان اللہ کو پچھاڑ سکتا ہے۔

بائبل کی کتاب خروج باب نمبر 33 جملہ 18 تا 23 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خلاف حقیقت باتیں لکھی ہیں۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے عہد نامہ قدیم اور جدید کی مخالفت کی ہے۔ لہٰذا یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہو سکتا۔(1) یہ خیال نیا نہیں بلکہ نزولِ قرآن کے وقت بھی یہی کہا گیا تھا اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات اصل صورت واضح کر دیتے ہیں:

1. ان کتابوں کا سلسلہ سند اپنے مصنفین تک ثابت نہیں ہے اور نہ ہی اس سند میں تاریخی اعتبار سے اتصال پایا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ثابت نہیں ہو سکی کہ یہ کتابیں الہامی ہیں۔

2. ان کتابوں میں بے شمار مقامات پر آپس میں معنوی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتب بے شمار اغلاط سے بھری پڑی ہیں۔(2)

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

3. ان کی تحریف کو خود مستشرقین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اظہار الحق میں عیسائیوں کے اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ موجودہ اناجیل میں واضح طور پر تحریف ہو چکی ہے۔ انہوں نے آدم کلارک، پولس، یوحنا، موشیم۔ واٹسن، یوسی، بیس۔ ہورن وغیرہ کے اقوال نقل کئے ہیں۔ یہ اقوال اظہار الحق جلد دوم کے صفحہ 109 سے صفحہ 145 تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مولانا شمس الحق افغانی نے اپنی کتاب علوم القرآن میں اسی طرح کے اقوال نقل کئے ہیں۔(1)

قرآن اور بائبل کے اختلاف کی حقیقت کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عیسائی پادری قرآن مجید اور بائبل کے درمیان جو اختلافات بیان کرتے ہیں وہ تین قسم کی ہیں:

1. نسخ احکام کے لحاظ سے

2. بعض واقعات ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور دونوں عہد ناموں میں نہیں۔

3. قرآن کے بیان کردہ حالات و واقعات ان عہد ناموں میں بیان کردہ احوال کے مخالف ہیں۔ ان تینوں پہلوؤں سے پادریوں کا قرآن پر طعن بے جا اور بے معنی ہے۔ کیونکہ نسخ صرف قرآن مجید کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ پہلی شریعتوں میں بھی کثرت سے نسخ ہوا ہے۔ نسخ کے وقوع پذیر ہونے میں عقلی طور پر کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اسے سمجھنا محال ہو۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت نے سوائے نو احکام کے تمام احکام کو منسوخ کر دیا۔ یہاں تک کہ تورات کے دس احکام جو لوگوں میں مشہور و معروف تھے، انہیں بھی منسوخ کر دیا اور عیسائی نظریے کے مطابق اس طرح شریعت کی تکمیل ہوئی۔ ان کے خیال کے مطابق ایک شریعت کی تکمیل پہلی شریعت میں نسخ کی شکل میں ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ احکام بھی اس لحاظ سے منسوخ ہی کہلائیں گے۔ اس طرح قرآن پر طعن کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔(2)

4. ثانی الذکر پہلو سے بھی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ عہد نامہ جدید میں بہت سے قصے ایسے ہیں جن کا ذکر عہد نامہ قدیم کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے "اظہار الحق" میں تیرہ ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جو عہد نامہ جدید میں موجود ہیں مگر عہد نامہ قدیم میں ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔(3)

لہٰذا قرآن پر اس اعتبار سے طعن نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن اور توراۃ میں واقعات کے اعتبار سے فرق

---

(1) افغانی، شمس الحق، علوم القرآن، امجد اکیڈمی لاہور، ص:136-138

(2) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور، ۳۹۱/۲

(3) ایضاً، ۳۹۲/۲-۳۹۸

ہے اور ایسا کرنے والا تاریخی اور اصولی طور پر غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ قرآن مجید پر اس اعتبار سے بھی طعن نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے واقعات بائبل کے خلاف ہیں۔ اس قسم کے اختلافات خود عہد نامہ قدیم کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اناجیل میں بعض کا بعض سے اختلاف ہے یا انجیل اور عہد نامہ عتیق کے درمیان بے شمار اختلافات ہیں۔ توراۃ کے تینوں نسخوں جو عبرانی، یونانی اور سامری زبانوں میں ہیں کے اندر بھی باہمی اختلافات ہیں۔

ان اختلافات کی تفصیل پر مبنی ایک نقشہ "اظہار الحق" کے صفحہ 13-412 پر موجود ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں کہ لیکلرک کے بیان کردہ ساٹھ اختلافات، تعداد میں حرفِ آخر نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا مقصد صرف ان مقامات کی نشاندہی کرنا ہے جن میں اس کے نزدیک عبرانی اور سامری نسخوں میں شدید اور زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔۔۔ ان تمام اختلافات کی تعداد بیاسی بنتی ہے۔(1)

ان تمام تفصیلات کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کا تورات کے مضامین سے اختلاف کرنا، اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ قرآن صحیح نہیں یا منزل من اللہ نہیں ہے۔ ورنہ خود مستشرقین کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود ان کے اپنے ہی قائم کردہ اصول کے مطابق توراۃ یا انجیل دونوں میں کوئی بھی غیر محرف نہیں۔ دوسری طرف اگر توراۃ اور انجیل میں اس قسم کے اختلافات کے باوجود وہ الہامی اور غیر محرف ہیں تو پھر قرآن پر اس اصول کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا۔

قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے ہوئے بعض مستشرقین نے قرآن مجید میں موجود (بقول ان کے) کچھ معنوی تضادات کی نشاندہی کی ہے۔(2) مثلاً

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾(3) اور ﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾(4)

"آپ نصیحت کرتے جائیں آپ کا کام نصیحت کرنا ہے۔ آپ انہیں جبراً مسلمان کرنے والے نہیں ہیں۔"

اور ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَ اِنْ

---

(1) ایضاً، ۲/۴۱۴

(2) ایضاً، ۲/۴۲۸

(3) البقرۃ:۲۵۶

(4) الغاشیۃ:۲۲،۲۱

تُطِیۡعُوۡہُ تَہۡتَدُوۡا وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ﴾[1]

''آپ فرمادیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ پھر بھی کسی نے آپ سے منہ پھیر رکھا تو رسول کی ذمہ داری تو اتنی ہے جتنی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی ہے۔ جو بوجھ تم پر ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم خود ہی ہو۔ اگر تم رسول ﷺ کی فرماں برداری کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔''

مستشرقین کے خیال میں یہ تمام آیات ان آیات کے مخالف ہیں جن میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح کئی ایک آیات میں کہا گیا ہے۔ مسیح انسان اور صرف رسول ہیں[2]۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ وہ نوع انسانی میں سے نہیں۔ بلکہ ان کا مقام بلند تر ہے۔ پہلا مضمون سورۃ نساء میں یوں ہے:

﴿اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ ۚ اَلۡقٰہَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡہُ﴾[3]

دوسرا مضمون سورۃ التحریم میں یوں ہے:

﴿وَ مَرۡیَمَ ابۡنَتَ عِمۡرٰنَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا فَنَفَخۡنَا فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِنَا﴾[4]

مستشرقین کے بیان کردہ اس اختلاف کی حیثیت کیا ہے؟

مستشرقین جس چیز کو اختلاف و تضاد کہہ رہے ہیں وہ در حقیقت تضاد نہیں ہے۔ قرآن میں بیان شدہ کسی مسئلے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پس منظر کو سمجھا جائے جس میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے۔ سورۃ البقرۃ، سورۃ الغاشیہ اور سورۃ النور کی آیات میں یہ آیات بیان ہوئی ہیں کہ کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دین اسلام قبول کرے۔ دعوت پیش کی جائے گی کسی کی مرضی کہ وہ دعوت قبول کرے یا نہ کرے۔ جبکہ جہاد صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی قوم دین کو مٹانے کے لئے حملہ آور ہو، یا اس مقصد کے لئے جتھہ بندی اور سازشیں کرے۔ مذکورہ آیات میں بیان شدہ مضمون عام حالات میں اشاعت و تبلیغ سے ہے جبکہ جہاد جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں بیان شدہ آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ ان آیات میں اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ مسیح علیہ السلام انسان نہیں تھے۔ قرآن نے تو سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 59 میں فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام حضرت آدم کی

---

(1) النور:۵۴

(2) مریم:30

(3) النساء:۱۷۱

(4) التحریم:۱۲

مانند ہیں۔ اگر آدم علیہ السلام اللہ کی خصوصی قدرت سے پیدا ہوئے تو انہیں انسان ماننے میں کیا چیز آڑے آتی ہے۔ مسیح علیہ السلام کے بارے میں روح اللہ یا اللہ کلمہ کہنا ان کا اعزاز ہے کہ وہ انسان کے منصب سے مزید روح اللہ اور کلمۃ اللہ بھی ہیں اگر کسی کو اس کی بہادری کی وجہ سے اللہ کا شیر کہا جائے تو کیا یہ اس کے انسان ہونے کی نفی ہوگی۔ یہ دونوں قسم کی آیات ہرگز اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ عیسیٰ ابن مریم نوعِ انسانی میں سے نہیں ہیں۔ ان سے یہ معانی سمجھنا محض غلط فہمی ہے۔ (اس سلسلے میں "اظہار الحق" کے مقدمے کا ساتواں مسئلہ دیکھا جاسکتا ہے) (1)

ماضی کے واقعات کی خبروں کے بارے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ جب اُمّی تھے تو آپ کو سابقہ اقوام کی تباہی کے حالات کا علم کس طرح ہو گیا۔ آپ نے جن واقعات کی خبر دی ان میں سے متعدد ایسے ہیں جن کا اشارہ تک توراۃ یا انجیل میں موجود نہیں۔ خود علمائے اہل کتاب بھی ان واقعات سے بالکل بے خبر تھے۔ کوئی ذی ہوش انسان یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ محض چند ملاقاتوں کے نتیجے میں حضور ﷺ کو چند لوگوں سے اتنے لاتعداد واقعات کا اتنی صحت سے علم ہو گیا کہ کوئی بات بھی خلاف حقائق ثابت نہیں ہوئی۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کو یہ خبریں دیں آخر انہوں نے خود ان کا ذکر کر کے خود شہرت کیوں نہیں حاصل کر لی۔ پھر جب ان سے سن کر حضور ﷺ نے ان واقعات کے انکشاف کو اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا تو ان لوگوں نے سارا راز فاش کیوں نہیں کر دیا کہ انہوں نے تو ہم سے ان واقعات کا علم حاصل کر لیا ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب "اظہار الحق" کے ترجمہ "بائبل سے قرآن تک" کے حاشیے میں مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ بحیرہ راہب کا جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے حضور ﷺ نے یہ سارے واقعات معلوم کئے تھے۔ اگر اس واقعے کو آنکھیں بند کر کے درست تسلیم کر لیا جائے کہ محض مختصر سی ملاقات میں حضور ﷺ نے اتنے زیادہ واقعات کا علم حاصل کر لیا تو پھر ان تمام واقعات کو تمام تفصیلات کے ساتھ یاد رکھنا اور موقع بموقع ان کا انکشاف کرنا کہ سر مو اصل سنے ہوئے واقعہ سے اختلاف نہیں ہو پایا، عقل اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ (2)

اسی طرح اس بات کی بھی کوئی حقیقت نہیں کہ حضور ﷺ نے ایک استاذ رکھا ہوا تھا جو آپ ﷺ کو سکھاتا اور واقعات کی خبر دیتا تھا۔ جب حضور ﷺ کو اس قدر شہرت حاصل ہو گئی تو کبھی

---

1. بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور، ۲/۲۸۴

(2) ایضاً، ۲/۴۰۷

آپ ﷺ کے استاذ یا آپ ﷺ کے کسی ہم درس نے اصل حقیقت کو منکشف نہ کیا؟ ایک طرف نبوت کے دعوے کے بعد اس طرح کشمکش جاری تھی اور لوگ واضح طور پر دوست اور دشمن میں تقسیم ہو چکے تھے تو آپ ﷺ کے استاذ اور شاگرد یا تو آپ ﷺ کے مخالف ہوں گے یا آپ ﷺ کے ساتھی۔ یا تیسری صورت ہے کہ کچھ آپ ﷺ کے طرفدار ہوں اور کچھ مخالف۔ ہر صورت میں اس بات کا امکان نہیں تھا کہ اصل معاملہ منکشف نہ ہوتا۔ کوئی شخص آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتا تھا جس کو آپ ﷺ کے انکشافات کی اصلیت کا علم ہو اور مخالفت کی اس شدت میں مخالف آپ ﷺ کے اس "بھید" اور کمزوری کو چھپا نہیں سکتا تھا۔

قرآن مجید میں بہت سے ایسے علوم سے پردہ اٹھایا گیا ہے جن کا ذکر اس وقت تک موجود نہ تھا۔ خصوصاً جن لوگوں کا نام لیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ ان سے علم حاصل کر کے قرآن لکھا کرتے تھے تو وہ لوگ تو بہر حال زیادہ سے زیادہ واقعاتِ ماضی ہی سے واقف تھے۔ اگر وہ توراۃ و انجیل دونوں کے عالم تسلیم کر بھی لئے جائیں تب بھی یہ بات بالکل واضح اور مسلمہ حقیقت ہے کہ توراۃ و انجیل دونوں ان علوم سے بالکل خالی بلکہ کوسوں دور ہیں جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔[1] اس صورت میں یہ بات تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ قرآن کا ماخذ وحی الٰہی کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

موریس بوکائیے نے اپنی کتاب کے تیسرے سے ساتویں باب تک کائنات، اس کی تخلیق، وسعت اور اس کے انجام کے بارے میں قرآن مجید کے بیان کردہ حقائق کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ قرآن مجید اور بائبل کے بیانات میں واضح فرق موجود ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر موصوف نے طبیعیات، کیمیاء، حیاتیات۔ زراعت اور دیگر سائنسی شعبوں میں قرآن مجید میں موجود اشارات کا ذکر بھی کیا ہے۔[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن توریت و انجیل سے اخذ شدہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان دونوں کے بیانات میں مطابقت ہونی چاہیے تھی۔

قرآن مجید نے مشرکین مکّہ کو چیلنج دیا کہ اگر وہ قرآن کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو وہ بھی آخر انسان ہی ہیں۔ وہ اس جیسا کلام لا کر دکھا دیں۔ مشرکین تو اس کے سامنے خاموش ہو گئے لیکن مستشرقین ان کی اس

---

(1) اس سلسلے میں ڈاکٹر موریس بوکائیے کی کتاب The Bible, The Quran and Science اور افضل الرحمٰن کی Quranic Science کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(2) ایضاً

خاموشی کی توجیہہ یوں کرتے ہیں کہ ہر کام کی کچھ بنیادی ضروریات، لوازمات اور سامان ہوتا ہے۔ ممکن ہے فصحائے عرب ان اسباب ولوازمات سے محروم ہوں یا انہوں نے ایسا جواب دینے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی ہو یا انہیں وہ سہولیات میسر نہ ہوں جو محمد ﷺ کو حاصل تھیں۔[1] ان کا یہ عذر بے بنیاد ہے۔ جس قسم کا کام ہمارے زیر بحث ہے اس کیلئے عموماً مندرجہ ذیل اسباب کی ضرورت ہو سکتی ہے:

۱۔ قدرت یا مہارت
۲۔ مادہ، جس سے وہ اس کی مثل پیش کر سکتے۔
۳۔ باعث ومحرّک
۴۔ نمونہ

جہاں تک قدرت یا مہارت کی بات ہے تو ہر شخص جانتا ہے کہ اہل عرب میں ہر ایک، دوسرے سے بڑھ کر قادر الکلام تھا۔ شاعری ان کے رگ وریشے میں رچی بسی تھی۔ تاریخ عرب کے اندر اس سلسلے میں اس قدر موجود ہیں کہ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ان لوگوں میں اس دعوتِ معارضت کا جواب دینے کی قدرت یا مہارت موجود تھی۔ قرآن تیار کرنے کے لئے جہاں تک مادے کی بات ہے تو عرب بھی وہی زبان بولتے تھے جو قرآن کی زبان ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن پہلی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے، اس صورت میں تو وہ بڑی آسانی سے قرآن کی کچھ آیات لے کر توراۃ سے مماثل مقامات پیش کر دیتے۔ (ان کے بقول) قرآن کا اصل منبع تو موجود تھا) اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو دعوت معارضت میں بھی ان کی ناکامی ثابت ہوتی ہے اور دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے کہ قرآن کا منبع توراۃ ہے۔ تیسری ضرورت "باعث و محرک" ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ان کو قرآن کے مدمقابل کتاب لکھنے کی ضرورت تھی یا نہیں؟ قرآن نے تو ان کو چیلنج بھی دیا ہوا تھا۔

اسی طرح قرآن مجید کی شکل میں ان کے سامنے نمونہ بھی موجود تھا۔ ان چار اسباب کے علاوہ اور کون سی چیز کی ضرورت تھی جو فصحائے عرب کے پاس نہ تھی کہ وہ قرآن کی مثل پیش کرنے سے عاجز رہے۔[2]

مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن کے اس چیلنج کا جواب مشرکینِ مکّہ نے پیش کیا ہو گا مگر وہ ہم تک نہ پہنچا ہو۔[3]

---

(1) افغانی، حوالہ مذکور، ص: ۲۷

(2) ایضاً، ص: ۲۸

(3) ایضاً

اس عذر کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ کسی شخص یا گروہ نے اتنا بڑا معرکہ آراکارنامہ سرانجام دیا ہو اور اتنی بڑی بات کو تاریخ ہضم کر گئی اور اس کا کہیں جواب نظر نہ آسکا۔ آخر کہیں نہ کہیں تو کسی نہ کسی انداز میں اس کا ذکر ملنا چاہیئے تھا۔ اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مستشرقین کے اس نقطہ نگاہ کو تسلیم کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن، سحر کی مانند ہے۔ سحر بھی ساحر کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن سحر معجزہ یا خدا کا کلام نہیں کہلا سکتا۔ [1] اس عذر کا جواب یہ ہے کہ سحر اور معجزہ میں فرق ہے۔ سحر کسبی اور اسباب پر مبنی ہوتا ہے۔ جو شخص ساحرانہ اسباب اختیار کرتا ہے تو ساحرانہ اعمال پیش کر سکتا ہے۔ ایک ہی وقت میں متعدد ساحرین کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے والوں نے جب دیکھ لیا کہ ان کا سحر، کسبی، فنی، اور اسبابی چیز ہے تو انہوں نے معجزے کو تسلیم کر لیا۔

مستشرقین قرآن کو کلام محمدی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ محمد کی بلاغت یکتا تھی، لوگ ان کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ [2] یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے اگر ایسی ہی بات ہوتی تو کفارِ مکّہ اس کا اظہار کرنے سے قطعاً نہ چُوکتے۔ یہ بات تو قابلِ تسلیم نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مستشرقین کی معلومات، مشرکینِ عرب سے زیادہ ہیں۔ جب مشرکین نے اس طرح کی بات نہیں کی تو آج تیرہ چودہ سو برس بعد اس طرح کا نقطۂ نگاہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس شبے کا ازالہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اور قرآن مجید دونوں آج بھی موجود ہیں۔ ہر صاحبِ علم ان دونوں میں فرق کر سکتا ہے۔ قرآن کے معجزانہ اسلوب کا احادیثِ نبویہ سے واضح فرق ہے۔ اس سلسلے میں اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن پیش کرنے سے پہلے خوب سوچ وبچار کرتے تھے جبکہ احادیث برجستہ کلام ہے۔ لیکن یہ بات بھی واقعات کے برعکس ہے کئی بار ایسے ہوا کہ کسی مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا اور عین اسی وقت اس سوال کے جواب میں وحی نازل ہوئی اور بقول مستشرقین، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برجستہ کلام فرمانا پڑا۔ لیکن ایسی برجستہ آیات میں ہمیں کہیں بھی کلام کے معیار میں پستی نظر نہیں آتی۔ [3]

اس سلسلے میں مستشرقین کا ایک موقف یہ ہے کہ ہر ایک چیز کا بانی وموجد تو ایک ہی ہوتا ہے۔ گویا

---

(1) ایضاً، ص: ۲۹

(2) ایضاً

(3) ایضاً

جس طرح دورِ حاضر میں سائنس کا ایک ماہر نئی چیز ایجاد کرتا ہے تو گویا وہی اس چیز کا موجد بنتا ہے کوئی دوسرا اس کا موجد نہیں کہلا سکتا۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ کوئی دوسرا شخص یہ چیز بنا نہیں سکتا گویا دوسرے لوگ قرآن کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہر ایک کیلئے مواقع یکساں ہوتے ہیں کہ وہ کوئی چیز ایجاد کرسکے۔ دوم یہ کہ جب چیز ایجاد یا دریافت ہو چکی تو اس کے بعد تو یہ صلاحیت پیدا ہو جانی چاہیئے تھی کہ اہلِ مکہ اس کا توڑ اور نقل پیش کرتے۔ (1)

قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہوئے مستشرقین نے اس کے جن معائب کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ

"قرآن کہتا ہے کہ ہدایت و گمراہی اللہ کی طرف سے ہے۔ جنت میں نہریں، حوریں اور محلات ہیں اور کافروں کے خلاف جہاد کرنا واجب ہے۔ یہ تینوں کام قبیح اور برے ہیں۔ ایسے قبیح مضامین والا کلام خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔"

اس نقطہ نگاہ کا جواب مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے "اظہار الحق" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کے مضامین عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں بہت سے مقامات پر موجود ہیں لہٰذا انہیں مان لینا چاہیئے کہ ان کی مقدس کتابیں بھی یقینی طور پر اللہ کی جانب سے نازل شدہ نہیں ہیں۔ عیسائیوں کی کتابوں کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ کتابِ خروج باب چہارم آیت نمبر 21 میں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو جب مصر پہنچے تو دیکھ وہ سب کرامات جو میں نے تیرے ہاتھ میں رکھی ہیں، فرعون کے آگے دکھانا۔ لیکن میں اس کے دل کو سخت کردوں گا اور وہ ان لوگوں کو جانے نہیں دے گا۔" (2)

یہی بات الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ کتاب خروج، باب ہفتم آیت نمبر 3، خروج باب دہم آیت نمبر 1، اسی باب کی بیسویں اور ستائیسویں آیات، خروج باب یازدہم آیت نمبر 11، استثناء باب انیتس آیت نمبر ۴ میں بھی موجود ہے، اس کے علاوہ رومیوں کے خط باب نمبر 11 آیت نمبر 8، یوحنا باب ۱۲ میں بھی یہ بات موجود ہے۔ (3) کتاب یسعیاہ باب ششم آیت نمبر 10 میں ہے۔

---

(1) ایضاً

(2) بائبل سے قرآن تک، حوالہ مذکور، جلد 2، ص: ۴۱۵

(3) ایضاً

"تو ان کے دلوں کو چربادے (پردہ ڈال دے) ان کے کانوں پر پردہ ڈال دے ان کی آنکھیں بند کردے ایسا نہ ہو کہ وہ آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے کانوں سے سنیں اور اپنے دلوں سے سمجھ لیں اور باز آجائیں اور شفا پائیں۔"(1)

کتاب حزقی اہل ترجمہ مذکورہ کے باب چودہ آیت نمبر 9 میں ہے۔

"اور اگر نبی فریب کھا کر کچھ کہے تو میں، خداوند نے اس کو فریب دیا اور میں اپنا ہاتھ اس پر چلاؤں گا اور اسے اپنے اسرائیلی لوگوں میں سے نابود کردوں گا۔"(2)

یسعیاہ کے کلام میں وضاحت موجود ہے کہ اے رب تونے ہمیں گمراہ کیا اور حزقیل کے کلام میں پیغمبر کو فریب دینے کا تذکرہ موجود ہے۔(3)

کتاب یسعیاہ کے باب 45 آیت نمبر 7 میں ہے۔

"میں ہی روشنی کا موجد اور تاریکی کا خالق ہوں۔ میں سلامتی کا بانی اور بلا کو پیدا کرنے والا ہوں۔ میں ہی خداوند یہ سب کچھ کرنے والا ہوں۔"(4)

نوحہ یرمیاہ کے باب 3 آیت 38 میں ہے۔

"کیا بھلائی اور برائی حق تعالیٰ ہی کے حکم سے نہیں ہے۔"(5)

متی کے باب آیت نمبر 25 اور 26 میں ہے:

"جب مسیح علیہ السلام ان شہروں کو قیامت کے عذاب سے ڈرا کر فارغ ہوئے جنھوں نے توبہ نہیں کی تھی تو فرمایا: اے باپ! آسمان اور زمین کے خداوند! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تونے یہ باتیں داناؤں اور عقلمندوں سے چھپائیں اور بچوں پر ظاہر کیں۔ ہاں اے باپ! کیونکہ ایسا ہی تجھے پسند آیا۔"(6)

"ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی کتب میں یہ بات مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اندھا کردیا۔ ان کے دلوں کو سخت کردیا تھا کانوں کو بہرہ

---

(1) ایضاً، جلد۲، ص:۴۱۷

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً، ص:۴۱۹

(5) ایضاً

(6) ایضاً

کر دیا تھا۔ غالباً انہی آیات کے پیشِ نظر فرقہ پروٹسٹنٹ کا پیشوا لوتھر عقیدۂ جبر کی طرف مائل رہا ہے۔" (1)

کیتھولک ہیرلڈ کی جلد نہم صفحہ 277 میں اس کے اقوال موجود ہیں جن سے اسی عقیدے کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اکیس حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے کہ بائبل کے نزدیک خدا تعالیٰ شر کا بھی خالق ہے اور وہ لوگوں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ (2)

مستشرقین کے ان اعتراضات کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے شر پیدا کرنے سے خدا کا شریر ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی طرح جیسے سیاہ و سفید رنگوں کے پیدا کرنے سے خدا سیاہ یا سفید نہیں ہوتا۔ اس نے خیر کے ساتھ شر کو اس لئے پیدا کیا کہ برائی کو ظاہر کئے بغیر نہ انسانوں کی آزمائش ہو سکتی تھی اور نہ اچھائی کی قدر معلوم ہو سکتی تھی۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو روشنی میں کوئی لطف نہ ہوتا۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو صحت کی قدر و اہمیت کا احساس کس طرح ہوتا۔ (3)

مستشرقین کے اعتراض کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن میں جنت، حوروں، دوزخ و عذاب کی باتیں ہیں۔ جو معجز کلام کے منافی ہیں۔ لہٰذا قرآن کلام الٰہی نہیں ہے۔ (4)

قرآن میں ان چیزوں کے ذکر میں قباحت کی کوئی بات نہیں ہے مسلمان یہ نہیں کہتے کہ جنت کی لذتیں جسمانی لذتوں تک محدود ہیں بلکہ جنت جسمانی و روحانی ہر دو قسم کی لذات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی لذت دوسری سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں یوں کیا گیا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (5)

ان میں رضوان من اللہ باقی انعامات و لذت سے بڑی چیز ہے۔ گویا جنت کا سب سے بڑا عطیہ روحانی لذت ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی لکھتے ہیں:

انسانی تخلیق دو جوہروں سے ہوئی ہے ایک لطیف علوی دوسرا کثیفِ سفلی، جسمانی سعادت و شقاوت

---

(1) ایضاً، ص: ۴۲۱

(2) ایضاً، ص: ۴۲۲

(3) ایضاً، ص: ۴۱۶

(4) ایضاً، ص: ۴۱۵

(5) التوبۃ: ۷۲

کا دارومدار ان دونوں ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب جسمانی فوائد و منافع کے ساتھ ساتھ روحانی سعادتوں کا حصول بھی ہو تو بلاشبہ روح ان سعادتوں کے حصول میں کامیاب ہو سکتی ہے جو اس کے لائق و مناسب ہیں۔ اسی طرح جسم ان سعادتوں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گا جو اس کی شان کے لائق ہیں۔ یقینا "فوز عظیم" کا مصداق یہی ہو سکتا۔[1] خود انا جیل کے اندر جنت وغیرہ کا ذکر موجود ہے جس میں جسمانی لذات ہوں گی۔ حضرت مسیح علیہ السلام عشائے ربانی کے واقعہ میں آپ حواریوں سے ارشاد فرماتے ہیں:

"میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر کبھی نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمھارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں نہ پیوں۔"[2]

اسی طرح ایک اور جگہ لکھا ہے:

"اور پورب، پچھم، اتر، دکھن سے لوگ آکر خدا کی بادشاہی کی ضیافت میں شریک ہوں گے۔"[3]

قدیم مسیحی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جنت میں روحانی و جسمانی دونوں طرح کی لذات ملیں گی۔ سینٹ آگسٹن کہتا ہے:

"مجھے یہی رائے بھلی لگی ہے کہ جنت جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔"[4]

سینٹ ایکویناس نے تفصیل کے ساتھ ان لوگوں کا رڈ کیا ہے جو جنت کے جسمانی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔[5] انہی لوگوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ قرآن کریم میں وہ مضامین نہیں پائے جاتے جو روح کے مقتضیات اور اس کے پسندیدہ ہو سکتے ہیں۔[6]

اس اعتراض کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دو چیزیں جو روح کے مقتضیات و مقاصد ہیں ایک کامل اعتقادات دوسرے نیک اعمال، قرآن کریم ان دونوں قسم کے مضامین کو مکمل طور پر بیان کرتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ کس کے نزدیک روح کے مقتضیات کیا ہیں؟ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص یا گروہ روح کے جو مقتضیات قرار دیتا ہے قرآن بھی انہی کی تکمیل پر زور دے۔ قرآن جس چیز کو روح کے مقاصد قرار دیتا

---

(1) کیرانوی، حوالہ مذکور، جلد ۲، ص: ۴۲۵، ۴۲۴

(2) متی 29:26، مرقس 25:14، لوقا 18:22؛ کیرانوی، حوالہ مذکور، ۴۲۷/۲

(3) لوقا 29:13؛ کیرانوی، حوالہ مذکور، جلد 2، ص: ۴۲۸

(4) ایضاً

(5) ایضاً

(6) ایضاً

ہے ان کے حاصل کرنے اور ان کی تکمیل کیلئے وہ راستہ اور طریقہ بھی بیان کرتا ہے۔

عیسائی اور ہندو مصنفین نے اسلام اور قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کے جوابات دیگر لوگوں کے علاوہ مولانا ثناء اللہ امر تسری نے اپنی کتب "مقدس رسول ﷺ"، جواباتِ نصاریٰ، ترکِ اسلام، اسلام اور مسیحیت حق پرکاش اور معارفِ قرآن میں، مولانا عبد الحق حقانی نے تفسیر حقانی کے مقدمہ "البیان فی علوم القرآن" میں مولانا تقی عثمانی نے علوم القرآن میں دیئے ہیں۔

تیسرا باب

عہد نبوی میں حفاظت قرآن مجید

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کتابتِ قرآن مجید پر مستشرقین کے اعتراضات کا خلاصہ

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تجزیاتی جائزہ

جمع صدر یعنی حفظ

عہد نبوی میں کتابت قرآن

کتب سابقہ لکھی ہوئی تھیں

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کتابت وحی

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تحریری حالت میں قرآن کی موجودگی پر مزید شواہد

۱۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تدوینِ قرآن مجید کے حوالے سے بعض متعارض روایات کا جائزہ

وہ چیزیں جن پر قرآن لکھا جاتا تھا قابلِ اعتبار تھیں؟

عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج کتابتِ قرآن کی خارجی شہادت ہے

مارگولیتھ کے اشکالات کا تجزیہ

تنقیدی جائزہ

حضرت عمر فاروقؓ (۲۳ھ) اور حضرت ہشام بن حکیم کے واقعہ کی حقیقت

***

عہد نبوی میں حفاظت قرآن مجید

عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن مجید کی حفاظت کے حوالے سے مستشرقین کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اس عہدِ میں قرآن مجید نہ تو لکھا گیا اور نہ ہی ایسا ممکن تھا۔ اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے مستشرقین اس لئے بھی ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے ہیں کہ اگر ثابت ہو جائے کہ قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں لکھا ہوا موجود نہیں تھا تو گویا ان کے نزدیک قرآن کی تاریخ مشکوک اور غیر معتبر ہو جائے گی۔

عہدِ نبوی ﷺ میں عدم کتابت قرآن کے بارے میں سب سے پہلے نولڈیکے نے اظہارِ خیال کیا، وہ لکھتا ہے کہ:

☆ جب محمد ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت قرآن مجید متفرق اجزاء میں منتشر حالت میں موجود تھا۔ اور ان اجزاء کے ضائع ہو جانے کا خدشہ تھا۔[1]

☆ لوگوں کو قرآن حفظ تو تھا لیکن کسی کو مکمل طور پر یاد نہ تھا۔ اس بنیاد پر وہ صحتِ قرآن کو مشکوک بناتے ہوئے حفظِ قرآن کا ذکر کر کے لکھتا ہے:

> Certainly no one knows the whole and a merely oral propagation would have left the door open to all kinds of deliberate and inadvertent altrations.[2]

یقینی طور پر کوئی بھی صرف زبانی طور پر قرآن کی اشاعت کی تفصیلات نہیں جانتا کیونکہ حفظ کے ذریعے قرآن کی حفاظت کے طریقوں میں دانستہ یا نادانستہ لاپرواہی قرآن میں تبدیلی کا راستہ کھول دیتی ہے۔

نولڈیکے مزید لکھتا ہے کہ محمد ﷺ نے کبھی بھی نہیں سوچا ہو گا کہ وہ اپنی وحی کو ایک مستند کتاب کی شکل میں جمع کریں گے۔ انہیں تو بس اپنی تحریک کے مقاصد سے ہی تعلق ہوتا تھا۔ اور اس بات کا خدشہ ان

(1) Noldeke,Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit.p.49

(2) IBID

کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوا کہ اگر وحی کو محفوظ کرنے کا بندوبست نہ کیا گیا تو یہ ضائع بھی ہو سکتی ہے۔ (1)

Encyclopaedia of Islam کے مقالہ نگار Buhl نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

۱۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ محمد ﷺ کی وفات کے وقت قرآن کی حالت کیا تھی۔

۲۔ یہ بات حتمی ہے کہ محمد ﷺ کی وفات کے وقت قرآن کسی حتمی شکل میں موجود نہ تھا۔ (2)

۳۔ وہ کہتا ہے کہ بعد میں نازل ہونے والے قرآن کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لکھا جاتا تھا لیکن ابتدائی طور پر نازل ہونے والے حصوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ (گویا اگر ثابت کر دیا جائے کہ ابتدائی دور والا قرآن بھی مکمل طور پر محفوظ کر لیا گیا تھا تو پھر پورا قرآن محفوظ ثابت ہو جاتا ہے)

۴۔ اس کے خیال میں عین ممکن ہے کہ ابتدائی قرآن مجید کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو۔

۵۔ مقالہ نگار لکھتا ہے کہ ابھی رسول اللہ ﷺ کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ محسوس کیا گیا کہ یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کو لکھ لیا جائے۔

۶۔ مقالہ نگار اس وقت موجود لکھنے کیلئے استعمال ہونے والی اشیاء کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے کہ بھلا اس جیسی چیزوں پر لکھی ہوئی کسی چیز کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

۷۔ اس کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں حضور ﷺ کے سامنے ہی قرآن میں گڑبڑ کر دی گئی تھی۔

مقالہ نگار لکھتا ہے کہ بلاذری بیان کرتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا رضاعی بھائی عبداللہ ابن ابی سرح بھی تھا وہ علی الاعلان کہا کرتا تھا کہ وہ قرآن بطور کاتب نبوی لکھا کرتا تھا اور اس نے کئی ایک باتوں کو اپنی طرف سے قرآن میں شامل کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ قریش کے سامنے کہا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو وحی کے الفاظ بدلنے پر آمادہ کیا۔ مقالہ نگار کے الفاظ یہ ہیں:

........he (Abd Allah b. Abi Sarh) boasted before the Kuraish that he had often induced the Prophet to alter the wording of the revelations whence it ultimately came to be said that he had falsified the Kuran.

---

(1) IBID

(2) یہ رائے اس نے الاتقان جلد اوّل صفحہ ۷۱ کے حوالے سے قائم کی ہے۔

یہ بات اس نے گولڈزیہر (1921-1850) کی کتاب:

" Die Richtungen der islamischen Koranauslegung"

کے حوالے سے بیان کی ہے۔ اس قسم کی بات اس نے حضرت حسان بن ثابتؓ کے بارے میں بھی کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Finally we may call attention to important evidence in a poem by Mohammad's lauriate Hassan Bin Thabit after the battle of Badr in which he speaks of a khatt al wahy on smoth page, which here must almost certainly mean the writing of a revelation.(1)

ترجمہ: آخر میں ہم حضرت محمد ﷺ کے شاعر حسان ابن ثابتؓ کی ایک نظم کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو انہوں نے جنگِ بدر کے بعد لکھی تھی جس میں انہوں نے وحی کے راستے کے بارے میں اشعار کہے تھے جس کا غالب اور یقینی معنی یہی بنتا ہے کہ انہوں نے اس نظم میں وحی لکھی ہے۔

آرتھر جیفری کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کے متن کی تحقیق اور تعین کی کوشش کی ہی نہیں وہ ایک طویل عرصے تک اس مسئلے کی اہمیت سے بے نیاز اور لاپرواہ رہے، حتیٰ کہ ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد نہ تو ممکن رہا کہ قرآن کا متن متعین کیا جاسکے اور نہ ہی انہوں نے اس کی زیادہ فکر کی۔ یہ نقطہ نگاہ آرتھر جیفری نے اپنی کتاب:

Material for the History of the Text of the Quran کے Preface میں بیان کیا ہے۔(2) رچرڈبل (1876-1952) اور آرتھر جیفری (1959) کا اصل زور بیان اس پر صرف ہوا ہے کہ قرآن مجید عہد نبوی میں متفقہ تحریری متن کے ساتھ موجود نہ تھا بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا نسخہ بھی اصل متن کے تعین کی طرف ایک کوشش تھی۔ ورنہ اس دور کے بعد بھی لوگوں کے پاس مختلف مصاحف موجود رہے جو ان کے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی متفقہ متن موجود نہ تھا۔ رچرڈبل کہتا ہے کہ اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ والے نسخے کی کوئی متفقہ حیثیت ہوتی تو اسے سرکاری تحویل میں ہونا چاہئے تھا نہ کہ

---

(1) Buhl : Article "Quran" in Encyclopaedia of Islam p. 4141

(2) Jaffery, Arthur, Material for the History of the text of the Quran (preface), p. (i), Leiden E.J. Brill, 1937

حضرت حفصہؓ کے پاس۔ (1)

حضرت عثمانؓ نے جو نسخہ تیار کروایا اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی مقصد کے تحت تیار کروایا گیا۔ اس میں حضرت عثمانؓ نے اپنی مرضی کے آدمیوں کو تدوین قرآن کمیٹی کا ممبر بنا دیا اور یوں اپنی خواہش اور پسند کے مطابق نسخہ تیار کروالیا۔ (2)

بعض مستشرقین تو اس حد تک چلے گئے ہیں کہ بقول ان کے حجاج بن یوسف وہ پہلا شخص ہے جس نے قرآن مجید کا متن متعین کیا۔ (3) اس سے قبل اس کا تعین نہیں ہوا تھا گویا جب قرآن کے متن کے تعین کو حجاج سے منسوب کیا جائے گا تو حجاج جیسے ظالم شخص سے قرآن کے متن کی نسبت سن کر ہی لوگ سمجھ لیں گے کہ حجاج نے کس طرح کا متن متعین کروایا ہو گا؟

چونکہ حجاج بن یوسف کے ساتھ لاتعداد ایسے واقعات منسوب ہیں جن سے اس کی سفاکیت کا پتہ چلتا ہے اس طرح متن قرآن مجید کے عظیم الشان کام کا سہرا بھی اسی کے سر باندھ کر یہ تاثر پیدا کرنے کہ کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کام کس قدر غیر معتبر انسان کے ہاتھوں انجام پایا۔

آرتھر جیفری نے اپنی کتاب کے آغاز میں اس سے ملتا جلتا موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے قرآن مجید کے متن کے تعین کا کام کیا وہ ابن مجاہد (م ۳۲۴ھ) ہیں۔ (4)

حالانکہ امام ابن مجاہد کا کام قراءاتِ سبعہ کی تدوین ہے نہ کہ متنِ قرآن کی تدوین۔ گویا آرتھر جیفری نے یہاں خلط مبحث سے کام لیا ہے۔

آرتھر جیفری اپنی کتاب: Material for the History of the text of The Quran

میں حفاظت و تاریخِ قرآن کے بارے میں مسلمانوں میں معروف روایت (5) کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ

---

(1) Bell, Richard :Introdution to the Quran, Edinburgh University Press Edniburah, 1958 , p 38-44

(2) Hirschfeld,H. : New Researches in to the Composition and Exequies of the Quran, Universty of London, 1902,p.35

(3) Bell,Ibid,p.43

(4) Jeffery,Arthur: Ibid, P. 1

(5) حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو قرآن مجید بین الدفتین جمع کروانے کا مشورہ دیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ ابتداء میں تو ان سے متفق نہ ہوئے۔ بعد میں انہوں نے سرکاری طور پر اس کام کے لیے زید بن ثابتؓ کی سربراہی میں کمیٹی بنائی جس نے یہ کام سرانجام دیا۔ دیکھیے: البخاری: الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث نمبر: ۴۹۸۶، ص ۴۲۳

وہ روایت من گھڑت ہے۔ اس بات سے یقینی کوئی بات نہیں کہ حضور ﷺ جب فوت ہوئے، وحی کی لکھی ہوئی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ رچرڈ بل اور Yale کا حوالہ دے کر لکھتا ہے کہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کے اندر اندرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن کا ایک خاصا حصہ حضور ﷺ کے پاس تھا۔ اس کا کچھ حصہ Revised اور کچھ Unrevised تھا۔ حضور ﷺ اسے کتاب کی شکل میں امت کو دینا چاہتے تھے مگر آپ ﷺ کی وفات ہو گئی اور اس مواد کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ وہ کدھر گیا۔ اس کی تائید میں اس نے کاشانی کی شرح "صافی" سے شیعہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے وفات سے قبل حضرت علیؓ کو بلایا اور انہیں بتایا کہ وحی کا کچھ حصہ آپ ﷺ کی چارپائی کے نیچے پڑا ہے یہ کپڑوں اور پتوں پر لکھا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم فرمایا کہ وہ اس مواد کو لے کر اسے کتابی شکل میں شائع کریں۔

☆ مختلف کڑیاں ملا کر جیفری نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وحی کا بہت سارا حصہ ضائع ہو گیا۔

☆ حضور ﷺ کا پیغام بنیادی طور پر زبانی تھا۔

☆ وحی کے کسی حصے کا لکھا جانا یا نہ لکھا جا سکنا محض چانس کی بات ہے۔

☆ عہدِ نبوی ﷺ میں جو قرآن لکھا گیا وہ سارا قرآن نہیں بلکہ اس کے اہم حصے تھے۔ (1)

آرتھر جیفری کے الفاظ یوں ہیں:

> It is clear that he had been perparing a book for his community which would be for them what the old Testment was for jews and the New Testament for the Christian but he died before his book was ready and we have in Quran is what his followers were able to gather together after his death and issue as the corpus of his revelations.(2)

۵۔ "یہ بات واضح ہے کہ حضرت محمد ﷺ اپنے لوگوں کیلئے ایک کتاب تیار کرتے رہے جس کے بارے میں آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ اسے ایک ایسی کتاب کی شکل دیں جس کی حیثیت وہی ہو عہدِ نامہ قدیم کی یہودیوں کے نزدیک اور عہد نامہ جدید کی عیسائیوں کے نزدیک ہے لیکن اس کام کی تکمیل سے قبل ہی آپ ﷺ کی وفات ہو گئی اور موجودہ قرآن وہی کچھ ہے جسے آپ ﷺ کے ساتھی آپ ﷺ کی وفات

---

(1) Jeffery, Arthur: Material for the History of the Text of the Quran, E.J. Brill, London, 1937, p. 6-9

(2) Jeffery, Arthur: The Koran; A Scripture, Heritage Press New York, 1952, p.47

کے بعد اکٹھا کر پائے اور جسے انہوں نے وحی کا مجموعہ قرار دیا۔"

Stanley Lane Poole لکھتا ہے:

☆ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن مجید چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں نازل ہوا۔ یہ ٹکڑے ابھی جمع نہیں کئے گئے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہو گئی۔

☆ آپ ﷺ کی وفات کے ساتھ جب ان ٹکڑوں کو جمع کرنے کے کام کا آغاز ہوا تو ساتھ ہی جنگیں شروع ہو گئیں جن میں بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہو گئے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

".....That the Muslims perceived on how perishable a foundation their sacred book was built [1]"

"مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کی مقدس کتاب کس قدر ختم ہو جانے والی بنیادوں پر لکھی گئی تھی۔"

۴۔ Anthology of Islamic Literature کے مصنف کا بھی یہی نقطہ نگاہ ہے کہ

The Koran was not put together in written form untill well after Mohammad's death [2].

آرتھر جیفری کہتا ہے کہ

"حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں قرآن پڑھتے وقت لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے۔"[3]

آربری (Arthur John Arberry) (1905-1969) کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ قرآن دراصل احکام و قوانین، اصول و ضوابط۔ اوامر و نواہی اور ہدایات کی کتاب ہے۔ اور عہد نبوی ﷺ میں اس کی حیثیت اور شکل بس یہی تھی کہ یہ عربوں کو راہنمائی مہیّا کرتی تھی۔ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن لکھا ہوا نہ تھا، اور اگر لکھا ہوا تھا بھی تو وہ منتشر اور جزوی طور پر تھا یا پھر لوگوں کے حافظوں میں تھا۔ [4] لیکن وہ واضح

---

(1) Lanepoole, Stanley: Studies in Mosque, Khayat, Beirut, 1966, p. 123

(2) Kritzeck, James: Anthology of Islamic Literature, p. 23

(3) Jeffery, Arthur: Material for the History of the Text of the Quran, E.J. Brill, London, P. 5-6

(4) Arberry, A.J: The Koran Interpreted, Allen and Unwin London, 1955, p.15

طور پر کہتا ہے:

"As book it was published after the Prophet's Death "(1)

ترجمہ: ایک کتاب کے طور پر یہ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد طبع ہوئی۔

۷۔ عہدِ نبوی ﷺ میں کتابتِ قرآن کے بارے میں مار گولیتھ (۱۹۴۰ء۔۱۸۵۸ء) کا نقطہ نگاہ باقی لوگوں سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس نے اپنے نقطہ نگاہ کا ذکر Encyclopedia of Religion and Ethics اور دوسری تصنیف "Mohammedanism" میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

☆ عہدِ نبوی ﷺ میں کوئی ایک مخصوص نسخہ حضور ﷺ نے نہیں چھوڑا۔ اس کے الفاظ میں:

One fact that emerges from a study of our authoraties is that the Prophet kept no official copy of His revelations.(2)

"ہمارے ماہرین کے مطالعہ سے جو حقیقت منظرِ عام پر آتی ہے، یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے وحی کا کوئی سرکاری نسخہ اپنے پاس نہیں رکھا۔"

☆ مار گولیتھ اس دور میں کتابت کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اور قرآن مجید حفظ ہو چکنے کے بعد اس کی کتابت کے تمام انتظامات کی حیثیت عارضی ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید جسے کتاب کہتا ہے اس سے مراد "لوح محفوظ" والا قرآن مجید ہے۔(3) (اسی کتاب کے آئندہ صفحات میں تفصیلات پیش کی گئی ہیں کہ قرآن مکمل طور پر عہد نبوی میں لکھا جا چکا تھا جو مار گولیتھ کے اس خیال کو رد کرتا ہے۔)

Margoliouth نے Encyclopaedia of Religion And Ethics میں قرآن کے عنوان کے تحت قرآن مجید کی تاریخ کے بارے میں حقائق کو خوب مسخ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ عہد نبوی ﷺ یا عہدِ صدیقی میں قرآن مجید کے کسی متفقہ نسخے کی موجودگی کا انکار کرتا ہے بلکہ اس نے مختلف عہدوں میں قرآن مجید کے متفقہ نسخے کی تیاری کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ ہر بار ایسا نسخہ تیار نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ سن چھیاسی ہجری تک اس سلسلے کو طویل کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عباسی دور میں قرآن مجید کی موجودہ تاریخ وضع کی گئی۔

(1) Ibid, p.15

(2) Margoliouth, D.S,Mohammadanism, Butterworth London, 1928, p. 40

(3) Ibid

Margolliouth عہدِ نبوی ﷺ میں کتابت و حفاظتِ قرآن کے بارے میں لکھتا ہے کہ خود آپ ﷺ نے لوگوں کو قرآن لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِن قَبْلِ أَن يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ﴾(اور قرآن کی وحی آپ پر نازل کی جاتی ہے اس کے پڑھنے کے لئے آپ جلدی نہ کیا کریں)۔ وہ کہتے ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں اگر قرآن لکھا گیا بھی تو وہ محض محمد ﷺ کے چند صحابیوں نے لکھا۔ اور اس سے یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کے تمام لکھے ہوئے قرآن کو ملالیں تب بھی پورا قرآن نہیں بنتا۔ انہوں نے ابن سعد (230ھ)۔ طبری (310ھ) اور بخاری وغیرہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے قرآن لکھا۔ لیکن ان سب روایات کو مستشرق مذکور مشکوک ہی قرار دیتا ہے۔ مار گولیتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ)، حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض کہتے ہیں حضرت ابو بکر صدیقؓ(13ھ) نے بعض کہتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے اور بعض کے نزدیک حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قرآن جمع کیا۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ سیوطی (911ھ) نے جمع کرنے والوں کے ذکر پر مشتمل بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان میں سے دو روایات گذشتہ صدی کے ناقدین کو پسند آئی ہیں ایک عہد حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) والی اور دوسری حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) والی۔ لیکن وہ ان دونوں کے بارے میں یہی تاثر پیدا کرتا ہے کہ ان میں بہت سی خامیاں اور نقائص تھے۔ خلیفہ ثالث نے اپنے آپ کو طاقتور پاتے ہوئے دیگر نسخے جلادیے۔ وہ اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ وحی کی بنیادی شہادت کی عدم موجودگی میں قرآن کی ساری تاریخ کو درست تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ مستشرق کہتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے بھی ایک نسخہ تیار کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شیعوں، حضرت ابی بن کعبؓ (22ھ)، حضرت ابن مسعودؓ (32ھ)، حضرت علیؓ (40ھ) کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ان کے پاس بھی مختلف مصاحف تھے۔ مار گولیتھ کہتا ہے کہ سن چھیاسی کے بعد قرآن اکٹھا کرنے کی کاروائی کا خاتمہ ہوا۔ قرآن کے متن کو معیاری بنانے کیلئے اس کے بعد کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ [1]

۹۔ مستشرق نکلسن (Nicholson)(1868-1945) کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن لکھا نہیں گیا۔ جس طرح سے قرآن نازل ہوتا تھا۔ اس حالت میں یہ ممکن نہ تھا کہ کتابی شکل میں قرآن جمع کیا جاتا۔ نہ ہی محمد ﷺ نے اور نہ ہی آپ ﷺ کے کسی ساتھی نے قرآن جمع کیا کہ اس کی کوئی

---

(1) Margolliouth D.S, Article: "The Koran" in Encyclopaedia of Religion and Ethics, p . 547,548

Bell,Richard, Introduction to the Quran, Edinburgh U.P., 1970,P. 39.

دائمی حیثیت باقی رہ جاتی۔[1]

۱۰۔ Arthur Stanely Triton (1861-1973) کے نقطہ نگاہ میں کوئی خاص بات نہیں وہ یہی کہتا ہے کہ قرآن عہدِ نبوی ﷺ میں متفرق جگہوں پر لکھا ہوا تھا۔ باقاعدہ تدوین عہدِ صدیقی میں ہوئی اور اس پر نظر ثانی حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے کی۔ اس کے الفاظ میں:

It must be remembered that the imperfect script of the time was more like a shorthand report of a speech than the printed version.[2]

"یہ بات یاد رکھی جائے کہ اُس دور کا نسخہ کسی تقریر کی مختصر نویسی کی رپورٹ ہی کی طرح تھی کوئی مطبوعہ متن نہ تھا۔"

S.E.Frost (1899-1978) بھی یہی کہتا ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن متفرق تھا۔ آپ کی وفات کے ایک سال بعد اسے جمع کیا گیا۔ لیکن اس وقت بھی فیصلہ نہ ہو پایا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات کیا ہیں؟ عہدِ نبوی ﷺ میں وہ حفظِ قرآن کا بھی ذکر کرتا ہے۔[3]

Bouquet کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے کئی سورتیں قرآن سے نکال دیں اور کئی ایک اپنی مرضی سے شامل قرآن کر دیں۔ اس کے بقول عہدِ نبوی ﷺ میں ہی قرآن میں لوگوں نے گڑبڑ کر دی تھی لیکن اس وقت کے بعد سے یہی نسخہ "معیاری نسخہ" چلا آرہا ہے۔ ممکن ہے یہ گڑبڑ آپ کے صحابہؓ نے کی ہو۔[4]

۱۳۔ Jhon Bagot کا خیال ہے کہ

۱۔ قرآن عہدِ نبوی ﷺ میں لوگ حفظ کیا کرتے تھے۔

۲۔ بعض اوقات متفرق اشیاء پر لکھ لیا کرتے تھے۔

۳۔ قرآن لکھنے کے کام کا آغاز، آپ ﷺ کی وفات کے کوئی بیس برس بعد کیا گیا۔[5]

---

(1) Nicholson, p xii, xiii (Preface of The Translation The Quran by Palmer

(2) Tritton, A.S: Islam, Belief and Practice, Hutchinson London, 1962, p. 15

(3) Frost, S.E: The Sacred Writings of World's great Religions, Simon Publications, 2001 p. 90

(4) Bouquet. A.C, Sacred Books of the World. Penguin Books, London. 1959, p.285

(5) Bagot, Glunbbe, John: Life and times of Muhammad, Hoader and Soughter, London, 1970, p. 17

۱۴۔ جدید مستشرق Michal Cook اپنی کتاب Mohammad میں لکھتا ہے دو باتیں جو بہت ساری احادیث کی روشنی میں سامنے آئی ہیں کہ

i کتابتِ قرآن کا کام محمد ﷺ کی زندگی میں مکمل نہیں ہوا۔

ii یہ کام کم از کم عہدِ عثمانی میں مکمل ہوا۔

وہ عہدِ نبوی ﷺ میں کتابت قرآن کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے اور متصادم بات کرتا ہے وہ ایک طرف کہتا ہے کہ اس دور میں لوگوں نے مکمل طور پر قرآنِ مجید حفظ کر لیا تھا۔ آپ ﷺ وحی کے نزول کے ساتھ ہی قرآن لکھوا بھی لیتے تھے لیکن دوسری طرف کہتا ہے:

iii محمد ﷺ کا تیار کروایا ہوا نسخہ حفاظ کی شہادت کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا۔

وہ قرآن کی ساری تاریخ کو تشکیک کا شکار کر دیتا ہے جب لکھتا ہے:

The last of these traditions has tended to prevail but the choice is arbitrary one. The truth may lie anywhere within the limits of the discordant traditions, or outside them. (1)

ترجمہ: ان احادیث میں سے آخری احادیث سے یہ اشارات ملتے ہیں لیکن ان سے کئی طرح کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ قرآن کی تاریخ کے بارے میں حقائق ان متصادم روایات کے اندر ہیں یا حقائق کو ان روایات سے حاصل ہونے والے نتائج کے باہر سے حاصل کیا جائے گا۔

۱۵۔ تاریخ قرآن کے بارے میں جدید مستشرق Jhon Burton اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

☆ مسلمانوں کی ساری تاریخ میں جمع قرآن کے بارے میں کتنا ہی اختلاف ہو کہ سب سے پہلے قرآن کس نے جمع کیا لیکن یہ بات ہر جگہ متفق علیہ ہے کہ قرآن جمع کرنے والے محمد ﷺ نہیں تھے۔ (2)

جان برٹن لکھتا ہے:

☆ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن اس لئے نہیں لکھا جاسکا کہ قرآن اس وقت مکمل طور پر ابھی نازل ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس کی ترتیب بھی ممکن نہیں تھی۔

☆ نسخ کی وجہ سے قرآن میں اغلاط رہ گئیں۔ "منسوخ التلاوۃ موجود الحکم" قسم کے نسخ کی موجودگی میں "مسلمانوں میں سے کسی کے پاس بھی وہ قرآن موجود نہیں ہے جو حضور ﷺ نے لکھوایا تھا۔" (3)

---

(1) Cook, Michal: Muhammad, Oxford University Press, 1983, p. 67

(2) Burton, John, The Collection of the Quran, Cambridge University Press, Cambridge, 1977, p. 231

(3) Ibid

☆ نسخ نے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ تاریخ قرآن سے محمد ﷺ کو خارج کر دیں۔ مسلمانوں کیلئے یہ ایک مجبوری کا عمل تھا۔ اور یہی ان کے پاس ایک واحد راستہ تھا کہ وہ محمد ﷺ کو تاریخ قرآن سے خارج کر دیں۔(1)

یعنی اگر مسلمان کہتے کہ قرآن، حضور ﷺ نے جمع کیا تو پھر تو حضور ﷺ کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ آپ ﷺ کے عہد میں قرآن جمع ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ روایات بھی موجود ہیں کہ اس دوران نسخ کی وجہ سے قرآن کے کئی حصے ختم کر دئے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن جو اس وقت لکھا گیا، مکمل نہ تھا۔ لہٰذا اس الجھن کی بناء پر انہوں نے جمع قرآن کی تاریخ سے حضور ﷺ کو خارج کر دیا۔(2)

جان برٹن نے عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن جمع کرنے کے بارے میں انواع واقسام کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے نولڈیکے اور Schawale کے خیالات بیان کئے ہیں اور ابتداء میں اس کے بیان کردہ نقطہ نگاہ کے علاوہ وہ نولڈیکے کی خوشہ چینی بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کے متن پر کچھ زیادہ تحقیقات نہیں کیں۔(3)

جان برٹن کہتا ہے کہ مسلمانوں نے جب قرآن مجید کی تاریخ کا مطالعہ کیا تو تین باتیں ان کے ذہنوں میں موجود تھیں۔(4)

۱۔ ہمارے قرآن کے موجودہ متون مکمل نہیں ہیں۔

۲۔ ابتدائی دور میں حضور ﷺ کے ساتھیوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف نسخے مرتب کئے تھے یہ نسخے ابتدائی دور میں گردش کرتے رہے۔

۳۔ قرآن، حدیث، فقہ اسلامی کے مآخذ ہیں اور ان میں باہمی تصادم موجود ہے۔(5)

☆ جان برٹن نے وہ روایات جمع کی ہیں جن سے (اس کے خیال میں) پتہ چلتا ہے کہ قرآن مکمل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اس نے عبداللہ بن عمرؓ (73ھ) کی یہ روایت نقل کی ہے: ''تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے سارا قرآن جمع کر لیا ہے۔ وہ کیسے جان سکتا ہے کہ سارا قرآن کیا تھا؟ قرآن کا بہت سارا حصہ تو

---

(1) Ibid

(2) Ibid

(3) Ibid

(4) Ibid

(5) Ibid

ضائع ہو چکا ہے۔اس کی بجائے یہ کہنا چاہئے کہ میں نے وہ قرآن جمع کر لیا ہے جو باقی بچا ہے"[1]

دوسری روایت یہ ہے کہ زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں:"حضور ﷺ کی وفات ہو گئی جبکہ قرآن کسی ایک جگہ لکھا ہوا نہ تھا"۔[2]

ان روایات سے وہ مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتا ہے:

☆ محمد ﷺ، قرآن جمع کرنے میں ناکام رہے۔[3]

☆ قرآن نامکمل ہے۔اس بات کا خدشہ بلکہ یقین موجود ہے۔[4]

☆ جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے خدشے کا ذکر کر کے وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن جمع نہیں کیا گیا۔اور قرآن مجید کا ایک حصہ ضائع ہو گیا۔[5]

☆ زید بن ثابتؓ کا تیار کروایا ہوا نسخہ مکمل نہ تھا۔[6]

نولڈیکے کی تقلید میں وہ مزید کہتا ہے:

☆ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن پر نظر ثانی کا کوئی امکان نہ تھا۔[7]

☆ جب آپ ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد کم نہ تھی اس وقت قرآن مجید لکھنے کی زحمت نہیں کی گئی۔[8]

☆ جب ماننے والوں کی تعداد خاصی ہو گئی تو لوگوں نے وحی کو حافظوں میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔[9]

☆ گوناں گوں سیاسی اور جنگی مصروفیات کی وجہ سے یادداشتوں کا بہت سا حصہ لوگوں کو یاد نہ رہ سکا۔اور وہ نازل شدہ آیات کو بھول گئے۔[10]

---

(1) Ibid

(2) Ibid

(3) Ibid

(4) Ibid

(5) Ibid

(6) Ibid

(7) Ibid

(8) Ibid

(9) Ibid

(10) Ibid

☆ اسی وجہ سے آیات کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔[1]

☆ کئی ایک سورتوں کو محمد ﷺ، خود ہی بھول گئے۔[2]

☆ کئی ایک آیات کو اختصار کی خاطر، محمد ﷺ نے خود ہی بدل دیا۔[3]

☆ کئی ایک آیات منسوخ ہو گئیں۔ اور محمد ﷺ نے خود ہی بعض آیات کاٹ دیں۔[4]

وہ لکھتا ہے:

The Mushaf is thus not co-extensive either with the fullness of the revelation made to Mohammad or with the Quran as this bears upon the Islamic fiqh.[5]

ترجمہ: یہ مصحف نازل ہونے والی وحی کے حوالے سے بھی مکمل نہیں ہے، اور نہ ہی اسلامی احکام کے اعتبار سے مکمل ہے۔

☆ تاریخ قرآن کے بارے میں بظاہر متعارض روایات کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ روایات مجموعی طور پر قرآن حکیم کے متن کا تعیّن کرنے کے سلسلے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔[6] (عہد نبوی میں مکمل حفظ اور مکمل کتابت والی روایات مددگار کیوں نہیں بن سکتیں۔)

جان برٹن، نولڈیکے کا یہ بیان نقل کرتا ہے:

The Prophet could not have had access to writing the revelations nor did he care for it during his mission.[7]

ترجمہ: محمد ﷺ خود بھی لکھنا نہیں جانتے تھے اور نہ ہی اپنے مشن کے دوران اس کی پرواہ کی کہ قرآن کو لکھا جائے۔

---

(1) Ibid

(2) Ibid

(3) Ibid

(4) Ibid

(5) Ibid

(6) Ibid

(7) Ibid

برصغیر کے ایک پادری نے میزان الحق میں قرآن مجید کے عہدِ نبوی ﷺ میں عدم کتابت پر اسی طرح کے دلائل اکٹھے کرتے ہوئے موقف اختیار کیا ہے کہ موجودہ قرآن وہ قرآن نہیں ہے جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ (1)

عہدِ نبوی ﷺ میں کتابتِ قرآن مجید پر مستشرقین کے اعتراضات کا خلاصہ:

گذشتہ صفحات میں ہم نے مستشرقین کے جو اقوال نقل کئے ہیں ان کی روشنی میں عہدِ نبوی ﷺ میں کتابتِ قرآن مجید کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ مندرجہ ذیل نکات پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عہدِ نبوی میں قرآن مجید مکمل طور پر کہیں بھی لکھا ہوا نہ تھا۔ اس دور میں اس کام کی نہ تو ضرورت محسوس کی گئی اور نہ ہی کوئی کوشش ہوئی۔

۲۔ باقاعدہ تدوینِ قرآن اور نزولِ قرآن مجید کے درمیانی عرصے میں قرآن کے کئی حصے ضائع ہو گئے۔

۳۔ وہ اشیاء جن پر ابتدائی عہد میں قرآن مجید لکھا جاتا تھا وہ جلد ضائع ہو جانے والی تھیں۔ گویا اگر قرآن لکھا بھی گیا تو وہ اشیاء ضائع ہو گئی ہوں گی جن وہ لکھا گیا تھا۔ (2)

۴۔ جنگوں میں حفاظِ کرام کے شہید ہو جانے سے قرآن مجید کا بہت سارا حصہ ضائع ہو گیا۔ حفاظتِ قرآن مجید کا سب سے بڑا ذریعہ حفظِ قرآن ہی تھا۔ (3)

۵۔ نسخ فی القرآن کی بنیاد پر خصوصاً جان برٹن اس بات کو خوب اچھالتا ہے کہ قرآن مجید اپنی اصلی نزولی حالت میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ اس کے بہت سارے حصے اب موجود نہیں رہے۔

۶۔ صحابہ کرامؓ عہدِ نبوی ﷺ میں ہی تلاوتِ قرآن مجید میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے اس سلسلے میں وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور ہشام بن حکیمؓ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ دونوں نے سورۃ الفرقان کی تلاوت میں ایک دوسرے کو غلط قرار دیا تھا۔ (4)

۷۔ مارگولیتھ کہتا ہے کہ حضور ﷺ کو یاد نہ رہتا تھا کہ انہوں نے اس سے قبل کیا کہا تھا اس لئے وہ ایسی

---

(1) فنڈر، میزان الحق، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور، ۱۸۹۲ء، ص ۴۴۔۳۶

(2) Ibid

(3) Ibid

(4) برکت اللہ، پادری، صحت کتب مقدسہ، صفحہ 296

آیات قرآن مجید میں شامل کر دیتے جو اس سے قبل بھی موجود ہوتیں لیکن اب ان کے الفاظ پہلی آیات کے الفاظ سے مختلف ہوتے۔[1]

۸۔ وہ یہ بھی کہتا کہ حضور ﷺ قرآن مجید لکھواتے وقت محض سنے سنائے واقعات کو بنیاد بناتے اس لئے انہیں بعض اوقات لکھوانے اور واقعات کے بیان میں غلطی لگ جاتی تھی اس طرح انہوں نے قرآن مجید میں کئی ایک ایسے واقعات بیان کر دیے جو تورات سے مختلف تھے۔

۹۔ وہ روایات جن میں قرآن مجید کے عہدِ نبوی ﷺ میں لکھے جانے کا ذکر کیا گیا ہے ناقابلِ اعتبار ہیں۔

۱۰۔ عبداللہ ابن سرح کے بیان کی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ لوگ عہدِ نبوی ﷺ میں ہی کہا کرتے تھے کہ ہم نے قرآن مجید میں اضافے کر دیئے ہیں۔

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تجزیاتی جائزہ:

اعتراضات کے ضمن میں یہ بات ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مستشرقین نے محض ایک دوسرے کی خوشہ چینی ہی کی ہے۔ عموماً ذاتی تحقیقات کو بہت کم دخل حاصل ہے۔ (گزشتہ صفحات میں تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔)

☆ بعض جگہ ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین تکلفاً ایک دوسرے سے مختلف انداز میں استدلال کرتے ہیں بعض اوقات شواہد بھی ایک دوسرے سے مختلف بیان کرتے ہیں لیکن ان کے ذہنوں میں پہلے سے جوطے شدہ بات موجود ہوتی ہے وہ سب کے ہاں یکساں اور ایک ہی ہوتی ہے۔ نولڈیکے (Theodor Noldeke) (1836-1931) مارگولیتھ (D. S. Margoliouth) (1858-1940) رچرڈ بل (Richard Bell) (1876—1952) منٹگمری واٹ (Montgomery Watt) (1909-2006) مائیکل کوک (Michal Cook) اور جان برٹن (John Burton) تک ہمیں ہر جگہ مذکورہ بالا صورت نظر آئے گی کہ دلائل و شواہد تو ممکن ہے ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن ہر جگہ نتیجہ ایک ہی نظر آئے گا کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن تحریری شکل میں موجود نہیں تھا۔

عہد نبوی میں حفاظتِ قرآن کے بارے میں مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا ردّ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ لوگ قرآن کو اپنی کتابوں پر قیاس کرتے ہیں اور انہیں اپنی

---

(1) Margoliauth, Article ,Quran Encyclopaedia of Religion and Ethics vol x p.542

کتابوں سے جس قدر لگاؤ ہے اس پر قرآن سے مسلمانوں کے تعلق کو قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن اور ان کی کتابوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ان کی کسی کتاب کا کوئی حافظ کبھی موجود نہیں رہا۔ جس تواتر کے ساتھ قرآن روزانہ پڑھا جاتا ہے کوئی دوسری الہامی یا غیر الہامی کتاب اس طرح تلاوت نہیں کی جاتی۔ مسلمانوں کو اپنی کتاب سے جو لگاؤ ہے ویسا لگاؤ دنیا کی کسی کتاب کے ماننے والوں کو اپنی کتاب سے نہیں ہے۔ مسلمان اپنی کتاب کے بارے میں جس قدر محتاط اور حساس ہیں دنیا کی کوئی قوم اس قدر حساس نہیں ہے۔ کسی اور کتاب کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا جبکہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے اپنے اوپر لیا ہے کسی اور کتاب کے محفوظ ہونے کا دعویٰ قرآن کے سوا کسی اور کتاب نے نہیں کیا۔

اس سلسلے میں علامہ قرطبی (671ھ) نے عباسی دور خلافت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید کی سالانہ علمی مجلس میں ایک یہودی عالم آتا تھا اس کی پر اثر علمی تقریر سے متاثر ہو کر خلیفہ اسے اسلام کی دعوت دیتا رہا۔ لیکن وہ ہر بار انکار کر دیتا۔ جب وہ تیسرے برس اس سالانہ علمی مجلس کیلئے آیا تو وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ میں توراۃ اور انجیل کو خوب مزین کر کے لیکن اس میں الفاظ بدل کر لوگوں کے پاس لے کر گیا لوگوں نے اس کی ظاہری تزئین کو دیکھ کر یہ دیکھے بغیر کہ اس میں مَیں نے ردوبدل کر دیا تھا، فوراً خرید لیا۔ لیکن یہی معاملہ میں نے قرآن کے ساتھ بھی کیا لیکن مسلمانوں نے جب تک اس کے اندر کو نہیں دیکھ لیا اس وقت تک اس کی ظاہری تزئین سے متاثر نہیں ہوئے۔ میں نے جان لیا کہ جس مذہب کے لوگ اپنی کتاب کے بارے میں اس قدر محتاط ہوں، اس کی کتاب میں تحریف نہیں کی جا سکتی۔ (1)

آئندہ ابواب میں مستشرقین کے نقطہ نگاہ کے ردّ میں قرآن مجید، احادیث و روایات اور کتب سیرت و تاریخ سے حوالے دیئے جائیں گے۔ ان ماخذ سے حاصل شدہ دلائل کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم مستشرقین کو قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ کے شواہد پیش کر کے متن قرآن کی صحت کے بارے میں مطمئن نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ تو ہمارے ان ماخذ کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس کا جوب یہ ہے کہ جب ہماری تاریخ، ہمارے ماخذ اور لٹریچر سے دلائل اکٹھے کر کے یہ لوگ ہمارے اوپر اعتراض کرتے ہیں تو ہم ان پر انہی ماخذ سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اسی جگہ وہ دلائل بھی موجود ہیں جن سے ان کے نقطہ نگاہ کا رد ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان ماخذ سے اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں اور اپنے خلاف پڑنے والی دلیل سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں حالانکہ تحقیق کا اصول یہ ہے کہ مواد کے مجموعی مطالعہ کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اصول تحقیق تو

(1) قرطبی، محمد بن احمد النصاری، الجامع لاحکام القرآن، الجزء العاشر، ص:5

سب کے یکساں ہیں۔ گزشتہ سطور میں مستشرقین کا جو طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے اس میں مسلمان یا غیر مسلم کا تو معاملہ ہی نہیں۔ یہ معاملہ تو مسلمہ بین الاقوامی تحقیقی معیارات کا ہے۔ ان کی خلاف ورزی بے اصولی ہوگی۔ حفاظت قرآن مجید کی پوری تاریخ روز روشن کی طرح بالکل عیاں ہے۔ مسلمانوں کی ان بنیادی کتب میں مستشرقین کے پیدا کردہ ایک ایک شبہ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اب کسی طرح کا ابہام موجود نہیں رہنا چاہیے۔

مستشرقین کا نقطہ نگاہ اس اعتبار سے بہت کمزور ہے کہ وہ عہد نبوی میں قرآن کی کتابت اور حفاظت کے بارے میں متفق الرائے نہیں ہیں۔ ایک گروہ اگر کہتا ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں مسلمانوں نے قرآن کے متن کو محفوظ کرنے کا کوئی کام نہیں کیا تو انہی میں سے پالمر Edward (1840-1882) Henry Palmer[1] اور ولیم میور William Muir (1905ء)[2] جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو پورے یقین سے کہتے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ میں پورا قرآن تحریری حالت میں موجود تھا ایک اور گروہ کہتا ہے کہ عہد نبوی میں تو قرآن لکھا گیا لیکن بعد میں عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں گڑبڑ کر دی گئی ایک اور گروہ کہتا ہے کہ عہد عثمانی تک قرآن درست تھا حضرت عثمان (35ھ) نے گڑبڑ کر دی اس طرح ان کا کسی ایک بات پر متفق نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا موقف کمزور ہے۔

عہد نبوی میں حفاظتِ قرآن کے حوالے سے یہ بات واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا بھی یہی نقطہ نگاہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید کا سرکاری نسخہ بین الدفتین شکل میں نہیں دیا۔ مستشرقین بھی یہی کہتے ہیں لیکن دونوں کے نقطہ نگاہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ قرآن کتابی شکل میں نہیں دیا لیکن وہ مکمل اور ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ حضور ﷺ کے اپنے نسخے اور صحابہؓ کے مصاحف میں موجود تھا۔ اگر مکمل اور مرتب شکل میں موجود نہ ہوتا تو پھر مختلف ترتیبوں والے مصاحف کی تعداد اتنی ہوتی جتنی صحابہؓ کی کل تعداد تھی اور جتنے لوگوں نے مصحف تیار کر رکھے تھے ان سب میں الگ الگ ترتیب پائی جاتی جبکہ عملاً پہلے دن سے ہی محض چند ایک صحابہؓ کے ذاتی مصاحف کے سوا تمام کے تمام صحابہؓ کے مصاحف میں سورتوں کی ایک ہی ترتیب پائی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے قرآن بین الدفتین کتابی شکل میں اس لئے نہیں دیا کہ ابھی وحی نازل ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ابھی کتنی وحی نازل ہونی ہے اور نئی نازل ہونے والی وحی کو کس جگہ رکھنا ہے۔ عہد نبوی میں قرآن منتشر اوراق کی شکل

---

(1) Palmer, E.H, The Koran, Oxford University press, 1949, p xxii (Introduction)

(2) Muir, William, Life of Mahomet, Vol I, p5, (مقدمہ) بحوالہ ہیکل، حسین، حیاۃ محمد ﷺ

میں موجود ہونے کا مستشرقین کے ہاں یہ معنیٰ ہے کہ نامکمل قرآن کے کچھ اوراق جن کی کوئی ترتیب نہ تھی منتشر حالت میں موجود تھے مستشرقین کے ذہنی پس منظر کو ذہن میں رکھیں تو منتشر اوراق کا مطلب یہ بنتا ہے کہ ان منتشر اوراق کو جب اکٹھا کیا گیا تو ضروری نہیں کہ اکٹھا کرنے والا سب اوراق حاصل کر پایا ہو گا۔ اس طرح جمع قرآن کے وقت مکمل قرآن حاصل نہ ہو سکا جبکہ منتشر اوراق سے مسلمانوں کی مراد محض اس کا بین الدفتین حالت میں موجود نہ ہونا ہے لیکن ان اوراق یا اس مواد میں مکمل اور مرتب قرآن موجود تھا۔

گزشتہ باب میں شواہد کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے حدیث، سیرت اور تاریخ سے متعلق روایات کے اخذ و قبول کا ایک سخت معیار مقرر کر رکھا ہے اور جس روایت یا بیان کے بارے میں کوئی بھی سقم ہو مسلمان اس روایت کو قبول نہیں کرتے۔ اگر سقم کسی ذریعے سے دور ہو جائے تو وہ اس روایت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس کڑے معیار سے گزرنے کے بعد صحیح ثابت ہونے والی روایات کی بنیاد پر قرآن کے متن کی صحت کو ثابت کیا گیا ہے لیکن ان روایات کے بارے میں مستشرقین بیک جنبش زبان کہہ دیتے ہیں کہ یہ روایات ناقابل اعتبار ہیں۔ اگر یہ روایات ناقابل اعتبار ہیں تو آخر اس کی کوئی وجہ یا علت تو بیان کرنی چاہیے۔ اگر ایک شخص دنیا کی کسی مسلمہ حقیقت کے بارے میں کہہ دے کہ میں اس حقیقت کو نہیں مانتا، تو کیا اس کے ایسا کہہ دینے سے وہ حقیقت ختم ہو جائے گی۔ اسے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کرنی چاہیے۔

مزید ستم یہ ہے کہ جن روایات میں بیسیوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں انہیں لپک کر اس لئے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ان روایات سے ان کے مقصود اور مزعومہ نقطہ نگاہ کو تقویت مل رہی ہوتی ہے۔ جبکہ مسلمہ روایات کو اس لئے مسترد کر دیتے ہیں کہ ان سے ان کے پہلے سے طے شدہ نقطہ نگاہ کی کمزوری ثابت ہو رہی ہوتی ہے۔

اس لئے عقل، اصول اور تحقیق کے اصول و ضوابط کی پیروی کرنے والوں کے لئے مستشرقین کا یہ طریق کار یقیناً ایک تحقیقی بے اصولی ہو گی کہ صحیح یا کمزور کی تمیز کئے بغیر اپنی پسند اور ناپسند کو "اصول تحقیق" بنا لیا جائے۔

روایات سے استنباط اور ان کے اخذ واستفادہ کے حوالے سے اس پہلو کی طرف بھی قارئین کرام کی توجہ مبذول کروانا ضروری ہے کہ مستشرقین ایک روایت کا اتنا حصہ تو قبول کر لیتے ہیں جتنے حصے سے انہیں اپنے موقف کی تائید کے لئے کوئی نکتہ ملتا ہے اور اس کا باقی حصہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً بحیرہ راہب سے رسول اللہ ﷺ کے بچپن کی ملاقات والی روایت سے اتنا حصہ تو لے لیتے ہیں کہ آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اسی روایت میں بحیرہ راہب نے رسول اللہ ﷺ کے نبی ہونے کی نشانیوں کا ذکر کیا تھا اس سے

آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

یہ رویہ جہاں اخلاقی طور پر درست نہیں وہاں اصول تحقیق کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے۔ یہ تو قرآن مجید کی اس روایت کی عملی شکل ہے۔ ﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ﴾(1)

"کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو۔"

آئندہ صفحات میں ان لاتعداد شواہد کا ذکر کیا گیا ہے جن کی موجودگی میں اس بات کا انکار ممکن ہی نہیں کہ قرآن مجید عہد نبوی میں مکمل طور لکھا ہوا مرتب شکل میں موجود تھا لیکن آرتھر جیفری اور اس کے ساتھی کہہ دیتے ہیں کہ تدوین قرآن کی تاریخ سے متعلق روایات غیر معتبر ہیں اگر غیر معتبر ہیں تو فنی طور ان کے غیر معتبر ہونے کی وجہ بھی بیان کرنی چاہیے۔ واقعاتی شواہد پیش کرنے چاہییں کہ یہ روایات ان اسباب کی بنا پر نا قابل اعتبار ہیں جب ایسا نہیں ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب مقدمہ اور دعویٰ کا ثبوت اور دلیل نہ ہو وہ مقدمہ خارج کر دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے والے پر عدالت کوئی جرمانہ اور سزا بھی عائد کر دے کہ اس نے عدالت کا وقت ضائع کیا ہے۔

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا جائزہ لینے کے آغاز میں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ صرف مستشرقین ہی ہمارے مخاطب نہیں ہیں بلکہ ان کے نظریات سے آگاہی رکھنے والے مسلمان بھی ہمارے مخاطب ہیں۔ ان پر بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی حیثیت تنقید و تحقیق کے اصولوں کی رُو سے کیا ہے؟ مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا محاکمہ کرنے کے لئے جب قرآن مجید، احادیث اور دیگر اسلامی ماخذ سے استشہاد کیا جائے گا تو بظاہر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستشرقین تو قرآن و حدیث اور اسلامی ماخذ میں یقین ہی نہیں رکھتے انہیں ان سے دلائل دینے کا تو کوئی جواز نہیں۔ لیکن حقیقت بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث اور اسلامی ماخذ سے مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تردید تو اس لئے کی جائے گی کہ جب وہ قرآن و حدیث سے اپنے مطلب کے دلائل نکال لیتے ہیں تو پھر اسی قرآن و حدیث میں ان کی تردید میں بھی دلائل موجود ہیں اس لئے اصولاً انہیں اپنے خلاف پڑنے والے دلائل پر بھی نگاہ کرنی چاہیئے۔ دوسری طرف مسلمان قارئین تو ان ماخذ میں یقین رکھتے ہیں انہیں حقائق سے آگاہ کرنے کے لئے قرآن، حدیث اور کتب سیرت و تاریخ سے حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔ دلائل کی بنیاد پر بھی مسلمانوں کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں قرآن مجید مکمل طور پر جمع ہو چکا تھا۔

جمع کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

---

(1) البقرة:85

۱۔ جمع صدر: یعنی سینہ اور حافظے میں محفوظ کرنا۔

۲۔ جمع کتابی: یعنی تحریر کے ذریعے جمع و محفوظ کرنا۔

جمع صدر یعنی حفظ:

مسلمانوں نے اپنی کتاب کی حفاظت نہ تو صرف حفظ کے ذریعے کی ہے اور نہ محض کتابت پر اکتفا کیا ہے بلکہ ان دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مستشرقین حفظ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ گویا حفظ ایک ناقابلِ اعتبار ذریعہ ہے جبکہ ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اسے محض کسی چیز کا زبانی یاد کرنا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ لوگوں کا قرآن سے لگاؤ، قرآن کے بارے میں ان کی احتیاط، اسے حفظ کرنے کا اجر و ثواب اور عربوں کے عظیم الشان حافظہ کے پہلوؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے حفظ کو اس کے پورے سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیے۔

اگرچہ قرآن کی حفاظت، حفظ اور کتابت دونوں طریقوں سے کی گئی لیکن اس سلسلے میں اصل چیز حفظ تھا۔ قرآن نے اس سلسلے میں فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ﴾ [1]

"بلکہ یہ قرآن واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جنہیں سمجھ دی گئی اور ہماری آیات کا انکار ظالم لوگ ہی کرتے ہیں۔"

حسن بصری فرماتے ہیں کہ حفظ کی نعمت صرف مسلمانوں کو عطا کی گئی ہے۔ اس سے پہلے کے لوگ اپنی کتابوں کو دیکھ کر پڑھا کرتے تھے۔ [2] علامہ ابن کثیر (774ھ) لکھتے ہیں کہ گذشتہ کتابوں میں امت مسلمہ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ أناجِيلُهُمْ فِي صُدُورِهِم ان کی انجیلیں ان کے سینوں میں ہوں گی۔ [3]

مسلم شریف میں روایت ہے اللہ تعالی فرماتے ہیں: میں نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جسے پانی نہیں دھو سکے گا اور جسے آپ سوتے جاگتے پڑھتے رہیں گے۔ [4]

نبی کریم ﷺ نے قبائل اور فوج کے سربراہ مقرر کرتے وقت بھی حفظ قرآن کو معیار بنایا تھا۔ [5]

---

(1) العنکبوت: 49

(2) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد 13، صفحہ 335

(3) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد ششم، صفحہ 295، زیر العنکبوت آیت نمبر 49

(4) مسلم، کتاب الجنة، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنة واهل النار، حدیث 7207

(5) الاتقان، 199/2

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قرآن چار افراد سے سیکھا کرو۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ (32ھ)، سالمؓ، معاذ بن جبلؓ (18ھ) اور ابی بن کعبؓ (22ھ)۔ [1] اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے علما نے لکھا ہے کہ یہ قرآن کے اساتذہ میں سے اہم ترین شخصیات تھیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے علاوہ کوئی اور صحابی اس مقام پر فائز نہ تھا کہ اس سے قرآن پڑھا جاسکتا۔ [2] حضور ﷺ نے تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) کی تلاوت کی بھی تعریف فرمائی تھی۔ [3]

تفصیلات اس پر شاہد ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں بھی حفظ قرآن کا باقاعدہ اہتمام تھا۔ صحابہؓ جس محبت اور لگاؤ سے قرآن حفظ کرتے تھے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت سیکڑوں حفاظ صحابہؓ موجود تھے۔ صحابہؓ کی کثرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنگ یمامہ میں ستر حفاظ شہید ہوئے۔ اتنے ہی حافظ صحابہؓ حضور ﷺ کے عہد میں بیرِ معونہ میں شہید کیے گئے۔ جب ان مواقع پر اس قدر حافظ صحابہؓ شہید ہوئے تو اس سے عقلی اعتبار سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سوسائٹی میں کتنے لوگ حافظ قرآن ہوں گے۔ ظاہر ہے جنگ یمامہ کی فوج صرف حافظوں پر ہی مشتمل تو نہ ہوگی۔ فوج تو Randomly تیار کی گئی ہوگی۔ قرآن کے متن کا محفوظ ہونا تو ایک الگ حقیقت ہے ہمیں تو یہ بات بھی معتبر روایات کی بنیاد پر معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ مختلف الفاظ کس طرح ادا فرمایا کرتے تھے اس سلسلے میں کتب حدیث میں ابواب موجود ہیں۔ [4]

اللہ تعالیٰ نے عربوں کی قوتِ حافظہ کو قرآن اور اسلام کی اشاعت تیزی سے کروانے کا ذریعہ بنایا۔ بقول مولانا تقی عثمانی اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو قرآن کی نہ اتنی سرعت کے ساتھ اشاعت ہو پاتی نہ قابل اعتماد حفاظت ہو سکتی۔ اللہ نے عربوں کو بے پناہ قوتِ حافظہ عطا فرمادی تھی کہ ایک شخص کو ہزاروں اشعار زبانی یاد ہوتے تھے۔ حفظ کی وجہ سے جہاں جہاں کوئی صحابیؓ گیا وہاں قرآن بھی پہنچ گیا۔ عرب چونکہ امی تھے اس لیے قرآن پڑھانے کے لیے پہلے لکھنے پڑھنے کا بندوبست کرنے کی بجائے اللہ نے حفظ کو قرآن

---

(1) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب رسول اللہ، حدیث نمبر 4999

(2) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، باب القراء من اصحاب النبی ﷺ، جلد نہم، صفحہ 422۔ عینی، بدر الدین، علامہ، عمدۃ القاری، جلد 11، صفحہ 484-485، 520

(3) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب حسن بالقراءۃ للقرآن، حدیث نمبر 5048، کتب الستۃ، ص: 437

(4) بخاری کتاب فضائل القرآن، باب مد القراءۃ، حدیث نمبر ۵۰۴۶، ۵۰۴۵۔ ابو داود، کتاب الحروف والقراءات، حدیث نمبر ۳۹۶۹ تا ۴۰۰۸

کی اشاعت کا ذریعہ بنادیا۔[1]

عربوں کی قوتِ حافظہ کے بارے میں محمد علی صابونی لکھتے ہیں کہ ان کی یہ قوت امتیازی شان رکھتی ہے، وہ سریع الحفظ اور ذہن رسا رکھتے تھے۔ انھیں سیکڑوں، ہزاروں اشعار زبانی یاد ہوتے تھے۔ حساب انساب اور تاریخ انہیں زبانی یاد ہوتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں عرب اس وقت امی تھے انہیں نہ لکھنا آتا تھا نہ پڑھنا۔ اس لیے فطری طور پر وہ حافظے سے کام لیتے تھے اور اس صلاحیت پر چونکہ انہیں زیادہ دار و مدار رکھنا پڑتا تھا اس لیے فطری طور پر یہ صلاحیت بڑی مضبوط اور قابل بھروسہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے عربوں کی اس صلاحیت کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ ان کی قوتِ حافظہ لاجواب تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو حفظ قرآن کے لیے استعمال کیا۔[2]

معروف مستشرق ولیم میور (1905ء) نے بھی اس سلسلے میں واقعاتی شواہد کی بنیاد پر کہا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق، اس کی مسلسل تلاوت اور عربوں کی قوتِ حافظہ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن ابتدائی دور میں ہی قابل اعتبار انداز سے حافظوں میں محفوظ ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

ارکانِ اسلام کی بنیاد اس مقدس وحی پر ہے جس کا کوئی نہ کوئی حصہ روزانہ کی ہر ایک نماز میں پڑھنا واجب ہے نماز کے بعض ارکان میں اس مقدس وحی کی تلاوت فرض اور بعض میں سنت ہے صدر اول سے ہی مسلمانوں کا اس پر اجماع تھا۔ اجماع کے احکام وہ اس مقدس وحی سے مستنبط کرتے ہیں۔ اسی ضرورت یعنی نماز میں قرآن پڑھنے کیلئے صدر اول کا ہر ایک مسلمان قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کرلیتا تھا جسے وہ اپنی زندگی کا گراں بہا سرمایہ متصور کرتا تھا۔[3]

عرب کے رہنے والے جنہیں اشعار وانساب وروایات حفظ کرلینے کی زمانہ جاہلیت سے عادت پڑی ہوئی تھی، ان کیلئے قرآن کی آیات حفظ کر لینا اور بھی آسان تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ نوشت و خواند کے طریقوں سے عموماً قاصر تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے ساتھی بھی ان صفات سے متصف تھے۔ جنہیں قرآنی آیات اس طرح، ان کے محلِ نزول کے ساتھ حفظ تھیں کہ وہ جب چاہتے تھے ان کا اعادہ کرلیتے تھے۔[4]

مگر ہم اہلِ عرب کی اس مافوق الفطرت قوتِ حافظہ کے باوجود تسلیم نہیں کر سکتے کہ اسی ایک

---

(1) ماخوذ تقی عثمانی، مولانا، علوم القرآن، صفحہ 177

(2) صابونی، محمد علی، التبیان فی علوم القرآن، صفحہ 47

(3) Muir, William, Life of Mahomet, Vol I, p5, (مقدمہ) بحوالہ ہیکل، حسین، حیاۃ محمد ﷺ

(4) ایضاً

طاقت کے بل بوتے پر قرآن محفوظ رہ گیا۔ بلکہ ہمارے سامنے ایسے دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے اصحاب میں اکثر افراد نے اپنے پیغمبر کی زندگی ہی میں قران کی متفرق سورتیں املاء بھی کر رکھی تھیں جس کے مجموعہ میں تقریباً سارا قرآن سمٹ آیا۔[1]

ولیم میور (1905ء) اس پر بھی شواہد پیش کرتا ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں لوگوں نے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسی عہد میں انہیں قرآن لکھنے کا طریقہ بھی آگیا تھا۔ یعنی ایک طرف عرب کے مافوق العادت قوتِ حافظہ اور چیزیں یاد رکھنے کیلئے حافظے سے کام لینے کی عادت، قرآنِ مجید حفظ کرنے میں مددگار ثابت ہوئی۔ تو دوسری طرف عین اسی دور میں کتابتِ قرآن کیلئے لوگوں کو لکھنے کا طریقہ بھی سکھایا گیا۔ پڑھنے لکھنے کے طریقے کے عام ہوجانے کا ذکر، ولیم میور (1905ء) بدر کے قیدیوں کے حوالے سے کرتا ہے۔ جو قیدی فدیہ دے کر بھی رہانہ ہوسکے ان میں سے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کی رہائی کی یہ شرط لگائی گئی کہ وہ مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھائے۔ میور (1905ء) لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کے بے شمار افراد نے ان سے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا۔ کیونکہ اہل مدینہ تہذیب و تمدن میں مکہ والوں سے بہت پیچھے تھے۔ اگرچہ ان میں بھی اکثر افراد اسلام لانے سے قبل کتابت سے واقف تھے۔"[2]

اس کی روشنی میں ولیم میور (1905ء) لکھتے ہیں:

"یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قرآن کی جو آیات اور سورتیں مسلمانوں کے حافظے میں منقوش تھیں وہ کتابت کی شکل میں مسطور بھی ہوگئیں۔"[3]

وہ مزید لکھتے ہیں:

"پھر یہ بھی ثابت ہے کہ قبائل میں سے جو لوگ اسلام لاتے، حضرت محمد ﷺ ان کی تعلیم و رہبری کیلئے اپنے اصحاب میں سے ایک یا زیادہ اشخاص ضرورت کے مطابق ان قبائل میں بھجوادیتے۔ اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے یہ مبلغین اپنے ہمراہ ایسی تحریریں بھی ساتھ لے جاتے جن میں اسلام کے اصول و قواعد لکھے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان مبلغین کی تحریری دستاویزوں میں قرآن بھی تحریری صورت میں ہوتا ہوگا۔ خصوصاً وہ آیات جو شعائرِ اسلام کیلئے مختص ہیں اور وہ آیات جن کا نماز میں پڑھنا ضروری ہے۔"[4]

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

قرآن خود بھی اپنی کتابت پر شواہد پیش کرتا ہے۔ کتب سیرت میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ جیسا کہ (ایک روایت کے مطابق) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کا اسلام لانے کا واقعہ ہے کہ ان کی ہمشیرہ کی تحویل میں سورۃ طٰہٰ تحریری شکل میں موجود تھی۔ ہجرت سے قبل جب مسلمانوں کی تعداد بالکل قلیل تھی اور مظلومیت کا بری طرح شکار تھے مگر قرآن کی املاء پھر بھی ان میں رائج تھی۔ یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی عذر پیش نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ عروج میں انہوں نے قرآن کے متعدد نسخے کتابت نہ کروالئے ہوں گے۔ خصوصاً جب کہ قرآن ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون بھی تھا اور ان اوراق کو اطراف واکناف ملک میں نہ بھجوا دیا ہو۔[1]

ولیم میور (1905ء) لکھتا ہے: "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن ان دونوں شکلوں (تحریر وحفظ میں) موجود تھا۔ اور ان کی رحلت کے ایک سال بعد تک اسی طرح رہا۔ یعنی:

ا۔ حفاظ کے سینوں میں

۲۔ مختلف لکھے ہوئے اجزاء میں

دن بدن ان دونوں طریقوں میں توسیع ہوتی گئی پس کیونکر تسلیم کرلیا جائے کہ قرآن کی ان دونوں صورتوں میں مطابقت نہ ہو جب کہ وہ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزیز ترین سرمایہ تھا۔ مسلمان اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں خدا کا کلام سمجھتے کہ اگر کسی کو اس کے متن میں شبہ ہوتا تو فوراً رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا جاتا جیسا کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ (22ھ) کا معاملہ ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اگر صحابہؓ کا قرآن کی آیات میں اختلاف ہوتا تو وہ اس کا حل تین صورتوں سے کرتے۔

ا۔ کتابت شدہ اجزاء سے

۲۔ اقرب الی الرسول صحابہؓ کے باہم مذاکرہ سے

۳۔ کاتبینِ وحی سے رجوع کی صورت میں[2]

حفاظت قرآن مجید میں حقیقت بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا مدار نہ مکمل طور پر حفظ پر تھا اور نہ ہی مکمل طور پر کتابت پر۔ لیکن اس وقت کے حالات بتاتے ہیں کہ ابتدائی طور پر زیادہ مدار حفظ پر کیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ قرآن کی ترغیب دی اس کے عظیم الشان اجر سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ لوگ حفظ پر لگ

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

گئے۔ آپ ﷺ راتوں کو تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے۔ نمازوں میں تلاوت کرتے۔ سید الحفاظ خود حضور ﷺ ہیں۔ صحابہؓ حفظ میں مسابقت کرتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو گھروں میں قرآن حفظ کرواتے۔ کوئی شخص صحابہؓ کے گھروں کے پاس سے گزرتا تو بچوں کے قرآن پڑھنے کی آوازیں اس طرح سنائی دیتیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ آپ ﷺ صحابہؓ کے گھروں کے پاس سے گزرتے تو آپ ﷺ رات کے اندھیرے میں رک جاتے اور قرآن سنتے۔ بخاری میں روایت ہے:

عن ابی موسیٰ ان النبی ﷺ قال له یا اباموسی لقد اوتیت مزمارا من مزامیر ال داؤد[1]

اے ابو موسی تجھے داؤد علیہ اسلام جیسی خوش الحانی عطا کی گئی ہے۔

جو شخص ہجرت کر کے مدینہ آتا اسے انصار کے سپرد کر دیا جاتا کہ وہ انہیں قرآن سکھائیں۔ مسجد میں قرآن سیکھنے والوں کی آواز اس قدر ہوگئی کہ حضور ﷺ نے انہیں منع فرمایا کہ آہستہ آواز میں پڑھیں کہ کسی دوسرے کو مغالطہ نہ لگے۔[2]

یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہؓ کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے مختلف علاقوں میں متعین فرماتے تھے۔ جن لوگوں کو بھیجا جاتا تھا ان کے بارے میں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے حافظ اور ماہر ہوتے ہوں گے۔ حضرت مصعب ابن عمیرؓ اور حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کو مدینہ طیبہ، معاذ ابن جبلؓ (18ھ) کو ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ میں قرآن کی تعلیم کے لیے بھیجا۔

مستشرقین نے شیعہ روایات کی روشنی میں عہد نبوی میں کتابت قرآن مجید کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن لکھا ہوا موجود نہ تھا۔ مثلاً آرتھر جیفری اس طرح کی روایت بیان کرتا ہے کہ نازل ہونے والی وحی کا کچھ حصہ حضور ﷺ کے سرہانے پڑا تھا کہ اسے بکری کھا گئی۔[3] جبکہ شیعہ کے معتبر علماء اس نقطہ نگاہ کی تردید کرتے ہیں۔

شیعہ عالم علامہ الخوئی دلائل کے ساتھ اس بات کی تردید کرتے ہیں۔[4]

علامہ رافعی لکھتے ہیں کہ صحابہؓ نبی کریم ﷺ کے سامنے نازل ہونے والے حصے لکھ لیا کرتے تھے۔

---

(1) بخاری کتاب فضائل القرآن، باب حسن الصوت، بالقراءۃ للقرآن، حدیث نمبر ۵۰۴۸۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لئے دیکھیں۔ ابوداؤد، باب کیف یستحب الترتیل فی القراءۃ، حدیث 1450 تا 1459

(2) مناہل العرفان، حصہ اول، صفحہ 234

(3) Material for the History of the Text of Quran, P.I (Preface)

(4) الخوئی، علامہ تفسیر البیان، صفحہ ۱۶۲۔ اس کا تفصیلی جائزہ کتاب کے پہلے باب میں پیش کیا گیا ہے۔

وہ حضور ﷺ کے حکم سے بھی ایسا کرتے اور خود اپنے طور پر بھی۔[1]

علامہ طبرسی نے سید مرتضیٰ کا بیان نقل کیا ہے کہ قرآن کریم کا صحت کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل کو نقل ہونا ایسا ہی ہے جیسے شہروں اور مختلف واقعات کا علم جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہے قرآن عہد نبوی میں اسی طرح ترتیب کے ساتھ جمع شدہ حالت میں موجود تھا جس طرح آج ہمارے پاس ہے۔ وہ یہ بات پورے دلائل اور شواہد کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے جن میں عبداللہ ابن مسعودؓ (32ھ) اور ابی بن کعبؓ (22ھ) وغیرہ شامل ہیں مکمل قرآن کئی کئی مرتبہ پڑھا۔ وہ لکھتے ہیں:

وَهُوَ يَدُلُّ بِأَمَلٍ على انه كان مجموعاً مرتباً غير منشود، ولا مبثوث۔[2]

انہوں نے علامہ سیوطی (911ھ) کا حوالہ بھی دیا ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں کہ اس پر نصوص بھی موجود ہیں اور اس پر اجماع بھی ہے کہ آیاتِ قرآن کی ترتیب توقیفی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ اس پر حضرت زید بن ثابت کا بیان کہ "کنا نولف القرآن من الرقاع "نص کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اجماع سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نے بھی اس کے خلاف نہیں لکھا کہ قرآن عہد نبوی ﷺ میں مکمل اور مرتب شکل میں موجود تھا[3] اس سلسلے میں علامہ سیوطی (911ھ) نے قاضی ابو بکر اور علامہ بغوی (516ھ) کے بیانات بھی نقل کیے ہیں۔[4]

شیعہ عالم ابوالفضل خیر محمدی اپنی کتاب بحوث فی تاریخ القرآن و علومہ میں عہد نبوی میں قرآن مجید کے مکمل و مرتب ہونے کی عقلی دلیل یہ دیتے ہیں کہ

ا۔ نبی کریم ﷺ کتابت و حفاظت قرآن کا سب چیزوں سے بڑھ کر اہتمام کرتے تھے۔ آپ ﷺ قرآن کے حفظ کی ترغیب دیتے تھے حتّٰی کہ اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کو جلدی کرنے سے منع کیا گیا کہ ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ ﴾ وہ ذات جو جانتی تھی اور جس کی مرضی تھی کہ قرآن نے رہتی دنیا تک مرکز و محور بننا ہے، وہ ذات اسے مختلف لوگوں کے سینوں میں ہی موجود رہنے تک کس طرح محدود رکھ سکتی تھی۔ عقل کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ

---

(1) رافعی، علامہ، اعجاز القرآن، 36

(2) طبرسی، مجمع البیان، الفن الخامس، جلد اول، صفحہ 15

(3) الاتقان، النوع 18، جلد اول، صفحہ 80

(4) ایضاً

نے اس دائمی صحیفہ ہدایت کو یقیناً ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا۔

۲۔ مصنف عہد نبوی میں قرآن کے مکمل و مرتب ہونے کی دوسری عقلی دلیل (بقول شیعہ مکتب فکر) یہ حدیث ثقلین پیش کرتے ہیں جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

انی تارک فیکم الثقلین: کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی۔[1]

۳۔ مصنف اس پر تیسری عقلی دلیل یہ دیتے ہیں کہ کتاب کا اطلاق کیا ہی اس چیز پر جاتا ہے جو لکھی ہوئی موجود ہو۔ جو چیز کسی کے حافظہ میں ہو اس پر کتاب کا اطلاق نہیں ہوتا اور نہ اس چیز پر کتاب کا اطلاق کیا جاتا ہے جو لوگوں پر پڑھی جاتی ہو یا لوگ اسے پڑھتے ہوں۔[2]

عہد نبوی ﷺ میں قرآن کے مکمل و مرتب ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ کے کاتبین وحی تھے۔ جب قرآن نازل ہوتا تو آپ ﷺ ان میں سے کسی کو بلاتے اور وہ قرآن کو لکھ لیتے۔ علامہ الخوئی تو اس سے آگے جاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتاب اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ایک وجود رکھتی ہو۔ متفرق اوراق و اقطاع کو کتاب نہیں کہا جا سکتا۔[3]

قرآن مجید کی حفاظت کے سلسلے میں حفظ نے بڑا بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مسلمانوں نے جس انداز سے قرآن مجید حفظ کیا اس کی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ سے نہیں مل سکتی۔ صحابہؓ قرآن مجید لکھتے اسے حفظ کرتے۔ حضور ﷺ کی ترغیبات بھی موجود تھیں۔ حفاظِ قرآن مجید کی فضیلت و اجر بھی بہت زیادہ بیان فرمایا گیا۔ اس صورت میں اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ قرآن مجید کے متن میں کوئی ادنیٰ سا تغیر ہو گیا ہو۔ قرآن مجید روزانہ پانچ نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں کہ قرآن کا حفظ مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔[4] علامہ جرجانی نے اپنی کتاب الشافی اور العبادی میں بھی یہ روایت بیان کی ہے۔[5] علامہ الجوینی کا قول ہے قرآن کے حفظ کو فرض کفایہ قرار دینے میں یہ راز ہے کہ اس کے تواتر کا سلسلہ منقطع نہ ہو اور اس کے الفاظ

---

(1) سنن ترمذی، باب مناقب اھل بیت النبی ﷺ، مسند احمد، جلد سوم، صفحہ 14،17،26،59۔ مستدرک حاکم، جلد سوم، صفحہ 109۔ اسکی مستند اسناد موجود ہیں۔

(2) الخوئی، علامہ، تفسیر البیان، صفحہ 16

(3) ابوالفضل، خیر محمدی، بحوث فی تاریخ القرآن و علومہ، دار التعارف للمطبوعات، شارع سوریا، بیروت، 1980

(4) الاتقان، جلد اول، صفحہ 199/2، چونتیسویں نوع

(5) ایضاً

اور ادائیگی کے طریقے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوں اسے کسی تحریف سے محفوظ کرنے کا یہ سب سے موثر اور دائمی اہتمام ہے۔[1]

صحابہ کرامؓ جس ذوق و شوق سے قرآن مجید حفظ کرتے تھے اسکی موجودگی میں یہ بات تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کسی نے بھی قرآن مکمل طور پر حفظ نہ کیا ہو ان کے ذوق و شوق کا تقاضا ہی اس وقت پورا ہوتا ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ انہوں نے مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ عہدِ نبوی ﷺ اور اس کے متصل بعد کے دور میں لاتعداد حفاظ کرام موجود تھے جن کی موجودگی میں کسی قسم کی گڑبڑ کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ صحابہ کرامؓ، حفظِ قرآن کے بارے میں بڑے مشتاق تھے۔ جبھی کوئی آیت نازل ہوتی لوگ اسے فوری طور پر حفظ کر لیتے۔ "زبدۃ البیان فی رسوم مصاحفِ عثمان" میں ہے:

"کان دأبُ الصحابة ﷺ من أوّل نزول الوحی إلی اٰخرہ المسارعةُ إلی حفظ"۔[2]

یعنی نزولِ قرآن کے آغاز ہی سے صحابہؓ کا یہ معمول تھا کہ جو حصہ نازل ہوتا اسے حفظ کر لیتے۔ اگر ہم صحابہ کرامؓ کے معاشرے کے ذہنی رجحانات کا جائزہ لیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس دور میں قرآن اور صحابہؓ لازم و ملزوم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے حالاتِ زندگی بیان کرتے وقت الگ سے کسی کے حافظِ قرآن ہونے کی صفت کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی جاتی تھی۔ کیونکہ سبھی لوگ کسی نہ کسی طرح حافظِ قرآن تھے۔ حفاظ صحابہ کرامؓ کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب اُحد کی لڑائی کے بعد شہدائے اُحد کو دفن کرنے کا مرحلہ آیا تو کپڑے کی قلت کی وجہ سے ایک ہی کپڑے میں کئی صحابہ کرامؓ کو اکٹھے لپیٹ کر دفن کیا گیا۔ ایک کپڑے میں ایک سے زیادہ صحابہ کرامؓ کو لپیٹتے وقت آپ ﷺ دریافت فرماتے کہ ان میں سب زیادہ قرآن کس کو آتا تھا۔ ترمذی شریف میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:

فَكَثُرَ الْقَتْلَى وَقَلَّتِ الثِّيَابُ قَالَ فَكُفِّنَ الرَّجُلُ وَالرَّجُلَانِ وَالثَّلَاثَةُ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ ثُمَّ يُدْفَنُونَ فِي قَبْرٍ وَاحِدٍ فَجَعَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُ عَنْهُمْ أَيُّهُمْ أَكْثَرُ قُرْآنًا فَيُقَدِّمُهُ إِلَى الْقِبْلَةِ۔[3]

"صحابہ کرامؓ میں سے بہت سے شہید ہوئے اور کفن کیلئے کپڑوں کی قلت ہوگئی تو ایک دو یا تین

(1) ایضاً

(2) رحمانی، تاریخ قرآن، صفحہ 47 بحوالہ زبدۃ البیان فی رسوم مصاحف عثمان

(3) ترمذی، جامع ترمذی، جلد نہم، صفحہ 121

صحابہ کرامؓ کو ایک ہی کپڑے میں لپیٹ کر ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ اس وقت حضور ﷺ دریافت فرماتے کہ ان میں سے سب سے زیادہ قرآن کس کو یاد تھا؟ پس جس شخص کو قرآن سب سے زیادہ یاد ہوتا اسے قبلہ کی طرف رکھتے۔"

حضور ﷺ کا اس انداز سے سوال فرمانا "ایھم اکثر قرانا" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شہدائے احد میں قرآن سب کو یا اکثر کو یاد تھا۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ یاد تھا۔ ورنہ آپ ﷺ محض کمی زیادتی ہی کے دریافت فرمانے پر اکتفانہ فرماتے بلکہ یہ بھی دریافت فرماتے کہ "ان میں سے کس کو قرآن یاد ہے اور کس کو یاد نہیں۔"

☆ اس استفسارِ نبوی ﷺ سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ حفظِ قرآن اور تعلیم کتاب اس طرح صحابہؓ میں عام تھی کہ وہ ہر ایک کی حالت سے بخوبی آگاہ تھے کہ کس کو کتنا قرآن آتا ہے۔

☆ بیئر معونہ کا واقعہ ایک معمولی سا واقعہ ہے یہ لوگ قرآن کی تعلیم کیلئے جا رہے تھے کہ ان کو شہید کر دیا گیا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت کیلئے مسلمانوں میں سے ستر حفاظ کو بھیجا گیا کہ وہ انہیں قرآن کی تعلیم دیں۔ یہ بات اس کی دلیل ہے کہ اس وقت اس سوسائٹی میں حفاظ کی تعداد کس قدر زیادہ تھی کہ ایک مقام پر لوگوں کی تعلیم کیلئے بھیجے جانے والوں کی تعداد ستر تھی۔ تو روزانہ جو جماعتیں اور وفود تعلیم قرآن کیلئے مختلف قبائل کو جاتے تھے انہیں نگاہ میں رکھیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سوسائٹی میں حفاظ کی تعداد کس قدر زیادہ تھی۔ مدینہ طیبہ کے اندر بھی تو مقامی ضرورت کیلئے حفاظ موجود ہوتے ہوں گے۔

☆ ۱۱ھ میں مسیلمہ کے مقابلے میں مہاجرین و انصار کے کل ۳۰۰ افراد شہید ہوئے جن میں سے ستر صحابہؓ حافظِ قرآن تھے۔(1)

☆ ابن الندیم نے ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن میں حفاظ صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی کا ذکر ہے۔ ان صحابہ کرامؓ میں یہ حضرات گرامی شامل ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت قیس بن صعصعہ، حضرت سعد بن منذر بن اوسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ (73ھ)، حضرت عقبہ بن عامر الجہنیؓ، حضرت ابو الدرداءؓ (32ھ)، حضرت تمیم داریؓ، حضرت معاذ بن الحارث الانصاریؓ، حضرت عبداللہ بن سائبؓ، حضرت سلیمان بن ابی حشمہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ (22ھ)، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ (18ھ)، حضرت سعد بن عبید بن نعمان انصاریؓ، حضرت مسلمہ بن مخلد بن الصامتؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبداللہ بن طلحہؓ، حضرت ابو

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 97-93

موسیٰ الاشعریؓ (30ھ)، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ابو ہریرۃؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عبادۃ بن صامتؓ، حضرت ابو حلیمہؓ، حضرت مجمع بن جاریہؓ، حضرت فضالہ بن عبیدؓ، حضرت سعد بن عبادۃؓ، حضرت ابن عباسؓ (68ھ)، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت عبداللہ بن ذوالجنادینؓ، حضرت عبید بن معاویہؓ، حضرت ابوزیدؓ۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ (م65ھ) جن کے بارے میں روایات بیان کی گئی ہیں کہ انہوں نے قرآن لکھا بھی تھا اور وہ حافظِ قرآن بھی تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ سے شکایت کی تھی کہ میرا حافظہ کمزور ہے اور انہوں نے حضور ﷺ سے اجازت مانگی تھی کہ انہیں احادیث لکھنے کی اجازت دیں۔[2] اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک ضعیف الحافظہ شخص قرآن کا حافظ تھا تو تیز حافظے والوں کا کیا عالم ہوگا۔ ابن سعد (230ھ) نے طبقات میں بھی ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ رات کو پڑھا جانے والا قرآن دن کو دوسروں کو سناتے تھے۔[3] سعد بن منذرؓ کے بارے میں فتح الباری میں روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں تین روز میں قرآن ختم کرنے کی اجازت دی جائے۔[4] عبداللہ ابن عمرؓ (73ھ) کے بارے میں نسائی شریف میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے قرآن یاد تھا اور ایک رات میں اسے ختم کیا کرتا تھا۔ حضور ﷺ نے انہیں منع فرمادیا اور ایک ماہ میں ختم کرنے کی اجازت دی۔[5] مشہور صحابیؓ تمیم داریؓ بھی حافظِ قرآن تھے۔ آپ رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن پڑھاتے تھے۔ طبقات میں روایت ہے کہ آپ کا معمول تھا کہ نمازِ تہجد میں سات راتوں میں قرآن ختم فرمایا کرتے تھے۔[6] علامہ ذہبی (م۷۴۸ھ) جو فن رجال و تاریخ کے بہت ماہر تھے اور صحابہ کرامؓ کے احوال سے بہت گہری واقفیت رکھتے تھے، طبقات القراء میں لکھتے ہیں:

"فهؤلاء الذين بلغنا أنهم حفظوا القرآن في حياة النبي -صلى الله عليه وسلم، وأخذ عنهم عرضا، وعليهم دارت أسانيد قراءة الأئمة العشرة. وقد جمع القرآن غيرهم من الصحابة

---

(1) ابن ندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست، الکتبۃ التجاریہ الکبریٰ، مصر، صفحہ 66

(2) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 47

(3) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد چہارم، صفحہ 10

(4) فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 47

(5) ابوداؤد، سنن، ابواب القراءات، باب فی کم اقرأ القرآن، حدیث نمبر 2946۔

(6) ذہبی، طبقات القراء، جلد سوم، صفحہ 59

كمعاذ بن جبل وأبي زيد وسالم مولى أبي حذيفة، وعبد الله بن عمرو عتبة بن عامر، ولكن لم تتصل بنا قراء تهم فلهذا اقتصرت على هؤلاء السبعة ـ رضي الله عنهم، واختصرت أخبارهم، فلو سقتها كلها لبلغت خمسين كراسا۔"[1]

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں قرآن مجید حفظ کیا تھا، اور انہی سے پھر عرضا حاصل کیا گیا؛ اور انہی پر ائمہ عشرہ کی قراءات کی سندوں کا دارومدار ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید جمع (حفظ) کیا تھا، جیسے حضرت معاذ بن جبلؓ (18ھ)، حضرت ابوزیدؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ (73ھ) اور حضرت عتبہ بن عامرؓ نے بھی قرآن جمع (حفظ) کیا تھا۔ لیکن ان کی قراءات ہم تک نہیں پہنچی، لہٰذا میں نے مذکورہ سات صحابہؓ پر ہی اکتفاء کیا ہے، اور انہی کی خبر مختصراً بیان کی ہے، اگر میں سب کا ذکر کرتا تو پچاس رجسٹر بن جاتے۔"

ان کے اس کلام سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بہت سے لوگ حافظِ قرآن تھے۔ نیز گذشتہ سطور میں ابن الندیم کے حوالے سے حفاظ صحابہ کرامؓ کے نام گنوائے گئے ہیں۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی (852ھ) نے فتح الباری میں علامہ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں اور علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے الاتقان میں دیگر بہت سے حفاظ صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا ہے۔

کنز العمال میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے اپنے لشکر کے سرداروں کو لکھا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقے سے حفاظِ قرآن کے ناموں پر مبنی فہرستیں مرکز کو روانہ کریں تاکہ بیت المال سے ان کے وظائف مقرر کیے جائیں۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) نے تنہا اپنے علاقے سے تین سو سے زائد صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی پر مشتمل فہرست ارسال کی۔[2]

مفتاح السعادۃ میں حضرت علیؓ (40ھ) کے بارے میں روایت ہے:

عن أبي عبد الرحمن السلمي قال: ما رأيت أقرأ من عليؓ، عرض القرآن على النبي ﷺ وهو من الذين حفظوا القرآن أجمع بلا شك عندنا، وقد أبعد الشعبي في قوله أنه لم يحفظه، قال يحيى ابن آدم قلت لأبي بكر بن عياش، يقولون إن علياً لم يقرأ القرآن فقال أبطل من قال هذا۔[3]

---

(1) ایضاً

(2) علی المتقی، علامہ، کنز العمال، جلد اول، صفحہ 217

(3) طاش کبریٰ زادہ، مفتاح السعادۃ، جلد اول 385-384

"حضرت علیؓ (40ھ) نے حضور ﷺ سے تمام قرآن پڑھا تھا اور آپ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں قرآن مکمل طور پر یاد تھا۔ اور شعبیؒ نے بڑی حیرت ناک بات کی ہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) نے قرآن نہیں پڑھا تھا، جبکہ یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن عیاش سے دریافت کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ (40ھ) کو پورا قرآن یاد نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ جو یہ کہتا ہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) کو قرآن پورا یاد نہ تھا، اس نے غلط کہا ہے۔"

قرآن مجید کی صحت پر اعتراض کرتے ہوئے مستشرقین کہتے ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں صحت و حفاظت قرآن مجید کا اصل مدار حفظ پر تھا اور اس عہد میں کسی بھی شخص کو مکمل قرآن مجید حفظ یاد نہ تھا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جو تفصیلات پیش کی ہیں اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حفاظتِ قرآن کے سلسلے میں شروع دن سے ہی مسلمانوں کے ہاں اس قسم کا اہتمام موجود تھا کہ اس کا متن تلاش کرنے کا کوئی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ مستشرقین کو چونکہ تورات انجیل سے واسطہ پڑا اور وہ پوری تاریخ میں ان کتب کے نسخے ہی تلاش و دریافت کرنے کی سعی ہی کرتے رہے ہیں انہیں کسی قدیم لائبریری سے کوئی نسخہ ملتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہمیں ہماری کتاب کا قدیم نسخہ ملا ہے جو حقیقی متن کی تلاش و تعین کیلئے مددگار ہوگا۔ مذکورہ بالا تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ اور گزشتہ صفحات میں بیان شدہ تفصیلات کی روشنی میں آرتھر جیفری کے اس نقطہ نگاہ کے جواز کی کوئی گنجائش موجود نظر نہیں آتی جس میں وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی کتاب کی تحقیق و حفاظت کیلئے اور اصل متن کی تلاش میں کوئی کوشش کی ہی نہیں۔[1] انہیں متن تلاش کرنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔

عہد نبوی میں کتابت قرآن:

حفاظتِ قرآن کا دوسرا ذریعہ کتابت ہے۔ نزولِ قرآن کے ساتھ ہی اس کے کتابی شکل میں موجود ہونے پر قرآن کی داخلی شہادت بھی موجود ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن مجید کے تحریری حالت میں موجود ہونے پر قرآن مجید کی داخلی شہادت:

مستشرقین نے قرآن مجید کی محفوظیت پر جو اعتراضات کئے ہیں اس کا آغاز وہ اس بات سے کرتے ہیں کہ قرآن عہدِ نبوی ﷺ میں ہی محفوظ شکل میں موجود نہ تھا۔ گویا حفاظتِ قرآن مجید کے پہلے مرحلہ اور بنیاد ہی کو مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

(1) Jaffery, Arther, Material for the History of the text of The Quran ,p I, (Preface)

ان کے اس موقف کا ردّ ہم مختلف دلائل سے کر سکتے ہیں ہمارے استدلال کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں واضح اشارات موجود ہیں کہ قرآن مجید کی کتابت کا آغاز اس کے نزول کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل قرآنی آیات بڑی واضح ہیں:

ترجمہ: "یہ ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور پڑھنا۔ پس جب ہم پڑھنے لگیں تو ہمارے ساتھ پڑھیں۔"[1]

اس آیتِ مبارکہ میں تاکید جملہ کیلئے "انّ" اور "حصر" کیلئے "علینا" مقدم کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جمع کرنا صرف ہمارا ہی کام ہے اور یہ کام ہم ضرور کریں گے۔

سورۃ الطور کی ابتدائی تین آیات میں ہے ﴿وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ فِي رَقٍّ مَنْشُورٍ﴾۔[2] "یہ کتاب قرآن مجید کشادہ اوراق میں لکھی ہے۔" اس کی تشریح حافظ ابنِ حجر یوں فرماتے ہیں: إنما كان في الأديم والعسب أولا قبل أن يجمع في عهد أبي بكر۔[3]

"عہدِ ابی بکرؓ میں قرآن جمع ہونے سے قبل قرآن مجید چمڑے کے قطعات پر لکھا جاتا تھا۔"

سورۃ الواقعہ میں ہے: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾۔[4]

"قرآن مجید عزت والی کتاب ہے جو محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے اس کو پاک لوگ چھوتے ہیں۔"

سورۃ عبس میں اس سلسلے میں فرمایا: ﴿فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾[5]

"یہ قرآن عزت والی کتاب ہے، پاکیزہ صحیفوں میں بزرگ اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں لکھا ہوا ہے۔"

ان آیات میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ قرآن کے حاملین نیک طینت اور نیک کردار ہیں گویا قرآن کے محفوظ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کا کردار اتنا اعلیٰ ہے کہ وہ قرآن میں گڑبڑ نہیں کرتے۔

---

(1) القیامہ:18

(2) الطور:1-3

(3) فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 11

(4) سورۃالواقعہ: 77تا79

(5) سورۃعبس:13-16

سورۃ البینۃ میں ہے: ﴿ رَسُولٌ مِنَ اللّٰهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴾(1)

"ایک رسول ﷺ، جو اللہ کی طرف سے ہے ان پر پاک اوراق پڑھتا ہے ان اوراق میں مضبوط کتب ہیں"۔

سورۃ البروج میں ہے: ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ﴾(2)

"یہ عزت والا قرآن لکھا جاتا ہے لوح محفوظ میں"۔

کفارِ مکہ، حضور ﷺ پر جو اعتراضات کرتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا ﴿ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴾۔(3) "یہ کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید پہلے لوگوں کے بے بنیاد قصے کہانیاں ہیں جو انہیں صبح و شام لوگ لکھواتے ہیں"۔ اس اعتراض سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید شروع دن سے ہی لکھا جا رہا تھا۔

سورۃ البینۃ کی آیت ﴿ رَسُولٌ مِنَ اللّٰهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴾(4) کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وَقَدْ أَعْلَمَ اللّٰهُ تَعَالَى فِي الْقُرْآنِ بِأَنَّهُ مَجْمُوعٌ فِي الصُّحُفِ فِي قَوْلِهِ: ﴿ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً ﴾۔(5)

"اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ظاہر کیا ہے کہ قرآن مختلف صحف میں جمع ہے وہ (نبی ﷺ) اب پاکیزہ صحف کی تلاوت کرتے ہیں۔"

قرآن کیلئے خود اس کے اپنے اندر "الکتاب" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ یہ لکھی ہوئی ہے۔ قرآن کے وہ مقامات جہاں اسے "الکتاب" کہا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں:

البقرۃ: ۲ ، آل عمران: ۲ ، یونس: ۲ ، ھود: ۲، الرّعد: ۲، ابراہیم: ۲ ، الحجر: ۲، الکہف: ۱، الشّعراء: ۲ ، النّمل: ۲ ، القصص: ۲ ، لقمٰن: ۲۔

قرآن مجید کی سورۃ الفرقان کی آیت مبارکہ نمبر 32 میں قرآن مجید کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ﴾

---

(1) البینۃ: 2،3

(2) البروج: 22-21

(3) الفرقان: 5

(4) البینۃ: 2

(5) فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 4

"یہ کافر کہتے ہیں کہ قرآن مجید یکبارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا۔ (ایسا اس لیئے کیا گیا) تاکہ آپ ﷺ کے قلب مبارک کو تسلی دی جاسکے۔"

اس آیت مبارکہ میں قرآن مجید کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔

اول تثبیتِ قلب۔۔۔۔ دوم ترتیل یعنی ضبطِ کتابی

لغت میں ترتیل ہم جنس اشیاء کو عمدۃ طریقے سے بالترتیب رکھنے کو کہتے ہیں، لسان العرب اور القاموس المحیط میں ہے:

"الرَّتَل: مُحرَّكةً، حُسنُ تناسُق الشيء"[1] یعنی ترتیب دینا۔ کلام کو بہتر اور عمدۃ طریقے سے اداء کرنا خوش الحانی اور ترنم سے پڑھنا۔

اساس البلاغۃ میں اس کا معنٰی مذکور ہے: "حسن تالیف"[2] حسنِ تالیف کی ایک صورت یہ ہے کہ کلام جن کلمات سے مرکب ہو ان کو مضمون وار مرتب کرتے وقت مناسب موقع و محل پر رکھا جائے اسی کو ضبط کتابی کہا جاتا ہے۔ اور ترتیل القرآن کے بارے میں لکھا ہے: ﴿رتل القرآن ترتیلا اذا ترسل فی تلاوته وأحسن تأليف حروفه وهو يترسل فی کلامه ويترتل﴾

قرآن مجید کی آیات مبارکہ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾[3]

"آپ اپنی زبان نہ ہلائیں تاکہ اسے پڑھنے میں جلدی کریں اسے جمع کرنا اور پڑھنا تو ہمارا ہی ذمہ ہے"۔

سورۃ القیامۃ کی اس آیت کی تفسیر میں مولانا حمید الدین فراہی لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ سے تین باتیں واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ قرآن، حضور ﷺ کے عہد میں جمع ہو کر ایک خاص ترتیب سے آپ ﷺ کو سنا دیا جائے گا اگر یہ وعدہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد پورا ہوا ہوتا تو آپ ﷺ کو اس قراءت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔

۲۔ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ جمع قرآن کے بعد دوبارہ جس طرح آپ ﷺ کو قرآن سنایا جائے اسی طرح آپ ﷺ اس کو پڑھیں۔ اور یہ بات عقلاً و نقلاً دونوں اعتبار سے بالکل غلط ہے کہ کوئی

---

(1) فیروز آبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، جلد دوم، صفحہ 301

(2) زمخشری، جار اللہ، اساس البلاغہ، جلد اول، صفحہ 154، زیر مادہ رتل، القاموس الفرید، صفحہ 230

(3) القیامۃ:16

بات آپ ﷺ پر وحی کے ذریعے نازل ہو اور آپ ﷺ اسے امت تک نہ پہنچائیں۔ عقلی اعتبار سے تو اس کی غلطی واضح ہے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ نقلاً اس اعتبار سے غلط ہے کہ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 67 میں فرمایا گیا ہے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ﴾

اے رسول ﷺ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے جو نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچادیں اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے فریضہ رسالت ادا نہیں کیا۔

یہ ایک عام حکم ہے اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ حضور ﷺ نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس ترتیب کے مطابق اس کی آخری قراءت ہوئی ہے اور یہ ترتیب وہی ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے۔ کیونکہ آخری قراءت کے اصلی ترتیب کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب قرآن نازل ہو چکا تو آخر میں جبریلؑ نے آپ کو پورا قرآن اس اصل ترتیب کے مطابق سنایا۔ اس وضاحت کے بعد عہد نبوی میں متن قرآن کے حوالہ سے بے شمار اشکال آپ سے آپ دور ہو جاتے ہیں۔[1]

قرآن کے عہد نبوی میں لکھے ہونے کی ایک سادہ عقلی دلیل یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ جس کتاب میں عام لین دین کے معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کا حکم اتنی تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہو کہ ادھار لین دین کے معاملے کو اس احتیاط اور اہتمام سے لکھ لینے کا حکم ہے کہ کاتب گواہ اور لکھنے کی دیگر باریکیوں کو بھی بیان کر دیا گیا ہے، کیا خود اس کتاب کے اپنے لکھے جانے کا اہتمام نہ کیا گیا ہو گا؟۔ اس سلسلے میں سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 282 جسے "آیت دین" کہا گیا ہے۔ قابلِ ذکر ہے۔ انسانوں کے حقوق و فرائض پر تو اس قدر توجہ دی گئی ہو کہ حکم دیا گیا کہ تم ہر چھوٹے اور بڑے معاملے کو لکھ لیا کرو۔ اس سلسلے میں کاتبوں اور گواہوں کو بھی براہِ راست احکام دیئے گئے ہوں لیکن رہتی دنیا تک نوعِ انسانی کو نورِ ہدایت سے منور کرنے والی کتاب کی حفاظت کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہ ہو۔ یہ بات بعید از قیاس نظر آتی ہے۔

کتب سابقہ لکھی ہوئی تھیں

تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کا لکھا جانا کوئی پہلا واقعہ نہ تھا بلکہ اس سے قبل الہامی کتب کو بھی لکھا گیا تھا۔ مثلاً سورۃ الشعراء کی آیت نمبر 196 میں ہے: ﴿ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴾ الزبر کا معنی ہے لکھنا۔ التزبیر کا معنی تحریر کا ہوتا ہے مزبر قلم کو کہتے ہیں اور الزبور لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 79 میں یہود کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ اپنی طرف سے اپنی مرضی کی بات

---

(1) فراہی، حمید الدین، مجموعہ تفاسیر فراہی، ص: 306، 305، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور، طبع اول

لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ قرآن نے کہا کہ ان کی اس حرکت پر تباہی وناکامی کی وعید ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے اہل کتاب سے ان کی آسمانی کتاب پیش کرنے کو کہا ہے۔ اس مطالبے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کی کتابیں لکھی ہوئی موجود تھیں۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کی چند آیات پیش کی جاتی ہیں:

﴿قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (1)

"ان سے کہیں کہ توراۃ لاؤ اور پڑھو اگر تم سچے ہو۔"

﴿أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُبِينٌ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (2)

"کیا تمھارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ تم اپنی کتاب لے آؤ اگر تم سچے ہو۔"

﴿إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى﴾ (3)

یہ کچھ لکھا ہے پہلے صحائف میں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحائف میں۔

اگر ان کی کتابیں لکھی ہوئی موجود نہ ہوتیں تو ان سے کتاب لانے کا مطالبہ کیوں کر کیا جاتا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ زنا کے ایک واقعہ کے فیصلے کیلئے حضور ﷺ نے یہودیوں کو اپنی کتاب لانے کا حکم فرمایا اور ان کے عالم نے کتاب کے اس مقام پر انگلی رکھ لی تھی جہاں زنا کی سزا درج تھی۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 92، سورۃ الانعام کی آیت نمبر 7، سورۃ الجمعہ کی آیت نمبر 5، اور النمل کی آیت نمبر ۴۰ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتب لکھی ہوئی موجود تھیں اس کے علاوہ سورۃ عبس کی آیات نمبر 13 تا 16 میں قرآن مجید کے لکھے ہوئے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کوئی پہلی کتاب نہیں جو لکھی گئی ہو بلکہ اس سے پہلی کتب بھی لکھی ہوئی تھیں۔ "صحفِ مکرمۃ" کے لفظ ہی سے اس بات کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ قرآن مرتب کتاب تھی۔

ان دلائل کے علاوہ ہمارے پاس متعدد مستند روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کے عہد میں سورتوں کی ترتیب موجود تھی۔ لوگ سورتوں کی تقسیم سے آگاہ تھے۔ اس سلسلے میں ترتیبِ قرآن کے باب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

---

(1) آل عمرآن:93

(2) الصفت:156-157

(3) الاعلیٰ:18-19

عہد نبوی ﷺ میں کتابت وحی

کتابتِ وحی کے سلسلے میں تفصیلی روایات ملتی ہیں کہ نزول وحی کے فوراً بعد اسے لکھ لیا جاتا تھا۔ اسکی وضاحت زید ابن ثابتؓ سے مروی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ زید ابنِ ثابت فرماتے ہیں :

كُنْتُ أَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ أَخَذَتْهُ بُرَحَاءُ شَدِيدَةٌ وَعَرِقَ عَرَقًا شَدِيدًا مِثْلَ الْجُمَانِ، ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ، فَكُنْتُ أَدْخُلُ بِقِطْعَةِ الْعُسُبِ أَوْ كِسَرِهِ، فَأَكْتُبُ وَهُوَ يُمْلِي عَلَيَّ، فَمَا أَفْرُغُ حَتَّى تَكَادَ رِجْلِي تَنْكَسِرُ مِنْ ثِقَلِ الْقُرْآنِ، حَتَّى أَقُولَ: لَا أَمْشِي عَلَى رِجْلِي أَبَدًا، فَإِذَا فَرَغْتُ قَالَ: سُورَةٌ اقْرَأْهُ سُورَةً، فَأَقْرَأُهُ، فَإِنْ كَانَ فِيهِ سَقْطٌ أَقَامَهُ، ثُمَّ أَخْرُجُ بِهِ إِلَى النَّاسِ۔ (1)

"میں رسول اللہ ﷺ کیلئے وحی کی کتابت کرتا تھا۔ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ کو سخت گرمی لگتی تھی۔ اور آپ ﷺ کے جسم اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے پھر آپ ﷺ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا۔ آپ ﷺ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا رہتا۔ یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہو جاتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے اور میں کبھی نہیں چل سکوں گا۔ جب میں فارغ ہو جاتا تو آپ ﷺ فرماتے: پڑھو! میں پڑھ کر سناتا۔ اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپ ﷺ اس کی اصلاح فرما دیتے پھر اسے لوگوں کیلئے لے آیا جاتا۔"

طبرانی نے یہ روایت اپنی اوسط میں بیان کی ہے۔ اس کے رجال کو ثقہ قرار دیا گیا ہے۔ (2) نزول وحی کے فوراً بعد کتابتِ قرآن کے بارے میں مزید تفصیلات مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابو داؤد، ابنِ حبّان، حاکم کی مستدرک کے علاوہ فتح الباری میں موجود ہیں۔ (3) علامہ بدرالدین عینی نے بخاری شریف کی شرح عمدۃ

---

(1) الطبرانی، المعجم الکبیر، حدیث نمبر : ۴۷۵۶؛ الہیثمی، نورالدین علی بن بکر: مجمع الزوائد، باب عرض الکتاب بعد إملائہ، ۱/۱۵۲

(2) الطبرانی: حوالہ مذکور؛ عثمانی، محمد تقی: علوم القرآن، ص ۱۷۸

(3) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کاتب النبی، حدیث نمبر 4990۔
ابن حبان: الصحیح، کتاب الوحی، حدیث نمبر 33 تا 44، جلد اول، ص: 119 تا 126 دار الباز، مکہ مکرمہ، 1987
ابن حجر: فتح الباری، جلد نہم، ص: 8 تا 18 ؛
بخاری کتاب فضائل القرآن، حدیث نمبر 4978-4983 میں اس موضوع کی مزید روایات موجود ہیں۔

القاری میں بھی تفصیلات بیان کی ہیں۔[1] حضرت عثمانؓ (35ھ) سے روایت ہے:

فَقَالَ عُثْمَانُ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ تَنْزِلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ فَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّيْءُ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُولُ ضَعُوا هَؤُلَاءِ الْآيَاتِ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا وَإِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ الْآيَةَ فَيَقُولُ ضَعُوا هَذِهِ الْآيَةَ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا۔[2]

جب آپ ﷺ پر کچھ نازل ہوتا تو آپ کاتبانِ وحی میں سے کسی کو طلب کرتے اور فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں فلاں فلاں جگہ پر درج کر دو جس میں ایسا ایسا مذکور ہے۔ پھر جب آپ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو حکم دیتے کہ اس آیت کو اس سورت میں رکھ دو جہاں ایسا ایسا مذکور ہے۔

مسلمان علماء نے تو رسم الخط عثمانیؓ کو توقیفی قرار دیا ہے اور اس کے خلاف یا اس کی مطابقت کے بغیر قرآن مجید لکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔ ذیل میں ہم اہم کتب کے حوالے سے یہ واضح کریں گے کہ رسم الخط عثمانی توقیفی ہے مناہل العرفان میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔

"الق الدواة، وحرف القلم، وانصب الباء وفرق السين ولا تعود الميم ، وحسن الله ومد الرحمن وجود الرحيم وضع قلمك على اذنك اليسرى فإنه اذكر لك۔"[3]

"دوات میں سیاہی اچھی طرح گھول لیں۔ قلم درست طریقے سے پکڑیں۔ باء کو سیدھا لکھیں۔ الرحمٰن کو مد کے ساتھ لکھیں۔ الرحیم کو خوبصورت لکھیں۔ قلم اپنے بائیں کان پر رکھیں۔ اس سے تمھیں بات یاد رہے گی۔"

ابن مبارک نے مذکورہ بالا روایت کی تائید کی ہے۔ الا بریز میں ہے کہ ابن مبارک اپنے استاذ عبد العزیز دباغ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ما للصحابة ولا لغيرهم في رسم القران ولا شعرة واحدة وإنما هو توقيف من النبي وهو الذي أمرهم ان يكتبوه على هيئة المعروفة بزيادة الالف و نقصانها، لاسرار لا تهتدي إليها العقول وهوسر من لاسرار خص الله به كتابه العزيز دون سائر الكتب السماوية و كما ان نظم القرآن معجزة فهو فرسمه ايضاً معجز۔"[4]

---

(1) عینی، بدر الدین، عمدۃ القاری شرح البخاری؛ تقی عثمانی: علوم القرآن، ص ۱۷۹

(2) ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب و من سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر ۳۰۸۶

(3) زرقانی، عبد العظیم، مناہل العرفان: جلد 1 ص: 370

(4) ایضاً: جلد، 1 ص: 76

"صحابہ کرامؓ یا کسی اور کا قرآنی رسم الخط میں کوئی دخل نہیں۔ بلکہ حضور ﷺ کے حکم سے ایسا لکھا گیا۔ آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ فرمایا تھا کہ فلاں جگہ پر الف لکھا جائے اور فلاں جگہ نہ لکھا جائے۔ عقل انسانی اس بات کا راز معلوم کرنے سے قاصر ہے یہ ایک ایسا راز ہے جو صرف قرآن کا خاصہؓ ہے اور دیگر کتب مقدسہ میں نہیں پایا جاتا۔ جس طرح قرآن مجید کے الفاظ اعجاز پر مبنی ہیں اسی طرح اس کا رسم الخط اعجاز سے خالی نہیں۔"

حضور ﷺ کے حکم سے آپ ﷺ کے سامنے بھی قرآن کی کتابت ہوئی تھی۔ متعدد صحابہؓ اپنے اپنے طور پر مصاحف لکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ (57ھ) کے لئے ایک آزاد شدہ غلام ابو یونس قرآن لکھتے تھے اور ان کے پاس مکمل مصحف موجود تھا۔[1]

حضرت حفصہؓ کے لئے عمرو بن رافع نے مصحف لکھا۔[2]

حضرت علیؓ (40ھ) نے بھی ایک مصحف تیار کیا تھا۔ الاتقان وغیرہ میں الفہرست کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد قرآن مکمل طور پر لکھا تھا۔ لیکن ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی سند منقطع ہے۔ محدثین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کی انہوں نے حضور ﷺ کے سامنے ہی قرآن لکھا تھا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ابن سیرین نے حضرت علیؓ (40ھ) کے اس مصحف کی تلاش کی لیکن کہیں سے دستیاب نہیں ہوا۔ کچھ اشیاء گزشتہ عالمی جنگ میں آستانہ پہنچی ہیں اور جن کی فہرست روزنامہ خلافت، جلد سوم، نمبر ۱۷۸ میں چھپی ہیں ان میں حضرت علیؓ (40ھ) کا نسخہ شامل ہے۔[3]

مسند احمد بن حنبل میں عثمان بن ابی العاصؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

أتاني جبرئيل فأمرني أن أضع هذه الآية هذا الموضع من هذه السورة إن الله يأمر بالعدل والإحسان۔۔۔[4]

میرے پاس جبرائیلؑ آئے اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو جو فلاں سورت کی ہے۔ فلاں مقام پر درج کر دوں۔ اور وہ آیت یہ تھی: ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان۔

---

(1) ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر 4993

(2) یعقوب حسن (مرتب)، کشاف الہدیٰ مقدمہ کتاب الہدیٰ، صفحہ ۱۴۶؛ بحوالہ تیسیر الوصول، کتاب التفسیر

(3) ایضاً

(4) الاتقان، جلد اول، صفحہ 94

بخاری شریف میں روایت ہے: لَمَّا نَزَلَتْ: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ، وَالْمُجٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ادْعُ لِي زَيْدًا وَلْيَجِئْ بِاللَّوْحِ وَالدَّوَاةِ وَالْكَتِفِ أَوِ الْكَتِفِ وَالدَّوَاةِ ثُمَّ قَالَ اكْتُبْ: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ ، وَخَلْفَ ظَهْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمْرُو بْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ الْأَعْمَى قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ فَمَا تَأْمُرُنِي فَإِنِّي رَجُلٌ ضَرِيرُ الْبَصَرِ فَنَزَلَتْ مَكَانَهَا: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُجٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ۔ (1)

جب آیت لایستوی القاعدون۔۔۔ نازل ہوئی رسول ﷺ نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ اور وہ تختی اور قلم اور کتف اور دوات لے کر آئے، پھر فرمایا: لکھو: لایستوی القعدون۔۔۔ الخ اور آپ ﷺ کے پیچھے عمرو بن ام مکتوم نابینا بیٹھے ہوئے تھے، تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں تو نابینا آدمی ہوں، تو اس کی جگہ یہ نازل ہوا: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُجٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ۔

دراصل اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہے، وہ اجر میں ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا۔ مہاجرین اور مجاہدین کے اجر کا سن کر پھر عبد اللہ ابن اُمِّ مکتوم نابینا صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ میرے بارے میں کیا حکم ہے (کہ میری تو بینائی میں نقص ہے گویا میں تو نابینا ہونے کی وجہ سے اجر سے محروم ہو گیا) اس پر آیت میں یہ حصہ نازل ہوا: "غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ" یعنی عذر کی وجہ سے گھروں میں رہ جانے والے اجر سے محروم نہیں ہوں گے۔

ان روایات میں غور کریں تو دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) نزول وحی کی کیفیت جوں ہی ختم ہوتی۔ حضور ﷺ فوراً نازل شدہ وحی کو لکھوا لیتے۔

(۲) یہ کتابت اس انداز سے ہوتی تھی کہ ایک مکمل نسخہ معرض وجود میں آرہا تھا۔ اول الذکر کے متعلق مجمع الزوائد کی روایت پیش کی جا سکتی ہے کہ زید ابنِ ثابت ؓ فرماتے ہیں کہ جب کیفیتِ وحی ختم ہوتی تو "فکنت ادخل علیه بقطعة الکتف۔۔۔ فاکتب" یعنی میں اسی وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور میرے پاس کتف کا ٹکڑا ہوتا اور میں (نازل شدہ) وحی کو لکھتا۔ (2)

محققین نے بہت سی ایسی روایات کا ذکر کیا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نزولِ وحی کے بعد جس کام کیلئے سب سے زیادہ مستعد و بے قرار رہتے تھے وہ کتابتِ وحی کا فریضہ ہی ہوتا تھا۔

---

(1) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کاتب النبی ﷺ، حدیث 4990

(2) ایضاً

یہ حقائق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قرآن کے کسی حصے کا ضائع ہو جانا محال تھا اس قسم کے شواہد یہ واضح کرنے کیلئے کافی ہیں کہ جو ہستی اس سلسلے میں اس قدر محتاط ہو، کیا اس نے قرآن غیر مربوط شکل میں ہی امت کو دے دیا ہو گا؟ حفاظتِ قرآن کی ذمہ داری اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے تاہم عالمِ اسباب میں بھی حضور ﷺ کے ذریعے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا۔ عرضہ اخیرہ میں حضور ﷺ نے جبرئیلؑ کو دو مرتبہ قرآن سنایا۔[1] اس کے بعد چھ ماہ کے عرصے میں کیا حضور ﷺ کی توجہ اس طرف مبذول ہی نہ ہوئی کہ جو کتاب میں دے کر جا رہا ہوں اس کی کوئی ترتیب بھی قائم کرنی ہے یا نہیں؟ جبکہ آپ ﷺ کو حضرِ اجل کا خیال ذہن مین ڈال دیا گیا ہو۔ اس قسم کی فروگذاشت تو ایک معمولی ذمہ دار شخص بھی نہیں کر سکتا۔

نزولِ قرآن کی کیفیت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ قرآن مجید کو حضور ﷺ نے ترتیب دیدی تھی۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی کچھ آیات ایک ہی دن نازل ہوئیں اور حضور ﷺ نے یہ آیات ایک کاتب مثلاً زید ابنِ ثابتؓ کو لکھوا دیں۔ انہیں لکھوانے کے بعد اپنے معمول کے مطابق پڑھوا کر سن بھی لیا۔ اس کے بعد باقی صحابہؓ نے بھی ان آیات کو لکھ لیا۔ پھر اس کے بعد کچھ اور آیات نازل ہوئیں۔ جن میں کچھ بقرۃ اور کچھ آل عمران کی تھیں۔ آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے ان کا مقام بتا دیا گیا اور آپ ﷺ نے اس کے مطابق ان آیات کو لکھوا دیا۔ پڑھوا کر سنا اور پھر ان کی اشاعت فرما دی۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ جب سورۃ البقرۃ کی گیارھویں آیت لکھی گئی تو حضور ﷺ نے اسے سنا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ ﷺ نے صرف اسی ایک آیت کو سنا۔ یا اس سے پہلے کی دس آیات بھی سنیں یا کم از کم وہ آیت سنی جو گیارھویں آیت کے متصل واقع ہے، اس کو بھی سنا۔ ظاہر ہے کہ صرف گیارھویں آیت سننے سے یہ تو واضح نہیں ہو جائیگا کہ یہ آیت گیارھویں یعنی اپنے نمبر پر لکھی گئی ہے یا نہیں؟ جب تک کہ کاتب کے پاس پہلے کی نازل شدہ اس سورت کی تمام کی تمام دس آیات لکھی ہوئی موجو نہ ہوں اور ان کا ربط ان آیات کے ساتھ نہ ہو۔ اس کے ساتھ اس روایت کو ذہن میں رکھیں جس میں سورۃ النساء کی آیت ﴿لایستوی القٰعدون من المؤمنین۔۔۔۔۔ میں غیراولی الضرر﴾ کے نزول کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بات کا اطلاق اگر ہم تمام کاتب صحابہؓ پر کریں تو یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہ جاتی کہ ان تمام صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن مجید کے مکمل (Up to date) نسخے تیار ہو رہے تھے۔

---

(1) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کان جبریل لیعرض القرآن علی النبی ﷺ، حدیث 4998

حضرت زید ابنِ ثابتؓ فرماتے ہیں: کنا نؤلف القرآن من الرقاع ۔[1]

اس بیان کی تشریح امام بیہقی (458ھ) یوں کرتے ہیں: ''المراد بالتالیف مانزل من الأیات المفردۃ فی سورھا وجمعھا۔''[2]

یعنی جن سورتوں کی جو جو آیات اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتی تھیں ان کو ہم حضور ﷺ کے حکم سے ان کو سورتوں کے ان ان مقامات پر ترتیب دے کر لکھا کرتے تھے جہاں جہاں انہیں ہونا چاہئے تھا۔ مختلف سورتوں میں جو جدید اضافے وحی کے ذریعے ہوتے رہتے تھے۔ انہیں ہم حضور ﷺ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کرامؓ کے پاس جمع ہوتے جاتے تھے تدریجاً مکمل ہوتے رہے۔ عہدِ صدیق اکبرؓ میں قرآن جمع کرتے وقت حضرت زید ابن ثابتؓ کا یہ کہنا کہ ''سورۃ براءۃ کی آخری آیات کسی سے نہ مل سکیں۔''[3] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ جانتے تھے کہ یہ آیات کس سورت کی ہیں اور انہیں کس جگہ لکھنا ہے۔ ورنہ تو یہ عبارت یوں ہونی چاہئے تھی: ''دو آیات مل نہیں رہی تھیں جب وہ مل گئیں تو ہم نے انہیں سورۃ براءۃ کے آخر میں لکھ دیا۔'' انہی تفصیلات میں حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) کی طرف منسوب اس روایت کا جواب بھی موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) فرماتی ہیں کہ ''قرآن کے کچھ حصے حضور ﷺ کے سرہانے پڑے تھے کہ انہیں بکری کھا گئی اور ان حصوں کو ابھی قرآن میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔''[4]

گذشتہ تفصیلات کی موجودگی میں اس طرح کی باتوں کو صحیح تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں رہتی۔ فرض کریں کہ یہ روایت ایک لمحہ کیلئے درست بھی مان لیں تب بھی یہ عقلی اور واقعاتی اعتبار سے درست نہیں کیونکہ فرض کیا کہ اس روایت میں جن آیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ آخری نازل ہونے والی آیات تھیں تو یہ بات تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے کہ حضور ﷺ آخری وحی کے نزول کے تقریباً نوے روز بعد تک دنیا میں تشریف فرما رہے کیا اس طویل عرصے میں آپ ﷺ کو یہ بات یاد ہی نہ آئی کہ میں یہ آیات لکھوا دوں۔ یہ تو فریضۂ نبوی ہی کے منافی ہے۔ آپ کو حکم تھا:

﴿یاأیھا الرسول بلّغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته﴾

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 76

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) Jaffery, Arther, Material for the History of the Text of the Koran, P.I

"اے رسول ! ﷺ آپ پر آپ کے رب کی جانب سے جو نازل ہوا ہے وہ لوگوں تک پہنچادیں۔ اگر آپ نے ایسانہ کیاتو گویاآپ نے فریضۂ نبوت اداء نہیں کیا"۔

صحابہؓ کی ایک خاصی تعداد ہر وقت حضور ﷺ کی خدمت میں موجود رہتی تھی ان میں کُتابِ وحی بھی ہوتے تھے۔ حضور ﷺ کو یہ حکم بھی تھا کہ آپ ﷺ پر جو کچھ نازل کیا گیاہے آپ ﷺ لوگوں تک پہنچا دیں اگر آپ ﷺ نے یہ نہ پہنچایا تو آپ ﷺ نے گویا منصبِ رسالت ادا نہیں کیا۔ کیا آپ ﷺ نے اس طویل عرصے تک اس بنیادی فریضے سے کوتاہی کی تھی؟ اس بات کا تو گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

عہدِ نبوی ﷺ میں موجود قرآن مجید کے نسخے:

حافظ ابنِ حجر عسقلانی (852ھ) نے فتح الباری کی نویں جلد میں اس سلسلے میں تفصیلات بیان کی ہیں کہ متعدد صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن مجید کے نسخے عہدِ نبوی ﷺ میں ہی موجود تھے۔[1] عہد نبوی میں مکمل طور پر قرآن مجید لکھنے والوں کی مکمل فہرست آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔ ان لوگوں میں ایک خاتون امِّ ورقہ بھی تھیں۔ علامہ سیوطی نے ان کے بارے میں لکھاہے کہ انہوں نے مکمل قرآن مجید یاد بھی کیا تھا اور لکھا بھی تھا۔ اس خاتون کو ان کے ایک غلام اور باندی نے عہد فاروقؓ میں شہید کر دیا۔ نبی کریم نے اُن کی شہادت کی خبر انہیں سنادی ہوئی تھی۔[2]

نبی کریم ﷺ نے حفظ قرآن کی ترغیب کا بندوبست فرمایا۔ آپ ﷺ کے فرامین کتب حدیث میں موجود ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا قابل رشک تین لوگ ہیں، ایک جسے اللہ نے قرآن کا علم دیا ہو اور اسے دن رات تلاوت کرتا ہو۔[3] آپ نے فرمایا تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے[4] ترمذی میں روایت سے آپ نے فرمایا امامت وہ کروائے جسے قرآن زیادہ آتا ہو[5]

مصنف عبدالرزاق میں روایت ہے: عن هشام بن عروة قال قرأت فی مصحف عائشة ۔ "ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ میں نے مصحفِ عائشہ صدیقہؓ سے تلاوت کی"۔

---

(1) فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 39-40

(2) سیوطی، جلد اول، ص:96

(3) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب الاغتباط القرآن، حدیث نمبر: 5025

(4) بخاری، کتاب فضائل القرآن، خیرکم من تعلم القرآن، حدیث نمبر: 5027

(5) ترمذی، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، حدیث نمبر 235

بخاری شریف میں روایت ہے کہ اس مصحف کی زیارت کیلئے ایک شخص عراق سے مدینہ طیبہ آیا تھا۔ روایت یوں ہے :قال العراق لعائشة یا أم المؤمنین أریني مصحفك۔ [1] "ایک عراقی شخص نے حضرت عائشہ صدیقہ (57ھ) سے کہا یا ام المومنین مجھے اپنا نسخہ دکھائیں۔"

کنز العمال میں ایک روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شام سے بھی لوگ اسی مقصد کیلئے آئے تھے۔ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی کے بارے میں تہذیب التہذیب میں ہے: "هوأحد من جمع القران و مصحفه بمصر الاٰن بخطه" [2] عقبہ بن عامر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا تھا اور ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کا نسخہ اس وقت مصر میں ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں تحریری حالت میں قرآن کی موجودگی پر مزید شواہد

احادیثِ نبویہ ﷺ میں بھی اور بہت سی وضاحتیں موجود ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن مجید مکمل طور پر لکھا جا چکا تھا۔ اسی قرآن کو صحابہ کرامؓ پڑھتے تھے۔ اسے ہی انہوں نے حفظ کیا اور یہ قرآن مرتب شکل میں تھا۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ (50ھ) سے مروی ہے:

قال جمعت القران فقرأت به کل لیلة فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فقال: إنی أخشی أن یطول علیك زمان أن تملّ، اقرأه فی کلّ شهر۔ [3]

ترجمہ: "میں نے قرآن جمع کیا اور میں ہر رات کو قرآن ختم کرتا تھا۔ یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خدشہ ہے کہ لمبے عرصہ تک ایسا کرنے سے تم تھکاوٹ کا شکار ہو جاؤ گے، ہر ایک مہینے میں قرآن ختم کیا کرو"۔

یہ روایت ابو داؤد شریف میں بھی تفصیلاً موجود ہے۔ اس روایت میں مسند احمد والی مذکورہ بالا روایت کے علاوہ مزید یوں بیان ہوا ہے:

قال إنی أجد قوة قال اقرأ فی خمس عشرة قال إنی أجد قوة قال اقرأ عشرین قال إنی أجد قوة قال اقرأ فی عشر قال إنی أجد قوة قال اقرأ فی سبع ولا تزیدن علی ذلك۔ [4]

عبداللہ ابن عمرو ابن العاص (50ھ) کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں اس سے (ایک ماہ میں قرآن

---

(1) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر: 4993

(2) کنز العمال، جلد ہفتم، صفحہ 245

(3) مسند احمد، جلد دوم، صفحہ 163، کتاب فضائل القرآن

(4) ابوداود، جلد اول، صفحہ 112، حدیث نمبر 1342

ختم کرنے) جلدی ختم کرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا بیس دن میں ختم کیا کرو۔ میں نے کہا میں اس سے بھی جلدی ختم کرنے کی طاقت رکھتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا پندرہ روز میں ختم کیا کرو میں نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا دس روز میں ختم کیا کرو میں نے کہا میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا سات دن میں ختم کیا کرو اور اس سے کم میں ختم نہ کرو۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی (852ھ) اس روایت کی سند کے بارے میں فرماتے ہیں: ''وإسناده صحیح''[1]

حافظ ابن کثیر (774ھ) اپنی تفسیر کے آخر میں کتاب فضائل القرآن میں لکھتے ہیں:

عن عمرو بن أوس قال قال النبی ﷺ قراءتك نظراً تضاعف علی قراءتك ظاهراً کفضل المکتوبة علی النافلة۔[2]

ترجمہ: عمرو ابن اوس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمھارا قرآن کو دیکھ کر تلاوت کرنا اس کی زبانی تلاوت سے وہی نسبت رکھتا ہے جو فرض نمازوں کو نفل نمازوں سے ہے۔ عبادۃ بن صامت روایت کرتے ہیں:

عن عبادة بن الصامت قال قال النبی ﷺ أفضل عبادة أمتی قراءة القرآن نظراً۔[3]

ترجمہ: عبادۃ بن صامت سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کی افضل عبادت یہ ہے کہ دیکھ کر قرآن پڑھا جائے۔

ایک اور ارشاد نبوی ﷺ یوں منقول ہے:

من قرأ القرآن فی المصحف کتب له ألفا حسنة ومن قرأ فی غیر المصحف فألف حسنة۔[4]

ترجمہ: ''جس نے قرآن کی تلاوت مصحف کو دیکھ کر کی، اس دو ہزار گنا ثواب ملتا ہے۔ اور جو مصحف کے بغیر تلاوت کرتا ہے اسے ایک ہزار گنا ثواب ملے گا۔'' کنز العمال میں حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ (68ھ) سے حضور ﷺ کا ارشاد مروی ہے: عن ابن عباس قال النبی ﷺ من أدام النظر فی المصحف متع ببصره ما دام فی الدنیا۔[5]

---

(1) فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 96، حدیث 5054

(2) ابن کثیر، فضائل القرآن، جلد اول، صفحہ 617

(3) کنز العمال، جلد اول صفحہ 526، حدیث نمبر 2358

(4) ایضاً، جلد اول، صفحہ 536، حدیث 2505

(5) ایضاً، جلد اول، صفحہ 535، حدیث نمبر 2506

ترجمہ: ”جو شخص قرآن کی ناظرہ تلاوت کرتا ہے، پوری زندگی اس کی بینائی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔“

ابن مسعودؓ (32ھ) سے بیقہی نے سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے:

”ادیموا النظر فی المصاحف“[1]

”مصحف کو دیکھ کر قرآن کی تلاوت کیا کرو۔“

کنز العمال ہی کی ایک روایت ہے:

عن عبداللہ ابن الزبیر قال قال النبی ﷺ من قرء القران ناظراً حتّٰی یختمہ غرس اللہ لہ بہ شجرۃ فی الجنۃ[2]

ترجمہ: ”جو قرآن دیکھ کر مکمل طور پر پڑھتا ہے، اللہ اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگا دیتے ہیں۔“

”ابنِ زبیر کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا جو شخص قرآن کو دیکھ کر پڑھتا ہے اس کیلئے اللہ تعالیٰ جنت میں ایک درخت لگا دیتے ہیں۔“ فضائل القرآن میں ابن کثیرؒ (774ھ) نقل فرماتے ہیں:

عن ابن عمر، قال: إذا رجع أحدکم من سوقہ فلینشر المصحف ولیقرأ۔[3]

ترجمہ: جب کوئی شخص اپنے کاروبار سے واپس آئے تو اسے چاہیے کہ وہ سورۃ البقرۃ مصحف سے تلاوت کرے۔

الاتقان میں ہے کہ امام حاکم فرماتے ہیں:

کتب حدیث سے اور بھی بہت سی روایات پیش کی جاسکتی ہیں جن کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں لوگ ایک مکمل اور مرتب قرآن سے متعارف تھے۔ یہ قرآن ہر شخص کے پاس تھا۔ اسے ہی لوگ یاد کرتے تھے۔ اس کی ترتیب ہر شخص کے ذہن میں موجود تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ محض چند لوگ تو اس کے متن اور ترتیب سے واقف ہوں اور عوام کو ان کی خبر نہ ہو۔ بیہقی میں ابنِ مسعودؓ (32ھ) سے مرفوعاً روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس شخص کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت رکھنے میں مسرت حاصل ہوتی ہو اسے چاہیے کہ وہ مصحف کو دیکھ کر پڑھے۔[4]

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 173

(2) کنز العمال، جلد اول، صفحہ 549، حدیث نمبر 2458

(3) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد چہارم، صفحہ 618، فضائل القرآن

(4) الاتقان، جلد اول، صفحہ 172-173

ابو ہریرہؓ (58ھ) سے روایت ہے: قال النبی الغرباء فی الدنیا اربعة۔۔۔۔ مصحف فی بیت لا یقرأ فیه۔[1] ابو ہریرہؓ (58ھ) سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا دنیا میں چار چیزیں غریب (اجنبی) ہیں۔ ان چار میں سے ایک قرآن کا وہ نسخہ ہے جو گھر میں ہو مگر اسے پڑھا نہ جاتا ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ (58ھ) سے روایت ہے:

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلَّمَهُ وَنَشَرَهُ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ۔۔۔[2]

ترجمہ: حضور ﷺ نے فرمایا وہ چیز جو آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس سے ملتی رہتی ہے وہ اس کے اعمال اور نیکیاں ہیں اور وہ علم ہے جس کی اس نے تبلیغ کی ہو اور وہ نیک اولاد ہے جو اس نے چھوڑی ہو، اور قرآن کا نسخہ ہے جسے اس نے چھوڑا ہو۔

ان روایات کی روشنی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ کی اس قدر ترغیب موجود تھی کہ لوگ اپنے گھروں میں قرآن کے نسخے رکھیں اور انہیں دیکھ کر پڑھیں۔ اس پس منظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک گھر میں ایک نسخہ کیا ہر فرد کیلئے ایک نسخہ ہو گا۔ اس سلسلے میں صحابہؓ کا یہ قول پیش کیا جاسکتا ہے:

بین اظھرنا المصاحف وقد تعلمنا مافیھا وعلمنا ھالماء نا وزراینا وخدمنا۔[3]

مصاحف کی اس کثرت کی بنیاد پر ہی حضور ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا: عَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: اقْرَءُوا الْقُرْآنَ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ هٰذِهِ الْمَصَاحِفُ الْمُعَلَّقَةُ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَنْ يُعَذِّبَ قَلْبًا وَعَى الْقُرْآنَ.[4]

قرآن پڑھتے رہو اور مصاحف کی موجودگی تمھیں غافل نہ کرے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے آدمی کو عذاب نہیں دیتا جس کے دل میں قرآن ہو۔

ان روایات کے علاوہ حضور ﷺ کے بہت سے ایسے اقوال و فرامین کا پتہ چلتا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید تحریری شکل میں عہدِ نبوی ﷺ میں موجود تھا۔ دار قطنی میں حکیم بن حزام سے روایت ہے: عن حکیم بن حزام ان النبی ﷺ قال لا یمسّ القراٰن الاّ طاھرٌ۔[5]

---

(1) کنز العمال، جلد اول، صفحہ 394

(2) ابن ماجة: السنن، باب ثَوَابِ مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ، حدیث نمبر ۲۴۲، ص ۲۴۹۲

(3) أحمد بن حنبل: المسند، حدیث نمبر ۵، ۲۲۲۹۰/۲۶۶؛ الطبرانی: المعجم الکبیر، حدیث نمبر ۷۷۷۵

(4) الدارمی: السنن، باب فضل من قرأ القرآن، ۳۳۸۲، ابن أبی شیبة: المصنف، کتاب فضائل القرآن وکتاب الزھد؛ کنز العمال، فی فضائل تلاوۃ القرآن، حدیث نمبر ۲۴۰۰

(5) الدار قطنی: السنن، باب فی نھی المُحدِث عن مس القرآن، حدیث نمبر: ۴۴۷

حکیم بن حزام سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کو پاک آدمی کے علاوہ کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ ظاہر ہے جس چیز کو چھوا جاتا ہے وہ کوئی حسی چیز ہی ہو گی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ حکم نہ مدینہ طیبہ کے صحابہؓ کو دیا گیا بلکہ دیگر ممالک میں دیا جہاں جہاں مسلمان موجود تھے۔ تحریری حالت میں ارسال کیا گیا۔ چنانچہ یمن والوں کو عمر بن حزمؓ کی وساطت سے جو احکام دیئے گئے ان میں یہ حکم بھی تھا: ''أن لا یمسّ القرآن إلا طاھراً''۔[1] قرآن مجید کے بارے میں جو دیگر احکام دیئے گئے ہیں ان میں ایک یہ بھی تھا: عن ابن عمر أن النبی ﷺ نھی أن یسافر بالقرآن إلی أرض العدوّ۔[2]

ابن عمرؓ (73ھ) سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دشمن کے علاقے کی طرف سفر میں قرآن کو ساتھ نہ لے جایا جائے۔ ایک روایت میں ہے: ''نھی أن یسافر بالمصحف۔۔۔۔۔ الخ''[3]

مسلم شریف کی ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ مصحف کے ساتھ سفر سے منع فرمایا: ''ان ینالہ العدوّ''[4] یعنی یہ احتیاط اس لئے ضروری قرار دی گئی ہے تا کہ مصحف کسی دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو چیز سینوں میں ہو اسے دشمن کے علاقے میں لے جانے یا نہ لے جانے کا کیا معنٰی؟ مذکورہ صدر روایات کے ذکر کے بعد امام مسلم (261ھ) نے یہ حدیث بیان فرمائی ہے: ''وقد سافر النبی ﷺ وأصحابہ رضی اللہ عنہم وھم یعلمون القرآن''۔[5] یعنی حضور ﷺ نے سفر فرمایا اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے بھی سفر کیا اور وہ قرآن جانتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے اسلام قبول کرنے کے واقعے سے منسوب ایک روایت کی رو سے بھی عہدِ نبوی ﷺ میں کتابتِ قرآن مجید پر دلیل ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی ہمشیرہ سے فرمایا کہ مجھے دکھاؤ جو کچھ تم پڑھ رہے تھے تو ہمشیرہ نے جواب فرمایا:

''إنك رجس ولا یمسہ إلا المطھرون، فقام فاغتسل أو توضّأ۔''[6]

---

(1) مشکوٰۃ المصابیح، باب مخاطب الجنب، ۴۲/۲

(2) البخاری: الجامع الصحیح، باب کراھیۃ السفر بالمصاحف إلی أرض العدوّ، حدیث نمبر ۲۹۹۰، ص ۲۴۰

(3) ابن حجر العسقلانی: فتح الباری، قولہ باب کراھیۃ السفر بالمصاحف إلی أرض العدوّ، ۱۹۰/۹؛ البخاری: حوالہ مذکور

(4) مسلم: الجامع الصحیح، بَاب النَّهْيِ أَنْ يُسَافَرَ بِالْمُصْحَفِ إِلَى أَرْضِ الْكُفَّارِ إِذَا خِيفَ وُقُوعُهُ بِأَيْدِيهِمْ، حدیث نمبر ۴۸۴۰، ص ۱۰۱۳

(5) البخاری: حوالہ مذکور

(6) ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، بیروت: دار صادر، ۱۹۶۸ء، ۲۶۸/۱

"بے شک آپ ناپاک ہیں، اور قرآن مجید کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ وہ کھڑے ہوئے، غسل کیا یا وضوء کیا۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کا یہ سوال کرنا کہ "مجھے دکھاؤ" خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن مجید کوئی حسّی چیز تھی ورنہ تو دیکھنے دکھانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مذکورہ بالا حقائق سے اسی بات پر شہادت ملتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بہت سے تحریری نسخہ ہائے قرآن مجید موجود تھے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن مجید حفظ اور کتابت کی صورت میں مکمل طور پر محفوظ تھا۔ نہ صرف حفظ پر اور نہ ہی صرف کتابت پر اکتفاء کیا گیا۔

ا۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تدوینِ قرآن مجید کے حوالے سے بعض متعارض روایات کا جائزہ

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے الاتقان فی علوم القرآن میں تاریخ تدوینِ قرآن کے بارے میں جو روایات بیان کی ہیں ان میں بعض روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ ان روایات کی بنیاد پر مستشرقین نے قرآن مجید کی حفاظت پر کئی ایک اعتراضات کئے ہیں۔[1] الاتقان میں علامہ سیوطی (911ھ) نے ایک روایت بیان کی ہے جو حضرت زید ابنِ ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: "مات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یجمع القرآن"۔[2] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ درآنحالیکہ قرآن کسی جگہ لکھا نہیں گیا تھا۔

اس روایت سے مستشرقین یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن مجید عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھا نہیں گیا تھا پھر اسی کی بنیاد پر وہ پوری عمارت تعمیر کر دیتے ہیں کہ جب قرآن مجید عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں لکھا گیا تو پھر بعد میں کس بنیاد پر لکھا گیا؟ اور بعد میں لکھے گئے قرآن پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں مستشرقین کے خیالات اس باب کے شروع میں بیان کر دئے گئے ہیں۔

یہ روایت دراصل علّامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) کے اس اندازِ تحریر کی ایک مثال ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر ہر طرح کی روایات نقل کرتے ہیں یہ انداز بیان دراصل متقدمین کے ہاں عام تھا کہ وہ کسی موضوع کے بارے میں لکھتے وقت اس بارے میں ثقہ وغیر ثقہ، صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات بیان

(1) الاتقان، 94/1

(2) ایضاً

کرتے ہیں اور ان دونوں قسم کی روایات میں فرق و امتیاز کرنا بعض اوقات قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں اور بعض اوقات ان بظاہر متعارض روایات کے ذکر کے بعد اپنی رائے آخر میں دے دیتے ہیں۔ اس قسم کی کتب میں مصنف اس طرح کے عنوان بھی قائم کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی نقطہ نگاہ کی حمایت میں موجود دلائل یا اس نقطہ نگاہ کی مخالفت میں موجود دلائل متقدمین کی کسی کتاب میں کسی روایت کا محض منقول ہونا ہی کافی نہیں۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے یہ روایت کس سیاق وسباق میں اور کس عنوان کے تحت بیان کی ہے۔ روایت کا معنی و مفہوم سیاق وسباق کے اعتبار سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا مصنف نے اس روایت کی تائید یا تردید میں کوئی اور روایت بھی بیان کی ہے یا نہیں؟ اگر اس کی تردید میں کوئی روایت بیان کی ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ کس روایت کی سند زیادہ صحیح، قابلِ اعتبار اور ثقہ ہے۔ اصولی طور پر ہم زیادہ صحیح روایت کو قبول کریں گے اور دوسری کو ترک کر دیں گے۔ اسی طرح اس کتاب میں مختلف منقول روایات کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتے وقت بحیثیت مجموعی ہی کوئی نتیجہ اخذ کریں گے۔ الاتقان اور اس قسم کی دیگر کتب کے اسلوبِ بیان اور طرز تحریر کو سمجھے بغیر حتمی طور پر کچھ کہنا، تحقیق کے اصولوں کے منافی ہے ان کتابوں کے اسلوب اور انداز کے بارے میں ہم نے دوسری جگہ پر روشنی ڈالی ہے۔ سطورِ بالا میں جس روایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اسی طرح کی روایت ہے۔

اس روایت کی سند کا جہاں تک تعلق ہے الاتقان میں یہ روایت "الدیر العاقولی" کی کتاب "کتاب الفوائد" کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔ اور اس کی سند یوں ہے:

حدثنا ابراهیم بن بشار حدثنا سفیان بن عیینة عن الزهری عن عبید عن زید بن ثابت۔ (1)

اس روایت سے جہاں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن عہدِ نبوی ﷺ میں جمع نہیں کیا گیا تھا وہاں اسی الاتقان میں موجود مستدرک امام حاکم کی ایک روایت زید ابن ثابتؓ ہی سے منقول ہے۔ جس میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید عہدِ نبوی ﷺ میں لکھا جاچکا تھا اور جمع بھی ہو گیا تھا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: "کنا عند رسول الله ﷺ نؤلف القرآن من الرقاع" (2)

ترجمہ: "ہم حضور ﷺ کے پاس بیٹھے قرآن مجید جوڑا کرتے تھے"

اس روایت کے بارے میں امام حاکم فرماتے ہیں: "هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین"۔ (3)

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) الحاکم: المستدرک علی الصحیحین، ۲۲۹/۲

یہ بات اصولی طور پر بھی طے شدہ ہے کہ ہم بخاری اور مسلم کی روایت کو ترجیح دیں گے امام بیہقی (458ھ) کے حوالے سے ہم نے گذشتہ صفحات میں اس کی وضاحت کی ہے کہ تالیف سے مراد یہ ہے کہ ہم آیات کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر جوڑا کرتے تھے جہاں جہاں ہمیں حضور ﷺ رکھنے کا حکم فرماتے تھے۔[1]

مسلمانوں کے ہاں یہ بات اصول کا مقام رکھتی ہے کہ پہلے درجے کی کتبِ حدیث کی روایت کے مقابلے میں چوتھے درجے کی کتاب کی روایت قابل ترجیح نہیں ہو سکتی۔

جب اس روایت زیر بحث کا جائزہ ہم ایک اور پہلو سے لیتے ہیں تو حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جب ہم اس روایت کو "الاتقان" کی دیگر روایات کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود علامہ سیوطی (911ھ) نے آگے چل کر ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید عہدِ نبوی ﷺ میں لکھا جا چکا تھا۔[2] تحقیق کا اصول بھی یہی ہے کہ تمام روایات سامنے رکھ کر مجموعی شہادت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ تمام روایات کا تقابلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایک روایت سامنے رکھ کر جو فیصلہ بھی کیا جائے وہ یک طرفہ فیصلہ ہو گا۔ خصوصاً جبکہ معاملہ حفاظتِ قرآن مجید جیسے اہم مسئلے کا ہو تو فیصلہ مزید احتیاط سے کرنا ہو گا۔

آگے چل کر امام سیوطی (911ھ) پہلی روایت سے مختلف ایک اور روایت میں بیان کرتے ہیں "روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں صرف چار صحابہ کرامؓ نے ہی قرآن جمع کیا تھا"۔[3]

اس روایت کا جائزہ لیتے ہوئے محققین نے اصل حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن مجید جمع کرنے والوں کی تعداد چار تک محدود نہیں بلکہ ان کی تعداد کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

جس روایت میں چار حضرات، حضرت ابو الدرداءؓ (32ھ)۔ حضرت معاذ بن جبلؓ (18ھ)۔ حضرت زید ابن ثابتؓ۔ اور حضرت ابو زیدؓ کے اسمائے گرامی کا ذکر ہے اس روایت میں اصل مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جمع قرآن کے سلسلے میں ان چار حضرات کا حصر قبیلہ خزرج کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ حضرت

---

(1) علامہ سیوطی نے الاتقان کی النوع الثامن عشر میں عہد نبوی میں کتابت قرآن مجید کے عنوان کے تحت اس طرح کی روایات تفصیل سے بیان کی ہیں۔

(2) السیوطی: حوالہ مذکور

(3) السیوطی، صفحہ 94/1

انس بن مالکؓ نے یہ بات اس وقت فرمائی جب کہ اوس اور خزرج میں باہمی گفتگو میں مفاخرت کی باتیں ہورہی تھیں اس بات کا ذکر ابن جریر طبریؒ (310ھ) نے قتادہ کی سند کے ساتھ انس بن مالکؓ سے روایت میں کیا ہے کہ اوس اور خزرج باہم مفاخرت کرنے لگے۔ اوس والے کہنے لگے ہمارا قبیلہ ایسا ہے کہ اس میں چار آدمی ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک کیلئے تو اللہ کا عرش کانپنے لگا وہ سعد بن معاذؓ ہیں۔ کسی کی شہادت دو کے برابر قرار دی گئی۔ وہ خزیمہ بن ثابت ہیں کسی کو ملائکہ نے غسل دیا وہ حنظلہ بن ابی عامر ہیں اور کسی کو شہادت کے بعد ملائکہ آسمان پر لے گئے وہ عاصم بن ثابت ہیں اس پر خزرج کے لوگ کہنے لگے۔ ہم میں سے چار ایسے آدمی ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا اور یہ نام بیان کئے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں یہ فضیلت و سعادت حاصل ہوئی نہ کہ اوس والوں کو۔[1] گویا اس جگہ قرآن جمع کرنے کا موضوع بنیادی طور پر زیرِ بحث ہے ہی نہیں۔

جہاں تک قرآن عہدِ نبوی میں جمع کرنے والوں کی بات ہے۔ اس سلسلے میں دیگر بہت سی روایات ملتی ہیں جن میں ان لوگوں کے اسمائے گرامی کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن جمع کیا تھا۔ ان کی اجمالی فہرست یوں ہے۔ امام بخاریؒ (256ھ) کی روایت کے مطابق حضرت ابوالدرداءؓ (32ھ)، حضرت معاذ بن جبلؓ (18ھ)، حضرت زید ابن ثابتؓ، حضرت ابوزیدؓ، حضرت ابی ابن کعبؓ (22ھ)، حضرت عائشہؓ (57ھ)[2] امام نسائی کی روایت کے مطابق ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ)، حضرت عمرو ابن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ۔ تہذیب التہذیب کے مطابق عبادہ بن صامتؓ، کنزالعمال کے مطابق، حضرت ابو ایوب انصاریؓ۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ زید ابنِ ثابتؓ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کیلئے قرآن لکھا تھا۔ اسی کتاب میں ہے عبداللہ ابن عمرؓ (73ھ) اور حضرت حفصہؓ کے پاس بھی قرآن مجید تھا۔[3]

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے اس روایت کا تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا ہے کہ کیا عہدِ نبوی ﷺ میں صرف انہی چار حضرات، حضرت ابی ابن کعبؓ (22ھ)۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ (18ھ)، حضرت زید ابن ثابتؓ اور حضرت ابوزیدؓ نے قرآن جمع کیا تھا۔[4] علامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں کہ

---

(1) الطحاوی: شرح مشکل آثار، ۱۴/۲۲۰؛ السیوطی، 94/1
(2) البخاری: الجامع الصحیح، ۲۲۸/۳
(3) الاستیعاب، ۱/۱۰۷؛ العسقلانی، فتح الباری، ۴۲/۹ (باب القرآء من اصحاب النبی ﷺ)
(4) سیوطی، 94/1

انس بن مالکؓ سے ہی ثابت کے طریق پر ایک اور روایت ہے جس میں حضرت ابی ابن کعبؓ (22ھ) کی بجائے حضرت ابوالدرداءؓ (32ھ) کا نام ہے۔[1]

علامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں قتادہ کی روایت سے مخالفت پائی جاتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ اس میں صیغہ حصر کے ساتھ چار ہی اشخاص کی تصریح کی گئی ہے اور دوسری وجہ حضرت ابوالدرداءؓ (32ھ) کا نام حضرت ابیؓ ابن کعبؓ (22ھ) کی جگہ آیا ہے۔ اور اماموں کی ایک جماعت نے قرآن کے جمع کرنے کا انحصار چار ہی اشخاص میں محدود کر دینا صحیح نہیں مانا۔[2]

علامہ سیوطی (911ھ)، علامہ مازری (م ۵۳۶ھ) کا بیان نقل کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے قول سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان چار اصحابؓ کے علاوہ کسی اور نے قرآن مجید جمع نہ کیا ہو، اور ان کی یہ بات فی الواقع درست ہی ہو۔ کیونکہ اس مقام پر کلام کی تقدیر یہ ہو گی کہ حضرت انسؓ کو ان لوگوں کے سوا کسی اور کا قرآن جمع کرنا معلوم نہ تھا اس نے قرآن مجید کو عہدِ رسالت میں جمع کر لیا ہے یا نہیں؟ لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے۔[3] سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں:

اگر حضرت انسؓ کے قول کی بنیاد ان کا ذاتی علم ہی قرار دیں تو پھر یہ اس بات لازم نہیں ہوتی کہ ان کا قول درست بھی ہو۔[4]

علامہ مازری لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے اس قول سے ملحد لوگوں نے استدلال کیا ہے۔ حالانکہ اس قول سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے کیونکہ ہم اس قول کو اس کے ظاہری معنوں پر محمول کرنا تسلیم ہی نہیں کرتے اور فرض کیا کہ ہم اس کے ظاہری معنوں کو صحیح مان لیں تو بھی یہ بات واقعاتی طور پر ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اُس دور میں ایک کثیر تعداد مین قرآن جمع کرنے والوں کے نام کتابون میں موجود ہیں[5]

علامہ سیوطی (911ھ)، قرطبی (671ھ) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بئیر معونہ کے واقعہ میں ستر حافظانِ قرآن شہید ہوئے یمامہ کی لڑائی میں بھی اتنے ہی قراءئے قرآن شہید ہوئے۔ اسکی بنیاد پر

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

(5) ایضاً

سیوطی (911ھ) کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسؓ نے جن چار اصحابؓ کا ذکر کیا ہے ان کے ساتھ انہیں خاص اور بے حد تعلق تھا اور دوسروں سے اس قدر تعلق نہ تھا۔ یا یہ بات ہے کہ حضرت انسؓ کے ذہن میں اتنے ہی لوگ آئے اور دوسرے نہ آسکے۔[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خاص اور معروف حفاظ ہوں۔

علامہ سیوطی (911ھ)، علامہ باقلانی (403ھ) کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی اس روایت کی وضاحت کئی طرح سے کی جاسکتی ہے۔ اول اس قول کا کوئی مفہوم ہی نہیں نکلتا۔ اس وجہ سے یہ لزوم بھی نہیں پایا جاتا کہ ان چار اصحاب کے علاوہ کسی نے قرآن جمع ہی نہ کیا ہو۔ دوم اس سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ قرآن مجید کو تمام ان تمام وجوہ اور قراءتوں پر جن پر اس کا نزول ہوا تھا، صرف انہی چار صاحبوں نے جمع کیا۔ سوم قرآن مجید میں سے اس کی تلاوت کے بعد منسوخ شدہ اور غیر منسوخ حصوں کی فراہمی اور حفظ میں ان چاروں کے علاوہ کسی اور نے سعی نہیں کی۔ چہارم یہاں قرآن جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ سے سیکھا ہو۔ پنجم ان حضرات نے قرآن پڑھنے پڑھانے پر اپنے اوقات صرف کر دے اور اسی وجہ سے ان کی شہرت سب سے زیادہ پھیل گئی۔ ششم یہ کہ اوروں نے یا تو حفظ کیا یا تحریر کیا لیکن ان لوگوں نے حفظ بھی کیا اور تحریر بھی۔ ہفتم یہ کہ ان اصحابؓ کے علاوہ کسی نے بصراحت قرآن کے جمع کرنے سے اس کے احکام کی پابندی اور تعمیل مراد ہے۔ اس قول کی تائید میں وہ ابوالدرداءؓ (32ھ) کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ کسی نے ان سے کہا کہ میرے بیٹے نے قرآن جمع کر لیا ہے آپؓ نے فرمایا کہ قرآن مجید وہی شخص جمع کر سکتا ہے جو اس کے اوامر ونواہی کی تعمیل کرے۔[2]

حافظ ابنِ حجر عسقلانی (852ھ) فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا احتمالات میں سے اکثر احتمال ایسے ہیں جن میں خواہ مخواہ تکلّف سے کام لیا گیا ہے۔ خصوصاً آخری تشریح تو مکمل طور پر تکلف پر مبنی ہے۔ ابنِ حجر نے جو تشریح اور احتمال خود اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ بیان در حقیقت اوس اور خزرج کی باہمی مفاخرت کی گفتگو کا حصہ ہے دونوں گروہوں نے اپنی اپنی مفاخرت جتائی اسی دوران خزرج والوں نے کہا کہ ہم میں سے چار لوگوں نے قرآن جمع کیا۔[3]

مذکورہ بالا تمام تشریحات کسی نہ کسی طور پر قرینِ حقیقت ہوسکتی ہیں۔ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ کوئی یا چند پہلو بعید از قیاس ہوں لیکن تمام کے تمام نکات دور دراز کار نہیں ہیں۔ ان تمام تفصیلات سے یہ

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس روایت کا مفہوم و مطلوب ہرگز وہ نہیں ہے جو مستشرقین نے فرض کیا ہے۔ درحقیقت اس روایت میں ایک مخصوص پہلو بیان کیا گیا ہے۔ مختلف محققین نے مستند احادیث و آثار کو جمع کیا ہے۔ جن میں عہد نبوی ﷺ میں قرآن حکیم جمع کرنے والوں کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان متفرق و منتشر روایات کو یکجا کیا جائے اور اس عہد میں جامعینِ قرآن کے نام جمع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم بیس ایسے صحابہؓ تھے۔ جنہوں نے یہ کام سرانجام دیا تھا۔ ان احادیث و روایات کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

''عن أنس جمع القرآن على عهد النبي ﷺ أربعة كلهم من الأنصار أبّي و معاذ وزيد بن ثابت وأبوزيد قلت من أبوزيد قال أحد عمومتي''[1]

ترجمہ: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ''عہدِ نبوی ﷺ میں چار حضرات نے قرآن جمع کیا یہ سب انصار میں سے تھے (اور یہ) ابیؓ ابن کعبؓ (22ھ)۔ معاذؓ۔ زید ابن ثابتؓ اور ابوزیدؓ تھے''۔ میں نے پوچھا یہ ابوزید کون ہیں؟ کہا کہ یہ میرے چچا ہیں۔ ایک روایت میں حضرت انسؓ کا بیان ہے:

''ونحن ورثناه''[2] یعنی ہم اس کے وارث ہوئے۔

اس کے وارث بننے کا مطلب کیا ہے؟ اسکی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔ حضرت انسؓ کے بیان کا واضح مطلب یہی نظر آتا ہے کہ ان صحابہؓ نے قرآن لکھا ہوا جمع کیا تھا۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں:

۱۔ جمع کا معنٰی ضم اور تالیف کے ہیں۔ جو کتابت کے ہم معنی ہے۔ حفظ کرنے یا یاد کرنے کے مترادف یا ہم معنی نہیں ہے۔ البتہ ''حفظ'' پر جمع کے لفظ کا استعمال مجاز ہے نہ کہ حقیقت۔ اصول یہ ہے کہ کسی لفظ کا معنی سب سے پہلے وہی لیا جاتا ہے جو حقیقی ہو۔ ہاں اگر حقیقی معنی مراد لینا صحیح نہ ہو تو دوسرا مجازی معنی لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس جگہ کوئی ایسی وجہ موجود نہیں ہے کہ معنی حقیقی مراد نہ لیے جائیں۔ بلکہ معنی حقیقی نہ لینے سے یہ روایت غلط ہو گی۔ کیونکہ حفاظِ کرام تو صحابہؓ میں چار سے تو بہر حال زیادہ تھے۔

۲۔ اگر یہاں جمع کا معنی ''حفظ'' لیا جائے اور کہا جائے کہ حافظ قرآن چار تھے تو اس وقت حضرت انسؓ کا یہ کہنا غلط ہو گا کہ ہم اس کے وارث ہوئے۔ اور یہ بیان خلاف واقعہ بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت انسؓ کا یہ کہنا لاعلمی کی وجہ سے ہو اور انہوں نے اپنے علم و یادداشت کے مطابق ان چار ہی کا ذکر کیا ہو تو

---

(1) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب مناقب الأنصار، باب مناقب زید بن ثابت، حدیث نمبر: ۳۸۱۰، ص ۳۰۹

(2) ایضاً، کتاب فضائل القرآن باب القراء من أصحاب النبی ﷺ، حدیث نمبر: ۵۰۰۴، ص ۴۳۴

اس کے متعلق یہ کہنا کافی ہو گا کہ انسؓ کے اس بیان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت انسؓ کو اپنی معلومات کی حکایت اور بیان مقصود ہے نہ ایک واقعی بات کا بیان کرنا مقصود ہے اور اگر اس قسم کے معنی کی مؤرخ کے کلام میں گنجائش ہو اور تاریخ کا معنی یہی ہو کہ مؤرخ اپنے علم اور معلومات کو ظاہر کرے تو پھر کبھی کسی مؤرخ سے تاریخی غلطی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ روایت غلط تسلیم کی جائے کہ حفاظِ قرآن کا چار سے زیادہ ہونا ایسا یقینی اور مضبوط ہے کہ اس میں کسی قسم کے احتمال اور شک وشبہ کی راہ باقی نہیں۔

۳۔ حضرت انسؓ کا ابوزید کے متعلق یہ کہنا: "ونحن ورثناہ" یعنی ہم اس قرآن کے وارث ہوئے اس امر کی روشن شہادت ہے کہ حضرت انسؓ کی غرض یہ ہے کہ ان چاروں نے عہدِ مبارک میں بتمام و کمال قرآن لکھ کر جمع کیا تھا۔ اور ابوزید کے قرآن کے انس وارث ہوئے۔ انسؓ۔ ابوزید کے رشتہ دار تھے اور ابوزید کے نسخے کے وہ ترکے کے طور پر وارث ہوئے۔

حضرت انسؓ کے اس بیان کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت انسؓ۔ ابوزید کے مال کے وارث بنے نہ قرآن کے۔ لیکن اس صورت میں حضرت انسؓ کا یہ کلام پہلے کلام سے بے تعلق ہو گا اور اس کا پہلے کلام سے کوئی ربط نہ ہو گا اور وراثتِ قرآن اگر مراد ہو تو اس میں چاروں کے لکھنے پر شہادت ہو گی اور جمع کے معنی کی توضیح ہو گی کہ اس کا معنی لکھنا ہے نہ کہ یاد کرنا اور حضرت انسؓ کا مقصود یہ ہو گا کہ ان چاروں نسخوں میں سے ایک مجھ تک پہنچا تھا۔ جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس سے ان کی غرض روایت کی توثیق ہے۔ پھر ظاہر اور مرتب کلام اور معنی سے گریز کر کے ایسے معنی مراد لینا جو بے تعلق اور غیر مفید ہیں اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۴۔ ابیّ بن کعبؓ (22ھ)، ابنِ مسعودؓ (32ھ)، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ (50ھ) وغیرہ ان حفاظ میں سے ہیں جن کا نام حفاظ کی فہرست میں بڑا نمایاں ہے۔ اہلِ مدینہ میں کوئی شخص ایسا نہیں ہو گا جو ان کے اس کمال سے واقف نہ ہو گا۔ حضور ﷺ نے اعلان عام فرمایا تھا کہ قرآن انہی سے پڑھیں اور "أقرؤنا أبي"[1] کا خطاب بھی عطاء کیا گیا تھا۔ ابی ابن کعبؓ (22ھ) کے اس خطاب سے بھی کوئی بے خبر نہ تھا۔ یہ بات باعث تعجب ہو گی کہ حضرت انسؓ جو حضور ﷺ کے خادمِ خاص اور دربارِ نبوت ﷺ میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ابی ابن کعبؓ (22ھ) جیسی شخصیت سے واقف نہ ہوں اور اس قسم کی بات کریں کہ ان چار اصحاب کے علاوہ حضور ﷺ کے عہد میں کوئی حافظِ قرآن نہ تھا۔ اس بحث کے

---

(1) ایضاً، حدیث نمبر ۴۴۸۱، ص ۳۶۷

اختتام پر ہم علامہ بدرالدین عینی کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :ان الذین جمعوا القراٰن علی عھد النبی ﷺ لا یحصیھم عدد ولا یضبطھم أحد۔ (1)

گذشتہ سطور میں جن اصحاب کے نام ذکر کئے گئے ہیں علامہ بدرالدین عینی نے ان میں ابو موسٰی اشعریؓ (30ھ)۔ مجمع بن جاریہؓ۔ قیس بن ابی صعصعہ۔ قیس بن سکنؓ۔ ام ورقہ بن نوفلؓ اور ابنتہ عبداللہ بن حارثؓ کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ (2) خطیب بغدادی (463ھ) نے ثابت بن بشیر بن ابی زید کا نام بھی لکھا ہے۔ (3)

مذکورہ بالا جن اصحابؓ کے اسمائے گرامی پیش کئے گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کریم لکھ کر محفوظ کیا تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے جمع قرآن پر جمع فی الصّدر کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ حفاظ صحابہؓ کی تعداد تو شمار میں لانا مشکل ہے۔ جنگ یمامہ میں ستر حفاظ شہید ہوئے۔ بئیر معونہ کے موقع پر ستر حفاظ شہید ہوئے۔ عہدِ نبوی ﷺ کے حفاظ کی تعداد تیس تک تو فتح الباری اور عمدۃ القاری میں موجود ہے۔ (4)

لہٰذا یہاں جمع کتابی مراد ہے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر عسقلانی (852ھ) کا بیان قابل ذکر ہے:

المراد بالجمع الکتابة فلا ینفی أن یکون غیرھم جمعه حفظا عن ظھر قلب وأما ھٰؤلاء فجمعوه کتابة وحفظوه عن ظھر قلب۔ (5)

"جمع سے مراد کتابت ہے، لہٰذا اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ ان لوگوں کے علاوہ کسی نے بھی زبانی یاد کر کے جمع کیا تھا، البتہ ان لوگوں نے لکھ کر بھی جمع کیا تھا اور زبانی حفظ بھی کیا ہوا تھا۔"

مستشرقین نے اتقان کی یہ عبارات تو اپنے مقصد کی خاطر خوب اچھالی ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں صرف چار لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بالکل متصل وہ لاتعداد روایات بیان کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن میں اس بیان کی تشریح کی ہے کہ اس بیان کا مطلب کیا ہے اور یہ کس سیاق وسباق اور

---

(1) العینی: عمدۃ القاری، باب القراء من أصحاب النبی ﷺ، ۲۸/۱۰

(2) ایضاً، ۲۷/۱۰

(3) السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، صفحہ 94/1

(4) العینی، حوالہ مذکور، ۲۷/۱۰؛ العسقلانی: فتح الباری، ۱۱/۹

(5) ایضاً

پس منظر میں بات کی گئی تھی۔ وہ ان روایات کو بھی بیان نہیں کرتے جن میں ان چار حضرات کے علاوہ دیگر اصحابؓ کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے قرآن عہدِ نبوی ﷺ میں جمع کیا تھا۔ ہم آئندہ سطور میں ان روایات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مستشرقین دانستہ کتمانِ حق کرتے ہیں۔

۱۔ ابن ابی داؤد میں محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں پانچ انصاری صحابہؓ نے قرآن مجید جمع کیا تھا۔ (1)

۲۔ ابن ابی داؤد اور بیہقی (458ھ) نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ اللہ کے عہدِ مبارک میں چھ لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا: ابیؓ بن کعب (22ھ)، ابوالدرداءؓ (32ھ)، سعید بن عبیدؓ، ابو زیدؓ، مجمع بن جاریہؓ۔ (2)

۳۔ ابو عبیدؒ (224ھ) نے کتاب القراءات میں عہدِ نبوی ﷺ کے قراء کا ذکر یوں کیا ہے مہاجرین میں سے خلفائے اربعہؓ، طلحہؓ، سعدؓ، ابن مسعودؓ (32ھ)، حذیفہؓ، سالمؓ، ابوہریرۃؓ (58ھ)، عبداللہ بن السائبؓ، ابن الزبیرؓ، ابن عباسؓ (68ھ)، ابن عمرؓ (73ھ)، حضرت عائشہؓ (57ھ)، حضرت حفصہؓ، ام سلمیٰؓ، انصار میں سے عبادۃ بن صامتؓ، معاذؓ، مجمع بن جاریہؓ، فضالہ بن عبیدؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، ابن ابی داؤد نے ان کے ساتھ حضرت تمیم داریؓ اور عقبہ بن عامرؓ کو بھی شمار کیا ہے۔ ابو عمرو الدانی نے ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) کے قرآن کا بھی ذکر کیا ہے۔ (3)

الاتقان میں علامہ سیوطیؒ (911ھ) نے اور بھی بہت سی روایات نقل کی ہیں جن سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ دیگر بہت سے لوگوں نے بھی قرآن مجید عہدِ نبوی ﷺ میں جمع کیا تھا۔ (4)

ان روایات کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر مستشرقین کی علمی دیانت کا اندازہ ہم انہی روایات سے لگا سکتے ہیں کہ باقی تمام روایات سے جو ان کے نقطہ نگاہ کے اثبات کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ آنکھیں بند لیتے ہیں۔

اس ساری تفصیل کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ میں جن لوگوں نے قرآن مجید جمع کیا تھا وہ محض چار نہ تھے بلکہ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اور مستشرقین کا یہ مؤقف کسی طرح بھی

---

(1) السیوطی: 94/1

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

درست ثابت نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ کی وفات ہو گئی درآنحالیکہ قرآن صرف چار لوگوں کے پاس تھا یا ابھی معرض تحریر میں آیا ہی نہ تھا۔

قرآن مجید کی محفوظیت میں شکوک پیدا کرتے ہوئے جو روایات پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ (57ھ) فرماتی ہیں۔ حضور ﷺ نے کسی شخص کو کچھ تلاوت کرتے سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت فرمائے اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد کرادی جسے میں سورت میں سے بھول چکا تھا۔ اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:

حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) سے روایت ہے "حضور ﷺ نے ایک شخص کو رات کے وقت کچھ تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ اس شخص پر رحمت فرمائے اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد کرادی جسے میں فلاں فلاں سورت میں سے بھول چکا تھا۔" (1)

بخاری میں اس سلسلے میں تین روایات ہیں۔ تیسری روایت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ یہ کہے کہ میں فلاں فلاں آیات بھول گیا بلکہ اسے بھلادیا گیا۔ جس طرح نسخ اللہ کا فعل ہے۔ اسی طرح ذہنوں سے کسی آیت کو محو کر دینا بھی اللہ کا فعل ہے۔ (2)

جب قرآن تحریری شکل میں موجود ہو۔ ہزاروں لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو۔ چند افراد اگر ایک آیت کو بھول بھی جائیں تب بھی قرآن پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر ایک کو آیت بھولتی ہے تو ہزاروں کے ذھنوں میں تو وہ محفوظ ہے اور ان کے ذریعے وہ آیت مستحضر ہو سکتی ہے۔

اس روایت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضور ﷺ نے کسی سے جو آیت سنی تھی وہ منسوخ التلاوۃ آیت ہو۔ حضور ﷺ اسے کبھی پڑھتے ہوں گے جو اب آپ کو بھلادی گئی تھی۔ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ لیکن اس وقت اس شخص کو اس کی تلاوۃ کے منسوخ ہوچکنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔ نبی کریم ﷺ چونکہ وہ آیت پڑھتے رہے تھے اس لئے اس کے سننے پر آپ نے محض جذباتی انداز میں فرمادیا ہو کہ اللہ اس شخص پر رحم کرے۔ ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ قرآن میں موجود آیت کے بارے میں

(1) بخاری، کتاب التفسیر، باب القرآن، حدیث نمبر 5037
مسلم، کتاب فضائل القرآن مایتعلق به، باب الامر بتعهد القرآن ع کراهة قول نسیت ایة کذا وجواز قول انسیتها، حدیث نمبر 1837-1838

(2) بخاری، حوالہ سابق، حدیث 5039

حضور ﷺ یہ فرمائیں کہ مجھے یہ آیت بھول چکی تھی۔ ایسی بات تو آج کل کے پختہ حافظ کے بارے میں بھی نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کہے کہ میں فلاں آیت بھول چکا تھا۔ آپ تو روزانہ تلاوت فرماتے تھے۔ اس روایت کو اس تناظر میں بھی دیکھیں کہ حضرت جبرائیل، حضور ﷺ سے رمضان میں دور کیا کرتے تھے۔ آخری رمضان میں یہ دور دو مرتبہ ہوا تھا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں اسی روایت کا وہ مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا جو بظاہر نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز حافظے میں موجود ہوتی ہے لیکن اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی دوسرے کے یاد کروانے یا اشارہ کرنے سے توجہ فوراً اس طرف منتقل ہو جاتی ہے اور وہ چیز حافظے میں مستحضر ہو جاتی ہے ایسے موقعے پر کہا جا سکتا ہے کہ "فلاں کے پڑھنے سے آیت مجھے یاد آگئی" یعنی توجہ اس طرف ہو گئی۔ یہ ایک عام محاورہ ہے۔

مولانا افغانی اس طرح کی روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مستشرقین جن روایات کو لے کر حفظ و تواتر قرآن پر اعتراضات کرتے ہیں اس کا عام جواب جو ایسے تمام مواقع کیلئے اصولی طور پر کافی ہے وہ یہ ہے کہ تواترِ حفظ قرآن، تواتر اور اجماعِ قطعی سے ثابت ہے اور جو روایات اس کے خلاف پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر ضعیف ہوتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ خبر واحد ہوتی ہیں جو ظنی ہوتی ہے اور ظنی بات کی حیثیت قطعی بات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتی ہے"[1] مسلم شریف کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایقل احد کم نسیت ایۃ کیت و کیت بل ھونسی"[2]

مستشرقین نے عہدِ نبوی میں قرآن کے محفوظ نہ ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ جن اشیاء پر قرآن لکھا جاتا تھا وہ قابل اعتبار نہیں ہوتی تھیں مسلمان علماء نے ان کے اس نقطہ نگاہ کی بھی خوب وضاحت کر دی ہے کہ:

وہ چیزیں جن پر قرآن لکھا جاتا تھا قابلِ اعتبار تھیں؟

یہ نقطہ نگاہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے حضور ﷺ کی ابتدائی یاداشتوں کو اس قسم کی چیزوں رقاع یعنی چمڑے یا لخاف (پتھر کی باریک تختیوں) عسیب (کھجوروں کی شاخ اور چوڑے پتے) کتف (اونٹ کا شانہ) وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے۔ یقیناً ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے جاہلی عرب کے صحیح حالات کا علم نہیں۔ جیسا کہ کتاب میں دوسری جگہ یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ صحابہؓ،

(1) افغانی، شمس الحق، مولانا، علوم القرآن، صفحہ: 123

(2) مسلم، کتاب فضائل القرآن وما یتعلق بہ، باب الامر بتعھد القرآن و کراھتہ قول نسیت ایۃ کذا وجواز قول انسیتھا، حدیث نمبر 1837

حضور ﷺ کے گرد بیٹھ کر قرآنی آیات ترتیب دیا کرتے تھے۔ [1]

رقاع، رقعہ کی جمع ہے۔ رقاع ایسے چمڑے کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو لکھنے ہی کیلئے تیار کئے جاتے تھے۔ گویا پارچمنٹ جسے عربی میں رق کہتے ہیں اس کی تعبیر رقاع کے لفظ سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع ہے۔ آخر اس وقت رقاع سے جس طرح کام لیا جاتا تھا۔ ابتدائی کتابت کے وقت بھی کیا یہی رقاع نہیں مل سکتا تھا۔ رقاع کے بارے میں مجمع البحار میں تحقیق کرتے ہوئے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ آئیں گے۔ ''وعلی رقبة رقاع تخفق'' [2]

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ''اراد بالرقاع ماعلیه من الحقوق والمکتوبة فی الرقاع'' [3]

جس کا مطلب یہی ہے کہ دین اور قرض جیسے مطالبات ادا کئے بغیر جو لوگ مر جائیں گے قیامت کے روز ان مطالبات کے وثائق رقاع میں لکھے ہوں گے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''رقاع'' کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے۔ عربوں کا رواج تھا کہ اپنے وثائق ان پر لکھتے تھے۔ [4] حضور ﷺ نے تحریر کیلئے ایسی چیزوں کا انتخاب فرمایا تھا جن کے بارے میں عام توقع یہ تھی کہ عام حوادث و آفات کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ان چیزوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ جن الفاظ میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے لاپرواہی سے کام لیا گیا ہے جس سے غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ اسکولوں میں بچے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں یا قدیم ہندوستان میں جو لکھنے کا طریقہ تھا اسے بیان کرتے ہوئے کہا جائے کہ تاڑ داڑ کے پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہوگی کیا سکولوں میں سلیٹ پر لکھنے کا رواج ہے اسے پتھر کے ٹکڑے کہنا ان کی صحیح تعبیر ہے۔ اسی طرح ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر یوں ہی لکھا جاتا تھا۔ جن لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں دیکھا ہے انہیں اس کی صحیح نوعیت کا اندازہ نہ ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ کاغذ کے اوراق سے زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ سے تاڑ کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں مسلم کتب خانہ ان ہی کتابوں پر مشتمل ہے جو تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں اسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس قسم کا

---

(1) غلام ربانی، مولانا، تدوین قرآن (از افاداتِ مولانا مناظر احسن گیلانی) مکتبۃ البرہان، دہلی، ۱۹۵۱ء، ص ۴۷

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

مغالطہ ان چیزوں کے متعلق بھی عوام میں پھیلا ہوا ہے جن پر قرآنی وحی کی ابتدائی یاداشتوں کو رسول اللہ ﷺ لکھوایا کرتے تھے۔ مشہور ہو گیا ہے کہ کھجور کی شاخوں بلکہ بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ کھجور کے پتوں یا پتھر یا ہڈیوں پر قرآن لکھا جاتا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ کھجور کے پتوں بلکہ اس کی شاخ میں اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے کہ جس پر سطر بہ سطر ہی لکھا جا سکے۔ اسی طرح بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنا کیا آسان ہے؟

احادیث میں ادیم۔ لخاف۔ کتف۔ عسیب۔ اقتاف کے الفاظ آئے ہیں۔ ادیم باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا۔ عرب جو ایک گوشت خور ملک تھا۔ ان کے ہاں سے ادیم کا کافی ذخیرہ مل جاتا تھا۔ حتیٰ کہ خیمہ تک صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ لخاف ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ سلیٹ اور لخاف میں گویا صرف رنگ کا فرق تھا۔ اسی طرح اونٹ کے کندھے کے پاس کی ہڈی جو گول ہوتی ہے طشتری کی طرح بن جاتی ہے اس کو خاص طریقے سے تراش کر نکالا جاتا تھا۔[1]

عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج کتابتِ قرآن کی خارجی شہادت ہے:

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج عام نہ تھا اور اسی وجہ سے قرآن بھی عہد نبوی ﷺ میں لکھا نہیں گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عرب میں اس وقت ایسی اشیاء کا فقدان تھا جو لکھنے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں۔ قدیم عرب کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں لکھنے کا رواج عام تھا گو آج کے دور کی طرح کاغذ اور لکھنے اور لکھنے کے دیگر لوازمات ترقی یافتہ شکل میں موجود نہ تھے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ لکھنے کا ایک معقول اور قابل اعتبار نظام موجود تھا۔ گو اہلِ مکہ کا عام رجحان پڑھنے کی طرف نہ تھا لیکن اس کے باوجود یہ کہنا ناممکن ہے کہ لوازمات تحریر کا فقدان تھا ذیل میں ہم ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے دور تک تحریر اور لوازمات تحریر عام تھیں۔

علامہ ابن خلدونؒ (808ھ) نے اس سلسلے میں تفصیلی جائزہ لیا ہے جس سے یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی کہ عرب لکھنے کے فن سے واقف تھے۔ علامہ لکھتے ہیں: "تاریخ شاہد ہے کہ تبابعہ کے دور میں جب حضریت و شہریت کا چرچا ہوا۔ شہروں کی آبادی بڑھی تو خط عربی بھی جسے خط حمیری کہتے ہیں معراج ترقی پر پہنچا۔ پھر جب تبابعہ کی بساط الٹی تو آلِ منذر یعنی سلاطین حیرہ کے ہاں فن کتابت کا رواج پڑا۔ انہی کی شاگردی اہل طائف اور قریش نے کی۔" سفیان بن امیہؓ نے سب سے پہلے حیرہ والوں سے کتابت

(1) ایضاً

سیکھی۔ بعض کہتے ہیں کہ حرب ابن امیہ نے اسلم بن سدرہ کی شاگردی میں یہ فن سیکھا۔ بہر حال اہل حیرہ ہی سے کتابت سیکھی۔ علامہ ابن خلدونؒ (808ھ) کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ قریش نے اہل عراق کے قبیلہ ایاد کی بجائے اہل حیرہ سے کتابت سیکھی تھی۔ حمیر کا جو طریق کتابت تھا اسے مسند طریق کہتے ہیں اس میں صرف جدا جدا لکھتے ہیں۔ حمیر سے مضر نے کتابت سیکھی مگر ان میں یہ فن چمک نہ سکا۔

علامہ ابن خلدونؒ (808ھ) کہتے ہیں کہ بدویت کی وجہ سے صنعت اور تہذیب پروان نہیں چڑھی۔ عرب چونکہ زیادہ تر بدویت کی طرف مائل تھے لہذا ان میں کتابت کا فن زیادہ ترقی نہ کرسکا۔ اس میں عربی خط کمال و پختگی میں اور اصول و قواعد کے لحاظ سے عروج تک نہ پہنچ سکا۔ بلکہ درمیانی درجہ بھی نہ پاسکا۔[1]

ابن خلدونؒ (808ھ) کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں میں لکھنے کا فن بہر حال موجود تھا۔

قرآن مجید لکھنے کیلئے جو مواد استعمال ہوتا تھا اس کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ مواد قابل اعتبار نہ تھا۔ لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں: اس قسم کا تاثر پیدا کرنا محض مستشرقین کی اس پالیسی کا حصہ ہے کہ قرآن مجید کی ابتدائی کتابت کو مشکوک بنا دیا جائے کہ قرآن جن اشیاء پر لکھا جاتا تھا وہ جلد ضائع ہو جانے والی اور ناقابل اعتبار تھیں۔ عہد نبوی ﷺ میں کتابت قرآن کے باب میں ہم نے مولانا مناظر احسن گیلانی کی تحقیق پیش کر دی ہے جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ یہ اشیاء قابل اعتبار تھیں۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ دکن میں ایسی ہی اشیاء پر لکھی ہوئی کتب موجود ہیں جو کاغذ پر لکھی ہوئی کتب سے زیادہ پائیدار ہیں۔ ابتدائی دور میں تو لکھنے کا مواد وہی رہا جس کا تذکرہ عام طور پر کیا جاتا ہے لیکن تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ کاغذ بھی ایجاد ہو گیا۔ عرب میں کاغذ (۷۰۴ء) میں آیا ہے۔[2] یہ وہ زمانہ ہے جب حجاج ابن یوسف گورنر تھا۔ اس زمانے تک عرب لکھنے پڑھنے میں ماہر ہو چکے تھے۔ قرض جیسے معاملات کو لکھنا۔ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم، زمینوں کی تقسیم اور ان سے حاصل شدہ محاصل کا حساب کتاب رکھنے اور دیگر بہت سے شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل کرتے چلے آرہے تھے۔[3] ابن ندیم الفہرست میں ایک روایت بیان کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب میں لکھنے کا عام

---

(1) ابن خلدون، مقدمہ: جلد 1، ص: 465

(2) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، تدوین قرآن، مکتبہ خلیل، لاہور، ص: 46-50

(3) Encyclopaedia Britanica, Vol.xvii, P.229

رواج موجود تھا ابن ندیم کی روایت یوں ہے:

''قال محمد بن إسحاق كان بمدينة لحديثه رجل يقال له محمد ابن الحسين ويعرف بابن أبي بعره جماعة للكتب له خزانة لحد ارلاحد مثلها كثرة تحتوى على قطعة من الكتب العربية فى النحو واللغة والأدب والكتب لقديمة فلقيت هذا الرجل دفعات فأنس بى وكان نفوراً فئينا بما عنده خائفا من بنى حمدان فاخرج لى قمطرا كبيراً فيه نحو ثلثمائة رطل جلود فلجان وصكاك وقرطاس مصر وروق صينى وورق تهامى وجلود آدم وورق خراسانى فيها تعليقات عن العرب و قصائد مفرادات من أشعارهم وغيرهم... ورأيت مايدل على ان النحوعن أبى الأسود ماهذا حكاية وهى أربعة أوراق احسيها من ورق الصين ترجمتها هذا فيها كلام فى الفاعل۔''(1)

''محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ محمد بن حسین نامی شخص جو ابن بعرہ کے نام سے مشہور تھا اور کتابیں جمع کرنے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے پاس ایک ایسا کتب خانہ تھا کہ اتنی زیادہ تعداد میں کتابیں اس کے کتب خانہ میں موجود تھیں کہ میں اس کا کتب خانہ دیکھنے گیا تو اس نے کتابوں کا ایک صندوق نکالا جن میں چار من کتابیں مختلف اشیاء پر لکھی ہوئی تھیں۔ کچھ جلد پر، کچھ مصری کاغذ پر۔ کچھ ہرن کی جلد پر کچھ تہامی اور خراسانی اوراق پر ان میں سے بعض عرب کے تعلیقات تھے۔ بعض قصائد مفردہ کچھ نحوی مسائل اور کچھ تاریخ وغیرہ۔ غالباً یہ چین کا کاغذ تھا۔''

طبقات ابن سعد میں کئی ایک شواہد موجود ہیں کہ کئی ایک لوگ لکھنا جانتے تھے۔ ابو عیس بن حیر جس کا نام عبد الرحمن ہے کے بارے میں ہے۔

1. يكتب بالعربية قبل الإسلام وكانت الكتابة فى العرب قليلاً (2)

''وہ قبل از اسلام زمانے میں لکھا کرتے تھے جبکہ عرب میں ابھی لکھنے کا رواج عام نہ تھا۔''

2. وكان أبى يكتب فى الجاهلية قبل الإسلام وكانت فى العرب قليلاً (3)

''حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ (22ھ) دور جاہلیت میں لکھا کرتے تھے جبکہ عرب میں لکھنے کا رواج عام نہ تھا۔''

---

(1) ابن ندیم، فہرست: 06-61

(2) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: جلد 2، ص: 24

(3) ایضاً: جلد 2، ص: 59

3. سعد ابن الربیع یکتب فی الجاھلیۃ وکانت الکتابۃ قلیلاً [1]
سعد ابن الربیع دور جاہلیت میں لکھنا جانتے تھے جبکہ کتابت بہت کم ہوتی تھی۔

4. شھر بن سعد یکتب فی الجاھلیۃ وکان الکتابۃ قلیلاً فی العرب [2]
"شہر بن سعد جاہلیت کے دور میں لکھا کرتے تھے اور عرب میں لکھنے کا رواج عام نہ تھا۔"

5. عبداللہ بن زید یکتب بالعربیۃ قبل الاسلام [3]
"عبداللہ بن زید قبل از اسلام دور میں لکھا کرتے تھے۔"

6. اوس بن خولی یکتب بالعربیۃ [4]
"اوس بن خولی عربی میں لکھا کرتے تھے۔"

7. المنذر بن عمرو یکتب بالعربیۃ [5]
"منذر بن عمرو عربی میں لکھا کرتے تھے۔"

8. اسید بن خضیر یکتب بالعربیۃ [6]
"اسید بن خضیر عربی میں لکھا کرتے تھے۔"

9. سعد بن عبادۃ کان فی الجاھلیۃ یکتب بالعربیۃ [7]
"سعد بن عبادۃ دور جاہلیت میں عربی میں لکھا کرتے تھے۔"

10. رافع بن مالك من الکملۃ وکان الکامل فی الجاھلیۃ الذی یکتب ویحسن لعوم والرمی وکان رافع کذالك وکانت الکتابۃ فی القوم قلیلاً [8]

اس طرح اگر ہم ان لوگوں کا شمار کرنے لگیں تو ان حضرات کے علاوہ سینکڑوں ایسے لوگ موجود

---

(1) ایضاً: جلد2، ص: 77

(2) ایضاً: جلد 2 ، ص: 83

(3) ایضاً: جلد 2 ، ص: 87

(4) ایضاً: جلد2 ، ص: 28

(5) ایضاً: جلد 2 ، ص: 100

(6) ایضاً: ج2، ص: 631

(7) ایضاً: جلد2 ، ص: 148

(8) ایضاً: جلد ،2 ص: 148

تھے جنہیں پڑھنے اور خصوصاً لکھنے میں مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ خلفائے اربعہ کے اسمائے گرامی بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں بڑے شوق سے لکھنا شروع کر دیا۔ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ نے تعلیم و کتابت کا باضابطہ بندوبست فرمایا۔ عبداللہ بن سعید بن العاصؓ کو جن کا خط اچھا تھا انہیں اس کام پر لگایا گیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ غزوہ بدر کے قیدیوں کی رہائی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ قیدیوں میں سے جس جس کو لکھنا آتا ہو وہ مسلمانوں میں سے دس دس افراد کو لکھنا سکھائیں۔ غزوہ بدر سے دو برس قبل ہی حضور ﷺ مکہ سے تشریف لائے تھے۔ جب ایک لڑائی میں حصہ لینے والوں میں اس قدر افراد موجود تھے کہ وہ دوسروں کو لکھنا سکھا سکتے تھے، تو یہ بات اس کی طرف اشارہ ہے کہ مکہ سے حضور ﷺ کی ہجرت تک کافی لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ دوسری جانب ان قیدیوں کے پڑھانے کے نتیجے میں پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد خاصی ہو گئی تھی۔

اس سلسلے میں تفصیلات اسلام کا نظام تعلیم و تربیت میں ڈاکٹر احمد شلبی وغیرہ نے پیش کی ہیں۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کی ترغیب و حکم سے عورتوں میں بھی ایک دوسرے کو پڑھانے کا اہتمام و رجحان موجود تھا۔ ابو داود شریف میں روایت ہے۔

''عن الشفاء بنت عبد الله قالت دخل علی البنی ﷺ وأنا عند حفصة فقال لی إلا تعلمین هذه حصذه رقیة لنملة کما علمتها الکتابة''[2]

''شفا بنت عبداللہ کہتی ہیں نبی ﷺ تشریف لائے اور میرے ساتھ حفصہؓ تھیں حضور ﷺ نے مجھے فرمایا کہ ان کو یہ چیونٹیوں کیلئے دم کیوں نہیں سکھاتیں جیسے ان کو لکھنا سکھایا۔''

ان لوگوں کے علاوہ جنھیں حضور ﷺ نے تعلیم دلائی اور کتابت سکھلائی، بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو مسلمان ہونے سے پہلے ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ابن عبدالبر اندلسی (463ھ) نے الاستیعاب میں ایسے چوبیس حضرات کے نام گنوائے ہیں جن سے حضور ﷺ لکھنے پڑھنے کا کام لیا کرتے تھے۔ ان حضرات میں مندرجہ ذیل لوگ شامل ہیں:

حضرت ابیؓ ابن کعب (22ھ)، زید ابن ثابتؓ، عبداللہ سعدؓ، ابو بکر صدیقؓ (13ھ)، عمر فاروقؓ، عثمانؓ (35ھ)، علی، زبیر بن العوام، خالد، آبان سعید، حنظلہ، علاء، خالد ابن ولید، عبداللہ بن رواحہ، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن عبداللہ ابن ابی مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن عاص، معاویہ بن

---

(1) احمد شلبی، اسلام کا نظام تعلیمو ترتیب اردو ترجمہ، ص: 23 (اس سلسلے میں صفحات 19 تا 24 کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے)

(2) ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی: حدیث نمبر 3887

سفیان، جہم بن الصلت، معیقیب بن فاطمہ، شرجیل بن حسنہ، عبداللہ بن ارقم زہری رضی اللہ عنہم، یہ اسمائے گرامی ان لوگوں کے ہیں جن سے لکھنے پڑھنے کا کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیا کرتے تھے۔ یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے علاوہ اور کوئی پڑھا لکھا شخص تھا ہی نہیں۔ (1)

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرب میں لکھنے کا عام رواج نہ ہونے کے باوجود لوگوں کی معقول اور قابل ذکر تعداد لکھنا جانتی تھی۔ مؤرخین کے اس سلسلے میں اختلافات ان لوگوں کی تعداد کے بہت زیادہ ہونے یا محض زیادہ ہونے کی حد تک ہیں جو اس بات کی نفی نہیں کرتے کہ عربوں کی بہت بڑی تعداد لکھنا جانتی تھی۔

گذشتہ صفحات میں تاریخِ تدوین قرآن مجید کا تفصیلی جائزہ اس انداز سے پیش کر دیا ہے جس سے مستشرقین کے بہت سے اعتراضات کا جواب خود بخود ہی مل جاتا ہے۔

کتابتِ قرآن مجید کا مسئلہ ہو یا حفظِ قرآن کا، ہر دو صورتوں میں اس بات کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن مجید کی حفاظت میں کوئی سقم رہ گیا ہو گا جس کی بناء پر قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو گیا ہو گا۔ حفظ اور کتابت دونوں ساتھ ساتھ موجود تھے کسی ایک پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ ان تمام تفصیلات کے باوجود بھی مستشرقین کا اپنے موقف پر جمے رہنے پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی صحت پر اعتراض کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی کتابوں کے حوالے سے اس اہتمام سے بالکل نامانوس ہیں جو قرآن کی حفاظت کیلئے سامنے آئے۔

مارگولیتھ کے اشکالات کا تجزیہ

مارگولیتھ نے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید کے غیر مکتوب ہونے پر ایک دلیل یہ دی ہے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا مضمون اور الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد نہیں رہتا تھا کہ انہوں نے اس سے قبل قرآن مجید میں کیا شامل کیا تھا۔ (2) ان آیات میں سے ایک مثال سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۴۰ اور سورۃ الانعام آیت نمبر ۶۸ ہے۔ جن کا مضمون اور الفاظ ملتے جلتے ہیں۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۴۰ کا ترجمہ یوں ہے:

"اور اللہ نے تم مومنوں پر اپنی کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم کہیں سنو کہ اللہ کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے تو جب تک وہ لوگ اور باتیں نہ کرنے لگیں ان کے

---

(1) ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: جلد 1، ص: 26

(2) Margoliouth: "The Quran" in Encyclopaedia of Religion and Ethics. p. x/542

پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے"۔ دوسری آیت سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۶۸ کا ترجمہ:

"اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ باتیں کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں اور اگر یہ بات شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو"۔

پہلی آیت میں (بقول مارگولیتھ) دوسری آیت کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ مارگولیتھ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قرآن کی آیات لکھی ہوئی نہ تھیں۔ اگر قرآن لکھا ہوا ہوتا تو پہلی آیت میں بعینہ وہی الفاظ ذکر کئے جاتے ہیں جو دوسری میں ہیں۔ الفاظ کے اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کے نزول کے وقت دوسری آیت کے الفاظ محفوظ نہیں رہے تھے۔ اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بالکل واضح بات ہے کہ اگر سورۃ نساء کے نزول کے وقت سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت کے الفاظ نہ رہے تھے تو پھر بعد میں وہ قرآن میں کس طرح شامل ہوئے۔ اگر سورۃ الانعام کے اصل الفاظ محفوظ نہ ہوتے تو اصول کا تقاضا تو یہ تھا کہ بعد میں لکھنے والے سورۃ الانعام میں بھی بعینہ وہ الفاظ لکھتے جو نساء میں ہیں ان دونوں آیات کا لفظی اختلاف تو در حقیقت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں آیات کے الفاظ ہمیشہ سے پوری طرح محفوظ اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کے قیاس و گمان کو کوئی دخل نہیں رہا۔ اگر قرآن کی کتابت قیاس اور اندازے سے ہوئی ہوتی تو ان آیات کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے محاورات میں جب کبھی سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ سابقہ گفتگو کے الفاظ بعینہ دہرائے جاتے ہیں جسے انگریزی میں (Direct Narration) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات وھی الفاظ دہرائے نہیں جاتے بلکہ سابقہ گفتگو کے بنیادی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ جسے Indirect Narration کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی صورت بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ یعنی ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کسی سابقہ گفتگو کو بعینہ نقل کیا جائے۔ اس کی بجائے دوسری صورت ہی اختیار کی جاتی ہے۔ سورۃ النساء میں پہلی دوسری صورت اختیار کی گئی ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت اپنے جملوں کی ساخت کے اعتبار سے جداگانہ اسلوب رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ایک سورت کے جملوں کے درمیان کسی دوسری سورت کا جملہ بعینہ جوڑ دیا جائے تو آیات کے تسلسل میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اور اس سے فقروں کی روانی باقی نہیں رہ جاتی جس کی اثر انگیزی سب کے نزدیک مسلم ہے۔ لہٰذا اگر ادبی ذوق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سورۃ النساء کی مذکورہ آیت میں سورۃ الانعام کے الفاظ بعینہ نقل کر دیئے جائیں تو عبارت کا زور اور تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ اس کے علاوہ تفسیر ابنِ کثیر میں بیان کیا گیا ہے کہ سورۃ الانعام جس کی مذکورہ آیت کے بارے میں مارگولیتھ کا دعوی ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہ

تھی۔ پوری کی پوری ایک مرتبہ نازل ہوئی اور اس میں یہ آیت بھی موجود ہے:

﴿وھٰذا کتٰب انزلنہ مبٰرک مصدق الذی بین یدیہ﴾[1]

"اور یہ کتاب (ویسی ہی ہے) جسے ہم نے نازل کیا ہے بابرکت جو اپنے سے پہلی کتابوں کو تصدیق کرتی ہے۔"

اس آیت کریمہ میں قرآن کو کتاب کہا گیا ہے۔ اگر سورۃ الانعام کے نزول کے وقت تک قرآن کریم کو لکھنے کا معمول نہ تھا تو اسے کتاب کہنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مارگولیتھ کا یہ اعتراض کسی بھی طرح درست ثابت نہیں ہوتا۔[2]

مارگولیتھ کا یہ اعتراض اس بات کی منہ بولتی مثال ہے کہ جس شخص کو عربی زبان اور خصوصاً قرآن حکیم کی زبان و اسلوب کا ادراک نہ ہو وہ قرآن کے ظاہری الفاظ کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ تکرار مضامین قرآن کے اعجاز کا ایک اہم پہلو ہے۔ شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ عام گفتگو یا تحریر میں اگر تکرار ہو تو سامع یا قاری کو بوجھل لگتا ہے۔ لیکن قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کا تکرار انسانی ذہن کو لذت دیتا ہے۔ انسان اس تکرار سے حظ محسوس کرتا ہے۔ تکرار کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی مضمون یا حکم کی اہمیت اجاگر کی جائے۔ بار بار وہی بات کی جاتی ہے جس کی اہمیت بہت زیادہ ہو۔ وہ سننے والے کو بار بار یاد دلائی جاتی ہے۔ تکرار کا ایک مقصد قرآن کی فصاحت و بلاغت کی عظیم شان کو ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ایک ہی مضمون کس طرح مختلف اسالیب، الفاظ اور تراکیب سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایک ہی مضمون کو متعدد اسالیب سے بیان کر سکنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس بارے میں تو قرآن نے خود کہا ہے کہ وکذالك نصرف الایت (ہم اسی طرح آیات کو بدل بدل کر مختلف اسالیب سے بیان کرتے ہیں۔) مارگولیتھ نے صرف ایک واقعہ کے تکرار کا ذکر کیا ہے حالانکہ قرآن مجید میں تو اس طرح کا تکرار قدم قدم پر موجود ہے۔ تخلیق آدم، قصہ ابلیس، واقعہ موسیٰ و فرعون، حضرت ابراہیم کی زندگی، انبیائے کرام کے واقعات، عقائد، جہاد ر مضمون بار بار بیان ہوا ہے۔

Encyclopaedia Britannica کے مقالہ نگار نے قرآن پر اعتراض کرتے ہوئے کچھ تاریخی شخصیات اور واقعات پیش کئے ہیں کہ قرآن مجید نے یہ واقعات غلط طور پر پیش کئے ہیں۔ مستشرقین کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے آدمی متعین کر رکھے تھے جو ادھر ادھر پھر کر واقعات اکٹھے کرتے۔ چونکہ محمد ﷺ زبانی

---

(1) الأنعام: ۹۳

(2) عثمانی: علوم القرآن، ص ۲۱۸۔۲۱۶

کچھ سنتے، اس لئے انہیں ان کے بیان کرنے یا سمجھنے میں غلطی لگ گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی یہ سب واقعات و شخصیات کو غلط طور پر حقیقت کے برعکس پیش کیا۔ ان واقعات و شخصیات میں ایک حضرت مریمؑ ہیں اور قرآن نے مغالطے کی بنیاد پر مریم کا غلط طور پر تعین کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کو بھی بنت عمران قرار دیا ہے۔[1]

تنقیدی جائزہ

اگر مقالہ نگار کسی یقینی دلیل کے ساتھ یہ بھی ثابت کر دیتا کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران نہ تھا تب تو یہ اعتراض کسی طور پر قابلِ اعتبار ہو سکتا تھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اگر ہم انہی سے پوچھیں کہ پھر حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ تو اس کے جواب میں ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کے والد کا نام بائبل میں بھی مذکور نہیں۔ اسی مقالہ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ

☆ حضرت مریمؑ کے والدین کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کی کسی تاریخی دستاویز میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔[2]

☆ ایک طرف یہ لاعلمی اور دوسری جانب یہ دعویٰ کہ قرآن حکیم میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام مغالطے پر مبنی ہے۔

☆ کیا یہ بات درست ہے کہ اگر ایک مرتبہ کسی کا نام عمران رکھا جا چکا ہو تو اس کے بعد دنیا میں کسی اور شخص کا نام عمران نہیں رکھا جا سکتا۔

☆ قرآن مجید نے تو بہت سے حقائق آشکار کیے ہیں۔ بات صرف حضرت عمران تک محدود نہیں۔ حضرت مریمؑ کی پیدائش، ان کی تربیت، بچپن اور دیگر بہت سے حالات کے بارے میں خود وہ ماخذ بھی خاموش ہیں۔ جنہیں عیسائی مستند سمجھتے ہیں۔ چاروں اناجیل میں بھی ان کا ذکر نہیں۔ قرآن مجید سب سے پہلے انہیں منظرِ عام پر لایا۔ ڈکشنری آف دی بائبل میں مذکور ہے:

"شروع شروع میں عیسائی دنیا ان انکشافات پر اعتراض کرتی رہی مگر اب خود عیسائیت کی ایسی کتابیں

(1) Noldeke: Theodor, Sketches from Eastern History Cambridge Scholars Publishing, 2009. p. 483/8, Encyclopaedia of Islam, V II

(2) McKenzie, John, L. Dictionary of the Bible, Geoffrey Chapman, London, 1985, p. 280

دریافت ہو رہی ہیں جن میں قرآن مجید کے بیان کردہ یہی حقائق بیان کئے گئے ہیں۔"(1)

لہٰذا جب عیسائی مآخذ میں حضرت مریمؑ کے والد کے بارے میں کچھ بھی موجود نہیں ہے تو عیسائیوں کو کسی اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔

بائبل کی ایک اور ڈکشنری جو John L.Mckenzie (1910-1991) نے مرتب کی ہے اس میں صراحت کے ساتھ وہ تمام ابہامات بیان ہوئے ہیں جو مریمؑ کی شخصیت کے تعیّن کے سلسلے میں اہلِ کتاب کے ہاں موجود ہیں۔

مصنف لکھتا ہے:

A by-product of this reticnce is our almost total lack of genuine information concerning the life and person of Mary.[2]

J.D.Douglas کی مرتب کردہ ڈکشنری آف دی بائبل میں اس سلسلے میں لکھا ہے

There have been various attempts to resolve these differences.[3]

یعنی اناجیل کے ان اختلافات کو حل کرنے کی بہت سی کوششیں ہو چکی ہیں مریمؑ کے بارے میں اناجیل کے اختلافات کے بارے میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار Will Smith کی ڈکشنری آف دی بائبل میں کیا گیا ہے۔[4] لہٰذا جب خود مستشرقین ہی اپنے ساتھی مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تردید کرتے اور حقائق کی وضاحت کرتے ہیں تو حقیقت کی وضاحت کیلئے ہمارے کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

قرآن مجید میں اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے Encyclopaedia Britannica کے مقالہ نگار

---

(1) Ibid

(2) McKenzie, John, L.Dictionary of the Bible, Geoffrey Chapman, London, 1985,p. 552

(3) Douglas, J.D.The illustrated Bible Dictionary, Interval City Press, Hodder, 1980,p. 959/2

(4) Smith, William, The New Smiths Bible Dictionary, Doubleday, New York, 1966, p. 230

نے فرعون کے وزیر ہامان کا بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن میں یہ غلطی ہے کہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام بائبل کے عہد نامہ قدیم میں نہیں ملتا۔ مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان، شاہ اسویرس کا وزیر تھا جس کا ذکر بائبل میں ملتا ہے مقالہ نگار کہتا ہے کہ چونکہ محمد ﷺ نے یہ واقعات زبانی سیکھے تھے لہٰذا مغالطے سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا۔ (1)

مقالہ نگار کے اس نقطہ نگاہ کا تنقیدی جائزہ مولانا تقی عثمانی نے لیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

"درحقیقت یہ بات بالکل بے سروپا ہے۔ اور اسی مفروضے پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک نام کے دو آدمی نہیں ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسویرس کے جس نام نہاد وزیر کا ذکر مقالہ نگار نے کیا ہے اس کا قصہ صرف بائبل کی ایک مشتبہ کتاب (Apocryphal Book) آستر میں مذکور ہے اس کتاب کو پروٹسٹنٹ فرقہ معتبر تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ مروجہ پروٹسٹنٹ اناجیل میں یہ کتاب موجود نہیں ہے۔ البتہ کیتھولک فرقہ میں اسے مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ہامان یا آمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ شاہ اسویرس کا وزیر نہیں بلکہ صدر دربار تھا (آستر ۱:۳)۔" (2)

اس کا جو قصہ اس کتاب میں مذکور ہے اسے ہامان کے قرآنی واقعے سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ قرآن نے بیان کیا ہے کہ فرعون نے ہامان کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کیلئے ایک بلند محل تیار کروائے تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسیٰ کے خدا کو جھانک سکے۔ قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہامان آخر وقت فرعون کا منہ چڑھا وزیر رہا۔ اور بالآخر اسی کے ساتھ غرق ہوا۔ اس کے برعکس کتاب آستر میں ہامان کی طرف اس نوعیت کا کوئی قصہ منسوب نہیں کیا گیا۔ (3)

کتاب آستر کا ہامان۔ بخت نصر کے واقعے کے بعد کا ہے۔ اور اس کا قصہ صرف اس قدر ہے کہ صرف ایک اتفاقی واقعہ کی بناء پر صرف مختصر عرصے کیلئے بادشاہ اسویرس کا تقرب اسے حاصل ہوا۔ لیکن اسی دوران وہ یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کروا دیتا ہے۔ جس کی بناء پر بادشاہ کی ملکہ آستر اس کی دشمن ہو جاتی ہے اور بادشاہ اسے سولی پر لٹکا کر اس کی جگہ ایک یہودی کو نامزد کرتا ہے۔

---

(1) Noldeke: Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit.p.49

(2) عثمانی، محمد تقی: علوم القرآن، ص ۲۸۹، ۲۹۰

(3) ایضاً، ص ۲۹۰

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور حضرت ہشام بن حکیم کے واقعہ کی حقیقت

مستشرقین نے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں قرآن مجید کے کسی متفقہ متن کے مفقود ہونے پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس وقت جبکہ قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صحابہؓ میں موجود تھی، لوگ قرآن حکیم کی تلاوت میں اختلاف کرتے تھے۔ اس کی مثال انہوں نے بخاری اور مسلم شریف میں موجود اس واقعہ سے دی ہے کہ ایک موقع پر نماز میں حضرت ہشام بن حکیم نے ایک قرأت کے مطابق تلاوت کی۔ ان کی اقتداء میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) انہیں پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے ان آیات کی تلاوت سنی اور دونوں کو کہہ دیا کہ تم درست پڑھتے رہو۔ اس واقعہ سے مستشرقین مندرجہ ذیل نتائج حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید کا متفقہ متن موجود نہ تھا۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض مصلحت کی خاطر ان دونوں حضرات کی قراءت کو درست قرار دے دیا۔

۳۔ یہ اختلاف، اختلاف قراءت یا سبعہ احرف سے الگ کوئی اور اختلاف تھا۔ کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور ہشام بن حکیمؓ دونوں ایک ہی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ (1)

کیا عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید کا متفقہ نسخہ موجود تھا یا نہیں اس پر گزشتہ ابواب میں تفصیلی بحث پیش کر دی گئی ہے۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو مصلحت کی بناء پر درست قرار دیا گیا، اس قسم کی بات وہی شخص کر سکتا ہے جو منصبِ نبوت کی اہمیت سے واقف نہ ہو یہ بات منصب نبوی کے منافی ہے کہ قرآن کے متن جیسے حساس مسئلہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مصلحت کا مظاہرہ فرماتے۔ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے نہ کہ مکہ مکرمہ کا۔ ظاہر ہے مدینہ میں ایسی صورتِ حال نہیں تھی کہ کسی قسم کی مصلحت اختیار کی جاتی۔ اب مسلمان اُس دور سے بالکل مختلف تھے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اسلام لائے تھے۔ متعدد مواقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کی ہر بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ تسلیم نہیں کیا بدر کے قیدیوں کے انجام کے واقعہ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کی رائے کے مطابق فیصلہ نہیں دیا تھا۔ اگر ان کے خوف اور دبدبے کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رائے سے کبھی بھی اختلاف نہ کرتے۔ جہاں تک تیسرے اعتراض کا معاملہ ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل وضاحت اس مسئلے کی پیچیدگی کو حل کر دیتی ہے۔

---

(1) برکت اللہ، پادری، صحت کتب مقدسہ، عریبک سوسائٹی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۶

۱۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جب وحی کے ذریعے سات حروف میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دی گئی تو یہ اجازت خاص خاص اقوام کے ساتھ مخصوص نہیں رہ سکتی تھی۔ صرف حضور ﷺ ہی صحابہ کرامؓ کو قرآن کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ صحابہ کرامؓ بھی ایک دوسرے کو قرآن پڑھاتے تھے۔ اس طرح ایک قبیلہ یا قوم کی خصوصیات دوسری قوم تک جاسکتی تھیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک قبیلہ ایک لفظ کو ایک خاص انداز سے جو دوسرے قبیلہ میں مروج ہے ادا نہ کرسکے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری قوم بھی پہلی قوم کے انداز کے مطابق ادا نہیں کرسکتی۔ مثلاً بنو ہذیل اور بنو ثقیف "حتّٰی" کی بجائے "عتّٰی" پڑھتے تھے۔ "حتّٰی" قریش کے محاورے میں تھا جب کہ دوسرے اسے عتّٰی کہتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا کہ قریش "عتّٰی" نہیں بول سکتے تھے۔ اگرچہ وہ عام طور پر "حتّٰی" ہی بولتے تھے اور یہی اصل لفظ تھا لیکن اگر وہ چاہتے تو عتّٰی بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابنِ مسعودؓ (32ھ) "حتّٰی حین" کی بجائے "عتّٰی حین" پڑھتے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے انہیں اس سے منع بھی فرمایا تھا کہ بنو ہذیل کے محاورے میں لوگوں کو قرآن نہ پڑھاؤ۔ اصل بات یہ تھی کہ قریش دوسری اقوام کے محاورات کے مطابق الفاظ ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ مکہ مکرمہ میں لوگ ہر سال حج اور میلوں وغیرہ پر جمع ہوا کرتے تھے اور قریش کو چونکہ ہر ایک قوم اور قبیلہ سے لین دین اور تجارت کا واسطہ پڑتا تھا اور علاوہ ازیں علمی مناظرے اور مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے اس لئے قریش کیلئے ہر ایک قوم کے محاورے سے واقفیت پیدا کرنی لازمی ہو گئی تھی۔ جس وقت ہشام مسلمان ہوئے اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ غالباً حضرت ہشام نے سورۃ الفرقان کی یہ آیات حضور ﷺ سے اس وقت سنی ہوں گی جب وہ کسی اور قبیلہ کو قرآن پڑھا رہے ہوں گے اور اسی انداز سے انہوں نے یاد کر لیا۔ حضور ﷺ کی طرف سے بحکم خدا یہ اجازت تھی "فاقرؤا ماتیسر منہ" یعنی جس طرح آسان ہو اسی طرح پڑھ لو۔ حضرت ہشام نے قریش کے محاورے کے مطابق اسے ادا کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی حضور ﷺ نے انہیں اس طرح پڑھنے سے منع فرمایا جس طرح وہ پڑھ رہے تھے۔ (یاد رہے کہ سبعہ احرف کی اجازت فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو ملی تھی جبکہ اسلام دور نزدیک تیزی سے پھیل رہا تھا اور حضرت ہشام بن حکیم فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے) یہ تمام تفصیلات اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ ہشام اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) میں ایک ہی قبیلے سے متعلق ہونے کے باوجود قرأتِ قرآن میں کیوں اختلاف ہوا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن حکیم اس وقت پڑھا تھا جب قرآن حکیم ایک ہی حرف پر تھا اور ہشامؓ نے ایسے وقت میں سیکھا تھا جب

دوسری اقوام کے اسلام میں کثرت سے داخل ہونے کیوجہ سے ان لوگوں کے ان کے اپنے محاورے میں قرآن پڑھانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات مکمل طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور ہشام بن حکیمؓ کے اس واقعے سے کسی طرح بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید کے متن میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث "اختلافِ قرأت" اور "سبعہ احرف" کے باب میں کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ جب قرآن حکیم "سات حروف" میں نازل ہوا تھا اور تمام حروف منزل من اللہ ہونے کی وجہ سے جائز تھے تو ان میں سے کسی ایک حرف میں پڑھنا اصل وحی کے الفاظ کے مطابق ہی پڑھنا تھا۔

چوتھا باب

عہد صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ میں حفاظت قرآن مجید اور مستشرقین

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تجزیہ

عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن

عہد صدیقی میں جمع قرآن۔ مقصد اور نوعیت

کیا عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں تدوینِ قرآن کا محرک یمامہ کے شہداء تھے؟

مصحف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۱۳ھ) کی تیاری کا حقیقی سبب

کیا قرآن مجید سب سے پہلے سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا؟

مستشرقین کے نقطہ نگاہ ''قرآن کا متن متنازع ہے'' کا تحقیقی جائزہ

***

عہدِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں حفاظتِ قرآن مجید اور مستشرقین

مستشرقین نے قرآن مجید کی محفوظیت پر جو اعتراضات کئے ہیں اس کیلئے انہوں نے تدوینِ قرآن کی تاریخ کو مسخ کر کے مختلف دلائل حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ایک انداز یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ عہدِ نبویؐ میں ہی قرآن مجید تحریری صورت میں موجود نہیں تھا۔ عہدِ ابو بکر صدیقؓ (13ھ) میں بھی اس سلسلے میں کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی بھی ہے تو اس وقت جو نسخہ معرض وجود میں آیا اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی عہدِ صدیق اکبرؓ میں معرض وجود میں آنے والے نسخے کے بارے میں مستشرقین کا موقف آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا:

1. عہدِ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) میں جو نسخہ تیار کیا گیا، وہ پورے قرآن پر مشتمل نہ تھا کیونکہ جنگ یمامہ کے شہداء اس نسخے کی تیاری کا محرک بنے۔ اور روایات بتلاتی ہیں کہ اس جنگ میں بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہو گئے۔ لہٰذا ان شہداء کے ساتھ ہی قرآن کے وہ حصے بھی ضائع ہو گئے۔ جو ان کے سینوں میں محفوظ تھے۔ نولڈیکے (1930ء)[1]، میور (1905ء)[2]، آرتھر جیفری (1938ء)[3]، راڈویل (1900ء)[4]، جان برٹن (1929ء)[5]، بھُل (1932ء)[6]، سٹین لے لین پول (1931ء)[7] اور

---

(1) Noldeke: Sketches from Eastern History, Cambridge Scholars Publishing, 2009, P.45

(2) Muir, William: The Life of Mohomet,Smith elder and co, cornhill, London, 1861,London, P.vii

(3) Jeffery, Arthur: Material for the History of the Text of the Quran, Leiden E.J. Brill,1937, P.6-9

(4) Rodwell, J.M.: The Koran, Preface,P.(i)

(5) Burton, John, collection of the Quran,P.116

(6) BuhL,Encyclopaedia of islam,Vol.III, P. 1067

(7) Lane, E.W., Selections form the Quran with an Interwoven Commentary, P.23

نکلسن (1945ء) کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے۔[1]

آرتھر جیفری بیان کرتا ہے:

Tradition says that it was the slaughter of a great number of these at the battle of Yamama in 12.A.H. that caused intrest to be aroused in getting all the relative material set down in permanent written form, lest with the passing away of the qurra much of it should be lost.[2]

2. مستشرقین کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ عہدِ صدیق اکبرؓ میں کسی باقاعدہ مرتب نسخے کی تیاری عمل میں نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نسخے کو الصحف کہا گیا گویا کہ یہ غیر مرتب کاغذات تھے۔[3]

ہو سکتا ہے کہ "محمد ﷺ کا پورے کا پورا مواد زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو ملا ہو یا نہ ملا ہو۔"[4]

لین پول کہتا ہے کہ کہ محمد ﷺ کے دور کے بعد قرآن لکھا گیا۔ اس وقت یہ منتشر اوراق میں تھا۔ اس کے بعد بھی اس سلسلے میں کوئی خاص طریقہ اختیار نہ کیا گیا۔[5]

3. مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے کسی سرکاری نسخے کی تیاری کا اہتمام نہیں کروایا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس نسخے کا سرکاری طور پر حفاظت کا اہتمام ہونا چاہیے تھا جبکہ ہم دیکھتے ہیں یہ نسخہ حضرت حفصہؓ کے پاس چلا گیا۔[6]

Weil لکھتا ہے کہ اگر یہ نسخہ سرکاری تھا تو اس کی حفاظت مطلوب تھی۔ حفاظت کا یہ کام دوسرے

---

(1) Nicholoson, R.A., Literary History of the Arabs, Charles Scribner's Sons, New York, 1907,P.164

(2) Jeffery, Arthur:Material for the History of the Text of the Quran, 6 (Preface)

(3) Noldeke: Sketches from Eastern History, P.45

(4) Bell, Richard.:The Origin of Islam in its Christian Environment, Routledge, 2012 P.39

(5) Lane, E.W.: Selections from the Quran with an Interwoven Commentary, P.23

(6) Noldeke: Sketches from Eastern History, P.45

Bell, Richard.:The Origin of Islam in its Christian Environment, P.102

ذرائع سے بہتر طور پر لیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ معیاری نسخہ تھا تو لوگوں نے آئندہ نقلیں حاصل کرنی تھیں۔ اس اعتبار سے بھی اسے حضرت حفصہؓ کے پاس نہیں جانا چاہیئے تھا کیونکہ ان تک عوام کی رسائی ممکن نہ تھی۔[1]

جارج سیل (George Sale) کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے۔[2]

راڈویل (Rodwell)[3] رچرڈ بل (Richard bell)[4] وغیرہ نے بھی اسی خیال کی پیروی کی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی نسخہ تیار کروایا گیا ہوتا تو اس کی تیاری کے بعد دیگر نسخوں کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر کئی مصاحف بھی زیرِ تلاوت رہے۔[5] اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "مصحفِ صدیقؓ بھی دیگر مصاحف کی طرح کا ایک ذاتی قسم کا نسخہ ہوگا۔"[6]

آرتھر جیفری کہتا ہے یہ بات کہ "حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے سرکاری طور پر باقاعدہ قرآن جمع کروایا ہو، شک سے خالی نہیں ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خالص ذاتی کاروائی تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ دیگر لوگوں سالمؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) وغیرہ نے بھی قرآن جمع کر رکھا تھا۔ اس نے دیگر مصاحف کی تفاصیل بھی بیان کی ہیں۔[7] عہدِ صدیقؓ میں سرکاری نسخے کی عدم موجودگی پر ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ اگر اس وقت ایسا کوئی نسخہ موجود ہوتا تو حضرت عثمانؓ (35ھ) کو نسخہ تیار کروانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔[8]

آرتھر جیفری کہتا ہے کہ عہدِ صدیقؓ کے بعد بھی بہت سے مصاحف مروّج رہے۔ لیکن یہ تمام

---

(1) Bell, Richard.: The Origin of Islam in its Christian Environment, P.38-40

(2) Sale, George, The Koran, Commonly called Al-Quran, with a Preliminary Discourse, P.51

(3) Rodwell, Preface, P.(ii)

(4) Bell, Richard.: The Origin of Islam in its Christian Environment, P.39-40

(5) IBID., P.39

Jeffery, Arthur, Material for the History of the Text of the Quran, P.7,8

(6) IBID,7

(7) IBID

(8) IBID, P.8

مصاحف نامکمل ہی تھے۔ البتہ ان کے لکھنے والوں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اپنے مصحف میں زیادہ سے زیادہ وحی کے حصے شامل کریں۔[1]

پھر ان مصاحف کو مزید غلط رنگ دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس کے بعد مملکت کو وسعت حاصل ہوئی۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی نسخہ کسی نہ کسی علاقے میں رائج ہوا۔ جس علاقے میں جس نسخے کو مستند سمجھ لیا گیا وہاں وہی نسخہ نافذ ہو گیا۔[2] جان برٹن (John Burton (1929)[3] اور بہل (Buhl)[4] تدوینِ قرآن کے بارے میں شکوک پیدا کرنے کیلئے بظاہر متعارض روایات کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ ہر جگہ پر غیر یقینی باتیں ہی سامنے آتی ہیں۔ تشکیک پیدا کرتے ہوئے جارج سیل حقائق کو مسخ کر کے یہ نتائج پیش کرتا ہے کہ ایک تو وہ اشیاء جن پر قرآن لکھا جاتا تھا، ناقابلِ اعتبار اور ضائع ہو جانے والی تھیں، دوسرا حافظے کی مدد سے بھی تدوینِ قرآن کا کام ہوا۔ لہٰذا یہ سارا کام ناقابلِ اعتبار ہے۔[5]

S.E.Frost (1899-1978) تشکیک کا حربہ اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ (حضرت) محمد ﷺ کی وفات کے ایک برس بعد حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات اکٹھی کی گئیں لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات اصل میں کیا تھیں؟[6] American Encyclopaedia کا مقالہ نگار مصحفِ صدیق رضی اللہ عنہ کو غیر یقینی قرار دینے کیلئے تشکیک کا ہتھیار یوں استعمال کرتا ہے کہ (حضرت) محمد ﷺ کی وفات کے بعد قرآن جمع کیا گیا اس سے قبل یہ ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔[7] N.J. Dawood نے بالکل یہی انداز اپنایا ہے وہ کہتا ہے کہ تکمیلِ قرآن کا کام عہدِ فاروقؓ میں ہوا اور مستند نسخہ عہدِ عثمانؓ میں تیار ہوا۔[8]

---

(1) IBID, P.6,7

(2) IBID

(3) Encyclopaedia Britannica, P.116

(4) Buhl, Vol. III, P.1067

(5) Sale, George, The Koran, Commonly called Al-Quran, P.51

(6) Frost, S.E., The Sacred Writings of World's Great Religions, Simon Publications, 2001 P.30

(7) The Encyclopedia Americana,P.4141

(8) Dawood, N.J.: The Koran, P.10

راڈویل بھی انہی خطوط پر چلا۔[1]

رچرڈ بل Richard Bell تشکیک کی راہ پر چلتے ہوئے کہتے ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے پاس ایک مصحف تھا۔ لہٰذا اگر ان کے پاس مصحف تھا تو انہیں قرآن لکھوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟[2] گویا اس سے وہ ایک وقت میں دو شکار کرتا ہے اول یہ کہ مصحفِ صدیقؓ کے موجود ہونے میں تشکیک پیدا کی جائے اور دوسرا یہ کہ عہدِ صدیقؓ کے بعد بھی قرآن کا کوئی متفقہ متن تیار نہ ہو سکا۔ جان برٹن کے نظریات تشکیک سے بھرے پڑے ہیں وہ کہتا ہے کہ جو مختلف مصاحف تیار کئے گئے تھے وہ دراصل قرآن حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی۔[3]

وہ مندرجہ ذیل دلائل سے زید ابن ثابتؓ کے نسخے کو نامکمل قرار دیتا ہے:

1. جنگ یمامہ میں حاملینِ قرآن شہید ہو گئے۔
2. زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی دراں حالیکہ قرآن ابھی جمع نہیں ہوا تھا۔
3. زید ابن ثابتؓ نے کہا تھا کہ "مجھے اگر پہاڑ اٹھانے کو کہا جاتا تو یہ میرے لئے آسان ہوتا۔ اس کی نسبت کہ مجھے قرآن جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔"
4. زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جمع قرآن کے دوران سورۃ التوبہ کی آیت ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ﴾ صرف ابو خذیمہؓ سے ملی۔
5. اس مصحف کی بنیاد حافظے پر تھی۔ وہ نولڈیکے کا مقلد ہونے کے باوجود کہتا ہے کہ نولڈیکے کو یہاں غلطی لگی ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ: زید ابن ثابتؓ نے جو قرآن لکھا تھا اس کی بنیاد تحریر پر تھی۔ حافظے پر دارومدار ہونے کی ایک دلیل اس نے یہ دی ہے کہ جو آیت مل نہیں رہی تھی وہ ایک شخص کے حافظے سے ملی۔[4]

جان برٹن کہتا ہے ہمارے سامنے دو سوال ہیں:

6. یہ مصاحف مکمل تھے یا نامکمل۔

---

(1) Rodwell, J.M.: The Koran, Preface, p.xii-xiii

(2) Bell, Richard.: The Origin of Islam in its Christian Environment, P.39-40

(3) Burton, John.: Collection of The Quran, P.116,117,231

Jeffery, Arthur, Material for the History of the Text of the Quran, P.1

(4) IBID, P. 116,117

7. سب سے پہلے قرآن کس نے جمع کیا۔ سالم رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) تھے یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) یا یہ ہستی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ (1)

تشکیک کے لئے وہ کہتا ہے:

"بعض روایات میں ہے قرآن جمع کروانے کی بات ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے ذہن میں آئی۔ اور دوسری روایات بتلاتی ہیں کہ اس قسم کا مشورہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے دیا تھا۔" (2) پروفیسر نکلسن بھی تشکیک پیدا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا وہ بھی کہتا ہے:

"جمع قرآن کی تمام تفصیلات غیر یقینی ہیں۔" (3) مارگولیتھ (D. S. Margoliouth) کا نقطہ نگاہ بھی تشکیک اور کتمانِ حقیقت کا مجموعہ ہے۔ وہ کہتا ہے حفاظتِ قرآن کا اصل مدار حفظ پر ہی تھا۔ سب سے پہلے قرآن، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے جمع کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے کام کی مزاحمت کی گئی کیونکہ ایسا کوئی حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا تھا۔ (4) بالکل یہی موقف میزان الحق میں پادری فنڈر نے اختیار کیا ہے۔

فنڈر اس سلسلے میں مزید لکھتا ہے:

"حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے یہ کام مصلحت کی خاطر کیا۔ انہیں شیعہ لوگ کافر قرار دیتے ہیں۔ مصحف کی تیاری کا کام ہونے کے باوجود متن قرآن کی تعیین کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ (5) جان برٹن، پادری برکت اللہ اور پادری فنڈر اس بات کو خوب اچھالتے ہیں کہ زید ابن ثابتؓ نے کہا کہ مجھے پہاڑ اٹھانے کو کہا جاتا تو یہ آسان ہوتا اس کام کی نسبت کہ مجھے قرآن جمع کرنے کو کہا گیا۔" (6)

ان تمام اعتراضات کا اگر خلاصہ نکالا جائے تو مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

☆ عہدِ صدیق اکبرؓ میں قرآن مجید کا کوئی متفقہ نسخہ معرضِ وجود میں نہ آ سکا۔ حضرت ابو بکر

---

(1) IBID, P.116

(2) IBID

(3) Nicholoson, R.A.: Literary History of the Arabs, P.164

(4) Margoliouth, D.S.: The Early Development of Mohammedanism, Simon Publications LLC, 2003 P.23

(5) فنڈر، میزان الحق، پنجاب ریلیجیس بکس سوسائٹی، لاہور، ۱۸۹۲ء، ص ۳۶-۴۴

(6) Burton, John.: Collection of the Quran, P.116

صدیقؓ (13ھ) کے تیار کردہ نسخے پر بھی تمام لوگوں کا اتفاق نہ تھا کیونکہ اس نسخہ کی تیاری کے بعد بھی بہت سے دیگر نسخے موجود رہے۔

☆ اگر 'مصحفِ صدیقؓ' کی حیثیت سرکاری تھی تو اسے سرکاری تحویل میں ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ یہ نسخہ حضرت حفصہؓ کے پاس رکھا گیا۔

☆ جنگ یمامہ کے حفاظ شہداء کی شہادت کی بناء پر قرآن مجید کا بہت سارا حصہ ضائع ہو گیا۔

☆ مستشرقین، تدوینِ قرآن کی تاریخ اور اس سلسلے میں پائی جانے والی روایات کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔

☆ عہد صدیق اکبرؓ تک قرآن منتشر ہڈیوں، کھجور کے پتوں اور جھلی وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔ یہ منتشر مواد اکٹھا نہ کیا جاسکا۔ کئی چیزیں جو قرآن کا حصہ ہو سکتی تھیں قرآن میں شامل نہ ہو سکیں

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تجزیہ:

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تحقیقی جائزہ پیش کرنے سے قبل یہ بنیادی حقیقت دہرانا ضروری ہے کہ ان کا نقطہ نگاہ تضادات کا شکار ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن جمع کرنے کی پہلی کوشش حضرت عثمانؓ (35ھ) نے کی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قرآن عہد نبوی ہیں ہی مکمل شکل میں موجود نہ تھا۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ عہد نبوی میں تو قرآن موجود تھا لیکن حضرت ابو بکرؓ (13ھ) نے گڑبڑ کر دی۔

استدلال کے حوالے سے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی جن کتابوں سے وہ اپنی مرضی کے دلائل حاصل کرتے ہیں انہی کتابوں کے انہی صفحات پر ان کے نقطہ نگاہ کے برعکس اور مسلمانوں کے نقطہ نگاہ کی تائید میں دلائل موجود ہوتے ہیں لیکن اپنے خلاف جانے والی بات سے وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ یہ تحقیق کے زاویہ نگاہ سے جانبدارانہ تحقیق کہلاتی ہے۔

عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن:

حضور ﷺ کی وفات کے بعد عہدِ صدیقی میں قرآنِ حکیم کا باقاعدہ 'بین الدفتین' نسخہ مرتب کیا گیا۔ اس نسخے کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جو روایت کتب حدیث میں موجود ہے وہ یوں ہے:

أَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ أَرْسَلَ إِلَيَّ أَبُو بَكْرٍ مَقْتَلَ أَهْلِ الْيَمَامَةِ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَهُ قَالَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ إِنَّ عُمَرَ أَتَانِي فَقَالَ إِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْآنِ وَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يَسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبَ كَثِيرٌ مِنَ الْقُرْآنِ وَإِنِّي أَرَى أَنْ تَأْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ قُلْتُ لِعُمَرَ كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ

رَسُولُ اللهِ ﷺ قَالَ عُمَرُ هٰذَا وَاللهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِي حَتَّى شَرَحَ اللهُ صَدْرِي لِذٰلِكَ وَرَأَيْتُ فِي ذٰلِكَ الَّذِي رَأَى عُمَرُ قَالَ زَيْدٌ قَالَ أَبُو بَكْرٍ إِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ لَا نَتَّهِمُكَ وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ فَتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاجْمَعْهُ فَوَاللهِ لَوْ كَلَّفُونِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجِبَالِ مَا كَانَ أَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا أَمَرَنِي بِهِ مِنْ جَمْعِ الْقُرْآنِ قُلْتُ كَيْفَ تَفْعَلُونَ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَالَ هُوَ وَاللهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ أَبُو بَكْرٍ يُرَاجِعُنِي حَتَّى شَرَحَ اللهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ أَجْمَعُهُ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ حَتَّى وَجَدْتُ آخِرَ سُورَةِ التَّوْبَةِ مَعَ أَبِي خُزَيْمَةَ الْأَنْصَارِيِّ لَمْ أَجِدْهَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَتَّى خَاتِمَةِ بَرَاءَةَ فَكَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللهُ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَيَاتَهُ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ[1]

حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے میری طرف پیغام بھیجا (کہ میں حاضر ہوں) اس وقت اہل یمامہ کے ساتھ قتال اور معرکہ ہوا تھا۔ اسی وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) بھی آپ کے پاس آئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے میرے پاس آکر کہا کہ معرکہ یمامہ میں بہت سے قاریانِ قرآن شہید ہوگئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ وہ آئندہ معرکوں میں بھی شہید ہوتے رہیں گے اور اس طرح بہت سا قرآن ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ میری رائے ہے کہ آپ قرآن کے جمع کئے جانے کا حکم دیں۔ میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو جواب دیا، جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا میں اسے کس طرح کروں؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے فرمایا۔ "واللہ یہ بات بہتر ہے"۔ غرضیکہ وہ مجھے ایسا کرنے کو کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا اور میں نے اس بارے میں وہی رائے قائم کرلی جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے قائم کی تھی۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے مجھ سے کہا "تو ایک سمجھ دار نوجوان ہے اور ہمیں تمھارے بارے میں کوئی بدگمانی بھی نہیں ہے۔ تم نبی کریم ﷺ کے کاتبِ وحی بھی

(1) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، ح:۴۹۸۶، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ص:۴۳۲

رہے ہو، اس لئے قرآن کی تفتیش اور تحقیق کر کے اسے جمع کرو۔" زید کہتے ہیں "واللہ مجھ کو ایک پہاڑ اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینے کا حکم دیتے تو یہ بات مجھ پر اتنی گراں نہ ہوتی جس قدر قرآن جمع کرنے کا حکم مجھ پر بھاری ہوا اور میں نے (ان حضرات سے) کہا کہ آپ دونوں حضرات وہ کام کس طرح کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے جواب دیا "واللہ یہ بات بہتر ہے۔" پھر وہ برابر اس بات پر اصرار کرتے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے میرا دل بھی اسی بات کیلئے کھول دیا جس بات کے واسطے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (23ھ) کا دل کھولا تھا۔ پھر میں نے قرآن کی تلاش کا آغاز کر دیا اور اسے کھجور کی شاخوں اور سفید پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کر دیا اور مجھے سورۃ التوبہ کی آخری آیتیں ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ صرف ابی خزیمہؓ کے پاس سے ملیں اور ان کے سوا کسی سے نہ ملیں۔ یہ منقول صحائف حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے پاس رہے یہاں تک کہ انہوں نے وفات پائی تو اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (23ھ) نے ان کی حفاظت کی اور حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد وہ صحائف اسی طرح حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہے۔"

اس باب میں مستشرقین کے نقطہ نگاہ کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان لوگوں کے خیال میں عہد صدیق اکبرؓ تک حفاظتِ قرآن کا بڑا ذریعہ حفظ ہی تھا۔ گویا حفظ نا قابل اعتماد ذریعۂ حفاظت ہے اور لوگوں کے ذہنوں سے کوئی چیز محو بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کے فوت ہونے سے وہ چیز ضائع بھی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں گزشتہ باب میں عربوں اور مسلمانوں کی قوتِ حافظہ میں امتیاز پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ حفظ کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں مستشرقین غلط فہمی کا شکار ہیں۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن۔ مقصد اور نوعیت

عہدِ نبوی ﷺ اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں قرآن کی کتابت اور جمع قرآن کی کاروائی میں مقصد اور نوعیت کے اعتبار سے نمایاں فرق ہے۔ اس دور میں جمع قرآن کے اقدام کا مطلب ہر گز یہ نہیں تھا کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن لکھا ہوا موجود ہی نہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن عہدِ نبویؐ میں لکھا ہوا موجود تھا۔ اس کے لاتعداد نسخے مکمل شکل میں موجود تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پھر اگر عہدِ نبویؐ میں قرآن لکھا ہوا مرتب شکل میں موجود تھا تو پھر عہدِ صدیقیؓ میں دوبارہ اس کاروائی کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس

بات کو ہم روایات کی روشنی میں واضح کریں گے۔

الاتقان میں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں :

إنما لم يجمع القرآن في المصحف... وقد كان القرآن كتب كله في عهد رسول الله لكن غير مجموع في موضع واحد [1]

"نبی کریمؐ نے قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع نہیں فرمایا تھا۔ نبی کریمؐ کے عہد میں قرآن مجید مکمل طور پر لکھا تو جا چکا تھا۔ لیکن وہ یکجا نہیں تھا۔"

اسی طرح کی ایک اور روایت بھی الاتقان میں ہے:

"وقال الحارث المحاسبي في كتاب فهم السنن كتابة القرآن ليست بمحدثة فإنه ﷺ كان يأمر بكتابته ولكنه كان مفرقا في الرقاع والأكتاف والعسب فإنما أمر الصديق بنسخها من مكان إلى مكان مجتمعا وكان ذلك بمنزلة أوراق وجدت في بيت رسول الله ﷺ فيها القرآن منتشر فجمعها جامع وربطها بخيط حتى لا يضيع منها شيء" [2]

"حارث محاسبی (م ۲۴۳ھ) فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی کتابت کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لکھنے کا حکم فرمایا تھا۔ لیکن اس وقت یہ رقاع اکتاف اور عسیب میں متفرق و منتشر حالت میں تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے اسے مرتب طریقے سے یکجا کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ان اوراق کی شکل میں تھا جو حضورؐ کے گھر سے پائے گئے تھے ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا۔ اسی کو جامع نے جمع کر دیا۔ اور ایک دھاگے کے ساتھ اس طرح پرو دیا کہ اس میں سے کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔"

امام حاکم نے مستدرک میں روایت بیان کی ہے:

جمع القرآن ثلاث مرات احداها بحضرة النبی ﷺ ثم أخرج بسند على شرط الشيخين عن زيد بن ثابت قال كنا عند رسول الله ﷺ نؤلف القرآن من

(1) سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن: جلد 1، ص:76

(2) ایضاً، جلد 1، ص:78

الرقاع... الثانية بحضرة أبوبكر[1]

ترجمہ: ”قرآن مجید تین مرتبہ جمع کیا گیا ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ہوا پھر انہوں نے صحیحین کی شرائط کے مطابق سند کے ساتھ لکھا ہے کہ زید ابن ثابت کہتے ہیں کہ ہم قرآن مجید نبی کریم ﷺ کے سامنے آیات کو جوڑ جوڑ کر ترتیب سے لکھتے تھے۔ دوسری مرتبہ قرآن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جمع ہوا۔“

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں روایت بیان کرنے کے بعد یہ تبصرہ کیا ہے:

”هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ، وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ، وَفِيهِ الْبَيَانُ الْوَاضِحُ: أَنَّ جَمْعَ الْقُرْآنِ لَمْ يَكُنْ مَرَّةً وَاحِدَةً، فَقَدْ جُمِعَ بَعْضُهُ بِحَضْرَةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، ثُمَّ جُمِعَ بَعْضُهُ بِحَضْرَةِ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ، وَالْجَمْعُ الثَّالِثُ هُوَ فِي تَرْتِيبِ السُّورَةِ كَانَ فِي خِلَافَةِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ“[2]

”یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے، اور اس کو شیخین نے درج نہیں کیا۔ اس میں واضح بیان ہے کہ قرآن صرف ایک مرتبہ جمع نہیں کیا گیا، بلکہ تین مرتبہ جمع کیا گیا۔ پہلی مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہی کے عہد میں جمع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ قرآن جمع کرنے کا کام عہد ابو بکر صدیقؓ (13ھ) میں ہوا۔ تیسری مرتبہ یہ کام عہدِ عثمانی میں ہوا۔“

گذشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں کس قدر حفاظ اور جامعین قرآن موجود تھے۔ ان لوگوں کا احصاء و شمار ہی ناممکن ہے۔ اس کتاب میں ”ترتیبِ قرآن“ کے باب میں وہ تمام عقلی و نقلی دلائل پیش کئے ہیں جن سے واضح کیا گیا ہے کہ قرآن عہدِ نبوی ﷺ مین مکمل شکل میں موجود تھا۔ (اس کی تفصیلات عہدِ نبوی ﷺ سے متعلق باب میں بیان کر دی گئی ہیں) لیکن چونکہ وحی کے نزول کا سلسلہ جاری تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے قرآن کو بین الدفتین یا ایک کتاب کی شکل نہیں دی اسے 'بین الدفتین' شکل عہدِ صدیقی میں دی گئی۔ عہدِ نبویؐ اور عہدِ صدیقیؓ کے مصحف میں فرق صرف اسی قدر تھا کہ حضور ﷺ باقاعدہ ایک معیاری نسخہ، جسے سرکاری حیثیت حاصل ہو، امت کو دے کر نہیں گئے۔ کیونکہ

(1) حاکم، امام، المستدرک علی الصحیحین: جلد 3، ص: 229

(2) حاکم، ابوعبداللہ النیساپوری، المستدرك علی الصحیحین فی الحدیث، کتاب التفسیر، جلد ۲، ص: ۲۴۹

الاتقان فی علوم القرآن، جلد 1 ص: 76

نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہونے کی وجہ سے معلوم نہ تھا کہ ابھی مزید کس قدر قرآن نازل ہونا ہے اور نازل ہونے والی وحی کو کس جگہ رکھنا ہے مزید یہ کہ نسخ کا بھی امکان ہو سکتا تھا اس لئے ایک باقاعدہ نسخہ مرتب کرنا ممکن ہی نہ تھا لیکن ایک سرکاری نسخے کے نہ ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ مکمل نسخہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ اس وقت تولاتعداد نسخے معرض وجود میں آچکے تھے جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے تو صرف ایک متفقہ اور سرکاری نسخہ تیار کروادیا۔

عہد صدیق میں قرآن جمع کرنے کی کاروائی کی ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو تاکید فرمائی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے کاتبانِ وحی نے جن متفرق چیزوں پر آیات قرآنیہ کو لکھا تھا صرف وہی منتشر اجزاء جمع کئے جائیں۔ اُس وقت صحابہؓ کے پاس ذاتی مصاحف بھی موجود تھے لیکن ان میں اس طرح کی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا تھا جیسی احتیاط اس تحریر میں برتی گئی تھی جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے سامنے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کروائی تھی اور جسے حضور ﷺ نے خود چیک کیا تھا۔ اور آپ کے چیک کرنے کے بعد یہ اوراق لوگوں کو وحی نقل کرنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔[1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے ایک متفقہ مصحف تیار کرتے ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذاتی مصاحف کو اس لئے بھی بنیاد نہیں بنایا کہ ان میں بعض صحابہؓ نے تفسیری نکات کو بھی اپنی یاداشت کے لئے حاشیہ یا آیات قرآن کے ساتھ ہی حاشیہ یا سطروں کے درمیان لکھ دیا تھا۔ اگر حضور ﷺ نے کچھ دعائیں سکھائیں تو وہ بھی بعض لوگوں نے اس متن کے ساتھ لکھ لی تھیں۔[2] بعض نے دعائے قنوت اسی میں لکھ لی تھی۔[3] اس لئے ذاتی نسخوں کو بنیاد نہیں بنایا گیا۔[4] بلکہ رسول ﷺ کے لکھوائے ہوئے متفرق اوراق کو بنیاد بنایا اس بات کی تائید فتح الباری سے بھی ہوتی ہے۔[5]

ابن ابی داؤد نے یحیی بن عبد الرحمن بن حاطب کے طریق سے روایت بیان کی ہے، جو عہد صدیقؓ

---

(1) الاتقان فی علوم القرآن: جلد 1 ص 77: 59؛ زرقانی، عبد العظیم، مناہل العرفان: صفحہ 301؛ تقی عثمانی، علوم القرآن: ص 183؛ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری: جلد 9 ص: 4

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

(5) ایضاً

میں قرآن جمع کرنے کے بارے میں ہے اور جسے علامہ سیوطی (911ھ) نے بیان کیا ہے اس روایت کا مضمون یہ ہے:

''وأخرج ابن أبي داؤد من طريق يحيى بن عبد الرحمن بن حاطب قال قدم عمر فقال من كان تلقى من رسول الله ﷺ شيئا من القرآن فليأت به وكانوا يكتبون ذلك في الصحف والألواح والعسب وكان لا يقبل من أحد شيئا حتى يشهد شهيدان وهذا يدل على أن زيدا كان لا يكتفي لمجرد وجدانه مكتوبا حتى يشهد به من تلقاه سماعا مع كون زيد كان يحفظ فكان يفعل ذلك مبالغة في الاحتياط''(1)

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے آکر مسجد میں اعلان فرمایا کہ جس شخص نے حضور ﷺ سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو وہ آکر اپنے یاد کردہ قرآن کو سنائے اور لکھنے والے اشخاص اس کو تختیوں اور کھجور کی شاخوں کے ڈنٹھلوں پر لکھتے جاتے تھے۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کسی شخص سے قرآن کا کوئی حصہ اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے تھے جب تک وہ آدمی دو گواہ نہ لائے۔'' (ان گواہیوں کی نوعیت اور حقیقت آیندہ سطور میں آئے گی)

ابن ابی داؤد کی ایک اور روایت الاتقان میں علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے نقل کی ہے یہ روایت ہشام بن عروہ کے طریق پر ان کے باپ عروہ سے ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

''وأخرج ابن أبي داود أيضا من طريق هشام بن عروة عن أبيه أن أبا بكر قال لعمر ولزيد اقعدا على باب المسجد فمن جاء كما بشاهدين على شيء من كتاب الله فاكتباه''(2)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا ''تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ پھر جو تمھارے پاس کتاب اللہ کا کوئی حصہ معہ دو گواہوں کے لائے اسے لکھ لو''۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''قم فكن مع زيد'' آپ اٹھیں اور زید کے

---

(1) الاتقان فی علوم القرآن: جلد 1، ص: 77

(2) ایضاً: ص 62

ساتھ اس کام میں لگ جائیں۔[1]

ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کے بارے میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (911ھ) فرماتے ہیں کہ اس روایت کے تمام راوی معتبر ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (852ھ) ان دو گواہوں کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

المراد بالشاهدين، الحفظ والكتابة[2]

''یعنی ان گواہوں سے مراد حفظ اور کتابت ہے۔''

المرشد الوجیز میں ہے کہ اس اعلان کے بعد لوگ ایک ایک دو دو کر کے آتے۔[3]

حافظ سخاوی اپنی کتاب جمال القراء میں اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

المراد انهما يشهدان على أن ذالك المكتوب كتب بين يدى رسول الله[4]

''یعنی دو گواہوں سے مراد ہے کہ یہ دو گواہ گواہی دیں کہ یہ لکھا ہوا قرآن حضورؐ کے سامنے لکھا گیا تھا۔''

ابن بطال گواہی سے یہ مراد لیتے ہیں کہ دونوں گواہ شہادت دیں کہ انہوں نے ایسا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے سنا ہے۔[5]

ابن حجر فرماتے ہیں: قال عمر من كان تلقى من رسول الله شيأ من القرآن فليات به[6]

علامہ زرقانی (1122ھ) مناہل العرفان میں فرماتے ہیں:

''حضرت زید ابن ثابتؓ صرف حفظ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔''[7]

اسی وجہ سے وہ صورت پیدا ہوئی جس کا ذکر بخاری کی ایک روایت میں موجود ہے کہ سورۃ براۃ کی

---

(1) ابوشامہ، شہاب الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل بن ابراہیم، المرشد الوجیز الی علوم تتعلق بالکتاب العزیز، انقرہ، ترکی، طبعہ ثانیہ، 1986، صفحہ 62-63

(2) سیوطی، جلال الدین، تدریب الراوی، دار الکتب الحدیثہ، قاہرہ، ۱۹۶۴ء، ص:۵۹

(3) المرشد الوجیز، صفحہ 63

(4) ایضاً

(5) ابن بطال، شرح صحیح البخاری، جلد پنجم، صفحہ 23-24

(6) سیوطی، تدریب الراوی، صفحہ 59؛ فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 14

(7) مناہل العرفان، جلد 1، ص: 301، 309

آخری آیت خزیمہؓ کے علاوہ لکھی ہوئی حالت میں کہیں سے مل نہیں رہی تھی۔ حالانکہ یہ آیت حضرت زید ابن ثابتؓ کو زبانی یاد تھی انکے علاوہ بھی صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد کو حفظ تھی لیکن حضرت زید ابن ثابتؓ چاہتے تھے کہ کتابت وحفظ دونوں کی بنیاد پر لکھنا چاہئے تاکہ دونوں کی وجہ سے زیادہ مؤثق انداز اختیار کیا جاسکے۔ یہ بات اس چیز کی دلیل ہے کہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے کمال احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ اس احتیاط کے بارے میں علامہ زرکشی (794ھ) اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وعلى هذا الدستور الرشيد تم جمع القرآن بإشراف أبي بكر وعمر وأكابر الصحابة وإجماع الأمة عليه دون نكير وكان ذلك منقبة خالدة لا يزال التاريخ يذكرها بالجميل لأبي بكر في الإشراف ولعمر في الاقتراح ولزيد في التنفيذ وللصحابة في المعاونة والإقرار''[1]

''اس اصول کے تحت قرآن جمع کرنے کا کام مکمل ہوا۔ اس میں حضرت ابو بکرؓ (13ھ) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور اکابر صحابہؓ کی سرپرستی اور نگرانی تھی اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے نہ کہ اس کی مخالفت۔ اور یہ ایک ایسی دائمی نیک نامی اور کارنامہ تھا کہ تاریخ میں ہمیشہ خوبصورت انداز میں موجود رہے گا کہ ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے اس کام کی سرپرستی کی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے اس کی ترغیب دی، حضرت زیدؓ نے اس پر عمل کیا اور صحابہؓ نے اس کی معاونت اور تائید کی۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (852ھ) نے اگرچہ دو گواہوں سے مراد ''حفظ اور کتابت'' لیا ہے۔ لیکن جمہور نے اس رائے کو اختیار کیا ہے کہ دو عادل گواہ حفظ کیلئے اور دو عادل گواہ کتابت کیلئے ضروری تھے۔[2]

گواہوں کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (911ھ) نے ابو شامہ کا قول نقل کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

قال أبو شامة وكان غرضهم ألا يكتب إلا من عين ما كتب بين يدي النبي صلى الله عليه وسلم لا من مجرد الحفظ قال ولذلك قال في آخر سورة التوبة لم أجدها مع غيره أي لم أجدها مكتوبة مع غيره لأنه كان لا يكتفي بالحفظ دون الكتابة[3]

---

(1) زرکشی، بدرالدین، محمد بن عبد اللہ، البرہان فی علوم القرآن، جلد ۱، ص:۲۳۹

(2) عسقلانی، ابن حجر، فتح الباری شرح بخاری، المطبعۃ البہیہ، قاہرہ، ۱۹۴۸ء، جلد ۹، ص:۹

(3) الاتقان فی علوم القرآن: جلد 1، ص:77

"ابو شامہ کہتے ہیں صحابہ کی غرض یہ تھی کہ قرآن نہ لکھا جائے مگر اسی اصل سے جو رسول ﷺ کے روبرو تحریر میں آیا ہے نہ کہ محض یادداشت پر اعتماد کر کے لکھ لیا جائے۔ اسی وجہ سے حضرت زیدؓ نے سورۃ التوبۃ کے آخری حصہ کی نسبت کہا ہے کہ "میں نے اسے ابی خزیمہؓ انصاری کے سوا کسی اور کے پاس نہیں پایا۔ یعنی اس کو لکھا ہوا صرف انہی کے پاس پایا کیونکہ حضرت زیدؓ محض یادداشت پر اکتفانہ کرتے تھے۔"

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (911ھ) اس کے بعد لکھتے ہیں:

قلت أو المراد أنهما يشهدان على أن ذلك مما عرض على النبی ﷺ عام وفاته

"میں کہتا ہوں کہ شہادت لینے سے مراد یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور حضرت زیدؓ دونوں اس بات کی شہادت بہم پہنچاتے تھے کہ جو قرآن کسی نے انہیں سنایا ہے آیا وہ نبیؐ پر ان کے سالِ وفات میں پیش ہو چکا ہے یا نہیں۔"

الوجیز میں ہے کہ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کو اس کام میں خصوصی طور پر بلایا گیا اور وہ اکیلے وہ سب کچھ لے کر آئے جتنا سب لوگوں سے قرآن جمع کیا گیا تھا۔[1]

علامہ علی القاری کی تحقیق یہ ہے کہ کسی حصے کو اسی وقت شامل قرآن کیا گیا جب ان کے پاس قطعی دلیل سے قرآن کے الفاظ کا اور دلیل ظنی سے اس کتابت یعنی رسم کا ثبوت مل گیا۔[2]

ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں لیث بن سعد سے روایت کی ہے کہ اُس نے کہا سب سے پہلے قرآن کو بین الدفتین (سرکاری طور پر) حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے جمع کیا اور حضرت زید ابن ثابتؓ نے اسے لکھا۔ حضرت زیدؓ کے پاس لوگ قرآن لاتے تھے اور وہ دو معتبر گواہوں کی گواہی کے بغیر اسے لکھتے نہ تھے اور سورۃ برأۃ کا آخری حصہ صرف ابو خزیمہؓ کے پاس ملا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے کہا اسے لکھ لو کیونکہ ان کی شہادت کو حضورؐ نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا۔ چنانچہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے اسے لکھ لیا۔[3]

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت زید ابن ثابتؓ نے قرآن جمع کرنے کا یہ کام نہایت احتیاط کے ساتھ کیا۔ اور کسی بھی طرح سے نہ اس سے کچھ ضائع ہونے دیا اور نہ ہی اس میں کسی چیز کا اضافہ

(1) ایضاً

(2) الوجیز، صفحہ 63

(3) الاتقان فی علوم القرآن: جلد 1، ص: 77

کیا۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کا اس کمیٹی کے سامنے آیت رجم کا پیش کرنا ہے۔ جسے قرآن میں شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ تنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے سوا اور کوئی شہادت بہم نہ پہنچی تھی۔ اس کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی معلوم تھا کہ یہ آیت نہیں ان کا مقصد یہ تھا کہ متن کے حاشیہ پر اس لئے لکھ دیا جائے کہ لوگوں کو معلوم رہے کہ رجم کی سزا بھی اللہ کی طرف سے طے شدہ سزا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) کے الفاظ میں :

وأن عمر أتى بآية الرجم فلم يكتبها لأنه كان وحده(1)

(حضرت عمرؓ آیت رجم لے کر اسی کمیٹی کے پاس آئے لیکن ان سے لیکر یہ آیت قرآن میں لکھی نہیں گئی کیونکہ اس کی شہادت میں وہ اکیلے تھے) اس کے علاوہ بھی چند روایات ملتی ہیں کہ کچھ صحابہ نے کچھ حصے تدوین قرآن کمیٹی کے سامنے پیش کئے لیکن انہیں اس بنا پر قرآن میں شامل نہ کیا گیا کہ یہ عرضۂ اخیرہ سے قبل منسوخ ہو چکے تھے۔ حضرت حفصہ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے "حفظ علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطی وہی صلوٰۃ العصر کے آخری الفاظ پیش کئے لیکن مذکورہ بالا سبب سے شامل نہیں کئے گئے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں۔(2)

جب قرآن مجید کا ایک نسخہ جس پر صحابہ کرامؓ نے اجماع کیا تیار ہو گیا تو اس وقت سورۃ التوبۃ کی آیت ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ کے قرآن میں شامل کرنے کے لئے دو مطلوبہ گواہیاں نہیں مل رہی تھیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر صحابہؓ کو یہ آیات زبانی اس انداز سے یاد تھیں کہ ان کی روزمرہ کی دعا کی طرح تھیں۔ اس قسم کی آیات جو لوگوں میں اوراد کی حیثیت رکھتی تھیں انہیں لوگوں نے عام طور پر لکھا ہوا نہ تھا۔ حالانکہ ان کی نقل وروایت تواتر کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس طرح یہ متواتر نقل وروایت دو گواہوں کے قائم مقام تھی کہ سورۃ التوبۃ کا یہ آخری حصہ حضورؐ کی موجودگی میں لکھا گیا ہے۔ اس موقع پر حضرت زید ابن ثابتؓ کا ایک قول منقول ہے کہ

---

(1) ایضاً

(2) سیوطی، الدر المنثور، جلد اوّل، صفحہ 302-303؛
سیوطی، الاتقان، جلد اول، صفحہ 77
علی المتقی، کنز العمال، کتاب الاذکار روایت نمبر 4759، جلد اول، صفحہ 244
ابن ابی شیبہ، کتاب المصنف، کتاب فضائل القرآن
ابن ابی داود، کتاب المصاحف، صفحہ 53

آپ نے فرمایا۔

لم أجدها مع غیرہ (1)

"میں نے ان آیات کو صرف ابو خزیمہؓ کے پاس پایا۔"

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خبرِ واحد کے ساتھ قرآن کا اثبات کیا گیا ہے۔ بلکہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے بذات خود یہ آیات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں۔ اور انہیں یہ معلوم تھا کہ انہیں کہاں کس سورت میں رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گواہیوں کے برابر قرار دیا تھا۔ اس ضمن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تلاش تائید و تقویت کیلئے تھی۔ اس لئے نہیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اس سے قبل ان آیات سے آگاہ نہ تھے۔ علامہ حارث المحاسبی نے اپنی کتاب 'فہم السنن' میں بیان کیا ہے۔

"قرآن کی کتابت (عہدِ صدیقیؓ میں) کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لکھنے کا حکم دیتے تھے لیکن وہ قرآن جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھا گیا تھا متفرق پرچوں، اونٹ کے شانے کی ہڈیوں اور کھجور کی شاخ کے ڈنٹھلوں پر لکھا ہوا تھا۔ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے صرف اس کے نقل کرنے اور اکٹھا کر لینے کا حکم دیا اور یہ کاروائی بمنزل اس بات کے تھی کہ جو اوراق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے پائے گئے تھے۔ جن میں قرآن لکھا ہوا تھا ان کو جمع کرنے والے نے اکٹھا کر کے ایک دھاگے سے باندھ دیا تا کہ ان میں سے کوئی ٹکڑا ضائع نہ ہو جائے۔" (2) اس روایت کی روشنی میں علامہ محاسبی خود سوال اٹھاتے ہیں:

فإن قیل کیف وقعت الثقة بأصحاب الرقاع وصدور الرجال (3)

"یعنی اگر کہا جائے کہ پرچوں کے رکھنے والوں اور لوگوں کے حافظوں پر کس طرح اعتماد کر لیا گیا؟"

پھر اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں کہ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ وہ لوگ ایسی معجز تالیف اور معروف نظم سے مکمل آگاہ تھے، جس کی تلاوت کرتے ہوئے بیس سال سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے آئے تھے اور اس لحاظ سے اس بات کا بالکل خوف نہ تھا کہ اس میں کوئی خارجی کلام ملا دیا جائے گا ہاں ڈر اس بات کا

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

ہو سکتا تھا کہ اس کے صفحات میں سے کوئی صفحہ ضائع نہ ہو جائے۔ [1]

اس سلسلے میں مولانا تقی عثمانی نے بھی عمدہ انداز سے جمع صدیقی کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت زید، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) سب حافظ قرآن تھے وہ اپنی یاداشت سے قرآن لکھ سکتے تھے۔ سیکڑوں حفاظ کی ایک جماعت تیار کر کے ان سے بھی قرآن کا نسخہ تیار کروا سکتے تھے۔ قرآن کے جو مکمل نسخے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے وہ ان میں سے کسی ایک کی نقل بھی کروا سکتے تھے۔ بلکہ انہوں نے سرکاری نسخہ تیار کرتے ہوئے کوئی آیت اس وقت تک نہیں لی جب تک کہ اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں حاصل نہیں کر لیں۔ جو تحریرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھوائیں اور انہیں چیک کیا تھا حضرت زید نے انہیں یکجا کر دیا۔ پھر اعلان عام کیا گیا کہ جس کے پاس قرآن لکھا ہوا موجود ہو وہ لے کر کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ جو ٹکڑا لایا جاتا اس کی چار طریقوں سے تصدیق کی جاتی:

8. اپنی یاداشت سے توثیق کی جاتی۔ مولانا تقی عثمانی، فتح الباری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کوئی ٹکڑا لاتا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے اور دونوں حافظے سے اس کی توثیق کرتے۔ دونوں گواہ گواہی دیتے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی۔ [2]

مولانا محمد تقی عثمانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بظاہر یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سال آپ پر پیش کر دی گئیں تھیں اور آپ نے اس کی تصدیق فرما دی تھی۔ [3]

علامہ زرکشی (794ھ) نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اس متفقہ اور مصدقہ نسخہ کا تقابل مختلف صحابہ کے لکھے ہوئے نسخوں سے بھی کیا جاتا تھا۔ [4]

کہ اس طریق کار کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے اور صرف حافظے پر اکتفاء کرنے کی بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھے ہوئے مواد سے نقل کیا جائے۔

---

(1) ایضاً

(2) عسقلانی، ابن حجر، فتح الباری: 9/11؛ تقی عثمانی، علوم القرآن، ص: 183

(3) ایضاً

(4) زرکشی، علامہ، البرہان فی علوم القرآن: جلد 1، ص: 234

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے جو نسخہ مرتب فرمایا اس کی مندرجہ ذیل خصوصیات تھیں:

i. اس نسخہ میں آیات حضور اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں۔ لیکن ہر سورت الگ الگ تھی اور ان کی کوئی ترتیب نہ تھی لیکن صحابہؓ کو زبانی طور پر سورتوں کی ترتیب کا علم تھا۔ وہ تلاوت اور خصوصاً نماز میں اس ترتیب کو ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ اس ترتیب سے مکمل طور پر مانوس تھے۔

ii. اس ترتیب میں سبعہ احرف کے ساتوں حروف شامل تھے۔

iii. یہ نسخہ خطِ حیری میں لکھا تھا۔

iv. اس میں صرف وہی آیات شامل تھیں جو منسوخ نہیں ہوئی تھیں۔

v. اس نسخہ کی تیاری کا مقصد یہ تھا کہ اجماع صحابہؓ سے ایسا نسخہ تیار ہو جائے جس کی طرف لوگ رجوع کر سکیں۔ (1)

صحابہؓ کے تحریر کیے ہوئے نسخوں اور اس مصحف میں فرق یہ تھا کہ اس نسخہ میں موجود آیات اور ان کی ترتیب پر سب صحابہؓ کا اجماع تھا اور حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ کے نسخے انفرادی طور پر تیار کیے گئے تھے۔ حضرت علیؓ نے اس کام کے بارے میں فرمایا:

"رحم اللہ أبابکر، هو أوّل من جمع کتاب اللہ بین اللوحین۔" (2)

"اللہ تعالیٰ، ابو بکر (13ھ) پر رحم فرمائے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو بین اللوحین جمع کیا۔"

علامہ زرقانی (1122ھ) مناہل العرفان میں فرماتے ہیں کہ:

"زید ابن ثابتؓ صرف حفظ پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔" (3) اسی وجہ سے وہ صورت پیدا ہوئی جس کا ذکر بخاری کی ایک روایت میں موجود ہے کہ سورۃ براۃ کی آخری آیت خزیمہؓ کے علاوہ کہیں سے مل نہیں رہی تھی۔ یعنی یہ لکھی ہوئی حالت میں ابو خزیمہؓ کے علاوہ کہیں سے مل نہیں رہی تھی۔ حالانکہ یہ آیت زید ابن ثابتؓ چاہتے تھے کہ کتابت و حفظ دونوں کی بنیاد پر لکھنا چاہیے تاکہ دونوں کی وجہ سے زیادہ مؤثق انداز اختیار کیا

(1) تقی عثمانی، مولانا، علوم القرآن، ص:183

(2) زرکشی، البرہان فی علوم القرآن، جلد1، ص239

(3) زرقانی، مناہل العرفان، جلد1، ص245

جاسکے۔

ولیم میور (1905ء) عہد صدیقی میں قرآن جمع 2 کرنے کے بارے میں جنگِ یمامہ میں مسلمانوں کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی شہادت کی بنا پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو خدشہ لاحق ہوا کہ اگر لوگ اسی طرح شہید ہوتے چلے گئے تو قرآن کی حفاظت پر کہیں آنچ نہ آجائے۔ اس لیے حضرت زید ابن ثابتؓ کو حکم دیا گیا کہ قرآن کو یکجا کر دیا جائے۔ زیدؓ بھی اسی کام پر رضامند ہو گئے۔ اور انہوں نے یہ کام اس طرح شروع کیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کے جو جو اجزاء ہوں وہ اسے لے کر زید ابن ثابتؓ کے پاس مسجدِ نبویؐ میں حاضر ہو جائے۔ اس کی مندرجہ ذیل صورتیں تھیں:

i. کچھ املاء کی شکل میں پتوں پر۔
ii. کچھ املاء کی شکل میں سفید پتھر پر
iii. حفاظ کے سینوں میں
iv. چمڑے اور ہڈیوں پر لکھا ہوا۔

اس کے بعد میور (1905ء) لکھتے ہیں کہ "زیدؓ نے ایک ایک تحریر کو سمیٹ لیا۔ اور حفاظِ قرآن کو اپنے گرد بٹھا کر دو یا تین برسوں میں یہی قرآن جو ہمارے ہاتھوں میں ہے مرتب کر دیا۔"[1]

میور (1905ء) لکھتا ہے: یہی نسخہ اس ترتیب کے مطابق ہے جو زید رضی اللہ عنہ لکھ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا کرتے تھے۔"[2] تو قرآن کو وحی الٰہی تسلیم کرنے والے لوگ اس میں کمی بیشی کی جرأت کیسے کر سکتے تھے۔ ایسا کرنا تو ایمان کی نفی ہے۔[3]

ولیم میور (1905ء) اس سلسلے میں مزید دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو یا تین سال بعد قرآن کے انہی قاریوں کو خلفائے اربعہ قومی سرمایہ سمجھتے اور انہیں ممالکِ محروسہ اسلام میں اقامتِ دین و تبلیغ کیلئے بھیجتے۔ کیا عہدِ نبویؐ کے ان حفاظِ قرآن اور زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے درمیان جمع قرآن کے مقصد میں کوئی واسطہ نہ رہا ہوگا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن سے نہ صرف مسلمانوں میں سے ہر فرد کی بے غرضی اور خلوص واضح ہوتا ہے بلکہ تمام ایسے وسائل و ذرائع ان

---

(1) بحوالہ، ہیکل، حسین، حیاۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مقدمہ)، ص Muir, Willim, Life of Mahmet, vol.I, p.4:28

(2) ایضاً

(3) ایضاً

کے قبضہ میں تھے جن سے انہوں نے اپنی کتاب پوری صحت و تکمیل کے ساتھ مرتب کرلی۔" (1)

وہ مزید لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی صحت و کمال ہر دو صفات کے متعلق ہمارے سامنے یہ دلیل بھی ہے کہ حضرت محمدؐ کے پیروؤں نے اپنے نبیؐ کی زندگی میں قرآن کے کسی نہ کسی حصہ کی املاء کر لی تھی۔ جس کی دوسری نقلیں ایک دوسرے مسلمان کے پاس ہونا قابلِ تسلیم ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ اس دور کے جو مسلمان نوشت وخواند سے واقف تھے۔ ان کے سامنے قرآن کے یہ تحریری اجزاء ضرور رہتے ہوں گے۔" (2)

میور (1905ء) لکھتے ہیں کہ عہد نبوی اور عہد ابو بکر میں قرآن کا ایک مکمل نسخہ موجود ہونے کی دلیل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کے ایسے اجزاء زید ابن ثابتؓ کے جمع کردہ نسخہ میں ضرور شامل ہوئے ہوں گے۔ پس ظاہر ہے کہ زیدؓ کا مرتبہ نسخہ اس دور میں قرآن لکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں نقش اور مادی چیزوں مثلاً ہڈیوں اور درختوں کے پتوں وغیرہ پر پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرتب کردہ نسخہ پر اس دور کے جاننے اور پڑھنے والوں نے پورا اتفاق کیا۔ حتٰی کہ اگر کسی کے پاس قرآن کا کوئی جزو رہ بھی گیا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ وہ قرآن میں شامل ہو چکا ہے اسکی جگہ زیدؓ ہی کا نسخہ قابلِ وثوق سمجھا۔ صحابہؓ میں سے کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ زیدؓ اور اسکے رفقائے جامعین نے قرآن کے فلاں ٹکڑے یا اس آیت اور لفظ کو جو ہمارے پاس محفوظ ہے نظر انداز کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ صحابہؓ میں سے کسی نے زیدؓ کے مرتبہ قرآن سے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اگر اختلاف ہوتا تو احادیث کی ان کتابوں میں تذکرہ بھی ضرور مل سکتا جن میں حضرت محمدؐ کے ایسے اقوال و افعال تک کی حکایت موجود ہے جن کا تعلق صرف ان کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ (3)

زید بن ثابتؓ کا مرتب کردہ نسخہ وہی تھا جو حضورؐ نے بصورتِ وحی چھوڑا تھا۔ اس سلسلے میں ولیم میور (1905ء) نے چار صورتیں بیان کی ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زیدؓ کا مدوّنہ نسخہ اس حد تک ضرور صحیح ہے جس حد تک اکمال و صحت دونوں کا امکان ہو سکتا ہے۔

ولیم میور (1905ء) لکھتا ہے کہ اس سلسلے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ زید

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

ابن ثابتؓ نے یہ نسخہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کا زیر نگرانی مرتب کیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ)، حضرت محمدؐ کے ایسے مخلص پیروکار تھے۔ جن کا ایمان تھا:

i. قرآن، آسمان سے نازل شدہ مقدس کتاب ہے۔

ii. وہ نبیؐ کے عہدِ رسالت میں مسلسل بیس سال شب و روز ان کی معیّت میں رہے

iii. انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں بے طمع سادگی اور امت کی اصلاح و بہبود کیلئے پر اسرار حکمت سے اپنا منصب سرانجام دیا۔

میور (1905ء) لکھتا ہے کہ یہ خصوصیات ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کے قرآن جمع کرانے میں ان پر کسی بدگمانی کا امکان نہیں ہو سکتا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) ایمان سے جانتے تھے کہ قرآن خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کے پیغمبرؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہوا۔ ان کا یہ عقیدہ محرک تھا کہ وہ قرآن کی جمع و ترتیب اور اکمال اور صحت پر پوری توجہ دیتے۔ یہی عقیدہ (حضرت عمرؓ) کا تھا اور اسی کے مطابق قرآن موجودہ صورت میں مدوّن ہوا۔ جس عہد میں قرآن مدوّن ہوا اس عہد کے ہر مسلمان کا یہی ایمان تھا۔ جن مسلمانوں نے کاتبینِ وحی (حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ) کی امداد ہر اس شکل میں کی جو ان کے اختیار میں تھی کہ جن حضرات کو صرف زبانی یاد تھا انہوں نے مذکورہ مجلس میں حاضر ہو کر اسی طرح انہیں سنا دیا۔ جن کی تحویل میں ہڈیوں درختوں کے پتوں پر جو آیات لکھی ہوئی تھیں انہوں نے وہ ٹکڑے اسی طرح زیدؓ کے سامنے رکھ دیے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کی طرح یہ مسلمان بھی اپنے دلوں میں رغبت لئے ہوئے تھے کہ ان کے سامنے نبیؐ نے جو کچھ وحی الٰہی بتا کر پڑھائے اس کے اظہار میں کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ واضح ہو چکا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز قرآن کے ہم پلہ نہیں۔ کیونکہ وہ اسے صدقِ دل سے خدا کا مقدس کلام سمجھتے تھے۔ (1)

کیا عہدِ صدیقؓ میں تدوینِ قرآن کا محرک یمامہ کے شہداء تھے؟

آرتھر جیفری ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے عہدِ صدیقی میں جمع قرآن کو یمامہ کے شہداء کے ساتھ اس طرح یکجا کیا ہے کہ گویا قرآن کے ضائع ہونے کے خدشہ کی بناء پر ہی یہ کاروائی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین محض اعتراض کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے بنیادی مآخذ بخاری شریف کی روایت کو تو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے سرکاری طور پر

---

(1) ایضاً

ایک نسخہ تیار کروایا تھا۔ جس کی تدوین میں تمام صحابہؓ شریک تھے۔ جس کی تیاری کیلئے باقاعدہ سرکاری اعلان کیا گیا۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے پاس جمع شدہ قرآن اس کمیٹی کے سامنے پیش کریں جو سرکاری طور پر اس مقصد کیلئے تشکیل دی گئی تھی۔ قرآن کا کوئی حصہ کسی سے قبول کرنے کیلئے شہادتیں ضروری تھیں۔ اس نسخے کی تیاری کے بعد اسے سرکاری تحویل میں رکھا گیا۔ مستشرقین مستند ذرائع سے حاصل ہونے والے ان حقائق کو تو کوئی وقعت نہیں دیتے، لیکن اپنی قیاس آرائیوں کو وہ حرف آخر سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں:

"اب اس دو عملی کو انصاف اور دیانت کے کون سے خانے میں فٹ کیا جائے کہ حضرت زید ابن ثابتؓ کی اس روایت میں وہ ساری باتیں تو آرتھر جیفری کی نگاہ میں جھوٹی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے عہد میں سطح پر قرآن حکیم کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن روایت کا وہ حصہ ان کی نگاہ میں بالکل صحیح ہے جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (23ھ) کا یہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ اگر صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو خطرہ ہے کہ کہیں قرآن کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے ایک طرف تو وہ یہ پوری روایت نقل کر کے اسے من گھڑت قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اسی روایت سے قرآن مجید کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال بھی کرتے ہیں۔"(1)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے جو طریق کار اپنایا تھا اسے ذہن میں رکھیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (23ھ) کے اس جملے سے مستشرقین کا یہ اعتراض خود بخود باطل ٹھہرتا ہے۔ اس وقت حافظہ اور کتابت دونوں ذرائع سے بیک وقت کام لیا جاتا تھا۔ اس وقت تک کوئی آیت لکھی ہی نہیں جاتی تھی جب تک کہ تمام موجود ذرائع سے اس کا جزوِ قرآن ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ فتح الباری اور دیگر کتب میں اس موقع پر اختیار کیئے گئے طریق کار کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کئی مواقع پر کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یوں ہے:

i. سرکاری اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ اپنے پاس موجود قرآن مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع قرآن کمیٹی کے سامنے پیش کریں۔

---

(1) عسقلانی فتح الباری، جلد ۹، ص:۱۱
تقی عثمانی، علوم القرآن، ص ۱۸۳

دو گواہ پیش کئے جائیں۔ گواہیوں کی تفصیل اس باب کے آغاز میں ہے۔

ii. سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) زبانی یاداشت سے اس کی توثیق فرماتے۔

iii. حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو بھی اس کمیٹی کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ اس طرح وہ حضرت زیدؓ کے ساتھ مل کر آیت وصول کرتے۔

iv. اس طرح لکھی ہوئی آیات کا موازنہ صحابہؓ کے ذاتی مجموعوں کے ساتھ بھی کیا گیا۔ یہ طریقِ کار اسی وقت ممکن ہوا جب آیاتِ قرآن کے مکتوب شکل میں محفوظ ہونے کے علاوہ حفاظ کی بھی ایک تعداد موجود تھی۔ اگر حفاظ صحابہؓ کی بڑی تعداد موجود نہ ہوتی تو یہ کارنامہ سرانجام دیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ صحابہؓ میں سے حفاظ قرآن کی تفاصیل کتاب میں دوسری جگہ پیش کی جاچکی ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے اس بیان کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر حفاظِ قرآن شہید ہوتے چلے گئے اور قرآن کے ایک سرکاری نسخے کی تیاری میں تاخیر ہوتی چلی گئی تو ایسا نہ ہو کہ قرآنِ کریم کا تواتر منقطع ہو جائے اور لکھے ہوئے مواد کی تصدیق صحابہؓ کے حافظوں کے تواتر سے کی جانی مشکل ہو جائے۔

مستشرقین نے قرآن مجید کی صحت کو مشکوک بنانے کیلئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں مکمل طور پر لکھا نہیں گیا لوگوں کو قرآن جزوی طور پر زبانی یاد تھا یا اسی طرح جزوی طور پر لکھا ہوا تھا اور پھر کہتے ہیں کہ عہدِ ابو بکر صدیقؓ (13ھ) میں یمامہ کی جنگ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوگئے اور یوں رہا سہا معاملہ بھی جاتا رہا اور اب گویا قرآن کے مکمل طور پر موجود ہونے کا (ان کے نزدیک) کوئی سوال ہی نہیں۔ ذیل میں ہم اس سلسلے میں تحقیقی جائزہ پیش کرتے ہیں:

یہ نقطہ نگاہ اختیار کرتے ہوئے مستشرقین ان لاتعداد تحقیق شدہ روایات سے انکار کرتے اور ایک مفروضے پر چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ روایت جس میں یمامہ کے شہداء کا ذکر ہے ۔ اس کا تفصیلی جائزہ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ)، سالمؓ کی شہادت سے اس لئے فکر مند نہیں ہوئے تھے کہ قرآن کا جو حصہ ان کے پاس تھا، ان کی شہادت کی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا اس طرح تو اس جنگ میں شہید ہونے والے دیگر حفاظ کی شہادت سے ان سب کے پاس موجود آیات کے ضائع ہونے کا صدمہ ہونا چاہیے تھا جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو صرف سالم کی شہادت سے ہی فکر لاحق ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کی فکر مندی کی بنیاد صرف حضرت سالم نہ تھے۔ سالم کا نام اس لئے لیا گیا کہ وہ ان ہستیوں میں سے تھے جن سے قرآن پڑھنے کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ پھر یہ بات بھی ذھن میں رہے کہ ایسا نہ تھا کہ حضرت سالم کو کوئی ایسی آیات یاد تھیں جو اوروں کو یاد نہ تھیں بلکہ کئی صحابہ پورے کے پورے قرآن کے حافظ تھے۔ سالم چونکہ ان میں سرکردہ اصحاب میں سے تھے اس لئے ان کا نام

بطور خاص لیا گیا۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

وقتل فی غضون ذلك من الصحابة كثيرة قيل سبع مائة وقيل أكثر (1)

"اس لڑائی کے دوران بہت سے صحابہؓ شہید ہوئے کہا جاتا ہے کہ سات سو یا اس سے زیادہ۔"

پھر آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''وَوَقَعَ مِنْ تَسْمِيَةِ الْقُرَّاءِ الَّذِينَ أَرَادَ عُمَرُ فِي رِوَايَةِ سُفْيَانَ بْنِ عُيَيْنَةَ الْمَذْكُورَةِ قُتِلَ سَالِمٌ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ وَلَفْظُه: سُورَةٌ فَلَمَّا قُتِلَ سَالِمٌ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ خَشِيَ عُمَرُ أَنْ يَذْهَبَ الْقُرْآنُ، فَجَاءَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ سُورَةٌ وَسَيَأْتِي أَنَّ سَالِمًا أَحَدُ مَنْ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِأَخْذِ الْقُرْآنِ عَنْهُ'' (2)

"سفیان بن عینیہ کی روایت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ کی شہادت سے پہلے جن شہید ہونے والے قراء کی طرف اشارہ کیا تھا ان کا نام مذکور نہیں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ جب سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ شہید ہو گئے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو قرآن ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت وہ ابو بکرؓ (13ھ) کے پاس آئے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ سالمؓ ان صحابہؓ میں سے ایک تھے جن سے رسول اللہ ﷺ نے قرآن حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔"

اس قسم کے اشکالات کا ازالہ اس حقیقت کے ذریعے ہو جاتا ہے کہ حفاظت قرآن کا دارومدار حفظ پر ہی نہیں تھا۔

کتاب کے دوسرے مقام پر پورے دلائل و شواہد کے ساتھ یہ واضح کر دیا ہے کہ وحی کے نزول کے فوراً بعد اسے لکھ لیا جاتا تھا۔ اس کیلئے کاتبینِ وحی متعین تھے۔ ان کاتبینِ وحی کے اسمائے گرامی کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کی احتیاط اور کتابتِ وحی کیلئے اہتمام کو اگر ہم نگاہ میں رکھیں تو اس قسم کے کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

دوسری طرف اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھیں کہ صحابہؓ قرآن مجید کی تلاوت روزانہ کیا کرتے تھے۔ نمازوں میں اس کی تلاوت کرتے۔ ہر شخص کیلئے لازم تھا کہ وہ قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور حفظ

(1) عسقلانی، فتح الباری، جلد ۹، ص: ۹

(2) ایضاً

کرے۔ (1) پھر عرب غیر معمولی حافظے کے بھی مالک تھے۔ اس لئے یہ یقینی بات ہے کہ ان سات سو بزرگوں میں جنھوں نے یمامہ میں شہادت پائی، بہت سے لوگ قرآن کے حافظ ہوں گے۔ ان سے زیادہ تعداد ان حضرات کی ہوگی جو بقیدِ حیات تھے اور پورے قرآن کے حافظ ہوں گے۔

جنگ یمامہ کے شہداء کی وجہ سے مستشرقین نے قرآن مجید کے ایک حصے کے ضائع ہو جانے کا جو خدشہ پیدا کیا ہے، اسکی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جس کتاب کے ساتھ لوگوں کا اس قسم کا تعلق ہو کہ آیات کے نزول کے ساتھ ہی اسے حفظ کرنے میں لوگ مصروف ہو جاتے ہوں، حفظ کرنا سعادت سمجھا جاتا ہو۔ جیسا شغف لوگوں کو حضورؐ کے ساتھ تھا ویسا ہی شغف قرآن کے ساتھ بھی تھا۔ ہم اس شغف کو ذہن میں رکھیں تو یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ اس کو کوئی بڑی سے بڑی آفت بھی مٹا سکے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) یا حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) جیسے ذہین حضرات کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت سالم کی شہادت سے اس لئے فکر میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر اسی طرح لوگوں کی شہادت ہوتی رہی تو ایک دن آسکتا ہے جب پورے قرآن کا حافظ روئے زمین پر نہ رہے اور قرآن کا کثیر حصہ ضائع ہو جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو اس بات کی فکر ہوئی تھی کہ اگر سالمؓ کی طرح باقی ایسے حضرات جن سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت حضورؐ نے مرحمت فرمائی تھی وہ اگر لڑائیوں میں شہید ہوتے چلے گئے تو قرآن پڑھانے والا کوئی نہ رہے گا اور جو نسخے ان بزرگوں کے پاس ہیں ممکن ہے وہ بھی ضائع ہو جائیں۔ اس لئے کہ وہ نسخے ذاتی اور شخصی ملکیت میں تھے اور انہیں محفوظ رکھنے کی ذمہ داری شخصی اور انفرادی تھی پوری قوم کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس خطرے کو صرف ایک طریقے سے دور کیا جا سکتا تھا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ ان بزرگوں کے تعاون سے کلام مجید کا ایک نسخہ تیار کروا کے خلافت کی حفاظت میں دے دیا جائے۔ اس عہد میں اس بات کا ایسا کوئی خدشہ نہ تھا کہ لوگوں کی شہادت کی وجہ سے قرآن ضائع ہو جاتا۔ ہمارے پاس شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت قرآن مجید کے اس قدر نسخے مکمل شکل میں موجود تھے کہ کسی قسم کا حادثہ قرآن پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت اس قدر نسخے موجود تھے کہ ان کا شمار ہی نہیں ہے۔

مستشرقین کے پیدا کردہ اس اشکال کا ازالہ ایک اور طریق سے بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ طریق یہ ہے کہ ہم ثابت کر دیں کہ جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظِ قرآن کے شہید ہو جانے کے باوجود اکابر صحابہؓ میں سے حفاظ کرام کی بہت بڑی جماعت بعد میں بھی ایک طویل عرصے تک زندہ رہی۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ واقعی حفاظ کے شہید ہو جانے سے حفاظتِ قرآن پر اثر پڑ سکتا تھا تو بھی باقی بچ رہنے والے حفاظ اتنی کثیر تعداد

---

(1) بخاری: الجامع الصحیح، ۳/۱۵۰، باب خیر کم من تعلم القرآن

میں تھے کہ حفاظتِ قرآن پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں ذیل میں ہم اکابر حفاظ صحابہؓ کی تاریخ وفات کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں۔

	نام صحابی	سالِ وفات
1.	حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	۱۳ھ (1)
2.	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ	۲۳ھ (2)
3.	حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ	۳۵ھ (3)
4.	حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ	۴۰ھ (4)
5.	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	۵۸ھ (5)
6.	حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ	۳۲ھ (6)
7.	حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ	۶۸ھ (7)
8.	حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا	۴۵ھ (8)
9.	حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ	۲۱ھ (9)
10.	حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ	۱۸ھ (10)
11.	حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ	۴۵ھ (11)

(1) الاعلام، جلد 1، ص: 78

(2) ایضاً، جلد 5، ص: 202

(3) ایضاً، جلد 4، ص: 371

(4) ایضاً، جلد 4، ص: 324

(5) ایضاً، جلد 4، ص: 4-5

(6) ایضاً، جلد 4، ص: 280

(7) ایضاً، جلد 4، ص: 228

(8) ایضاً، جلد 2، ص: 292

(9) ایضاً، جلد 1، ص: 78

(10) ایضاً، جلد 8، صفحہ 166

(11) عبد السلام ندوی، سیرت صحابہ، ص: 391

12. حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ ۳۲ھ[1]

بے شک حفاظِ کرام کی بڑی تعداد جنگ یمامہ میں شہید ہوگئی تاہم اگر صرف مذکورہ بالا حفاظ ہی زندہ بچے ہوتے تب بھی قرآن کی حفاظت پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ان تمام حضرات کا مسلّمہ علمی مقام تھا۔عبد اللہ ابنِ مسعود ؓ(32ھ)اور حضرت اُبی بن کعب ؓ(22ھ)کے مقام ومرتبہ کا اعتراف مستشرقین نے بھی کیا ہے۔جب حضرت عثمان ؓ(35ھ) کا تیار کردہ، مصحف ابن مسعود ؓ(32ھ)کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنا مصحف سرکاری تحویل میں دینے سے انکار کر دیا تھا۔اس مقام پر مستشرقین نے حضرت عبد اللہ ابن مسعود ؓ (32ھ)اور اُبی ابن کعب ؓ(22ھ)کے مقام ومرتبے کا وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ابن مسعود رضی اللہ عنہ عرصہ اخیر میں حضرت زید ابن ثابت کے ساتھ موجود تھے۔[2] ہم نے جنگ یمامہ کے بعد جن چند حفاظ کا ذکر کیا ہے ان میں یہ دونوں ہستیاں موجود تھیں۔ہم اگر ایک لحہ بھر کیلئے یہی فرض کرلیں کہ صرف یہی دو صحابی ؓ بچے تھے جو قرآن کے حافظ تھے تو بھی خود مستشرقین کے حوالے سے اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ جاتی کہ قرآن کی حفاظت پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص ؓ(50ھ)سے مروی بخاری کی یہ روایت ہم نے اس سے قبل نقل کی ہے کہ عبد اللہ کہتے ہیں:

سمعت النبی ﷺ یقول خذوا القرآن من اربعة من عبد الله ابن مسعود وسالم ومعاذ وابیّ[3]

"قرآن چار حضرات سے پڑھو۔ سالم ؓ، ابن مسعود ؓ (32ھ)، معاذ ؓ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم (22ھ)سے۔"

مسروق تابعی کا قول ہے۔میں نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہم، ابن مسعود رضی اللہ عنہم (32ھ)، حضرت عمر رضی اللہ عنہم، حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہم، ابو الدرداء رضی اللہ عنہم(32ھ) اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم(22ھ)کے درمیان پایا۔ پھر ان کا علم دو حضرت علی رضی اللہ عنہ(40ھ) اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ (32ھ)میں جمع پایا۔[4] ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ)نے سرکاری طور پر شام میں بطور معلم مقرر فرمایا تھا۔

---

(1) ایضاً، ص: 193

(2) ابن ابی شیبہ، الکتاب المصنف فی الاحادیث، جلد ششم، صفحہ 53، دالکتب العلمیہ، بیروت

(3) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث نمبر: 4986

(4) ایضاً

حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ابن مسعودؓ (32ھ)، حضور ﷺ سے قریب ترین رہا کرتے تھے۔[1]
فتح مکہ کے بعد حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ (18ھ) کو حضور ﷺ کی طرف سے مکہ مکرمہ میں معلم مقرر کیا گیا۔[2]

حضرت زید ابن ثابتؓ کو تبوک میں 'علَم' دیا گیا۔ کیونکہ وہ قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے۔ آپؓ کاتبِ وحی بھی تھے۔ وہ قرآن کے جامعین میں سے تھے۔ قرآن مجید مکمل طور پر آپؓ کو حفظ تھا۔ عرضۂ اخیرہ میں انہوں نے حضورؐ کو قرآن سنایا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے حکم سے آپؓ نے قرآن جمع فرمایا۔[3] حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) حافظۂ قرآن تھیں۔[4]

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ (68ھ) کو "حبر الامّۃ۔" سلطان المفسرین اور ترجمان القرآن کے خطاب دیئے گئے۔[5]

ابو داؤد شریف میں روایت ہے کہ حضرت حفصہؓ بھی حافظۂ قرآن تھیں۔[6]

حفاظ صحابہؓ میں سے سات صحابہؓ ایسے تھے جن کی سند سب سے زیادہ مسلّم تھی۔ ان صحابہ کا ذکر کر کے علامہ ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں :

فهؤلاء الذين بلغنا أنهم حفظوا القرآن في حياة النبي ﷺ، وأخذ عنهم عرضا، وعليهم دارت أسانيد قراءة الأئمة العشرة واشتهر بإقراء القرآن من بينهم سبعة عثمان وعلي وأبي بن كعب وأبو الدرداء وزيد بن ثابت وعبد الله بن مسعود وأبو موسى الأشعري كلهم جمعوا التنزيل بين حنايا صدورهم وأقرؤوه لكثير غيرهم[7]

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے سات ایسے لوگ تھے جو قرآن پڑھانے میں مشہور ہوئے، وہ حضرت عثمان

---

(1) عسقلانی، فتح الباری، جلد 9، ص: 4
(2) ایضاً
(3) ایضاً
(4) ایضاً
(5) ایضاً
(6) ایضاً
(7) الذہبی، شمس الدین، ابو بکر عبد اللہ محمد ابن احمد بن عثمان، معرفۃ القراء الکبار علی الطبقات والاعصار، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 1417ھ، جلد 1، صفحہ 20

ابن عفانؓ، حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت اُبیّ ابن کعبؓ (22ھ)، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت زید ابن ثابتؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (32ھ)، اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم (30ھ) ہیں۔ ان سب نے قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کیا اور پھر بہت سے لوگوں کو آگے پڑھایا۔

ان اصحاب کے بارے میں یہ تفصیلات ہم نے محض ایک جھلک دکھانے کیلئے پیش کی ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ جنگ یمامہ میں حفاظ صحابہؓ کی ایک خاصی تعداد شہید ہو جانے کے باوجود اس بات کا قطعاً کوئی امکان اور خدشہ باقی نہیں رہتا کہ شاید قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو گا۔ عملاً یہ بات بھی خلاف عقل ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان شہید ہونے والوں کو کچھ مخصوص حصہ قرآن یاد تھا۔ جو باقی بچ رہنے والے صحابہؓ کو یاد نہ تھا۔ اگر کچھ آیات یا مکمل قرآن کے حافظ شہید ہوئے تو اسی طرح کے بہت سے حافظ زندہ بھی تھے۔ اس لئے مستشرقین کا محض یہ وہم ہے کہ ان شہداء کی وجہ سے قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا۔

اس نقطہ نگاہ اور اعتراض کا رد اس بنیاد پر بھی ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا اہتمام محض تحریر کی مدد سے ہی نہیں ہوا بلکہ اصل بنیاد حافظہ تھا۔ خود مستشرقین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ابتدائی عہد میں حفاظتِ قرآن کی اصل بنیاد حافظہ تھا۔

ولیم میور (1905ء) جیسا شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ "عربوں کا حافظہ ضرب المثل تھا اور صحابہ کرامؓ جس شوق کے ساتھ قرآن حفظ کرتے تھے اس کی موجودگی میں اس بات کا امکان باقی نہیں رہتا کہ قرآن کا ایک حصہ کسی کو یاد ہو اور دوسرا حصہ اسے یاد نہ ہو۔"(1)

ذیل میں ہم ان چند حفاظ و قرائے کرام کے اسمائے گرامی, محض استحضار کی خاطر, بیان کرتے ہیں (جن کا ذکر اگرچہ کتاب میں دوسری کئی جگہوں پر کیا گیا ہے) جنہوں نے عہدِ نبویؐ میں مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

حضرات خلفائے راشدینؓ، حضرت زید ابن ثابتؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (32ھ)، حضرت ابوالدرداءؓ (32ھ)، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (30ھ)، حضرت ابی ابن کعبؓ (22ھ)، حضرت معاذ ابن جبلؓ (18ھ)، حضرت ابن عباسؓ (68ھ)، حضرت عبداللہ ابن سائبؓ، حضرت ابوزیدؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ)، حضرت حفصہؓ، حضرت مجمع بن جاریہؓ، حضرت فضالہ بن عبیدؓ، حضرت مسلمہ بن مخلدؓ، حضرت تمیم داریؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ وغیرہ۔

عہد نبوی اور عہد حضرت ابوبکر صدیقؓ (13ھ) میں قرآن مجید کے متعدد مکمل نسخے موجود ہونے

---

(1) بحوالہ، ہیکل حسین، حیاۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، (مقدمہ)

کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن ناظرہ پڑھنے کی ترغیب دی اور اجر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے قرآن مجید دیکھ کر پڑھنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اسکی ایک مثال یہ ہے:

"الاستیعاب" میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو کسی نے بتایا کہ ایک شخص کوفہ میں یاد سے قرآن پڑھاتا ہے (یعنی دیکھ کر مصحف سے نہیں پڑھاتے) یہ سن کر آپ غضبناک ہو گئے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ عبداللہ ابن مسعودؓ (32ھ) ہیں تو آپ خاموش ہو گئے۔[1] اس روایت کے دو پہلو ہیں۔

ایک رخ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) یاد سے قرآن پڑھانے والے پر غضبناک ہوئے یعنی آپؓ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ بغیر دیکھے قرآن پڑھیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر ذہن کو ہم عہدِ نبویؐ میں واپس لے جائیں کہ اس دور میں قرآن پڑھانے والے مختلف قبیلوں اور علاقوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اس لئے یہ قیاس غالب ہے کہ ان لوگوں کے پاس کلام مجید کا لکھا ہوا حصہ یا مکمل قرآن موجود ہوتا ہوگا اگر بغیر دیکھ کر پڑھنے کا رواج ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) مذکورہ بالا خبر سن کر غضبناک نہ ہوتے۔

مذکورہ صدر روایت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو معلوم ہوا کہ زبانی پڑھانے والے ابن مسعودؓ (32ھ) ہیں تو آپؓ خاموش ہو گئے۔ کیونکہ ابنِ مسعودؓ (32ھ) ان لوگوں میں سے تھے جن کو حضورؐ نے تعلیم قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔[2] اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے عہد میں عام رواج یہی تھا کہ لوگ قرآن دیکھ کر پڑھیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ لاتعداد نسخے اس وقت موجود تھے۔ (گذشتہ باب میں اس سلسلے میں بہت سے شواہد پیش کئے جا چکے ہیں)

گذشتہ سطور میں جو پس منظر بیان کیا گیا ہے اس میں حضرت سالم کے شہید ہونے سے حفاظتِ متنِ قرآن کے حوالہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے خدشے پر غور کریں تو اس کی مزید تائید ملے گی کہ ایسے بزرگ جنہیں حافظہ سے قرآن پڑھانے کی اجازت ہو، حضرت عمر فاروقؓ رضی اللہ عنہ (33ھ) کے نزدیک وہی ہو سکتے تھے جن کو حضورؐ نے اجازت دی ہو۔ اور ایسے حضرات بہت تھوڑے تھے۔ ان میں سے ایک جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے اور اگر اسی طرح یہ لوگ سدھارتے چلے جاتے تو حضرتؓ عمر فاروقؓ

---

(1) محمد بن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، جلد 1، ص: 155

(2) ایضاً

(33ھ) کے خیال کے مطابق کوئی ایسا شخص باقی نہ رہ جاتا جو اس فریضہ کو سرانجام دیتا۔
اس صورتحال میں سوال یہ تھا کہ کیا قرآن کے مکتوبہ نسخے کو لوگوں کی ذاتی کوشش پر چھوڑ دیا جاتا۔ جس شخص سے چاہیں اور قرآن کا جو جزو چاہیں لکھ لیں اور جس طرح چاہیں لکھ لیں۔ اور اس کے ذریعے درس شروع کر دیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلتا اس کیلئے کسی باریک بینی کی ضرورت نہیں۔ ایک نہیں، ہزاروں نسخے تیار ہو جاتے کوئی مالک یوم الدین لکھتا کوئی ملک یوم الدین لکھتا اور پڑھتا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا چلا جاتا۔ طرزِ تحریر اور رسم الخط کا اختلاف فتنہ کا سبب بنتا جاتا۔

مصحف ابو بکر صدیق (13ھ) کی تیاری کا حقیقی سبب

جنگ یمامہ کے بعد تک کچھ حضرات کے پاس ان کے ذاتی نسخے موجود تھے مگر کوئی متفقہ سرکاری نسخہ موجود نہ تھا۔ جبکہ اسلامی ممالک کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے ایک سرکاری نسخۂ قرآن کی ضرورت بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی اس لئے گمان یہی ہے کہ لوگوں کو تلاوت کے لئے قرآن کے نسخوں کی ضرورت پیش آتی ہو گی وہ قرآن مجید کی نقلیں حاصل کر لیتے ہوں گے اور اپنے طریقے سے لکھ لیتے ہوں گے۔ ان حالات میں اگر معمولی فہم و فراست کے انسان کے سامنے بھی یہ مقصود ہو تا کہ ایک کتاب کے جو نسخے بھی تیار ہوں وہ ہر اعتبار سے حتّٰی کہ رسم الخط میں بھی ایک جیسے ہوں تو وہ کون سی راہِ عمل اختیار کرے گا۔ اس کیلئے صرف ایک ہی راہ ہے۔ یعنی ایک مستند نسخہ تیار کر کے اسے رائج کر دیا جائے۔ کنز العمال میں ایک روایت ہے کہ۔

"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ صحتِ تلفظ کا بھی بہت اہتمام کیا تھا اور ہر جگہ تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ قرآن کی تعلیم کے ساتھ صحت اعراب کی تعلیم بھی دی جائے اور فرمایا تھا کہ جو شخص علم لغت میں ماہر نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے" اس روایت کی روشنی میں یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) نہ صرف قرآن کا ایک متفقہ نسخہ امت کو دینا چاہتے تھے بلکہ قرآن کی تلاوت کا طریقہ اور انداز بھی سکھانا چاہتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ نسخہ حکومت ہی کی زیر نگرانی تیار کروایا جاتا۔ اور حکومت ہی کے زیر حفاظت رہتا۔ انہی شواہد سے اس بات کی بھی واضح طور پر نشاندہی ہو جاتی ہے کہ عہدِ صدیقیؓ میں قرآن کا مسئلہ، کتابتِ قرآن کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا وہ ایک مستند جامع اور سرکاری و متفقہ نسخے کی تیاری کا تھا۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کے مشورے سے حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے وہی کچھ کیا جس کا تقاضا حالات کر رہے تھے۔ اس اقدام کو صحابہؓ نے سراہا۔ اس سے اتفاق کیا۔ اگر یہ اقدام حقیقت پر مبنی اور وقت کی ضرورت نہ ہوتا تو صحابہؓ کرام کسی صورت بھی اس سے اتفاق نہ کرتے۔ حالات اسی بات کے

متقاضی تھے کہ ایک متفقہ سرکاری نسخہ بلاد وامصار میں رائج ہو۔ بے شک لوگ اپنے اپنے ذاتی مصاحف سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہیں۔ وہ جس قراءت اور لہجے میں چاہیں قرآن پڑھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک سرکاری متن بھی جاری کر دیا جائے۔ یہ کام عہدِ نبویؐ میں ہو چکا ہوتا اگر وحی کے نزول کا سلسلہ جاری نہ ہوتا۔ چونکہ حضورؐ کو اس بات کا کچھ علم نہ ہوتا تھا کہ آئندہ کیا وحی نازل ہونی ہوتی ہے۔ اسی لئے آپؐ نے قرآن مجید کو "بین الدفتین" جمع نہیں فرمایا تھا۔ اس کام کی تکمیل انقطاعِ وحی کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے مل کر فرمائی۔

اس وقت پہلے لکھے ہوئے قرآن مجید کو سرکاری اہتمام سے ایک سرکاری اور اجماعی متفقہ نسخے کی شکل میں بین الدفتین شکل دی گئی۔

اس نسخے کے تیاری کے وقت سبعہ احرف سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ ان دو ہی حقائق کو ذہن میں رکھا جائے تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اس نسخے کی تیاری کے بعد بھی کئی ایک لوگوں کے پاس ذاتی مصاحف موجود رہے تو اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں ہے۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ۔ ﴾ جس طریقے سے حاصل کی گئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی بھی آیت ایسی نہ تھی جو اس قرآن میں جمع ہونے سے رہ گئی ہو۔ گویا جہاں تک موادِ قرآن کے ایک ایک لفظ کو یکجا کر دینے کا تعلق ہے، 'مصحف صدیق رضی اللہ عنہ' بالکل مکمل مصحف تھا جس طریقے سے یہ مواد حاصل کیا گیا اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مصحف مستند بھی تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) نے شہادتوں کا جو اصول لازم قرار دیا تھا اس کا ذکر گزشتہ صفحات پر موجود ہے۔ لیکن چونکہ اس میں سبعہ احرف سے کوئی تعرض نہ کیا گیا اور نہ ہی اس کا پروگرام تھا تو کئی صحابہؓ چھوڑ، اگر ہر صحابیؓ کے پاس بھی اپنا نسخہ ہوتا تو بھی کسی قسم کے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے مشترکہ پروگرام کے مطابق قرآن جمع کرنے کے کام کا آغاز ہوا تو اس سے قبل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے گھر پر ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔[1]

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ)، حضرت عمر فاروقؓ (33ھ)، حضرت عثمانؓ (35ھ)، حضرت علیؓ، حضرت ابی ابن کعبؓ (22ھ)، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ (32ھ)، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ (68ھ)، حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ (73ھ)، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابن السائبؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت سعیدؓ، حضرت سالمؓ، حضرت

(1) صارم، عبد الصمد، تاریخ قرآن، ص:68

ابو ہریرہؓ (58ھ)، حضرت ابو زیدؓ ، حضرت عبد اللہ ابن صامتؓ ، حضرت ابو الدرداءؓ (32ھ)، حضرت ابو موسٰی اشعریؓ (30ھ)، حضرت عمرو بن العاصؓ ، حضرت زید ابن ثابتؓ۔ احمد بن ابی یعقوب معروف بہ ابن راضح (م292ھ) کی بیان کردہ ایک روایت کے مطابق پچاس انصاری صحابہ [1] اورابن ابی داود(م316ھ) کی روایت کے مطابق نفر یعنی ایک جماعت نے اس کاروائی میں حصہ لیا۔ [2]

ان تمام حضرات نے اس پروگرام کی تائید کی۔ اب اگر کوئی شخص حضرت علیؓ، حضرت اُبیّ بن کعبؓ (22ھ) یا حضرت ابن مسعودؓ (32ھ) کے بارے میں کچھ کہے تو اسکی بات ان اعتبار سے بے وزن ہے کہ یہ تمام حضراتؓ تو اس پروگرام کے تائید کنند گان میں شامل ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ابتداء میں انہوں نے حمایت کی لیکن بعد میں وہ اس کاروائی سے مطمئن نہ ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کہیں بھی کسی درجے کی کسی روایت مین اس بات کا ذکر ہمیں نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے "جمع صدیقی" پر کوئی اعتراض کیا۔ اس طرح کا کوئی اعتراض نہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے نسخے میں اور ان حضرات کے نسخوں میں سوائے "سبعہ احرف" کے اور کوئی اختلاف نہ تھا۔ ابن مسعودؓ (32ھ) نے "مصحف عثمانؓ" پر جو اعتراض کیا تھا وہ سبعہ احرف ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔

مستشرقین عہدِ صدیقی میں "باقاعدہ جمع قرآن" کی نفی کرتے ہیں۔ یہاں پر دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جنگ یمامہ کے ایک ہی واقعہ سے مستشرقین بالکل دو مختلف اور ایک دوسرے کے الٹ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس جنگ میں حفاظ کی شہادت کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) نے جو یہ فرمایا تھا کہ اگر حفاظ اسی طرح شہید ہوتے چلے گئے تو قرآن کی حفاظت مشکل ہو جائے گی ،" حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے اس قول سے ایک گروہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ گویا یمامہ میں جو حفاظ شہید ہو گئے ان کے حافظوں میں قرآن کے جو جو حصے تھے وہ تو ضائع ہو گئے اور اس طرح وہ حصے موجودہ قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ [3]

دوسرا گروہ اسی واقعہ سے اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ جنگ یمامہ میں جو لوگ شہید ہوئے ان میں کوئی خاص قابل ذکر حافظ موجود نہ تھا۔ بلکہ یہ شہداء تو نو مسلم تھے۔ [4] اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ عہدِ صدیقیؓ میں کتابت و جمع قرآن کا جو محرک بیان کیا گیا ہے کہ حفاظ کی شہادت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

---

(1) ابن واضح، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ الیعقوبی، جلد دوم، صفحہ 113، مطبعۃ الغری النجف ایران، 1358ھ۔

(2) ابن ابی داود، ابو بکر عبد اللہ، کتاب امصاحف، تحقیق آرتھر جیفری، مطبعہ رحمانیہ، مصر، طبع اول، 1936، صفحہ 11

(3) Bell, Richared, The origin of the Quran in its chrstian Envirment P.38-40

(4) Jeffery, Arthur, Material For the the History of the text of the Quran, P.I-IV

(33ھ) متفکر تھے، کوئی قابل ذکر محرک نہیں تھا۔ لہٰذا عہدِ صدیقیؓ میں ایسا کوئی نسخہ مرتب نہیں ہوا۔ جسے ہم کہہ سکیں کہ یہ کوئی متفقہ نسخہ تھا۔

جب ہم ثانی الذکر نقطہ نگاہ اور اس کے نتائج کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقطہ نگاہ بڑا قدیم ہے اور موجودہ دور سے قبل اسے (Fredrick Schwally) نے بیان کیا تھا۔[1] کسی بھی مستشرق نے زحمت گوارہ نہیں کی کہ یمامہ کے شہداء کی فہرست دیکھ کر اس بات کی تحقیق کرتا کہ یہ اعتراض کس حد تک درست ہے۔ طبری (310ھ) کا بیان ہے کہ جنگ یمامہ میں مدینہ طیبہ کے رہنے والے مہاجرین کی تعداد تین سو ساٹھ اور مدینہ طیبہ کے علاوہ دوسرے مقامات سے شامل ہونے والے مہاجرین تین سو تھے۔[2] ظاہر ہے کہ ان چھ سو ساٹھ افراد کے پورے نام تو تاریخ میں محفوظ نہیں رہے۔ البتہ ان میں سے اٹھاون انصار و مہاجرین کے اسمائے گرامی حافظ ابن کثیر (774ھ) نے نقل فرمائے ہیں۔[3]

مستشرقین کے اس نقطہء نگاہ، "کہ یمامہ میں شہید ہونے والوں میں خاص قابل ذکر حضرات موجود نہ تھے۔ اور شہداء عموماً نو مسلم ہی تھے۔" کا تنقیدی جائزہ حقائق کی روشنی میں لینے کیلئے ان اٹھاون میں سے چند حضرات کے بارے میں اختصار کے ساتھ چند باتیں پیش کرتے ہیں:

ان شہداء میں سے ایک حضرت سالم مولیٰ ابی خذیفہؓ ہیں۔ جو حافظ اور قاری ہونے کے اعتبار سے صحابہؓ میں ممتاز ترین مقام رکھتے تھے۔ حضورؐ نے بطورِ خاص جن حضراتؓ سے قرآن سیکھنے کا لوگوں کو حکم فرمایا تھا۔ ان میں ایک یہ بھی تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ رضی اللہ عنہ (33ھ) نے بھی ان کی اقتداء کی ہے۔ سفر میں بھی اکثر اوقات یہی صحابہؓ کے امام ہوتے تھے۔ کیونکہ انہیں "اقرأ" سمجھا جاتا تھا۔[4]

ان میں سے ایک حضرت زید بن خطابؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کے بھائی تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ رضی اللہ عنہ (33ھ) فرماتے ہیں کہ ہوا کا ہر جھونکا مجھے زید کی یاد دلاتا ہے۔[5]

ایک بزرگ حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ ہیں۔ آپ خطیب النبیؐ ہیں۔[6]

---

(1) Buhl, Encyclopaedia of Islam, (Article Koran), Vol II, P.1067

(2) طبری، ابن جریر، تاریخ الرسل و الملوک، جلد 2، ص:517

(3) ابن کثیر، محمد بن اسماعیل، حافظ، البدایہ والنہایہ، جلد 6، ص:340

(4) ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، جلد 2، ص:68،69

(5) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد ششم، مطبعہ السعادۃ، مصر، ص:336

(6) ابن قیم، زاد المعاد، معینیہ، مصر، جلد 1، ص:30

ایک اور بدری صحابی عباد بن بشر ہیں۔[1] حضرت عائشہؓ (57ھ) سے روایت ہے کہ یہ ان تین حضرات میں سے ایک ہیں جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے باقی صحابہؓ پر فائق تھے۔[2]

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ بھی انہی شہداء میں سے ہیں۔ آپ "اقرأ الصحابہ" حضرت ابی ابن کعبؓ (22ھ) کے شاگرد تھے۔[3]

حضرت زید ابن ثابتؓ کے بھائی حضرت یزید بن ثابتؓ[4] حضرت براء بن عازبؓ کے چچا حضرت قیس بن الحارثؓ۔ حضرت معاذؓ کے بھائی عائذ بن ماعضؓ۔ حضرت زبیرؓ کے بھائی سائب بن عوامؓ۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے بیٹے حضرت سائب بن عثمانؓ بھی انہی شہداء میں شامل ہیں۔

ان صحابہؓ کے علاوہ اٹھارہ مہاجرین کے نام ہیں۔ ان شہداء میں انصار کے بیس صحابہؓ ایسے تھے جو غزوہ بدر سے قبل مسلمان ہوئے تھے ان کے علاوہ دس صحابہ ایسے تھے جو غزوہ احد میں شریک تھے۔ یہ وہ حضراتِ گرامی ہیں جن کے اسماء ابن الاثیر الجزری نے (630ھ) الکامل فی التاریخ[5] میں اور ابن کثیر (774ھ) نے البدایہ والنہایہ میں پیش کئے ہیں۔[6]

یہ تفصیل ان شہداء کی ہے جن کے نام تاریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ باقی ناموں میں بہت نام ور شہداء کے ہوں گے لیکن Fredrick Schwally، M.Watt اور Richard Bell جیسے لوگ انہیں نو مسلم کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔

لہٰذا حقیقت بات یہ ہے کہ مستشرقین کے دونوں نقطہ ہائے نگاہ غلط ہیں کہ نہ جنگِ یمامہ کے شہداء کی وجہ سے قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہوا نہ ہی ایسی بات ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (13ھ) نے جو مصحف تیار کروایا وہ محض کسی بڑے مقصد کے بغیر تیار کروایا گیا۔ اس مصحف کی تیاری کا مقصد ایک اجماعی اور متفقہ مصحف کی تیاری تھا۔

دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ کیا عہدِ صدیقیؓ میں قرآن جمع کئے جانے کا یہ محرک ثابت ہو گا تو

---

(1) الاصابہ، جلد2، ص:255

(2) ایضاً

(3) ایضاً، جلد2، ص:217

(4) ایضاً

(5) ابن اثیر الجزری، الکامل فی التاریخ، جلد2، ص:140

(6) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد2، ص:334-340

تب ہی ہم جمع قرآن کی کاروائی کو تسلیم کریں گے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ محرک نہ بھی ہوتا تب بھی اس کاروائی کا وقوع پذیر ہونا ناگزیر تھا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یمامہ کے شہداء جمع قرآن کی کاروائی کا فوری محرک بنے تھے۔

اصل صورت احوال یہ تھی کہ بات صرف یمامہ کے شہداء ہی کی نہیں تھی بلکہ جنگوں کا سلسلہ جاری تھا۔ صحابہؓ، دین کیلئے قربان ہونے کیلئے بے تاب تھے اس ماحول میں اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے دل میں قرآن جمع کرنے کی فکر پیدا ہو گئی تو اس میں کوئی پریشانی کی بات نہ تھی۔ بلکہ یہ ان کی دور اندیشی تھی۔

قرآن میں تحریف اور حذف و اضافے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا کیونکہ اس وقت تک ہزاروں حفاظ کے سینوں میں اس کے الفاظ ترتیب توقیفی کے تحت محفوظ تھے۔ صرف چونکہ قبائل کی زبانوں میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ سبعہ احرف اور اختلافِ قراءت کے تحت بعض الفاظ مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت تھی۔ ان تینوں مواقع کی تفصیلات دیکھیں تو قرآن میں کوئی اختلاف ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتا تاریخِ قرآن کے تمام حقائق اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہیں۔ خالص تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقائق مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تائید نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں قابل ذکر ہیں۔

مارگولیتھ لکھتا ہے کہ۔ قرآن مجید کے بعض حصے اور آیات ناقص ہیں۔ حضرت زیدؓ نے قرآن کے کئی ٹکڑے قرآن سے نکال دیئے اور یہ ٹکڑے اب احادیث میں موجود ہیں۔ (1)

اس نقطہ نگاہ کارڈ کرنے کیلئے ہم مندرجہ ذیل حقائق پیش کر سکتے ہیں۔

اگر معاملہ ایسا ہوتا کہ جہاں جہاں سے یہ حصے توڑنے کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ حصے جو احادیث میں ملتے ہیں ان کی اور جہاں سے وہ توڑے گئے ان کے مضامین میں یکسانیت پائی جاتی تو تب بھی کم از کم قابلِ بحث و قابل توجہ ہوتی۔ مگر یہ اعتراضات محض وہم و گمان کی بنیاد پر کئے گئے ہیں۔ اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاتی کہ قرآن کی فلاں آیت یا ٹکڑا ناقص ہے اور فلاں حدیث میں جو فلاں بات کی گئی ہے وہ پہلے قرآن کا جزو تھا۔ اگر اس عبارت کو اس ناقص فقرے کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس کے ملنے سے ایک کامل فقرہ بن جاتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ ٹکڑے جو احادیث میں بیان کئے گئے ہیں ان کیلئے کوئی ایسی جگہ قرآن مجید کے اندر نہیں ملتی کہ جہاں انہیں رکھا جا سکے۔ اسی سے ان ٹکڑوں کی اصل حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ حصے جنہیں قرآن کے حصے قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت

---

(1) Margoliuth, D.S, (Article Koran) Encyclopaedia of Rligin and Ethics, Vol X, P. 543

چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یا تو ان سے بعض فقرات کا یہ مفروضہ نقص دور ہو جاتا یا ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت پائی جاتی۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ عبارتیں جن کا ذکر احادیث میں ہے نہ تو فرضی نقص کو پورا کرتی ہیں نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی کوئی بات پائی جاتی ہے جو حصے معترضین کے خیال کے مطابق گم ہو گئے تھے ان کا تو نام ونشان تک نہیں ملتا اور جو احادیث میں عبارتیں پائی جاتی ہیں وہ گم شدہ حصوں میں سے نہیں ہیں۔ کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ (اور اس سے ایک دانش مند آدمی ایک مفید نتیجہ پر نہیں پہنچتا) ایک چیز کے گم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے وہ چیز یا اس کے کچھ اجزاء برآمد ہو گئے ہیں مگر جب اس برآمد شدہ چیز کو دیکھا جاتا ہے تو یہ قطعاً اس چیز کا حصہ ثابت نہیں ہوتا جس کے گم ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔

پھر کیا یہ بات بھی تعجب انگیز نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بعض حصے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (35ھ) نے قرآن مجید سے نکالے اور حضرت علیؓ خود ہی ان کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے مگر وہ اپنی فضیلت کے حصوں کو دوبارہ قرآن میں درج نہ کر سکے پس یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اعتراض خود ہی اپنے اندر تضادات کا حامل ہے۔ اس بات کا بھی قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے کئی ایسے حصوں کو قرآن مجید میں شامل کر دیا جنہیں داخل قرآن کرنے کا حضورؐ کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اس نقطہ نگاہ کی بنیاد محض مستشرقین کا وہم ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کا اہتمام صرف کتابت سے نہیں ہوا بلکہ اصل چیز حفظِ قرآن تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے حافظوں میں سے بھی یہ آیات نکال دی ہوں۔ اگر جمع قرآن کا کام صرف حضرت زید رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوتا تو شاید کسی کو شبہ ہو جاتا لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کام ایک کمیٹی کے سپرد تھا اور لوگوں سے قرآن کا کوئی حصہ لیتے وقت ایک معیار بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا تو کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لاتعداد روایات کی روشنی میں بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی صحابی نے صحیفہ ءابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ان روایات سے ہمیں جو اطلاع ملتی ہے اسے یقیناً متفقہ شہادت کہا جاسکتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس سلسلے میں دو مواقع پر شامل ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا قرآن حفظ کرنا۔ ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم کا موجود ہونا جنہوں نے براہ راست قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ ان سب شواہد کی روشنی میں اس بات کا کوئی شبہ وامکان باقی نہیں رہ جاتا کہ قرآن میں حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے کوئی گڑبڑ کر دی ہو گی۔ اگر سرمو غلطی ہو بھی جاتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً اس کی نشاندہی فرمادیتے۔ قرآن کی حیثیت محض ایک کتاب ہی کی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ لوگوں کا فقید المثال لگاؤ بھی تھا۔ وہ ان کی زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا

بن چکا تھا۔ وہ حضور ﷺ کے اس فرمان سے آگاہ تھے۔ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھا کرو۔ اگر کسی نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہوا ہو تو اسے چاہئے کہ اسے مٹا دے اور جو قرآن کے اس اعلان سے باخبر تھے۔

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ﴾[1]

﴿ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ﴾[2]

یعنی ہم ہی اس قرآن کو نازل کرنے والے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ اور باطل اس میں کسی طرح داخل نہیں ہو سکتا۔

آج کے اس دور میں اس بات کا کوئی امکان عملاً اور اصولاً ممکن نہیں کہ کوئی قرآن میں سر مو تبدیلی کر سکے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں تو ایسی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اگر ایک سے غلطی ہو جاتی تو دوسرا لازمی طور پر اس کی اصلاح فرما دیتا۔ ہم جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قرآن جمع کرنے اور پھر نسخ مصاحف کے وقت ایسی امکانی غلطیوں کی اصلاح کے اتنے بڑے ذرائع موجود تھے کہ غلطی کا امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ چہ جائیکہ اس کا وقوع ثابت کیا جا سکے۔

اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں تھا کہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے کچھ ایسی آیات قرآن میں شامل کر دیں جو اس سے قبل منسوخ ہو چکی تھیں۔ کیونکہ اگر کوئی آیت منسوخ ہو گئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے کہ کوئی کہے کہ فلاں ملک کا فلاں قانون منسوخ ہو گیا ہے اور اس ملک کی عدالت کا کوئی جج اس کی منسوخی سے واقف نہیں تھا اور اس جج نے منسوخ حکم کے مطابق فیصلہ کر دیا اور کسی کے علم میں ہی یہ بات نہ آئی کہ یہ فیصلہ تو غلط ہوا ہے اور اسی منسوخ شدہ حکم کو قانون کی دستاویز میں ہمیشہ شامل رکھا گیا اور اسے خارج نہیں کیا گیا۔ کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ منسوخ شدہ حکم کے مطابق ہی انتظامیہ عمل کرتی رہی۔ اگر ایسا ممکن نہیں ہو سکتا تو پھر اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا کہ قرآن کا ایک حکم منسوخ ہو چکا مگر زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ، ان کی کمیٹی، جس میں اکابر صحابہ کرام شامل تھے۔ خلیفہ وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے علاوہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے بے خبر ہی رہے۔ اگر ایک آدھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بات ہوتی تو ہم شاید اس بات کو تسلیم کر لیتے لیکن جمع قرآن کا یہ کام ساری امت کا اجتماعی مسئلہ تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن اور حضور ﷺ کی ذاتِ

---

(1) الحجر:9

(2) حم السجدۃ:42

گرامی سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اگر کوئی صحابی رضی اللہ عنہ تھوڑے عرصے کیلئے کہیں باہر جاتا تو واپسی پر اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ میری عدم موجودگی میں کونسی آیت یا کونسا حکم نازل ہوا ہے۔ اس اعتراض کی نفی مندرجہ ذیل نکات بھی کرتے ہیں۔

i. یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ دعویٰ کی آخر کوئی نہ کوئی دلیل تو ہونی چاہیے۔ لیکن بغیر دلیل کے اعتراض کیا گیا ہے۔ لہٰذا عدم دلیل کی وجہ سے اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

ii. اس طرح تو پھر ہر کوئی جس آیت کا چاہے انکار کر سکتا ہے اور کہہ دے کہ میں فلاں آیت کو زائد سمجھتا ہوں۔

iii. حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو آخر کیا مشکل پڑی تھی کہ وہ کسی آیت کو قرآن سے نکالتے۔ آخر اس کاروائی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیے تھا۔

iv. اگر یہ کاروائی محض فردِ واحد کی کاروائی ہوتی تو شاید اس قسم کی بدگمانی کی کوئی گنجائش نکل آتی لیکن اس مقصد کیلئے تو کمیٹی کام کر رہی تھی۔

v. اس وقت اہل بیت رضی اللہ عنہم کے حفاظ بھی تو موجود تھے۔ اگر ان کے مناقب قرآن سے خارج کئے تو وہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کام سے روک سکتے تھے۔

vi. ایسی متعدد روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کاروائی میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ شریک تھے۔ اس صورت میں مذکورہ صدر خدشہ کی کوئی عقلی گنجائش باقی نہیں ہے۔

مستشرقین نے عہدِ نبویؐ کے بعد قرآن مجید میں جن جن مقامات پر اضافوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک ''سورۃ الصفّ'' کی آیت ﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ﴾ ہے۔ یہ آیت سورۃ الصفّ میں (بقول ان کے) عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بڑھائی گئی۔ [1] مستشرقین نے یہ نقطہ نگاہ اختیار کرتے وقت اس بات پر غور نہیں کیا کہ حضورؐ کی رسالت کی تصدیق (جو کہ اس آیتِ مذکورہ بالا کا موضوع ہے) خود ان کے اپنے موجودہ مقدس صحیفوں توراہ اور انجیل میں بھی موجود ہے جنہیں یہ غیر محرف سمجھتے ہیں مستشرقین کے اس نقطہ نگاہ کا ایک پس منظر ہے۔ ان میں سے جو مذہباً عیسائی ہیں ان کیلئے سورۃ الصفّ کی یہ آیت ایک ناقابل عبور سمندر ہے۔ اور اس مشکل کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ اس آیت کو بعد کی الحاقی آیت قرار دے دیا جائے اس لفظ 'احمد' کا پس منظر انجیل کی وہ آیت ہے جس میں مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے نبی کی پیش گوئی فرمائی جو انجیل کی اپنی زبان میں 'فارقلیط' اور اس کے قدیم ترجمے میں 'احمد' ہے۔ اگر مسیحی

---

(1) حسین ہیکل، حیاۃ محمد، (مقدمہ): ص 28

مستشرقین اسی طرح تسلیم کر لیتے تو جس طرح ان کے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت مسیحؑ پر ایمان لانا ضروری تھا اسی طرح حضرت مسیحؑ کے بعد "احمد" کو بھی نبی تسلیم کرنا لازم قرار پاتا۔ مگر ان کا ایسا تسلیم کر لینا اسلام کا اقرار کر لینا تھا۔ جس سے ان کی روح انکار کرتی ہے۔ (1)

سورۃ الصفّ کی آیت مذکورہ کے الحاقی ہونے کے بارے میں مستشرقین یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت قرآن میں توراۃ وانجیل سے لے کر شامل کی گئی ہے تاکہ حضورؐ کی رسالت کی دلیل حاصل کی جاسکے۔ (2)

اس غلط نقطہ نگاہ کی تردید میں ہم یہی کہیں گے کہ کیا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن میں اضافہ کرنے کیلئے انجیل سے ایک آیت کی بھیک مانگتے جس کی اثر آفرینیوں اور اعجاز نے قیصر و کسریٰ کو ان کے آبائی تخت سے دھکیل کر خود اس پر تسلط قائم کیا۔ انہی اثر آفرینیوں کے نتیجے میں بے شمار ممالک کے باشندے حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے ہیں۔ ماضی میں عیسائیوں پر مسلمانوں کا سیاسی عروج علمی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے ناقابل تردید ہے۔ بخلاف ازیں توراۃ وانجیل کی تقدیس اور قرآن کی تحریف ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید کسی منطقی دلیل سے نہیں کی جاسکتی ان دونوں کتابوں کے زورِ بیان سے قرآن میں اضافہ وتصحیف کے دعویٰ پر نہ تو تاریخ سے شہادت پیش کی جاسکتی ہے نہ عقل ودانش اس کی تائید کرتے ہیں۔ (3)

کتاب کے دیگر مقامات پر اس سلسلے میں تفصیلی روایات پیش کر دی گئی ہیں کہ قرآن محض لکھی ہوئی عبارات کا نام نہ تھا۔ بلکہ یہ سینوں میں محفوظ تھا۔ عبارت میں تو تبدیلی کر دی گئی لیکن آخر حافظوں کو کون بدل سکتا تھا؟ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو کسی معمولی سی بات پر خلیفہ سے باز پرس کر لیا کرتے تھے کیا وہ خاموش ہی بیٹھے رہے اور ان کے سامنے قرآن میں تحریف ہوتی گئی؟

قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عالمِ اسباب میں بھی اس سلسلے میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ایک شوشے میں بھی سرمو تبدیلی کرنے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ قرآن مجید میں تحریف ثابت کرنے کیلئے مختلف لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد تاریخی استدلال پر نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں محض حقائق سے لاعلمی ہی کار فرما نظر آتی ہے۔ قرآن مجید کو ایک محفوظ کتاب ثابت کرنے کیلئے ہمیں دو باتیں ثابت کرنی ہوں گی :

i. قرآن مجید میں کوئی حرف یا آیت یا آیت کا حصہ بڑھایا نہیں گیا۔

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

قرآن مجید میں سے کوئی حرف یا آیت کا حصہ گھٹایا نہیں گیا۔

ii. اوّل الذکر پہلو پر کوئی معتبر یا غیر معتبر روایت نہیں پائی جاتی۔ اس سلسلے میں تو کوئی غیر اصلی روایت بھی موجود نہیں ہے۔ کسی بھی زمانے میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ فلاں آیت یا آیت کا فلاں حصہ جو اس وقت قرآن میں پڑھا جاتا ہے۔ حضورؐ کے وقت قرآن میں موجود نہیں تھا۔

سوائے اس روایت کے جو عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ (32ھ) کے بارے میں ہے کہ وہ "معوذتین" کو قرآن میں شامل نہیں سمجھتے تھے۔ اس روایت کے بارے میں اختلافِ مصاحف کے باب میں یہ بات دلائل کے ساتھ ثابت وواضح کر دی گئی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی طرف یہ نسبت غیر مصدقہ ہے وہ معوذتین کو قرآن کا حصہ سمجھتے تھے۔ (اس سلسلے میں تفصیلات 'اختلاف مصاحف' کے باب میں پیش کی گئی ہیں۔)

اس کے علاوہ ایسی ایک روایت بھی موجود نہیں جس سے مذکورہ بالا پہلو پر کوئی دلیل موجود ہو۔ جب ہم یہ بات استدلال کی بنیاد پر تسلیم کر لیتے ہیں کہ قرآن میں کچھ بڑھایا نہیں گیا تو یہ ثابت کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی کمی بھی نہیں کی گئی۔ کیونکہ اول الذکر امر کا ثبوت ثانی الذکر امر کے ثبوت کا ممد ہے۔ قرآن میں کچھ نہ بڑھانے کے جو اسباب و وجوہ تھے۔ وہی نہ بڑھانے کے بھی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اگر قرآن بے احتیاطی سے لکھا گیا کہ اس میں سورتیں یا آیات لکھے جانے سے رہ گئیں تو اس کا اثر دوسرے پہلو پر بھی ہونا چاہئے تھا۔ یعنی اگر قرآن سے کچھ گھٹایا گیا تھا تو بڑھایا بھی جا سکتا تھا۔ ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ جس احتیاط نے قرآن میں کچھ زیادتی نہیں ہونے دی وہی احتیاط اس میں سے کچھ کم نہ ہو جانے کا سبب بنی۔

مستشرقین اور ان کے ایک مشرقی ساتھی، پادری برکت اللہ نے قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں سے عہدِ صدیقی کے حوالے سے ایک اعتراض یہ ہے کہ جب حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) اور حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) نے فرمایا کہ قرآن جمع کریں تو انہوں نے اس ذمہ داری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کام کے مقابلے میں مجھے پہاڑ اٹھانے کا حکم دیا جاتا تو یہ کام میرے لئے آسان ہوتا۔[1] حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس تبصرے سے پادری برکت اللہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ کام ناممکن تھا کہ اس عہد میں قرآن جمع کیا جا سکتا۔ اگر اس عہد میں یہ کام ممکن نہ تھا تو اب اس کا امکان کیوں کر ہو سکتا ہے کہ قرآن کا اصل متن حاصل کیا جا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہاڑ اٹھانے کا محاورہ کبھی بھی ناممکن کام کیلئے استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ محاورہ

---

(1) برکت اللہ پادری، صحت کتب مقدسہ، ص 292-293

مشکل کام کیلئے مستعمل ہے۔ اس میں زید ابن ثابتؓ کا مقصد یہ نہ تھا کہ قرآن جمع کرنا ناممکن کام تھا اور مجھے وہ سپرد کر دیا گیا ہے۔

بلکہ اس محاورے سے ان کی مراد اس کام کی اہمیت کا اظہار تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور حضورؐ کا یہ فرمان بھی آپ کے ذہن میں تھا کہ جس نے کلام اللہ میں وہ کہا جو اس میں نہیں تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا۔ اس کے علاوہ صحابہؓ کا قرآن اور سنت کے بارے میں عام احتیاطی رویہ بھی پیش نظر رہے تو زید ابن ثابتؓ کے بیان کو سمجھنا مزید آسان ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ روایت بیان کرنے میں بے حد محتاط تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ)، حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) اور کئی ایک دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے احادیث کی ایک خاصی بڑی تعداد صرف اس احتیاط کے تحت لوگوں کے سامنے بیان نہیں کی کہ کہیں وہ ایسی بات روایت نہ کر دیں جو حضورؐ نے نہیں فرمائی اور وہ اسے روایت کر کے "من كذب علی متعمدًا فليتبوأ مقعده من النار..."[1] کی وعید کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا بیان بھی اسی ذہنی پس منظر میں تھا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے مستشرقین کے اعتراضات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور دلائل کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ ان اعتراضات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حقائق ان اعتراضات اور ان کے نتائج کا ساتھ نہیں دیتے۔

اس سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں ثابت کر سکتے ہیں کہ ان اعتراضات کی کوئی حیثیت نہیں ہے:

☆ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ اسکی حفاظت مضبوط اور قطعی الدلات شہادت سے واضح ہے۔ ان قطعی دلائل کے مقابلے میں اس قسم کے خیالات کو محض وہم ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے تمام اعتراضات کے پیچھے مستشرقین کے ظن و تخمین اور قیاسات کارفرما ہیں۔ ظاہر ہے کہ قطعی دلائل کے مقابلے میں ظن و تخمین کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مستشرقین کی کتب سے لاتعداد ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جہاں وہ مسلمہ دلائل کے ساتھ قرآن کے محفوظ ہونے کے مقابلے میں possibily Perhaps, may have, might have کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

☆ قرآن فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے اس کی عبادت میں موجود ایجاز و اعجاز کے نکات کو بڑے بڑے اہلِ زبان ہی سمجھ سکے ہیں جو لوگ اس کی زبان کو سمجھ سکے وہ اس کے اعجاز کا اعتراف کئے بغیر رہ نہیں سکے

---

(1) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی، حدیث نمبر 110، ص: 12

لیکن مستشرقین جو اول تو عربی زبان سے آگاہ نہیں یا عربی جانتے بھی نہیں تو وہ صلاحیت اور ذوق سے محروم ہیں جو قرآن کی زبان کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے ان میں سے اگر کوئی شخص اُٹھ کر کہہ دیتا ہے کہ مجھے فلاں سورۃ ادھوری نظر آتی ہے اور وہ کہہ دیتا ہے کہ اصل فقرہ کچھ اور ہو گا۔ لیکن اس کے مقابلے میں حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو کچھ سکھایا وہ سب کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حفظ کر لیا۔ اس کے مقابلے میں یہ بات ایک وہم ہے۔ معتبر تاریخی شواہد کے مقابلے میں اس قسم کی باتیں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ جب حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن لکھا اس وقت انہوں نے لوگوں کے حافظے سے بھی مدد لی تھی۔

کیا قرآن مجید سب سے پہلے سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ نے جمع کیا تھا؟[1]

ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں کہمس کے طریق پر ابن بریدۃ سے روایت کیا ہے کہ ابن بریدہ نے کہا" پہلا شخص جس نے قرآن کو مصحف کی شکل دی وہ سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ تھے۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس وقت تک چادر نہیں اوڑھوں گا جب تک میں قرآن جمع نہ کر لوں۔ چنانچہ انہوں نے قرآن جمع کر لیا۔۔ اس کا نام رکھنے میں سب کا اتفاق ہو گیا کہ اس کا نام مصحف ہو گا۔[2]

اس نقطہ نگاہ کے ردّ کیلئے ہم مندرجہ ذیل نکات پیش کر سکتے ہیں:

1. علامہ جلال الدین سیوطیؒ (911ھ) فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند منقطع ہے۔[3]
2. جب حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے قرآن مجید جمع کرنے کیلئے کاروائی کا آغاز کیا اس وقت جن صحابہؓ کی مجلس شوریٰ کا اجلاس حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کے گھر پر ہوا۔ ان صحابہؓ میں سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ بھی تھے۔
3. اس وقت جو مسئلہ در پیش تھا اسے سمجھ لیا جائے تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہتی کہ سالمؓ نے پہلے قرآن جمع کیا تھا۔ اکیلے سالمؓ کی کیا بات ہوئی اس وقت تو لاتعداد صحابہؓ کے پاس ذاتی نسخے موجود تھے۔

اس وقت اصل مسئلہ یہ تھا کہ تمام صحابہؓ کے اتفاق رائے سے ایک سرکاری اور مستند نسخہ تیار کیا جائے۔ اس سرکاری نسخے کی تیاری اور صحابہؓ کے ذاتی مصاحف میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ذاتی نسخے تو اس متفقہ

---

(1) Burton, John, Collection of The Quran.p.116

(2) الاتقان، جلد 1، ص: 78

(3) ایضاً

نسخے کی تیاری کے بعد بھی موجود رہے۔ اس نسخے کی تیاری سے پہلے جن جن لوگوں کے پاس ذاتی مصاحف موجود تھے ان کے اسمائے گرامی دوسرے مقام پر بیان کئے گئے ہیں ان لوگوں میں حضرت ابو الدرداءؓ(32ھ)۔ حضرت معاذابن جبلؓ(18ھ)۔ حضرت زید ابن ثابتؓ۔ حضرت ابو زیدؓ۔ حضرت ابی ابن کعبؓ(22ھ)۔ حضرت ابن عمرؓ(73ھ)۔ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری(30ھ)۔ حضرت عمرو بن العاصؓ۔ حضرت سعد بن عبادہؓ۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (32ھ)۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ۔ حضرت تمیم داریؓ۔ حضرت مجمع بن جاریہؓ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ)اور حضرت علیؓ نے قرآن مجید لکھا تھا۔ حضرت زید ابن ثابتؓ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کیلئے قرآن لکھا تھا۔[1] تاریخ المصاحف کے مطالعے کے بعد اس سے بھی زیادہ صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی معلوم کئے جاسکتے ہیں جنھوں نے عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید لکھ کر محفوظ کیا تھا۔ اس ابتدائی عہد میں جب کہ لکھنے پڑھنے کی استعداد رکھنے والے لوگ بہت کم تھے، اس قدر کثرت سے قرآن مجید لکھے جاچکے تھے کہ ان کے ناموں کا احصاء خاصا مشکل ہے۔ اس صورت میں صرف ایک روایت پکڑ کر تشکیک پیدا کرنے کا کوئی جواز نہیں بلکہ علمی و تحقیقی بد دیانتی ہے۔

مستشرقین کے نقطہ نگاہ "قرآن کا متن متنازع ہے" کا تحقیقی جائزہ

ابن ابی داوٗد کی بعض روایات کی بنیاد پر مستشرقین نے تاریخ قرآن پر اعتراضات کئے ہیں جبکہ موصوف کی کتاب المصاحف کی تمام روایات کو سامنے رکھ کر ہی کوئی رائے اور فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے۔ دراصل اس کتاب اور اس جیسی دیگر کتب میں ہر طرح کی روایات موجود ہیں صحیح بھی ہیں اور سقیم بھی، ثقہ بھی ہیں اور غیر ثقہ بھی۔ یہ کام محقق کے ذمہ ہے کہ وہ ان روایات میں فرق و امتیاز کرے۔ مستشرقین نے اس قسم کی کتب سے روایات لے کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید دور اوّل ہی سے متنازعہ چلا آرہا ہے۔[2]

مستشرقین کے پیدا کردہ اس ابہام کی مدلل وضاحت اس باب کے شروع میں کر دی گئی ہے۔

کیا مصحف صدیقی کی سرکاری حیثیت اس سے متاثر ہوتی ہے کہ اسے حضرت حفصہؓ کے پاس رکھا گیا؟

عہدِ صدیقؓ اکبر میں قرآن مجید کے ایک مستند سرکاری نسخہ کی تیاری کا انکار کرتے ہوئے

---

(1) ایضاً

(2) Jeffery, Arthur, Material for The Histroy of the Text The Quran,ii,iii, (preface)

مستشرقین نے ایک دلیل یہ دی ہے کہ یہ نسخہ تو حضرت حفصہؓ کے پاس چلا گیا۔ اگر اس کی حیثیت ایک سرکاری نسخے کی ہوتی تو اسے سرکاری تحویل میں ہونا چاہئیے تھا۔ ان کے اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس میں حقیقت بیانی بھی موجود نہیں ہے۔ جب یہ نسخہ عہد صدیقیؓ میں تیار ہو گیا تو اسکے بعد وہ فوری طور پر تو حضرت حفصہؓ کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ اپنی تیاری کے بعد یہ سرکاری تحویل میں رہا۔ حضرت حفصہؓ کے پاس تو یہ اس وقت گیا جب حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کی بھی وفات ہو گئی۔[1]

حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کی وفات پر حضرت حفصہؓ کے پاس اس لئے بھیجا گیا کیونکہ خلافت کا مسئلہ ابھی طے نہ ہوا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے تو حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا اور خلافت کا مسئلہ طے کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ لیکن ان کے بعد صورتحال ایسی نہ تھی بلکہ خلافت کا مسئلہ کئی روز تک زیر بحث رہا۔ اس لئے ایسی صورتحال میں اسے حضرت حفصہؓ کے پاس رکھ دیا گیا۔ خلافت کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد حضرت عثمان غنیؓ (35ھ)، حضرت حفصہؓ کے مقام و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے واپس نہیں لائے۔

پروفیسر منٹگمری واٹ اور رچرڈ بل کے اس زیر بحث نقطہ نگاہ کی نفی اس اعتبار سے بھی ہو جاتی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے بعد تو یہ نسخہ حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) ہی کے پاس گیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ایک کڑی یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کو اخفاء میں رکھنے کی وجہ سے تو خود مستشرقین اپنے ہی ہاتھوں اپنے مؤقف کی تردید کیلئے ہمیں دلیل مہیا کر رہے ہیں۔ جب اس کتمان اور اخفاء کا راز کھلتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے بعد یہ نسخہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے پاس گیا تھا تو ہمیں خود بخود دلیل میسر آجاتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) کے پاس اس نسخے کا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نسخہ سرکاری نسخہ تھا۔ اگر سرکاری نسخہ نہ ہوتا تو یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے ورثاء کو آپ رضی اللہ عنہ کے دیگر سامان کی طرح مل جاتا۔

حضرت حفصہؓ کا اس نسخے کے بارے میں طرز عمل بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سرکاری نسخہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (35ھ) نے جب ان سے ایک مقصد کے تحت اس نسخے کا مطالبہ کیا تو اسے امت کی امانت سمجھتے ہوئے انہوں نے واپس کر دیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر تیسرے مرحلہ میں اس نسخے کے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس جانے سے اس نسخے کی سرکاری حیثیت متاثر ہوئی تھی تو پھر دوسرے

---

(1) فتح الباری، جلد 9، ص: 13-12

مرحلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) کے پاس رہنے سے اس کی سرکاری حیثیت ثابت کیوں نہیں کی جا سکتی؟

عہدِ صدیق رضی اللہ عنہ میں قرآن جمع کرنے کی نوعیت اور طریقِ کار کو سمجھ لیا جائے تو بہت سے اعتراضات اور خدشات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

مستشرقین کا یہ نقطہ نگاہ کہ عہد نبوت کے فوراً بعد قرآن مجید میں اختلافات ظاہر ہو گئے تھے، ایک تاریخی غلط بیانی ہے۔ مستشرقین یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، عہد صدیقی رضی اللہ عنہ اور عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کی بار بار ضرورت اس لئے پیش آتی رہی کہ قرآن مجید صحیح طور پر جمع نہیں ہو رہا تھا۔ ہر موقع پر اس میں کوئی نہ کوئی سقم رہ جاتا تھا۔ اور ہر بار جمع کرنے کے بعد اس میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ اسی گڑبڑ کے ازالے کیلئے بار بار کوشش کرنی پڑتی تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں مواقع پر قرآن مجید کے جمع کئے جانے کی نوعیت مختلف تھی۔ تینوں مواقع پر قران مجید جمع کرنے کے مقاصد بھی مختلف تھے۔ مثلاً

☆ قرآن مجید عہد نبویؐ میں لکھا ہوا مکمل اور مرتب شکل میں موجود تھا۔ لیکن سرکاری طور پر ایک نسخہ موجود نہ تھا۔

☆ عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں ایک بین الدفتین نسخہ تیار کیا گیا۔ لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذاتی مصاحف بھی باقی رہے۔

☆ عہدِ عثمانی رضی اللہ عنہ میں 'جمع قرآن' کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ دور دراز کے علاقوں میں قرآن کے مختلف الفاظ کو پڑھنے میں لوگوں میں اختلافات پیدا ہونے لگے تھے۔

مستشرقین نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا ہے کہ وہ قرآن مجید میں تحریف ثابت کر سکیں۔ گذشتہ صفحات میں اس سلسلے میں جن اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی حیثیت محض الزامات و اتہامات کی ہے۔ ان اعتراضات کو شبہ کہنا بھی درست نہیں ہو گا۔ ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ عقلی اعتبار سے بھی ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان اعتراضات کو دیکھ کر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کے پس منظر میں یا تو تاریخ قرآن سے لاعلمی کارفرما ہے یا جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی تاریخ کو اس وقت تک صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جب تک ہم صحابہؓ اور ان کے بعد کے دور کے لوگوں کے قرآن مجید کے ساتھ جذباتی لگاؤ کو نہ سمجھیں۔

قرآن مجید کی تدوین کوئی ایسی کاروائی نہ تھی کہ جو ایک یا دو یا تین آدمیوں کی انفرادی کاروائی ہو اور خفیہ طور پر کسی جگہ بیٹھ کر جمع و تدوین کا کام کر لیا گیا۔ بلکہ وہ باقاعدہ تشکیل دی گئی ایک کمیٹی تھی جو اس

زمانے کے منتخب اور مختلف قبائل کے سربراہ اور افراد پر مشتمل تھی جو علم، تقویٰ اور حضورؐ سے تعلق میں ممتاز تھے۔ ان کی نگرانی میں آیاتِ قرآنیہ کی کتابت اور مصحف قرآن مرتب کرنا شروع کیا گیا کہ زمانہ رسالت میں کتابت شدہ آیات لانے والے لوگ اس کے ساتھ شہادت بھی پیش کر رہے تھے۔ ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ ابتداء میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے کس طرح قرآن جمع کیا تھا۔ شہادتوں کی بنیاد پر قرآن جمع کیا گیا۔ یہ شہادتیں کس طرح کی تھیں۔ جو آیات لکھی جارہی تھیں وہ حفاظ کے سینوں میں موجود تھیں ایک ایک صحابیؓ ان کی روزانہ تلاوت کرتا تھا۔ نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔ دوسروں کو قرآن کی تعلیم دی جارہی تھی۔ جب اس اہتمام کے ساتھ قرآن کی کتابت ہوئی ہو کہ مجلس خاص نے اس کی نگرانی کی۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک لفظ بھی اس سے کم رہ گیا ہو۔ چہ جائیکہ پوری پوری سورتیں اور تقریباً گیارہ ہزار آیات حذف کر دی گئیں۔ عقلاً اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ جس قرآن کی جمع وتدوین کے وقت دس ہزار سے زائد حفاظ صحابہؓ موجود ہوں اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ)، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) یا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) اپنی من مانی کر لیتے۔ بالفرض اگر ایک آیت ہی کم رہ جاتی تو مدینہ کے ایک ایک گلی کوچہ سے صحابہؓ قطار در قطار مسجدِ نبویؐ کے سامنے آکر لوگوں کو بتاتے کہ اے مسلمانو! دیکھو یہ آیت قرآن میں نہیں لکھی گئی۔

حالانکہ اہل بیت میں سے کبھی بھی کسی نے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ فلاں فلاں آیت قرآن میں شامل ہونے سے رہ گئی ہے۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ قرآن کا ایک بڑا حصہ نکال دیں اور کوئی شخص آواز ہی نہ اٹھائے۔ حالانکہ یہ لوگ تو قرآن و اسلام کے شیدائی تھے۔ قرآن و اسلام کی حفاظت انہیں ہر چیز سے عزیز ہوگی۔ ان کے ان احساسات و جذبات کی موجودگی میں دو تین آدمی ملی بھگت سے قرآن میں اس قدر تبدیلیوں کے مرتکب ہو گئے اور کسی نے آواز تک نہیں اٹھائی۔ جس چیز کی حفاظت کیلئے انہوں نے جہاد کیا۔ مشقتیں برداشت کیں۔ مال خرچ کیا۔ خاندان اور وطن کو چھوڑا۔ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرلینے سے گریز نہیں کیا۔ اس میں دو تین آدمیوں کی ملی بھگت نے اس قدر تغیرات پیدا کر دیے اور کسی نے بولنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔

قرآن مجید ایسی کتاب نہ تھی کہ جو لوگوں کی الماریوں کی ہی زینت ہو بلکہ لوگ اسے باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ ابیؓ بن کعبؓ (22ھ) مسجد نبویؐ میں قرآن سناتے اور تمام اکابر صحابہؓ ان سے قرآن سنتے۔ کسی بھی روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت علیؓ ان لوگوں میں موجود نہ ہوں لامحالہ وہ بھی ان صحابہؓ میں شامل ہوں گے۔ یہاں دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ابیؓ بن کعبؓ (22ھ) یا تو وہ قرآن پڑھتے ہوں گے (بقول مستشرقین) جس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے تحریف کر ڈالی تھی یا آپ وہ پڑھتے

ہوں گے جو صدیقیؓ قرآن سے مختلف اور طویل تھا اور جس میں مناقب اہل بیت کا ذکر تھا۔ دونوں صورتوں میں سے ایک صورت تو یقیناً ہوئی ہوتی۔ یا تو حضرت علیؓ (40ھ) کو ابی ابن کعبؓ (22ھ) پر اعتراض کرنا چاہیے تھا یا دیگر حفاظ صحابہؓ انہیں بتلاتے کہ آپ جو قرآن پڑھ رہے ہیں وہ اصل قرآن نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا اور تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی تو پھر اس بات کو تسلیم کر لینا ہمارا فرض ٹھہرتا ہے کہ قرآن میں کسی کے نزدیک بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔ قرآن سب کے نزدیک ایک ہی تھا۔ اس میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اگر کوئی حافظ دورانِ تلاوت ایک لفظ بھی چھوڑ دے تو بلا امتیاز عمر و مقام اور منصب اسے ایک معمولی بچہ بھی ٹوکتا ہے۔ اس لئے یہ بات عقل کے اعتبار سے بھی قابل قبول نہیں ہے کہ جس قرآن کو حضرات صحابہؓ نے حضورؐ کے زمانے میں سنا ہو اسے حفظ کیا ہو کوئی شخص بعد میں آکر اس میں تحریف کر ڈالے۔

پانچواں باب

جمع عثمانی اور مستشرقین

عہدِ عثمانی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن

کیا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۳۵ھ) نے سیاسی مصلحت اور مقاصد کے تحت قرآن مجید کا نسخہ تیار کروایا تھا؟

کیا ابن مسعود رضی اللہ عنہ (۳۲ھ)، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (۳۵ھ) کے مصحف سے متفق نہ تھے؟

***

جمع عثمانی اور مستشرقین

مصحفِ عثمانیؓ پر اعتراضات کے سلسلے میں نولڈکے (Noldeke)(1836-1930) کے نقطہ نگاہ کو دیگر لوگوں نے اپنایا ہے اور یہ نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) سے قبل قرآن مجید کا کوئی معیاری اور مرتب نسخہ موجود نہ تھا اور مصحفِ عثمانؓ، مصحفِ صدیقؓ کی نقل ہی تھا۔ لہٰذا اگر مصحفِ صدیقؓ صحیح نہ تھا تو مصحفِ عثمانؓ کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ [1] رچرڈ بل (Richard Bell)-(1876-1952) نے کہا ہے کہ قرآن مجید عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ ابو بکر صدیقؓ (13ھ) میں اختلافات کا شکار تھا اور مصحفِ عثمانیؓ، مصحفِ صدیقؓ کی نقل ہونے کی وجہ سے ناقص ہی ہے۔ [2]

منٹگمری واٹ (1909-2006) کہتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں قرآن مجید کے متفرق اجزاء کو اکٹھا نہیں کیا جا سکا تھا۔ [3] S.E. Frost (1899-1978) کہتے ہیں کہ قرآن مجید، حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بارہ برس بعد تک بھی جمع نہیں ہو سکا تھا حضرت عثمانؓ نے اس مسئلے کے حل کا حکم دیا کہ آپ ﷺ کی اصل تعلیمات کا کھوج لگایا جائے۔ [4]

اس وقت جو نسخہ معرض وجود میں آیا وہ دیگر مذاہب، زرتشت۔ یہودیت اور عربی روایات کے علاوہ عوامی داستانوں کے ردی ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ [5]

Encyclopaedia of Islam میں Koran کے مقالہ نگار Buhl کا بھی نقطہ نگاہ یہی ہے کہ مصحفِ عثمانؓ، مصحفِ صدیقؓ کی نقل تھا لیکن ساتھ ہی کہتا ہے کہ مصحفِ صدیقؓ کوئی باقاعدہ مرتب نسخہ نہ تھا۔ [6] آرتھر جیفری (1892-1959) کہتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک قرآن مجید کے

---

(1) Noldeke, Theodor, Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit, P.51.

(2) Bell, Richard, Introduction to The Quran, Edinburgh, 1963. P. 40-43.

(3) Watt, Montgomery, Mohammad at Makka, Oxford 1953. P.9

(4) Frost , S.E., The Sacred Writings of world's Great Religions, P.307

(5) Buhl, Encyclopaedia of Islam, Lieden, E.J.Brill, 1978.vol.II,P.1067.

(6) IBID.

اصل متن کا تعین نہ ہوسکا۔ لوگ مختلف طریقوں سے قرآن مجید پڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد ابن مجاہدؒ نے متن قرآن مجید کا تعین کیا وہ یہ تاثر دیتا ہے کہ ایک طویل عرصہ تک متن متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس میں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہو گا۔ یہ مستشرق لکھتے ہیں کہ متنِ قرآن مجید کے تعین کا مسئلہ ابھی تک مسلمانوں کے ہاں اپنے بچپن کے دور میں ہے۔ (1) بہل یہ اعتراض بھی کرتا ہے کہ نوآموز اور ناتجربہ کار کاتبوں کی طرف سے کچھ لاپرواہیاں اور غلطیاں ہوئیں۔ (2) نولڈیکے (Noldeke) (1836-1930)، حضرت عثمان غنیؓ کی تدوین قرآن کی ساری کاروائی کو مشکوک بناتے ہوئے کہتا ہے:

> As to how they were conducted we have no trustworthy information, tradition being here too much under the influence of dogmatic presuppositions.(3)

مستشرقین، حضرت عثمان غنیؓ کے تیار کروائے ہوئے نسخے کی حیثیت کم کرنے کے لئے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ نے ساری کاروائی سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کی۔ ورنہ جمع قرآن کی کوئی حقیقی ضرورت نہ تھی۔

> But essentially political object of putting an end to controversies by admitting only one form of the common book of religion and of law this measure was necessary.(4)

بلاشر (5) (Régis Blachère)(1900-1973) اور آرتھر جیفری (6) (Arthur Jeffery)(1892-1959) نے بھی یہی نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے۔

اس طرح کا ایک اعتراض یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اس کمیٹی کے باقی تینوں ممبران

---

(1) Jeffery, Arthur, Material for Histroy of The Text of The Quran, P.I

(2) IBID, P.I, Buhl, Encyclopaedia of Islam, vol II, P.1067

(3) Sketches from Eastern History , P. 51

(4) IBID, P.50 Nicholson, Literary History of The Arabs, Unwin London, 1907

(5) بحوالہ حقانی، عبدالحق، مولانا، البیان فی علوم القرآن (مقدمہ تفسیر حقانی)، دارالاشاعت تفسیر حقانی دہلی 1932، صفحہ 258؛ صبحی صالح، ڈاکٹر، مباحث فی علوم القرآن، صفحہ 280-279

(6) Material for Histroy of The Text of The Quran, P.5

قریشی تھے۔ یہ تینوں حضرات طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت عثمان غنیؓ کے رشتہ دار تھے۔ اس لئے یہ سب لوگ ایک مشترکہ مصلحت کی خاطر متحد ہو گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ کا تلفظ قرآن کا معیار بنے۔ اور حضرت زید بن ثابتؓ ان کے ہم نوا بن گئے اور وہ ان کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ جانتے تھے کہ وہ قریش کے خواص میں سے نہیں ہیں۔ (1)

اس مصحف پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے مخصوص مقاصد کے سلسلے میں قرآن مجید کے کچھ حصے اس سے خارج کر دیئے۔ نولڈیکے (Noldeke)(1836-1930) لکھتا ہے:

It seems to me highly probable that this second redaction took this simple form, Zaid read off from the codex which he had previously written......(2)

اسی بنیاد پر وہ قرآن مجید کے موجودہ نسخے کو نامکمل قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Othman's Koran was not complete. Some passages are evidently fragmentry and few detached pieces are still extent which was originally part of the Koran. Although have been omitted by Zaid. Amongst these are some which there is no reason to suppose Mohammad desired to suppress.(3)

وہ مزید لکھتا ہے:

Zaid may easily have overlooked a few stray fragments, but he purposly ommited any thing he believed to belong to the Koran is very unlike.(4)

بل (R.Bell) اور ٹوری (Torrey)(1883-1956) کی پیروی میں جیفری (-1892

---

(1) البیان فی علوم القرآن، صفحہ 258، صبحی صالح، صفحہ 280-279

(2) Sketches from Eastern History, P.50

(3) IBID, P.52

(4) IBID, P.52

1959) بزعم خود ان کے انتقادِ اعلیٰ (Higher Criticism) کے اصولوں کا نصوص قرآن پر اطلاق، کا دعویٰ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی نامزد کمیٹی نے سرکاری نسخہ میں قرآن کے نام سے جو مواد جمع کیا وہ یقیناً! محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے درست طور پر منسوب ہے ماسوائے چند آیات کے جن کی اسناد مشکوک ہیں۔ تاہم کمیٹی نے ایک بہت بڑا مواد جو اس وقت کے اہم علمی مراکز میں پائے جانے والے قرآنی نسخہ جات میں موجود تھا، کو نظر انداز کر دیا اور ایسا بہت سارا مواد قرآن میں شامل کر دیا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب کے حتمی شکل دینے کا موقع ملتا تو وہ اس مواد کو شامل نہ کرتے۔[1] وہ کہتا ہے۔

"اب یہ امر تقریباً ناممکن ہے کہ ہماری نسل قرآنی متن کا حقیقی تنقیدی نسخہ دیکھ سکے"[2]

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جیفری (1892-1959) مصحف عثمانی میں جس مواد کے شامل کیے یا نا کیے جانے کا خیال بڑی معصومیت کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کی کوئی ایک مثال بھی صحیح اسناد کے ساتھ پیش نہیں کر سکا۔ اختلاف قراء ات پر مبنی روایات کا جو ذخیرہ اس نے اپنی کتاب (Other Materials) میں پیش کیا ہے ان روایات کی اسناد خود جیفری (1892-1959) کے اعتراف کے مطابق مکمل ہیں اور نہ مستند[3] جیفری (1892-1959) قرآن حکیم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ثابت کرتے ہوئے قرآن کے پیرا یہ اظہار کو غیر واضح اور غیر معیاری کہتا ہے مگر اس بارے میں وہ اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کرتا۔[4]

قرآن حکیم کو بائبل کی طرح ایک مقدس کتاب قرار دیتے ہوئے جیفری (1892-1959) یہ باور کراتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے بھی اچھے مقاصد اور نیک نیتی کے ساتھ متن قرآن میں کچھ تبدیلیاں اور اس کی بہتری کے اقدامات تجویز کر دیئے ہونگے۔[5] بد قسمتی سے جیفری (1892-1959) اس امر کا اندازہ نہیں کر سکا کہ قرآن حکیم کے متن میں کمی بیشی کرنا اسلامی نقطہ نظر سے اتنا بھاری جرم ہے کہ کوئی اس کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر بغرض محال کوئی ایک اس کا ارتکاب کر بھی بیٹھتا تو صحابہ کرام کی

---

(1) Arthur, Jeffery, The Koran: selected Suras, P.14,15

(2) Jeffery, The Quran as Scripture. "The Textual History of the Quran", P.103

(3) Material for the History of the text of the Koran, P.8

(4) IBID, P.21

(5) اکرم، چوہدری، ڈاکٹر، اختلاف قراءآت قرآنیہ اور مستشرقین (آرتھر جیفری کا خصوصی مطالعہ)، فکر و نظر، اسلام آباد، جلد 34، شمارہ 3، صفحہ 71

جلیل القدر جماعت اسے قطعاً برداشت نہ کرتی۔[1]

تاویل القرآن کے مؤلف، ضربت عیسوی نے اسی بات کو دہراتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے وہ تمام آیات قرآن سے خارج کر دیں جن میں اہل بیت کے مناقب بیان کئے گئے تھے۔ اسی طرح کہا گیا کہ قرآن مجید میں کچھ منافقین کے نام تھے۔ اب ان لوگوں کی اولادیں مسلمان ہو گئیں تو مصلحت کی خاطر ان کے نام قرآن سے نکال دیے گئے۔[2]

یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ سورۃ التوبۃ کی آیت ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾[3] حضرت ابو خزیمہؓ کے علاوہ کسی کے پاس سے نہ ملی۔[4]

اس روایت سے بھی مستشرقین یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاید اس طرح کی اور بھی آیات شامل قرآن ہونے سے رہ گئی ہوں۔ Tritton(1973) لکھتا ہے کہ دو ایسی سورتیں ہیں جو اس سے قبل موجود تھیں لیکن اب نہیں ہیں۔[5]

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے نسخے کے علاوہ دیگر تمام مصاحف جلوا ڈالے اس طرح قرآن مجید کا بہت سا حصہ اس عمل میں ضائع ہو گیا اور قرآن کا حقیقی متن اگر ہم جاننا چاہیں بھی تو نہیں جان سکتے۔[6]

اس سلسلے میں آرتھر جیفری(1892-1959) نے ابن ابی داوود کی کتاب المصاحف کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ما قبل عہد عثمان" کی قراءتیں اب ضائع ہو چکی ہیں۔[7] یہی موقف Encyclopaedia of Islam کے مقالہ نگار نے اختیار کیا ہے۔[8] پادری فنڈر(Funder) نے

---

(1) ایضاً

(2) ضربت عیسوی، تاویل القرآن، پنجاب سوسائٹی، لاہور، 1921ء، ص: 106-107

(3) التوبۃ: ۱۲۸

(4) ایضاً، ص: 106-107

(5) Tritton, A.S, Islam Belief and practice, Hutchnison London, 1962. P. 60

(6) Sketches from Eastern History, P. 52

(7) Material for Histroy of The Text of The Quran, P. 10

(8) Buhl, vol. II, P. 1073

میزان الحق میں اسی نقطہ نگاہ کو اپنایا ہے۔ [1]

مارگولیتھ (Margoliouth)(1858-1940) کا خلاصہ تحقیق بھی یہی ہے۔ [2]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ تو ایک متفقہ متن اور متفقہ تلفظ تیار نہ کر سکے۔ [3] اگرچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانِ غنیؓ نے اختلافات ختم کرنے کے لیے باقی نسخے جلوا دیے تھے۔ لیکن اختلافات ختم کرنے کے لیے جلانے یا ضائع کرنے کا یہ عمل بالکل بے اثر تھا۔ کیونکہ قرآن مجید تو لوگوں کے حافظے میں موجود تھا۔ [4] مقالہ نگار لکھتا ہے کہ

الف: اس مصحف کی تیاری کے بعد بھی دیگر مصاحف موجود رہے۔ [5]

ب: اس طرح قرآن مجید کے متن میں اختلافات بھی موجود رہے۔ [6]

ج: مصحفِ عثمان غنیؓ حقیقی قرآن نہیں ہے۔ اور اس مصحف کی کوئی ترتیب بھی نہ تھی۔ [7]

د: جو مصاحف دیگر ممالک کو روانہ کیے گئے ان میں بھی ہم آہنگی نہ تھی۔ [8]

In this way there arose a perplexing confusion of readings and in place of the striving for uniformity that one would have expected people became accustomed to unlimited liberty in these matters so that did not hesitate to substitute for particular words their synonyms or to insert short explainatory additions. This freedom was all the more unbredled in its development as the unmayed caliphs had

---

(1) فنڈر، پادری، میزان الحق، ص: 44-36

(2) Margoliuth, D.S. Mohammadanism, Butterworth London, 1928 P.70

(3) Buhl, vol. II, P. 1073

(4) Buhl, vol. II, P.1073

(5) Introduction to the Quran, P. 42-44

(6) IBID. P. 42-44

(7) IBID. vol II, P. 1073

(8) IBID. vol II, P. 1073

little feeling on such question and preferred to take care that passions were not aroused by state interference in such matters.[1]

Encyclopaedia of Islam کے مقالہ نگار نے تفسیر طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ خود بھی اپنے تیار کروائے ہوئے نسخے کو مستند اور صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک آیت پڑھی جس میں اصل متن کے علاوہ کچھ اضافی الفاظ بھی تھے۔[2] اس بنا پر مقالہ نگار لکھتا ہے:

If this is correct it is no wonder that others took still greater liberties. Various circumstances contributed to the continual variations in the form of the text.[3]

نولڈیکے (1836-1930) لکھتا ہے کہ اس میں slight clerical errors باقی رہ گئیں تھیں۔[4]

مارگولیتھ (Margoliuth)(1858-1940) (بقول اس کے) اس ابہام اور اغلاط کے بارے میں لکھتا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کو حضرت عثمان غنیؓ نے اس لئے کام پر لگایا کہ انتہائی ابہام کی موجودگی میں وہی اس متن کی وضاحت کر سکتے تھے۔ اس کے الفاظ میں:

Perhaps because in the extreme ambiguity and imperfection of the arabic script he alone could interpret the first edition with certainity.[5]

پادری فنڈر نے یہ اعتراضات نقل کئے ہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن کا متن تیار کروایا۔ حالانکہ شیعہ انہیں کافر قرار دیتے ہیں۔

اگر اصل قرآن اور حضرت عثمان غنیؓ کا قرآن ایک ہی تھا تو دوسرے قرآنوں کو جلایا کیوں گیا؟

---

(1) IBID. vol II, P. 1073

(2) IBID, vol II, P.1073

(3) IBID. vol II, P. 1073

(4) Sketches from Eastern History, P.53

(5) Mohammadanism, P.70

شیعہ کہتے ہیں کہ قرآن کو خود گم کر دیا گیا۔ (1)

ان تمام افکار و آراء کا بنیادی نقطہ نگاہ یہی ہے کہ مصحفِ عثمان غنیؓ بھی ناقص ہی تھا۔ اس میں تصرفات بھی کر دیئے گئے اور اس کی ترتیب بھی بدل دی گئی۔

عہدِ عثمانیؓ میں جمع قرآن

حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ حکومت تک اسلامی مملکت وسیع علاقے تک پھیل چکی تھی۔ اور عرب کے علاوہ عجم کے علاقے اسلامی حکومت کا حصہ بن چکے تھے۔ قرآن مجید لوگوں کا مرکز و محور تھا۔ لوگوں کی سہولت کے لیے قرآن کے بعض الفاظ ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت بھی موجود تھی۔ دوسری طرف 'سبعہ احرف' بھی موجود تھے۔ صحابہؓ ان سات حروف کے ساتھ قرآن پڑھا کرتے تھے۔ صحابہؓ نے اپنے شاگردوں کو بھی انہی کے مطابق پڑھایا۔ جب اسلامی مملکت کی حدود عجم تک وسیع ہوئیں تو صحابہؓ ان علاقوں میں بھی پھیل گئے۔ ہر مفتوحہ علاقے میں سرکاری طور پر معلمین متعین کئے جاتے تھے۔ (2) اس طرح معلم صحابہؓ کے ذریعے سبعہ احرف کے مطابق قرآن پڑھنے والے صحابہؓ عرب و عجم کے وسیع علاقے میں پھیل گئے۔ جب تک لوگ سبعہ احرف کی حقیقت سے آگاہ تھے اس وقت تک مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن جن لوگوں پر یہ بات واضح نہ تھی کہ سبعہ احرف کی سہولت کا اصل مقصد کیا تھا۔ اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف میں نازل ہوا ہے تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے کھڑے ہونے لگے۔ بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے۔ ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر اور جائز قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے دوسری طرف یہ مسئلہ بھی تھا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ، جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، کے علاوہ پورے عالم اسلام میں کوئی معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لیے معیار اور حجت بن سکے۔ کیونکہ اس نسخے کے علاوہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ اس لئے جھگڑوں کے حل کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت درست اور کونسی غلط ہے؟ متن قرآن کی بنیاد پر کسی اختلاف سے بچنے کے سلسلے میں یہ عظیم الشان کارنامہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں رونما ہوا۔ ان کے اس کارنامے کی

---

(1) فنڈر، پادری، میزان الحق، ص: ۳۶۔۴۰

(2) بخاری، کتاب فضائل قرآن، باب جمع القرآن، حدیث نمبر 4987، الاتقان، جلد 1، ص: 61

تفصیلات روایات میں موجود ہیں۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں مصروف تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے۔ چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے پاس حاضر ہوئے اور پوری صورت حال واضح کی۔ انہوں نے خلیفہ سے کہا کہ قبل اس کے کہ یہ امت کتاب اللہ کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کا شکار ہو جائے، آپ اس اختلاف کا علاج فرما لیں۔ میں آرمینیہ کے محاذ پر مصروف جہاد تھا کہ میں نے دیکھا کہ شام کے رہنے والے لوگ ابی ابن کعبؓ کی قراءت میں پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی، اس بنا پر وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔[1]

اس سلسلے میں علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں

ان حزیفة قدم من غزوة فلم یدخل بیته، حتی اتی عثمان فقال یا امیرالمومنین ادرك الناس قال وما ذاك قال غزوت ارمینیته فاذا اهل الشام یقرؤن بقراءة ابی ابن کعبؓ فیاتون بمالم یسمع اهل العراق واذا اهل العراق یقرؤن بقراءة عبداللہ ابن مسعود فیاتون بمالم یسمع اهل الشام فیکفر بعضهم بعضا۔۔[2]

”حضرت حذیفہؓ کی ایک غزوہ سے واپسی ہوئی تو واپسی پر وہ اپنے گھر میں داخل نہیں ہوئے تا آنکہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے امیر المومنین لوگوں کی خبر لیجئے۔ انہوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے کہا میں لڑائی کے سلسلے میں آرمینیہ گیا تو معلوم ہوا کہ اہل شام ابی ابن کعبؓ کی قرأت میں پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی اور اہلِ عراق عبد اللہ ابنِ مسعودؓ کی قراءت میں پڑھتے ہیں جسے اہلِ شام نے نہیں سنا ہوتا۔ اس اختلاف کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔“

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا واقعہ بخاری شریف میں یوں بیان ہوا ہے۔

عن ابنِ شهاب ان انس بن مالك حدثه ان حذیفة بن الیمان قدم علیٰ عثمان وكان یغازی اهل الشام فی فتح ارمینیة واذر بیجان مع اهلالعراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القرائة، فقال حذیفة لعثمان، یا امیر المومنین ! ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاریٰ، فارسل عثمان الیٰ حفصة ان

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 78

(2) عمدۃ القاری، جلد دوہم، صفحہ 16، باب جمع القرآن

ارسلی الینا بالصحف نفسحنها فی المصاحف، ثم نردھا الیك فارسلت به حفصة الی عثمان، فامرزید ابن ثابت وعبد الله ابن زبیر و سعید بن العاص وعبد الرحمن بن الحارث بن ہشام فنسخوھا فی المصاحف وقال عثمان للرھط القرشیین الثلاثة: اذا اختلفتم انتم وزید ابن ثابت فی شی من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فانه انما نزل بلسانھم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف، ردّ عثمان الصحف الی حفصة، وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وابه بھما سوا من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق[1]

ترجمہ: "حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عثمانؓ کے پاس آذر بائیجان کے معرکے کے بعد حاضر ہوئے انہیں قراءت قرآن میں باہمی اختلاف نے بہت پریشان کیا تھا۔ حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا اے امیر المومنین! اس امت کی خبر لیجئے قبل اس سے کہ وہ اپنی کتاب میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کرنے لگیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس قرآنِ حکیم کے نوشتہ صحیفے اور اجزاء بھیج دیں ہم انہیں نقل کرلیں گے اور ایک مصحف کی شکل میں جمع کرلیں گے پھر انہیں آپ کی طرف لوٹا دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے۔ حضرت عثمانؓ نے زید ابنِ ثابتؓ، عبد اللہ ابن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبد الرحمن بن حارث بن ہشامؓ کو متعین فرمایا کہ وہ ان صحائف کو ایک مصحف میں نقل کریں۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اور حضرت عثمانؓ نے جماعتِ قریش کے تینوں افراد (عبد اللہ ابن زبیر، سعید بن العاص، اور عبد الرحمن بن حارث) کو فرمایا کہ جب تم اور زید بن ثابتؓ میں قرآن کریم کی کسی آیت کے لکھنے میں اختلاف ہو تو پھر اسے لغتِ قریش میں لکھنا کیونکہ قرآن لغتِ قریش میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ ان حضرات نے اسی پر عمل کیا۔ یہاں تک کہ جب یہ حضرات ان صحائف کو نقل کر چکے تو حضرت عثمانؓ نے ان اصل صحائف کو حضرت حفصہؓ کی طرف واپس لوٹا دیا۔ اور ہر علاقے میں ایک ایک مصحف ارسال کر دیا اور یہ حکم صادر فرما دیا کہ ان کے علاوہ جو مجموعے اور صحیفے لوگوں کے پاس لکھے ہوئے موجود ہوں ان کو جلا دیا جائے۔"

حضرت عثمانؓ کے عہد میں پیدا ہونے والے ان اختلافات کے بارے میں ابنِ اِشتہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے:

اختلفوا فی القرآن علی عھد عثمان حتی اقتتل الغلامان والعلمون فبلغ ذالك

(1) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث نمبر 4987 (کتب الستہ)

عثمان بن عفان فقال عندی تکذبون و تلمنون فیه فمن نأی عنی کان اشد تکذیباً واکثرلحناً یا اصحاب محمد اجتمعوا فاکتبوا للناس اماناً[1]

چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے اسی وقت لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ ارشاد فرمایا کہ:

أنتم عندی تختلفون فیه وتلحنون فمن نأی عنی من أهل الأعصار أشد فیه اختلافاً وأشد لحناً، اجتمعوا یا أصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! فاکتبوا للناس إماماً[2]

تم لوگ مدینہ منورہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب واختلاف کرتے ہوں گے۔ لہٰذا تم لوگ مل کر قرآن کریم کا ایک ایسا نسخہ تیار کرو جو سب کے لیے واجب الاقتداء ہو۔

مصحف عثمان غنیؓ کے بارے میں اس وضاحت سے صاف طور پر واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید کا ایک مصحف تیار کروانے کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے اپنی سیاسی پالیسی یا ذاتی مقاصد کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ آذر بائیجان سے واپسی کے فوراً بعد حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا امیر المؤمنین کے پاس آنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اس اختلاف سے بڑے پریشان تھے۔ پھر انہوں نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے سامنے یہ مسئلہ اس انداز سے پیش کیا کہ وہ بھی اس کی سنگینی کو فوراً سمجھ گئے۔ اس صورتحال میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی اور انفرادی مصاحف ختم کر کے قرآن کریم کے معیاری نسخے عالم اسلام میں نہ پھیلائے گئے تو زبردست فتنہ رونما ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے مندرجہ ذیل کام کئے۔

قرآن کریم کے سات معیاری نسخے تیار کروائے اور انہیں مختلف اطراف میں روانہ کیا۔ یہ سات نسخے در حقیقت حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) والے نسخے کی نقل تھے۔ متن کے اعتبار سے ان دونوں مصاحف میں کوئی فرق نہ تھا۔ صرف رسم الخط کا فرق تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کا تیار کروایا ہوا مصحف ہی مصحف عثمان کی بنیاد تھا۔ اس میں قریش کی لغت کو بنیاد بنایا گیا۔ ان مصاحف کا رسم الخط ایسا رکھا کہ اس میں ساتوں حروف سما سکیں۔ چنانچہ یہ مصاحف نقاط اور حرکات سے خالی تھے اور انہیں سبعہ احرف میں سے ہر حرف کے مطابق پڑھا جا سکتا تھا۔ جتنے انفرادی نسخے لوگوں کے پاس موجود تھے ان

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 78

(2) فتح الباری، جلد 9، ص: 15

سب کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اگر لوگوں کے انفرادی نسخے باقی رہتے تو اختلاف کی بنیاد باقی رہتی۔ لوگ پھر بھی الگ الگ نسخوں کو بنیاد بنائے رکھتے۔ اس لئے انہیں ختم کرنا ہی قرین مصلحت تھا۔

یہ پابندی عائد کر دی کہ آئندہ جو نسخے لکھے جائیں وہ اسی کے مطابق تیار کئے جائیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے تیار کردہ نسخے میں الگ الگ سورتیں تھیں۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے ان سورتوں کو مرتب کر کے ایک مصحف کی شکل دے دی۔ (1)

ان اقدامات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام عالم اسلام میں رسم الخط اور ترتیب سوَر کے اعتبار سے تمام مصاحف میں یکسانیت ہو۔ اس بات کی وضاحت حضرت علیؓ (40ھ) کے ایک قول سے ہو جاتی ہے۔ جو ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں نقل کی ہے:

قال علی: لا تقولوا فی عثمان إلّا خیراً، فواللہ! ما فعل الذی فعل فی المصاحف إلا عن ملإ منا۔ قال: ما تقولون فی ھٰذہِ القرائۃ فقد بلغنی أن بعضھم یقول: إن قرائتی خیر من قرائتك وھذا یکاد أن یکون کفراً۔ قلنا: فما تری؟ قال: أریٰ أن نجمع الناس علی مصحف واحد فلا تکون فرقۃ ولا اختلاف۔ قلنا: فنعم ما رأیت (2)

"حضرت علیؓ (40ھ) نے فرمایا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلائی کے علاوہ نہ کہو کیونکہ انہوں نے اللہ کی قسم مصاحف کے بارے میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا۔ انہوں نے ہم سب سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ان قراءتوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے حالانکہ یہ ایسی بات ہے کہ جو کفر کے قریب تر پہنچتی ہے۔"

اس پر ہم نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے کہا کہ "پھر آپؓ کی رائے کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تا کہ کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے۔ ہم سب نے کہا کہ آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی۔"

---

(1) سیوطی، جلد 1، ص: 61

(2) کتاب المصاحف، ابوبکر بن أبی داود السجستانی عبد اللہ بن سلیمان بن الأشعث (م ۳۱۰ھ) تحقیق: محمد بن عبدہ الناشر: الفاروق الحدیثۃ، القاھرۃ، مصر العربیۃ، ۱۴۲۳ھ، باب ۱، ص: ۹۷

اس روایت میں حضرت عثمان غنی ؓ (35ھ) کے الفاظ' أن نجمع الناس علی مصحف واحد' ہمارے موضوع کے اعتبار سے خاص توجہ کے حامل ہیں کہ آپ نے یہ ارادہ ظاہر فرمایا کہ ہم ایک مصحف تیار کرنا چاہتے ہیں جو پورے عالم اسلام کے لیے یکساں اور معیاری ہو اور اس کے بعد کسی صحیح قراءت کے انکار یا منسوخ یا کسی شاذ قراءت پر اصرار کی کسی کے پاس گنجائش باقی نہ رہے۔

مولانا تقی عثمانی نے مصحف عثمانی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی تیاری کے وقت بنیادی طور پر انہی صحیفوں کو سامنے رکھا گیا جو حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے زمانے میں لکھے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کیلئے وہی طریق کار اختیار فرمایا جو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں انہیں دوبارہ طلب کیا گیا۔ اور مصحف لکھتے وقت ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کیا گیا۔ اس مرتبہ سورۃ الاحزاب کی ایک آیت: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی [1]۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی۔ کیونکہ حضرت زید ابن ثابت فرماتے ہیں۔

فقدت اية من الاحزاب حين نسخنا قد كنت اسمع رسول الله ﷺ يقرأ بها فالقسناها فوجدناها مع خزيمة بن ثابت الانصاري ؓ [2]

مجھے یہ مصحف لکھتے وقت سورۃ الاحزاب کی آیت نہ ملی۔ جو میں رسول ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ ہم نے اسے تلاش لیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے زمانے میں جو صحائف لکھے گئے، ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں بھی یہ آیت شامل تھی۔ لیکن چونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اس وقت تک نہیں لکھی جب تک ان تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی۔ اسی طرح دوسری آیات تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں۔ لیکن سورۃ الاحزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خذیمہ بن ثابتؓ کے کسی اور کے پاس

---

(1) تقی، عثمانی، مولانا، علوم القرآن، صفحہ 191

(2) فتح الباری، جلد نہم، صفحہ 17

الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی[1]۔ یہ تمام تفصیلات مولانا تقی عثمانی نے پیش کی ہیں[2]۔

(اس سلسلے میں مزید معلومات کیلئے پی ایچ ڈی کے مقالہ 'تدوین قرآن مجید پر مستشرقین کے اعتراضات کا محققانہ جائزہ' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔)

علامہ مقری اپنی کتاب نفح الطیب میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے تیار کروائے ہوئے مصحف پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

هٰذَا مَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مِنْهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَعَبْدُ اللهِ ابْنُ زُبَيْرٍ وَسَعِيْدُ بْنُ الْعَاصِ[3]

اس کے بعد دیگر صحابہؓ کے نام بھی درج ہیں جنہوں نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے اس کام پر اجماع کیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو امت مسلمہ میں عظیم محقق اور بلند پایہ عالم کی حیثیت حاصل ہے ہمارے اس موضوع زیر نظر کے بارے میں آپؒ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند صالح بندوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس کی جمع و تدوین کی خدمت سرانجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہ قرآنی پر متفق ہو جائیں اور عظیم جماعتیں اس کی تعلیم و تلاوت میں مشغول رہیں تاکہ سلسلہ تواتر ٹوٹ نہ جائے۔ اس کی تکمیل اس طرح ظہور میں آئی کہ عہدِ عثمان غنیؓ میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ اور اجماع سے تمام مصاحف میں سے ایک مصحف (جو عثمانؓ نے مصحف صدیقؓ سے نقل کر کے تیار کروایا تھا) پر اتفاق کیا گیا۔ جس میں شاذ قراء تیں نہیں لی گئیں بلکہ متواتر قراء تیں ہی لی گئیں اور قبائل عرب کی سات زبانوں (سبعہ احرف) میں سے جن پر قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ (اور اس کے پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی ان لوگوں کو جو لغت قریش کے پڑھنے سے عاجز ہوں) ایک لغت قریش کو لے لیا گیا اور باقی لغات کے مصحف متروک کر دیئے گئے۔"[4]

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 78

(2) تقی، عثمانی، 191

(3) مقری، نفح الطیب، ج1، ص: 398

(4) شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء، ج2، ص: 5

شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ کہ، صحابہؓ کے 'مشورہ اور اجماع' سے ایک نسخہ تیار کیا گیا، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے یہی بات ثابت ہوئی کہ یہ کاروائی حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا ذاتی کام نہ تھا بلکہ صحابہؓ ان کے ساتھ شامل تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جمع قرآن کا کام بلاوجہ نہیں کیا تھا نہ ہی اس میں آپؓ کا کوئی خصوصی مخفی مقصد تھا۔ مصحفِ عثمان غنیؓ کوئی نئی چیز نہ تھا بلکہ یہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے نسخہ کی نقل تھا۔

ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے پورے اہتمام سے تمام مسلمانوں کی شمولیت اور اجماع سے ایک متفقہ سرکاری نسخہ قرآن تیار کروایا تھا تو حضرت عثمان غنیؓ کو 'جمع قرآن' کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل تفصیل سے بھی مل جاتا ہے۔

جمع صدیقؓ اور جمع عثمانؓ میں فرق بیان کرتے ہوئے علامہ ابن التین کہتے ہیں:

"حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے جمع کرنے میں یہ فرق تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے اس خوف سے جمع کیا تھا کہ قرآن کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ کیونکہ وہ اس وقت متفرق و منتشر صحیفوں میں تھا۔ انہوں نے ان سب اوراق کو لے کر آیات اور سورتوں کی اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب کے مطابق حضور ﷺ نے لکھوایا تھا اور پڑھایا تھا ایک شیرازہ میں جمع کر دیا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جب وجوہ قراءت میں لوگوں کو اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت قرآن کو صحیح قراءت کے ساتھ جو عرضہ اخیرۂ کے مطابق تھی اور جس کی صحت میں مطلق شبہ نہ تھا نقل کرا دیا تا کہ اختلافاتِ قراءت رفع ہو جائیں۔ انہوں نے ترتیب میں نہ تقدیم کی نہ تاخیر۔ نہ اس میں کسی تاویل کو دخل دیا۔ صرف قراءت میں لوگوں کے شبہ یا فساد کرنے سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔" [1]

اسی طرح کے مزید بیانات علامہ ابن التین[2]، قاضی ابو بکر[3] اور علامہ محاسبی[4] اور علامہ عینی

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 78

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ کہ، صحابہؓ کے 'مشورہ اور اجماع' سے ایک نسخہ تیار کیا گیا، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے یہی بات ثابت ہوئی کہ یہ کاروائی حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا ذاتی کام نہ تھا بلکہ صحابہؓ ان کے ساتھ شامل تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جمع قرآن کا کام بلاوجہ نہیں کیا تھا نہ ہی اس میں آپؓ کا کوئی خصوصی مخفی مقصد تھا۔ مصحفِ عثمان غنیؓ کوئی نئی چیز نہ تھا بلکہ یہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے نسخہ کی نقل تھا۔

ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے پورے اہتمام سے تمام مسلمانوں کی شمولیت اور اجماع سے ایک متفقہ سرکاری نسخہ قرآن تیار کروایا تھا تو حضرت عثمان غنیؓ کو 'جمع قرآن' کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل تفصیل سے بھی مل جاتا ہے۔

جمع صدیقؓ اور جمع عثمانؓ میں فرق بیان کرتے ہوئے علامہ ابن التین کہتے ہیں:

"حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے جمع کرنے میں یہ فرق تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے اس خوف سے جمع کیا تھا کہ قرآن کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ کیونکہ وہ اس وقت متفرق و منتشر صحیفوں میں تھا۔ انہوں نے ان سب اوراق کو لے کر آیات اور سورتوں کی اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب کے مطابق حضور ﷺ نے لکھوایا تھا اور پڑھایا تھا ایک شیرازہ میں جمع کر دیا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جب وجوہ قراءت میں لوگوں کو اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت قرآن کو صحیح قراءت کے ساتھ جو عرضہ اخیرئہ کے مطابق تھی اور جس کی صحت میں مطلق شبہ نہ تھا نقل کرا دیا تا کہ اختلافاتِ قراءت رفع ہو جائیں۔ انہوں نے ترتیب میں نہ تقدیم کی نہ تاخیر۔ نہ اس میں کسی تاویل کو دخل دیا۔ صرف قراءت میں لوگوں کے شبہ یا فساد کرنے سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔" [1]

اسی طرح کے مزید بیانات علامہ ابن التین [2]، قاضی ابو بکر [3] اور علامہ محاسبی [4] اور علامہ عینی

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 78

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

[1] سے بھی منقول ہیں۔

ان روایات کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے علمائے اسلام نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے عمل کی یہی تشریح کی ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا مقصد قرآن مجید کے کسی 'حرف' کو ختم کرنا نہ تھا بلکہ انہیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض لوگ درست حروف کا انکار کر رہے ہیں۔ اور بعض لوگ آپس میں جھگڑنے لگے تھے۔ اسی مقصد کے لیے آپؓ نے معیاری نسخہ تیار کروایا۔ یہی نقطہ نگاہ ابن حزمؒ (456ھ) نے الفصل في الملل[2] میں، مولانا عبد الحق حقانیؒ (1052ھ) نے تفسیر حقانی[3] کے مقدمہ البیان میں اور علامہ زرقانیؒ (1122ھ) نے 'مناھل العرفان'[4] میں نقل کیا ہے۔ آپؓ نے تو ایسا رسم الخط اختیار فرمایا کہ اس کے اختیار کرنے سے ایک ہی لفظ کو تمام جائز حروف میں پڑھنے والے اپنے اپنے 'حرف' کے مطابق پڑھ سکیں۔ یہ اقدام 'سبعہ احرف' کو محفوظ کرنا تھا نہ کہ انہیں ضائع کر دینا۔

کیا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے سیاسی مصلحت اور مقاصد کے تحت قرآن مجید کا نسخہ تیار کروایا تھا؟

اس اعتراض کا رد ہم مندرجہ ذیل حقائق کی روشنی میں کر سکتے ہیں:

یہ کاروائی محض آناً فاناً عمل میں نہیں آگئی بلکہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی شکایت اور حالات کی سنگینی کے بعد حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے ایک مصحف کی تیاری کا حکم فرمایا تھا۔ آپؓ نے یہ کاروائی اکیلے ہی نہیں کی بلکہ صحابہؓ کا مشورہ اس میں شامل تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے یہ کاروائی ذاتی طور پر نہیں کی بلکہ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ بخاری شریف اور الاتقان میں ان حضرات کی تعداد چار بیان کی گئی ہے۔ ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام شامل تھے۔[5] جبکہ ابن ابی داؤد نے محمد بن سیرین کے طریق پر کثیر بن افلح سے روایت کی ہے کہ انہوں نے

---

(1) عمدۃ القاری، جلد ہشتم، ص: 655

(2) ابن حزم، علامہ، کتاب الفصل فی الملل والاھوٰ والنحل، مطبع الادبیہ، مصر، 1320

(3) حقانی، عبدالحق، مولانا، مقدمہ تفسیر حقانی، البیان فی علوم القرآن، ص: 52، 51

(4) زرقانی، عبدالعظیم، مناہل العرفان، جلد1، ص: 268-272

(5) بخاری، باب جمع القرآن، جلد3، ص: 146

سے بھی منقول ہیں۔[1]

ان روایات کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے علمائے اسلام نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے عمل کی یہی تشریح کی ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا مقصد قرآن مجید کے کسی 'حرف' کو ختم کرنا نہ تھا بلکہ انہیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض لوگ درست حروف کا انکار کر رہے ہیں۔ اور بعض لوگ آپس میں جھگڑنے لگے تھے۔ اسی مقصد کے لیے آپؓ نے معیاری نسخہ تیار کروایا۔ یہی نقطہ نگاہ ابن حزمؒ (456ھ) نے الفصل في الملل[2] میں، مولانا عبدالحق حقانیؒ (1052ھ) نے تفسیر حقانی[3] کے مقدمہ البیان میں اور علامہ زرقانیؒ (1122ھ) نے 'مناهل العرفان'[4] میں نقل کیا ہے۔ آپؓ نے تو ایسا رسم الخط اختیار فرمایا کہ اس کے اختیار کرنے سے ایک ہی لفظ کو تمام جائز حروف میں پڑھنے والے اپنے اپنے 'حرف' کے مطابق پڑھ سکیں۔ یہ اقدام 'سبعہ احرف' کو محفوظ کرنا تھا نہ کہ انہیں ضائع کر دینا۔

کیا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے سیاسی مصلحت اور مقاصد کے تحت قرآن مجید کا نسخہ تیار کروایا تھا؟

اس اعتراض کا رد ہم مندرجہ ذیل حقائق کی روشنی میں کر سکتے ہیں:

یہ کاروائی محض آناً فاناً عمل میں نہیں آگئی بلکہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی شکایت اور حالات کی سنگینی کے بعد حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے ایک مصحف کی تیاری کا حکم فرمایا تھا۔ آپؓ نے یہ کاروائی اکیلے ہی نہیں کی بلکہ صحابہؓ کا مشورہ اس میں شامل تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے یہ کاروائی ذاتی طور پر نہیں کی بلکہ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ بخاری شریف اور الاتقان میں ان حضرات کی تعداد چار بیان کی گئی ہے۔ ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام شامل تھے۔[5] جبکہ ابن ابی داؤد نے محمد بن سیرین کے طریق پر کثیر بن افلح سے روایت کی ہے کہ انہوں نے

---

(1) عمدۃ القاری، جلد ہشتم، ص: 655

(2) ابن حزم، علامہ، کتاب الفصل فی الملل والاهوٰ والنحل، مطبع الادبیہ، مصر، 1320

(3) حقانی، عبدالحق، مولانا، مقدمہ تفسیر حقانی، البیان فی علوم القرآن، ص: 52، 51

(4) زرقانی، عبدالعظیم، مناہل العرفان، جلد1، ص: 268-272

(5) بخاری، باب جمع القرآن، جلد3، ص: 146

کہا جس وقت حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے مصحف لکھوانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس غرض سے بارہ مشہور آدمی قریش اور انصار میں سے جمع کئے اور ان کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ قرآن لکھیں۔[1]

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے فتح الباری میں اس سلسلے میں تفصیلات بیان کی ہیں اور ان دو متناقض روایات کی وضاحت کی ہے کہ اس کمیٹی کے ارکان کی تعداد چار تھی یا بارہ؟ ان کی اس وضاحت کا خلاصہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ کام چار اصحابؓ ہی کے سپرد تھا لیکن دیگر صحابہؓ کو بھی ان کی مدد پر مامور کر دیا گیا تھا۔ ان اصحاب میں ابیّ ابن کعبؓ (22ھ)، کثیر بن افلحؓ، مالک بن ابی عامرؓ، انس بن مالکؓ، ابن عباسؓ (68ھ) وغیرہ شامل تھے۔[2]

بارہ اصحابؓ والی روایت کا تنقیدی جائزہ صبحی صالح نے 'مباحث فی علوم القرآن' میں لیا ہے۔ وہ اس روایت کو معتبر نہیں سمجھتے ڈاکٹر صبحی صالح نے اس ضمن میں مستشرقین جن میں بلاشر (1900-1973) وغیرہ شامل ہیں، کے خیالات کا بڑے موثر انداز سے ردّ کیا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم مستشرقین کے اس موقف کا رڈ ڈاکٹر صبحی صالح کے بیان کی روشنی میں کریں گے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے محض سیاسی مقاصد کے حصول اور سیاسی پالیسی کے طور پر قرآن میں مداخلت کی تھی اور اپنی مرضی کا ایک نسخہ تیار کروالیا تھا۔ اور اس کمیٹی کے ارکان، حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے آلہ کار بن گئے اور گٹھ جوڑ کر کے ایک نیا نسخہ تیار کر لیا۔[3]

اس سلسلے میں بلاشر پیش پیش ہے جس نے جمع و تدوین قرآن کے بارے میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی نیت پر حملے کئے ہیں یہ تمام حملے بالکل بے بنیاد ہیں۔ مستشرقین کے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے کہ جس سے ثابت کیا جاسکے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے پیش نظر سیاسی مقاصد کا حصول تھا اور آپ نے یہ کاروائی اس لئے بھی کی کہ مہاجرین کی اہمیت جتائی جاسکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صبحی صالح نے بلاشر کا حوالہ دیا ہے۔[4]

ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ یہ اتہام محض مستشرقین کی الزام تراشی ہے اور عبث قیاس آرائیوں کا آئینہ دار ہے اور کسی تاریخی روایت سے ان کے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ کوئی دانشمند شخص یہ بات

---

(1) ابن ابی داؤد: حوالہ مذکور، جلد ۱، ص ۱۰۴

(2) فتح الباری، جلد 9، ص: 5

(3) صبحی صالح، ڈاکٹر، مباحث فی علوم القرآن، ص: 79

(4) ایضاً

بلاشر (Régis Blachère) (1900-1973) لکھتا ہے:

"اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ کمیٹی کے ارکان کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا۔ اگرچہ وہ ان دنوں تنقید و تبصرہ کے طرز و انداز سے پوری طرح آشنا نہ تھے۔"[1]

اس کی دونوں باتوں میں تضاد ہے ایک طرف ان کو ذمہ دار اور متقی قرار دیتا ہے اور دوسری طرف قرآن جیسی کتاب میں تحریف کی سازش میں ملوث قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک بات ہی درست ہو سکتی ہے اور ہم اس بات کو درست کہیں گے جسے تاریخ اور دلائل و شواہد درست قرار دیں۔

ہم اس سلسلے میں ولیم میور (1819-1905) کی وضاحت بھی پیش کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے ساتھی مستشرقین کے موقف کو رد کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس نظر ثانی میں علماء نے آیات اور قراءتوں میں سے ایک ایک آیت کا پہلے نسخے سے مقابلہ کیا۔[2] اس کمیٹی میں قریشی صحابہؓ ہی کو اس لئے شامل کیا گیا کہ قرآن انہی کے لب ولہجہ میں نازل ہوا تھا۔[3] میور (1819-1905) نے بھی اس مصحف کی تیاری کا یہ جواز تسلیم کیا ہے کہ آذربائیجان میں لوگوں کے اندر قرآن کی تلاوت پر اختلافات دیکھنے میں آئے تھے۔[4]

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے دیگر چند لوگوں سے مل کر اپنی پسند کا ایک نسخہ تیار کروالیا تھا اس الزام کا رد ہم مندرجہ ذیل حقائق کی روشنی میں بھی کر سکتے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے زمانے میں جب حضرت زید بن ثابتؓ نے تدوین قرآن کے کام کا آغاز کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (23ھ) نے تدوین قرآن کمیٹی کے سامنے آیت رجم پیش کی۔ لیکن حضرت زید بن ثابت نے اسے قرآن میں شامل نہیں کیا۔ اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ مستشرقین بیان کرتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (23ھ) اپنی حیثیت استعمال کر کے یہ آیت قرآن میں شامل کرواسکتے تھے۔ لیکن یہ آیت چونکہ قرآن کا حصہ نہ تھی اس لئے اسے شامل قرآن نہیں کیا گیا۔ (یہ اب منسوخ ہو چکی تھی)

حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ سورۃ التوبہ کی آخری آیت: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ ﴾[5] صرف ایک صحابیؓ سے ملی۔ لیکن جب تک اس آیت کے بارے میں بھی وہ شرائط پوری نہ

(1) صبحی صالح، ص: 81

(2) Muir, Willium, Life of Mahomet, Smith, London, 1860, P.XIII

(3) IBID, PXIII

(4) IBID, PXIII

(5) التوبۃ: ۱۲۸

ہوئیں جو اس وقت ملحوظ رکھی جا سکتی تھیں اس وقت تک اسے قرآن میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہی معاملہ عہد حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) میں سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ.. ﴾ [1] کے ساتھ پیش آیا تھا۔ [2]

اگر حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے کچھ ذاتی مخصوص مقاصد تھے تو ان کی تکمیل کے لیے دوسرے صحابہؓ کو' ان صحابہ کی بجائے' کمیٹی میں شامل کر کے اپنے مقصد کی تکمیل کر سکتے تھے۔

مشہور مستشرق اسپر نگر نے مسلمانوں کے فن اسماء الرجال جو انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کرنے کے لئے جاری کیا تھا اور جس کی مثال دنیا کی کوئی اور قوم پیش نہیں کر سکی، کے بارے میں لکھتا ہے۔ "مسلمانوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے اقوال کو محفوظ کرنے کے لیے پانچ لاکھ لوگوں کے حالات زندگی محفوظ کر لیئے۔" [3] ایسی محتاط قوم سے یہ بات کیونکر منسوب کی جا سکتی ہے کہ اس نے ملی بھگت کر کے قرآن کریم میں تغیر و تبدل کر لیا۔

کیا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے وہ آیات قرآن مجید سے حذف کر دی تھیں جن میں حضرت علیؓ اور اہل بیت کے مناقب بیان کئے گئے تھے؟ [4]

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق پیش کئے جا سکتے ہیں :

یہ اعتراض عقل کے سراسر خلاف ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جو مصحف تیار کروایا اس پر تمام امت نے اتفاق کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کسی بھی حلقے سے اس سے اختلاف نہیں کیا گیا۔ صرف عبداللہ بن مسعودؓ نے اس بات پر اعتراض کیا تھا کہ انہیں جمع قرآن کی کاروائی میں شریک کیوں نہیں کیا گیا۔ قرآن کے متن میں کسی طرح کی کمی بیشی کا اعتراض کسی بھی حلقے کی جانب سے نہیں کیا گیا۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے ساتھ خاندانی چپقلش رکھنے والے اور انہیں شہید کرنے والے لوگوں میں سے کسی نے آپؓ پر اس پہلو سے اعتراض نہیں کیا کہ آپؓ نے قرآن میں کمی بیشی کر دی۔ خصوصاً بنو امیہ اور حضرت علیؓ کے ساتھیوں کے درمیان مخاصمت کو ذہن میں رکھیں تو نظر آتا ہے کہ اتنے شدید

---

(1) الاحزاب: ۲۳

(2) IBID, PXIII

(3) اسپر نگر، مقدمہ الاصابہ فی تمییز الصحابہ، کلکتہ

(4) فنڈر، پادری، میزان الحق، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور 1892ء، ص: 36-44

اختلافات کے باوجود حضرت علیؓ (40ھ) کے ساتھی اسی قران پر متفق رہے جسے بعد میں انہی لوگوں نے 'صحیفہ عثمانی' کا نام دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ آج تک تمام فرقے قرآن کی صیانت اور عصمت پر متفق ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) جنہوں نے قرآن دو مرتبہ لکھا دونوں کے عہد میں حضرت علیؓ (40ھ) موجود تھے۔ لیکن کبھی بھی قرآن کے بارے میں اختلاف نہیں ہوا نہ ہی حضرت علیؓ (40ھ) نے کوئی اختلاف کیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (33ھ) اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) میں سے کسی کا دور بھی جبر و تشدد کا دور نہ تھا کہ حضرت علیؓ (40ھ) مجبوراً چپ ہو گئے ہوتے۔ نہ ہی اس بات کا امکان ہو سکتا تھا کہ قرآن سے آیات و مضامین حذف کئے جا رہے ہوں اور لوگ خاموشی سے بیٹھے ہوں۔ بات انہی اہل بیت کے بارے میں کی جا رہی ہے جنہوں نے ایک شخص یزید کی بیعت محض اس بنا پر نہ کی کہ وہ فاسق و فاجر تھا اور اسی فاسق کے خلاف لڑتے ہوئے اپنے پورے خاندان کی جانیں لٹا دیں۔

اگر حضرت علی تینوں خلفائے راشدینؓ کے عہد میں کچھ نہ کر سکے تو بعد میں جب وہ خود خلیفہ بنے تو اس وقت بھی تو وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ اس وقت تو انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ بلکہ اگر وہ ایسا کر دیتے کہ بقول مستشرقین اصل قرآن، امت کو لوٹا دیتے تو وہ امت کے ہیرو بن جاتے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ "جامع القرآن" کا خطاب تو حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کو دیا ہے، حضرت علیؓ (40ھ) امت سے کہہ سکتے تھے کہ لوگو! یہ ہے قرآن کا وہ حصہ جو پہلے تینوں خلفاء نے غائب کر دیا تھا اور اس کا صرف مجھے ہی علم تھا۔ ہم تو اس کے بالکل برعکس دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پورے عہد حکومت میں کبھی اس کا تذکرہ تک نہیں کیا بلکہ ہمیں تو اس کے بالکل برعکس بیانات ملتے ہیں۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) جرأت مند انسان تھے۔ کیا کوئی شخص یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) کے بارے میں کوئی تاثر قائم کرے کہ انہوں نے تحریف قرآن کی کاروائی آنکھوں سے دیکھ لی اور کسی کو روکا تک نہیں یا بزدلی یا مصلحت کا مظاہرہ کیا۔ قرآن مجید تو ان کے بارے میں کہتا ہے:

﴿يُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (1)

"وہ جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔"

---

(1) المائدۃ:۵۴

رمضان المبارک کی راتوں میں جب ابی بن کعب (22ھ) لوگوں کی امامت کرواتے اور قرآن مجید سناتے تھے اس وقت حضرت علیؓ (40ھ) ان کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔[1] اگر قرآن میں کوئی رڈبدل ہوتا تو آپؓ اسی وقت اعتراض کر سکتے تھے۔

یہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قرآن مجید میں رڈبدل کر دیا تھا۔ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جبر کے ذریعے قرآن کریم کے قدیم نسخے معدوم کر دیئے تو یہ بات دیکھنا ضروری ہے کہ آیا حضرت عثمانؓ (35ھ) کا دخل اس قدر بڑھا ہوا تھا اور ان کی طاقت اس قدر وسیع ہو گئی تھی کہ اتنی بڑی قوم کے قبضہ اور حافظہ سے ہر ایک سورت اور ہر آیت کو انہوں نے مٹا دیا۔ عملاً ایسا ممکن ہی نہ تھا بلکہ انہوں نے دیگر مصاحف جبر کے ذریعے ختم نہیں کئے بلکہ اس کام میں لوگوں کی مرضی شامل تھی کیونکہ ایسا کرنا ہی قرین عقل تھا۔

اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ انہوں نے حضرت ابن مسعودؓ (32ھ) جیسے لوگوں سے قرآن کے نسخے چھین لئے تھے (جبکہ ایسا نہیں ہوا) تو یہ کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے کہ مصحف ابن مسعودؓ (32ھ) کی جو نقلیں عام مسلمانوں میں مشتہر اور مروج ہو چکی تھیں وہ بھی انہوں نے سب لوگوں سے واپس لے لی ہوں۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مسلمانوں میں لاتعداد نقلیں اس وقت تک عام ہو چکی تھیں۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو یہ لوگ تو حق کے لیے بڑے دلیر تھے وہ مقابلہ کر کے اس تحریف کو روک سکتے تھے۔ یہ بات سب کو معلوم ہی ہے کہ مسلمانوں نے تو جس بات کو بھی حق سمجھا اس کے لیے جنگ کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔

اگر ہم بطور تنزل اتنا بھی مان لیں کہ ان میں سے کسی مسلمان کو حضرت عثمانؓ (35ھ) کے نسخہ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوا تھا تو وہ اتنا ضرور کرتا کہ (اور یہ کرنے میں اس کے لیے کوئی دقت بھی نہ تھی) جو صحیح نسخہ اس کے پاس یا کسی اور کے پاس معلوم ہوتا اس کو حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے زمانے میں چھپا کر ہی محفوظ کر لیتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی وفات کے ساتھ ہی اس "صحیح نسخہ" کی نقلیں فوراً پھیل جاتیں۔ خصوصاً عہد علیؓ (40ھ) میں تو اس کو کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔ جیفری (1892-1959) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نسخہ کو متفقہ نسخہ قرار نہیں دیتا اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ دیگر مصاحف بھی موجود رہے جو مصحف عثمانی سے مختلف تھے۔

"مقابل مسودات قرآن" کے متعارف کرانے کی پر جوش سرگرمی میں جیفری (1892-1959) اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ اگرچہ تذبذب کے بعد ہی سہی مگر عبد اللہ

---

(1) بخاری، جلد 1، ص: 234، (کتاب صلوۃ التراویح)

بن مسعودؓ نے اپنی قراءت کو مصحف عثمانی کے حق میں واپس لے لیا [1] اور پھر کبھی بھی اس پر اصرار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جیفری (1892-1959) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے کسی ایسے بیان کو سامنے لانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا جس میں انہوں نے مصحف عثمانی کی کسی ایک بھی قراءت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے خلاف قرار دیا ہو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے بعد حضرت ابیّ بن کعبؓ دوسرے صحابی رسول ہیں جن سے اختلافی قراءت کا ایک ایک بہت بڑا ذخیرہ منسوب کیا گیا ہے اگرچہ جیفری (1892-1959) اعتراف کرتا ہے کہ تمام ثانوی مسودات حضرت ابن مسعودؓ سے منسوب نسخے سے اخذ کئے گئے ہیں اور حضرت ابیّ بن کعبؓ کے مسودہ قرآن سے کوئی بھی نسخہ اخذ نہیں کیا گیا۔ اس اعتراف کے باوجود وہ حضرت ابیّ بن کعبؓ سے منسوب مختلف قراءتوں کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اور اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیتا ہے کہ حضرت ابیّ بن کعبؓ اس کمیٹی کے ممبر تھے جس نے حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے حکم پر قرآن حکیم کو جمع کرنے کی عظیم الشان خدمت سرانجام دی تھی۔ ایک اور صحابیؓ رسول حضرت علیؓ ہیں جن سے مصحف عثمانی کی تنقیذ سے قبل ایک نسخہ منسوب ہے۔ ان سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے مصحف کو نافذ کرنے کی جرأت مندانہ فیصلے پر اپنے کامل اطمینان و تشکر کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اگر عثمان کی بجائے بار خلافت میرے کندھوں پر ہوتا تو یقیناً میں بھی قرآن حکیم کی جمع و تدوین میں وہی کام کرتا جو عثمانؓ نے کیا ہے" [2]

مصحف عثمانیؓ کی بنیاد وہ نسخہ تھا جو اس وقت حضرت حفصہؓ کی نگرانی میں تھا۔ [3] عقل کہتی ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ (35ھ) نے قرآن میں تغیر تبدل کر دیا تھا تو پھر حضرت حفصہؓ کو ان کا مصحف واپس کبھی نہ کیا جاتا کیونکہ اس کی موجودگی میں تو حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی ساری کاروائی رائیگاں جا سکتی تھی۔

حضرت حفصہؓ نے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ اے عثمانؓ! آپ نے تو ایک نیا قرآن تیار کر لیا ہے حالانکہ میرا مصحف تو کچھ اور تھا۔

یہ بات نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ وہ مقدمتان اور کتاب المصاحف میں درج اختلاف قراءت پر مبنی روایات کو من وعن صحیح تسلیم کر لیتا ہے مگر انہی کتب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کی جمع و تدوین قرآن کی خدمت کے بارے میں روایات کو بغیر کوئی معقول وجہ بتائے رد کر دیتا ہے۔ حالانکہ

---

(1) آرتھر جیفری، مقدمتان، صفحہ 73

(2) ابن ابی داود، کتاب المصاحف، صفحہ 23

(3) بخاری، جلد 3، ص: 146 (باب جمع القرآن)

حدیث اور تاریخ کے ماخذوں میں ان روایات کی سند نہایت قوی اور ان کا پایہ استناد بہت مضبوط ہے[1] یہ اسلامی تاریخ کی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کا جمع مدون کیا ہوا نسخہ مصحف عثمانی کی اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

القیسی کا بیان ہے کہ کم از کم ۱۲ ہزار صحابہ کرام اور تابعین پر مشتمل ایک جماعت نے اس وقت کی اسلامی سلطنت کے طول و عرض میں پھیل کر مصحف عثمانی کے مطابق تلاوت قرآن حکیم سکھانے اور اس کے علاوہ رائج طریقوں سے منع کرنے کی خدمت انجام دی[2] یہ یقیناً ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بھاری تعداد جن میں صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے کسی ایسی قراءت قرآن کو رائج کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے جس کا انتساب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کی جانب ہوتا۔ جیفری (1892-1959) قرآن حکیم کے بارے میں اپنی تحقیقات کے لیے پروفیسر برجسٹراسر اور پریکٹل سے اشتراک عمل کا ذکر تو بڑے فخر سے کرتا ہے مگر حیران کن امر یہ ہے کہ وہ اس ادارے کی ابتدائی رپورٹ اور اس کی کاروائی کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور اس کا کہیں تذکرہ تک نہیں کرتا۔[3]

"حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے باقی تمام مصاحف نذر آتش کر دیئے" اور اس کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے تیار کروائے ہوئے نسخے کو کوئی چیلنج نہ کر سکے لیکن اتنی بات تو تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے کہ حضرت حفصہؓ والا نسخہ مروان بن حکم کے دور تک موجود تھا[4]۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے قرآن کے نسخے کی تیاری (24ھ تا 35ھ) اور مروان کی کاروائی (64ھ تا 65ھ) کے درمیان کئی برس کا عرصہ گزرا۔[5] اگر حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قرآن میں تغیر و تبدل کروا دیا تھا تو حضرت حفصہؓ کا نسخہ قرآن کی اصل صورت میں موجود تھا۔ فوراً اصل کی کاپیاں تیار کروائی جا سکتی تھیں۔

یہ بات بھی ناقابل تسلیم ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا دور جبر و تشدد کا دور تھا۔ ایسا خیال کرنا تاریخی غلطی ہوگی۔ جس خلیفہ نے محض اس لئے بلوائیوں کے ہاتھوں شہادت قبول کر لی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی انکی حفاظت کے لیے ان کے دروازے پر کھڑا ہو۔ اور ان کی حفاظت کرتے ہوئے کسی مسلمان کی

---

(1) البخاری، جلد ششم، صفحات 476-480

(2) ابو محمد القیسی، الابانہ، صفحہ 96-97

(3) محمد اکرم، چوہدری، ڈاکٹر، حوالہ سابق

(4) معین الدین ندوی، تاریخ اسلام، جلد 1، ص: 378

(5) ایضاً

جان ضائع ہو۔ وہ ہستی محض ذاتی مقاصد کے تحت تیار کردہ قرآن کو لوگوں میں مروّج کرنے کے لیے لوگوں پر تشدد کرے گی؟۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی وفات کے بعد حضرت حفصہؓ والے نسخے سے اصل قرآن حاصل نہ کیا جاسکا کیونکہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے اثرات بڑے گہرے تھے تو یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے کیونکہ جو خلیفہ بلوائیوں کے ہاتھوں، کسی میدان میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں شہید ہو رہا ہے اور اس کی شہادت کا بدلہ بھی نہیں لیا جا رہا، جبر کے زیر اثر اس کے دورس سیاسی اثرات کے بارے میں کیا تصور کیا جاسکتا ہے؟

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں کے فرقوں میں خون ریز لڑائیاں ہو رہی تھیں، اس وقت بھی ان سب کا قرآن ایک ہی تھا۔ اگر اس میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے تغیر و تبدل کروایا تھا تو ان سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پر متفق ہونا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے دیگر مصاحف ہی تلف کئے ہوں گے لوگوں کے حافظوں سے تو قرآن محو نہیں کیا تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے 'مصحف' کے بارے میں علامہ ابن حزمؒ (456ھ) لکھتے ہیں:

حضرت علیؓ (40ھ) جو روافض کے نزدیک بہت عظیم مقام رکھتے ہیں وہ پونے چھ برس تک برسر اقتدار رہے۔ ان کا حکم چلتا تھا ان پر کیا دباؤ تھا کہ انہوں نے اصل قرآن جاری نہیں فرمایا۔ امام حسنؓ کو بھی خلافت ملی۔ وہ بھی امام معصوم سمجھے گئے ہیں ان سب باتوں کے باوجود کسی کو یہ کس طرح جرأت ہو سکتی ہے کہ ایسی بات کہے۔ (1)

علامہ فرماتے ہیں:

"قرآن میں کوئی حرف زائد یا کم یا تبدیل ہونا، ہم کیسے تسلیم کرسکتے ہیں جب کہ قرآن میں تغیر کی وجہ سے ان حضرات پر جہاد، اہل شام سے لڑائی سے زیادہ ضروری و اہم تھا۔" (2)

کیا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے اہل بیت اور حضرت علیؓ سے متعلق آیات قرآن مجید سے نکال دی تھیں۔ مستشرقین کے اس موقف کا جواب ہم انہی کے ایک ساتھی ولیم میور (1819-1905) کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

---

(1) ابن حزم، کتاب الفصل فی الملل فی الاھوٰ والنحل، جلد 2، ص: 78

(2) ایضاً

ولیم میور (1819-1905)(William Muir) لکھتے ہیں:

"یہ اعتراض عقل کے سراسر منافی ہے خصوصاً بنو امیہ اور دوست داران علیؓ کے مناقشات پر نظر کرتے ہوئے کہ اتنے شدید اختلاف کے باوجود دوستداران علیؓ اسی قرآن پر متفق رہے۔ جسے بعد میں انہی لوگوں نے صحیفہ عثمانی سے نامزد کر دیا نہ صرف یہ بلکہ آج تک تمام شیعہ سنی فرقے قرآن کی صیانت و عصمت پر متفق ہیں۔"[1]

پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) و حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) دونوں کے عہدوں میں اسی قرآن پر اکتفا کیا گیا اور حضرت علیؓ (40ھ) بھی موجود تھے لیکن آپؓ نے کوئی معارضہ نہیں فرمایا۔

میور (1819-1905) لکھتے ہیں آخر حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے لئے تحریف میں کون سے مفاد وابستہ تھے۔ خصوصاً جب کہ ایسے اقدام کی صورت میں انہیں مسلمانوں کی برہمی کا اندیشہ بھی ہو سکتا تھا۔[2]

ولیم میور (1819-1905) مصحف عثمانیؓ پر اعتراضات کے جواب دیتے ہوئے اس اعتراض کے بارے میں لکھتے ہیں:

حضرت عثمانؓ (35ھ) کے عہد میں جب قرآن پر نظر ثانی ہوئی اور پھر اسے شائع کیا گیا تو ان مسلمانوں کی کثیر تعداد موجود تھی جو رسول ﷺ کی زندگی میں حضور ﷺ سے اسی طرح قرآن کو سنتے رہے جس طرح حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے دوبارہ حضرت زیدؓ وغیرہ کو دکھا کر شائع کیا۔ اور ان صحابہ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔[3]

اگر حضرت علیؓ (40ھ) کی عصمت پر قرآن کی آیات نازل ہوئی ہوتیں جن پر خود حضرت علیؓ (40ھ) بربنائے مصلحت خاموش ہو گئے تو لازم تھا کہ حضرت علیؓ کے انصار و اصحاب ہی حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی اس زیادتی پر فریاد کرتے۔[4]

آخر میں ولیم میور (1819-1905) لکھتے ہیں:

پس ان معارضات سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن سے کوئی ایسی آیت نظر انداز نہیں کی گئی

(1) Life of Mahomet, P.XIV

(2) IBID, PXIV.

(3) IBID, PXIV.

(4) IBID, PXVII.

جو حضرت علیؓ (40ھ) کی عصمت پر دال ہو۔ اس سلسلے میں میور (1819-1905) کا تیسرا معارضہ یہ ہے کہ جب حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی وفات کے بعد حضرت علیؓ (40ھ) کی بیعت ہوئی جو حضرت علیؓ (40ھ) کے غلبہ کی بین دلیل ہے۔ کیا عقل باور کر سکتی ہے کہ اصحاب علیؓ (40ھ) ناقص قرآن پر اکتفا کر لیتے اور ناقص بھی ایسا کہ جس سے ان کے امام (حضرت علیؓ) کی فضیلت کی آیات قلم زد کر دی گئی ہوں۔ آخر محبان علیؓ (40ھ) ایسے قرآن پر کیوں متفق ہو گئے جو ان کے مخالف اور ان کے پیشواؤں کے مقاصد بیان کرنے میں ناقص رہا۔ وہ لوگ تو اسے دینی دستاویز کے طور پر پڑھتے رہے اور اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ حضرت علیؓ (40ھ) نے اسی قرآن کو پھیلانے کا حکم دیا۔ خود اپنے قلم سے بھی اس کے نسخے لکھے اور انہیں دور دراز علاقوں میں پھیلایا۔ (1)

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے تو لوگوں کو متواتر اور ثابت شدہ قراءتوں پر جمع کیا تھا۔ یہ تو حقیقت ہی کے برعکس ہے کہ انہوں نے سات قراءتیں یا سبعہ احرف کو ختم کر کے ایک 'حرف' پر لوگوں کو جمع کیا تھا۔ (2)

مصحف عثمانیؓ میں ایسا رسم الخط اختیار کیا گیا تھا کہ اس میں وہ ساری قراءتیں اور حروف سما سکیں۔ آپ نے یہ اہتمام اس لئے کیا تھا بلکہ صحیح تر لفظوں میں آپ کے مصحف کا اصلی مقصد یہ تھا کہ شاذ قراءتوں کے پھیلنے کا سدّباب کیا جائے اور جائز و ثابت شدہ قراءتوں میں قرآن کو محدود کیا جائے۔ (3)

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے ایسا رسم الخط اختیار کیا جس میں 'ساتوں حروف' سما سکیں۔ امام ابن حزمؒ (456ھ) نے اس سلسلے میں اپنی کتاب، 'کتاب الفصل فی الملل والأھواء والنحل' میں مدلل بحث کی ہے اور اس قسم کے اعتراضات کا ردّ خالص عقلی اور منطقی انداز میں کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے عہد میں قرآن میں تغیر و تبدل ہو گیا تھا۔ امام موصوف نے خود یہود و نصاریٰ کی طرف سے کئے گئے کچھ اعتراضات کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر ان کا ردّ فرمایا ہے۔ (4) انہوں نے مندرجہ ذیل اعتراضات نقل کئے ہیں:

مسلمان اپنی کتاب کی نقل کو کس طرح صحیح کہہ سکتے ہیں حالانکہ اس کی قراءت میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ بہت سے حروف بڑھاتے ہیں اور بعض انہیں نکال ڈالتے

---

(1) IBID, PXVII.

(2) مناہل العرفان، جلد 1، ص: 253-254

(3) ایضاً، جلد 1، ص: 354

(4) الملل والنحل، جلد 2، ص: 76-88

ہیں۔

مسلمان ایسی اسانید سے جو تمھارے یہاں انتہائی صحت کو پہنچی ہوئی ہیں روایت کرتے ہیں کہ تمھارے نبی ﷺ کے اصحاب ؓ کے چند گواہوں نے اور ان کے ایسے تابعین ؒ نے جن کی تم تعظیم کرتے ہو اور اپنا دین ان سے اخذ کرتے ہو، قرآن کو ایسے زائد مبدلہ الفاظ میں پڑھا ہے تم لوگ ان الفاظ میں پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ عبداللہ ابن مسعود ؓ (32ھ) کا مصحف تمھارے مصحف کے خلاف تھا۔

ان میں ایک بات یہ ہے کہ مسلمان علماء کے چند گروہ جن کی مسلمانوں کے ہاں تعظیم کی جاتی ہے اور ان سے اپنا دین اخذ کرتے ہیں کہ عثمان بن عفان ؓ (35ھ) نے بہت سی صحیح قراءتوں کو نکال ڈالا۔ جب انہوں نے وہ مصحف لکھا جس پر انہوں نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور ان سات حرفوں میں سے جن میں مسلمانوں کے نزدیک قرآن نازل کیا گیا ہے اسے صرف ایک حرف پر کر دیا۔

روافض کا دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ؓ نے قرآن کو بدل ڈالا۔ اور اس کو گھٹا بڑھا دیا۔[1]

علامہ ابن حزم ؒ (456ھ) نے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے لیکن اس مقام پر ہم صرف اس پہلو کو زیر بحث لائیں گے کہ کیا حضرت عثمان غنی ؓ (35ھ) نے قرآن میں کوئی نارواتغیر کیا تھا؟ حضرت عثمان غنی ؓ (35ھ) کے بارے میں علامہ ابن حزم ؒ (456ھ) فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ حضرت عثمان غنی ؓ (35ھ) نے سات میں سے چھ حروف کو مٹا دیا تھا۔[2] وہ فرماتے ہیں:

حضرت عثمان غنی ؓ (35ھ) ایسے وقت میں ہوئے ہیں کہ تمام جزیرہ العرب مسلمانوں، قرآنوں، مساجد اور قاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ قراء حضرات بچوں، بڑوں اور دور ونزدیک کے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یمن جو ایک وسیع علاقہ تھا۔ بحرین، عمان جن کی آبادی وسیع تھی اور متعدد دیہاتوں شہروں پر مشتمل تھی مکہ، طائف، مدینہ، شام، جزیرہ، مصر، کوفہ، بصرہ، ان تمام مقامات پر اس قدر قرآن اور قاری موجود تھے کہ ان کا شمار خدا تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر حضرت عثمان غنی ؓ (35ھ) ایسا قصد کرتے بھی جیسا کہ یہ لوگ بیان کرتے ہیں تو بھی ہر گز ایسا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے تھے۔[3]

علامہ ابن حزم (456ھ) ؒ فرماتے ہیں:

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً، جلد 2، ص: 77

یہ کہنا کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے لوگوں کو ایک ہی قراءت پر جمع کیا تو یہ بھی باطل ہے گذشتہ سطور میں قرآن کے لاتعداد نسخوں، مساجد، حفاظ اور قراء کی جس کثرت کا ذکر کیا گیا ہے اس کی روشنی میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتے تھے اور نہ انہوں نے کبھی ایسا کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں تو محض اس بات کا اندیشہ ہوا تھا کہ کوئی فاسق آدمی بعد میں آکر دین میں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ یا اہل خبر میں سے ہی کوئی شخص وہم کا شکار ہو کر قرآن مجید کا کوئی حصہ بدل ڈالے۔ کسی بھی صورت میں ایسا اختلاف ہو سکتا تھا کہ جو گمراہی تک پہنچا دے۔ انہوں نے قرآن لکھ کر مختلف سمتوں میں بھجوائے کہ اگر کہیں اختلاف پیدا ہو تو اس نسخے کی طرف رجوع کر لیں۔ کیونکہ یہ نسخے محض حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی ذاتی صوابدید کے مطابق نہیں لکھے گئے تھے بلکہ تمام صحابہؓ کے متفقہ نسخے تھے۔

علامہ ابن حزمؒ (456ھ) فرماتے ہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے چھ حروف مٹا دئے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں واضح کیا گیا ہے اگر حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) ایسا کرنا چاہتے بھی تو وہ اس پر قادر ہی نہ تھے۔ پھر مسلمانوں کا تو متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن سے کسی ایک شوشے کو بھی خارج کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے یہ ساتوں حروف ہمارے ہاں اس وقت بھی موجود ہیں جیسے یہ پہلے دن موجود تھے۔ یہ سبعہ احرف مشہور و ماثور قراءتوں کی شکل میں آج بھی محفوظ و ثابت ہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے قرآن بدل دینے کے بارے میں امام ابن حزمؒ (456ھ) فرماتے ہیں کہ اس وقت تک لاکھوں قرآن موجود تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) لاکھ کوشش کرتے تب بھی وہ تمام کے تمام قرآن سرکاری تحویل میں نہیں لے سکتے تھے۔ جب اتنی کثیر آبادی اور وسیع علاقے کے لوگوں کو ایک انداز سے قرآن یاد ہو گا تو حضرت عثمانؓ (35ھ) کی تبدیلی کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی نابغہ یا زہیر کے شعر میں کوئی کلمہ گھٹانا بڑھانا چاہے تو بھی قادر نہ ہو گا اور اس تبدیلی کرنے والے شخص کا پول جلد ہی کھل جائے گا اور ثابت شدہ نسخے اس کی مخالفت کریں گے۔ پھر قرآن جو کہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے اس میں اس قسم کی تبدیلی کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔

مستشرقین نے تمام زور استدلال اس پر صرف کر دیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا مصحف ناقابل اعتبار، غیر مرتب اور نامکمل تھا۔ اس کے لیے وہ مختلف قسم کے حربے اختیار کرتے ہیں گذشتہ صفحات میں ہم نے اس اعتراض کا تحقیقی جائزہ پیش کر دیا ہے کہ حضرت علیؓ (40ھ) اور اہل بیت کے مناقب والے حصے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قرآن سے نکال دیئے تھے۔ اسی طرح اس نقطہ نگاہ کا جواب بھی دے دیا گیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے 6 / 7 حصہ قرآن ضائع کر دیا تھا۔ مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن

مجید کی کئی ایک آیات اب قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں جو پہلے موجود تھیں۔ اس خیال کی نفی اس حقیقت کی روشنی میں ہو جاتی ہے کہ قرآن وہی ہے جو عرضہ اخیرہ میں نبی کریم ﷺ نے جبریل کو سنایا اور ان سے سنا تھا آغازِ نزول سے عرضہ اخیرہ تک کئی ایک آیات منسوخ ہو گئی تھیں جو کچھ منسوخ ہو گیا وہ قرآن نہیں رہا۔

اس سلسلے میں ابن الجزری ؒ لکھتے ہیں:

ولا شك أن القرآن نسخ منه وغير فيه في العرضة الأخيرة فقد صحّ النّص بذلك عن غير واحد من الصحابة و روينا بإسناد صحيح عن زرّ بن حبيش قال: قال لی ابن عباس: أی القرائتين تقرأ؟ قلت: الأخيرة قال: فإن النبی ﷺ كان يعرض القرآن على جبريل في كل عام مرّة. قال: فعرض عليه القرآن في العام الذی قبض فيه النبی ﷺ مرّتين، فشهد عبد الله يعنی ابن مسعود ما نسخ منه وما بدّل[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عرضہ اخیرہ کے وقت بہت سی قراءتیں خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوخ قرار دے دی گئیں۔ صرف حضرت ابی بکرہؓ نے مرادف الفاظ کے جس اختلاف کا ذکر کیا ہے اس کی جزئیات بھی یقیناً اسی وقت منسوخ ہو گئی ہوں گی۔ کیونکہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جو مصحف تیار کروایا وہ عرضہ اخیرہ کے مطابق تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قران مجید میں کسی قسم کا اپنی طرف سے ایسا تصرف نہیں کیا کہ جسے تحریف کہا جائے۔

اس سلسلے میں ولیم میور (1819-1905) (William Muir) لکھتے ہیں:

بنابریں ہم پوری طمانیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مصحف عثمان غنیؓ (35ھ) اور زید بن ثابتؓ کے اس نسخے میں اصلاً کوئی تعارض نہ تھا۔ جس میں حضرت زیدؓ نے قراءۃ کی مختلف صورتوں میں سے صرف قریش کے لہجہ کو ملحوظ رکھا۔[2] بعض لوگوں نے مصحف عثمانیؓ (35ھ) کے بارے میں یہ ابہام پیش کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ (35ھ) نے ایک طرف فرمایا کہ اگر لکھنے والوں میں رسم الخط کے بارے میں کہیں اختلاف ہو تو قریش کے رسم الخط کو ترجیح دی جائے۔[3] اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے ساتوں حروف کو باقی رکھا تو پھر قریش کے رسم الخط کو باقی رکھنے کا مطلب کیا ہوا؟

---

(1) الجزری، ابوالخیر، النشر فی القراءات العشر، المکتبۃ التجاریہ، مصر، جلد 2، ص: 38

(2) Life of Mahomet, PXIX

(3) الاتقان، جلد 1، ص: 78

اس ابہام کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ در حقیقت حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا یہی وہ جملہ ہے جس سے حافظ ابن جریرؒ اور بعض دوسرے علماء نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے چھ حروف ختم کر کے صرف ایک حرف یعنی 'حرفِ قریش' کو باقی رکھا لیکن در حقیقت اگر حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے اس ارشاد پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ انہوں نے 'حرفِ قریش' کے علاوہ باقی چھ حروف کو ختم کروادیا تھا بلکہ مجموعی طور پر تمام روایات کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا مطلب یہ تھا کہ اگر قرآن کی کتابت کے دوران رسم الخط کے طریقے میں کوئی اختلاف ہو تو قریش کے رسم الخط کو اختیار کیا جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کی اس ہدایت کے بعد صحابہؓ نے جب کتابت قرآن کا کام شروع کیا تو پورے قرآن کریم میں ان کے درمیان صرف ایک اختلاف پیش آیا۔ اس اختلاف کا ذکر امام زہری نے یوں فرمایا ہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ اور باقی اراکین کمیٹی کے درمیان اختلاف ہوا کہ تابوت کو تابوۃ لکھا جائے یا تابوت۔ چنانچہ اسے قریش کے طریقے کے مطابق تابوت لکھا گیا۔ (1)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے حضرت زید بن ثابتؓ اور قریشی صحابہؓ کے درمیان جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے رسم الخط کا اختلاف مراد تھا نہ کہ لغات کا۔

مصحف عثمانؓ (35ھ) کے بارے میں ایک ابہام یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ نے سبعہ احرف کے اختلاف کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات حروف مصاحف عثمانؓ میں شامل نہیں ہو سکے۔ حضرت ابو بکرہؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

> إنَّ جبريل قال: يَا مُحَمَّدُ! اِقْرَأ الْقُرْآنَ عَلَى حَرْفٍ، قال ميكائيل: استزده۔ حتّى بلغ سبعة أحرف۔ قال: كُلٌّ شَافٍ كَافٍ، مَا لَمْ تَخْلِطْ آيَةَ عَذَابٍ بِرَحْمَةٍ أَوْ رَحْمَةً بِعَذَابٍ، نحو قولك تعالى: أقبل وهلُمَّ واذهب وأسرع وعجل۔ (2)

"حضرت جبریل، نبی کریم ﷺ کو پاس آئے اور کہا پڑھئے ایک حرف پر۔ میکائیل نے کہا ان کے لیے اضافہ کیجئے تو کہا پڑھئے دو حرفوں پر۔ میکائیلؑ نے پھر کہا ان کے لیے اضافہ کریں تو اضافہ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ سات حروف کے اضافے تک پہنچ گئے اور

---

(1) ایضاً، جلد 1، ص: 85

(2) قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع الاحکام القرآن، قاہرہ، 1967، جلد 1، ص: 43

کہا کہ ان پر پڑھیے ہر ایک حرف ان کے لیے کافی وشافی ہے بجز اس کے کہ کوئی آیت رحمت میں مخلوط ہو جائے۔ مثلاً تعال هلمَّ اور أقبل (کہ یہ الفاظ متعدد ہیں لیکن معنی سب کا ایک ہے) اور مثلاً اذهب اسرع او رعجّل (کہ ان کا معنی بھی ایک ہی ہے)۔''

امام طحاویؒ نے ابو بکرہؓ کی روایت کے بعد مزید تفصیل بیان کی ہے کہ ور قابن ابی نجیح ابن عباسؓ (68ھ) سے بیان کرتے ہیں کہ اُبی ابن کعبؓ (22ھ) آیت ﴿ لِلَّذِيْنَ ءَ امَنُوا انْظُرُوْنَا ﴾[1] کو 'أمهلونا' کو 'أخِّرونا' جیسے لفظوں سے پڑھنے کی اجازت دے دیا کرتے تھے اور ان تینوں کے معانی 'مہلت دو' ہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ان مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت محض ابتدائی دور میں تھی کیونکہ بعض لوگوں کے لئے لغت قریش کا تلفظ ممکن نہ تھا۔ مثلاً ہذیل والوں کے لیے یمن کی لغت دشوار تھی۔ مگر الفاظ کی یہ وسعت صرف اسی حد تک تھی کہ متحد و یکساں ہی رہیں۔ یہ ایک رخصت تھی جس کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا تا آنکہ لوگوں کے باہمی میل جول اور روابط کے بڑھنے سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی لغات پر قادر ہو گیا حتی کہ تمام لغات کا مرجع و مدار نبی کریم ﷺ کی لغت بن گئی تو باقی منسوخ کر دیا گیا کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی ابتداء میں جن عاجز افراد کو عذر و مجبوری کی بناء پر دوسری لغت میں پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی وہ بھی ختم کر دی گئی۔[2]

قرآن مجید کے حقیقی متن کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بعد قرآن مجید سے خارج کیا گیا ہو۔ جو چیز چھوڑ دی گئی تھی وہ قرآن مجید کا متن نہ تھی۔

مصحف عثمان غنیؓ پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے سامنے جب ان کا لکھوایا ہوا مصحف پیش کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا کہ إن في القرآن لحناً ستقيمه العرب بألسنتهم۔[3]

جیفری (1892-1959) مصحف عثمانی کی شاذ کتابت کی منفرد خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے انہیں ایسی غلطیاں قرار دیتا ہے جو کہ مصحف عثمانی میں اب تک موجود ہیں۔ وہ الدانی متوفی ۴۴۴ھ کو ہدف تنقید بناتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی کتاب المقنع جو کہ کاتبینِ قرآن کے لیے کتابت کے بارے میں ہدایات پر

---

(1) الحدید: ۱۳

(2) الطحاوی، شرح مشکل الآثار، بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ۔ ''نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ''، ۸/۱۰۸، ۱۰۱

(3) آلوسی، محمود، علامہ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار احیاء التراث الاسلامیہ، بیروت، جلد 1، ص: 28

مبنی ہے، میں الفاظ قرآن کو اسی طرح لکھنے پر زور دیا ہے جس طرح کہ وہ مصحف عثمانی میں پہلے سے لکھے چلے آ رہے تھے۔[1]

مصحف عثمانی کے رسم الخط کے بارے میں جملہ اعتراضات جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، کا اسی قدر جواب کافی ہے کہ مصحف عثمانی کے امتیازات جنہیں جیفری (1892-1959) اور دیگر مستشرقین املاء کی غلطیاں گردانتے ہیں مسلمانوں نے گذشتہ صدیوں کے سفر میں محض اس لیے بحال رکھے کہ املاء کی درستگی کے نام پر کہیں تحریف کا دروازہ نہ کھل جائے۔

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے ان الفاظ کہ "ابھی اس متن میں غلطیاں ہیں"، کے بارے میں علامہ آلوسی (1270ھ) فرماتے ہیں:

لم یصح عن عثمان أصلاً یعنی یہ روایت حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے بالکل بھی ثابت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا جواب یہ ہے کہ مصحف عثمانؓ پر صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا۔ رسم عثمانیؓ وحی سے بھی ثابت ہے۔ غلطی پر اجماع (حدیث نبویؐ کی روسے) ہو ہی نہیں سکتا۔

اس روایت کے آغاز میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جمع قرآن کمیٹی کے ارکان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "أحسنتم وأجملتم" (تم نے اچھا اور عمدہ کام کیا)۔ اس مجموعہ میں اگر غلطی ہوتی تو آپ غلطی کی تحسین کس طرح کرسکتے تھے۔

ابوعبیدہ نے عبدالرحمن بن ہانی سے نقل کیا ہے کہ میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے پاس تھا کہ کاتبان مصاحف پیش کرتے تھے تو اس میں "لم یتسنَّ، لاتبدیل للخلق اور وأمهل الکافرین" لکھا ہوا تھا آپ نے قلم دوات منگوا کر تینوں جگہوں کی غلطی کی اصلاح کر دی۔ اس روایت سے لحن والی روایت کی نفی ہو جاتی ہے کہ آپ نے نہایت احتیاط سے کام لیا اور کتابت کی معمولی غلطی کو بھی رہنے نہیں دیا۔

اس اعتراض کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں 'لحن' سے مراد غلطی نہیں بلکہ قرآن کے وہ صحیح الفاظ مراد ہیں جو عرب کی زبان پر چڑھے ہوئے نہ تھے اور ان کی طرزِ گفتار کے مطابق نہ تھے۔ ایسے الفاظ کے بارے میں فرمایا کہ قرآن مجید میں ایسے انداز کے الفاظ ہیں جن کو عرب بار بار پڑھنے سے قابو پالیں گے۔ اور ان کی زبان رفتہ رفتہ اس طرز کی عادی بن جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ لحن دو معنوں میں مشترک ہے۔ ایک معنی غلطی ہے اور دوسرا معنی طرز کلام ہے۔ درحقیقت اس روایت میں دوسرا معنی مراد

---

(1) The Quran as Scripture,P.100-102.

ہے یہی معنی امام راغب نے مفردات القرآن میں بیان کیا ہے کہ اسے 'لحن محمود' کہا جاتا ہے۔
اس کے متعلق شاعر کہتا ہے کہ "خَيْرُ الْحَدِيثِ مَاكَانَ لَحناً" (اچھی بات وہ ہے جو خاص طرز سے کہی جائے) یہی معنی خود قرآن مجید کی آیت مبارکہ ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾[1] میں استعمال کیا گیا ہے۔

بخاری شریف میں موجود حضور ﷺ کا ایک بیان مبارک بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لعل بعضكم ألحن بحجته۔" جس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین مقدمہ میں سے کبھی ایک فصیح طرزِ کلام کا ماہر ہوتا ہے۔ میں اس کی بات سن کر فیصلہ کرتا ہوں۔ لہٰذا اگر وہ حقیقت میں اس شخص کا حق نہ ہو تو یہ ڈگری اس کے حق میں آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لحن کا معنی غلطی نہیں بلکہ ایک خاص طرز تلفظ ہے۔

ایک وضاحت یہ بھی یہ کہ گئی ہے کہ لحن سے رسم الخط کا لحن مراد ہو کہ رسم مصحف عثمانیؓ میں بعض جگہ ملفوظ اور مکتوب الفاظ موافق نہیں لیکن عرب اہل لسان اپنی زبان سے اس کو درست پڑھ لیں گے۔ جیسے کہ انگریزی زبان میں مکتوب اور ملفوظ الفاظ میں فرق ہوتا ہے لیکن اہل زبان انہیں پڑھتے درست ہی ہیں۔[2]

محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں۔
اس روایت کی سند منقطع اور مضطرب ہے اور اس کے راوی ضعیف ہیں۔[3]

حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے مصحف پر اعتراضات کے جواب کے سلسلے میں آخر میں ہم ولیم میور (1819-1905) کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں وہ لکھتا ہے کہ 'قرآن کی ترتیب خود اس کی شاہد ہے کہ جامعین نے اس میں پوری دقت نظر کا لحاظ رکھا' اس کی مختلف سورتیں اس سادگی سے ایک دوسری کے ساتھ مربوط کر دی گئیں جن کی ترتیب دیکھ کر کسی تصنیفاتی تکلف کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ جامعین قرآن میں تصنیف کی شوخی سے زیادہ ایمان واخلاص کا جذبہ کار فرما تھا اور اسی ایمان کے ولولہ میں وہ صرف سورتوں بلکہ آیات کی ترتیب میں بھی تصنع سے اپنا دامن بچاتے ہوئے نکل

---

(1) محمد: ۳۰

(2) روح المعالی، جلد 1، ص: 28

(3) ایضاً

گئے۔[1]

ولیم میور (1819-1905) آخر میں نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ہم پورے شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عہد عثمانؓ میں حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کی جس صورت میں نظر ثانی کی وہ نہ صرف حرفاً حرفاً صحیح ہے بلکہ اس کے جمع کرنے کے موقع پر جو اتفاقات یک جا ہوتے گئے ان کی رو سے بھی یہ نسخہ اس قدر صحیح ہے کہ نہ تو اس میں کوئی آیت وحی میں سے اوجھل ہو سکی۔ اور نہ جانبین نے از خود کسی آیت کو قلم انداز کیا۔[2]

پس! یہی قرآن ہے جسے حضرت محمد ﷺ نے پوری دیانت و امانت کے ساتھ دوسروں کو سنایا۔[3]

کیا ابن مسعودؓ (32ھ)، حضرت عثمانؓ (35ھ) کے مصحف سے متفق نہ تھے؟

اس سلسلے میں ترمذی شریف کی ایک روایت ہے جس میں امام زہریؒ سے منقول ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (32ھ) کو شکایت تھی کہ کتابت قرآن کا کام ان کے سپرد کیوں نہیں کیا گیا جبکہ انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے مقابلے میں زیادہ طویل عرصے تک حضور ﷺ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔[4] اس سلسلے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے فتح الباری میں اس نقطہ نگاہ کا رد کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے یہ کام مدینہ طیبہ میں شروع کیا تھا اور ابن مسعودؓ (32ھ) اس وقت کوفہ میں تھے اور حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) ان کے انتظار میں اس کام کو مؤخر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ کام سونپا تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ مرحلہ بھی انہی کے ہاتھ سے تکمیل کو پہنچے۔[5]

حافظ ابن حجرؒ کی اس توجیہہ کی علاوہ اس نقطہ نگاہ کا رد یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عثمان غنی (35ھ) کو اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا اس میں صحابہؓ کے علمی مقام و مرتبے کو عمل دخل کم تھا بلکہ اس کے

---

(1) Life of Mahomet, PXXI.

(2) IBID, PXXI.

(3) IBID, PXXI.

(4) ترمذی، جامع ترمذی، کتاب جمع القرآن، باب القراء من اصحاب النبی ﷺ، جلد 6، ص: 299

(5) فتح الباری، جلد 9، ص: 13-15

مقابلے میں اس مسئلے کا تعلق تجربے سے تھا۔ حضور ﷺ نے جن صحابہؓ کے نام علمائے قرآن اور قراء قرآن کے بارے میں ارشاد فرمائے ہوئے تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی تھے لیکن عہد عثمانیؓ کا مسئلہ کچھ اس سے مختلف تھا۔ کیا حضرت زید بن ثابتؓ کے لیے یہ اعزاز کچھ کم تھا کہ حضرت ابن مسعودؓ (32ھ) سے فوقیت رکھنے والے حضرات، حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) اور حضرت عمر فاروقؓ (33ھ) نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے پہلے 'جمع القران' کے کام پر زید بن ثابتؓ ہی کو مامور فرمایا تھا۔ جب حضرت زید بن ثابتؓ کو حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے مصحف کی تیاری پر مامور فرمایا اس وقت تو حضرت ابن مسعودؓ (32ھ) مدینہ طیبہ کے اندر موجود نہ تھے اور ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ کو منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن جب حضرات شیخین نے حضرت زیدؓ کو اس کام پر مامور فرمایا تھا اس وقت تو حضرت ابن مسعودؓ (32ھ) مدینہ طیبہ میں موجود تھے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کو مصحف کی تیاری پر کوئی پہلی مرتبہ متعین نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس سے پہلے عہد شیخین میں بھی ان کو اس کام کے لیے موزوں ترین قرار دیا گیا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے اپنے متقدمین ہی کی اقتداء میں انہیں تعینات کیا تھا۔ دونوں مواقع پر انہی کا انتخاب اس سبب سے تھا کہ عرضہ اخیرہ میں وہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ (1)

اس لئے حضرات، ابن مسعودؓ (32ھ) اور زید بن ثابتؓ کے منصب میں موازنہ کرتے ہوئے ہمیں ان مذکورہ بالا حقائق کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔

احراق مصاحف کے بارے میں ولیم میور (1819-1905) کہتا ہے کہ یہ ایک ناانصافی کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے مجمع علیہ نسخے کے علاوہ تمام مصاحف تلف کروا دیئے۔ لیکن میور (1819-1905) لکھتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دور میں کسی نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) پر الزام نہیں لگایا کہ انہوں نے قرآن میں تحریف و تصحیف کی ہے۔ اگر حقیقت میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) ایسے ہی کرتے تو یہ راز ضرور آشکار ہو کر رہتا مگر حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) پر یہ اتہام متاخرین شیعہ نے اپنے اغراض کے لیے وضع کر لیا۔ (2)

اگر مستشرقین قرآن حکیم کے متن پر اپنے انتقاد اعلی (Higher criticism) کے اصولوں کا غیر جانبداری کے ساتھ اطلاق کریں اخلاص اور دیانت داری سے ایسا کرتے ہوئے وہ قرآن حکیم کے اس

---

(1) ایضاً

(2) Life of Mahomet, PVII.

دعوے کی صداقت کا عملی مشاہدہ ضرور کریں گے کہ "اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے نازل کیا گیا ہوتا تو وہ اس قرآن میں بے شمار اختلافات اور تضادات پاتے"۔[1] اور یہ کہ "بے شک ہم نے ہی اس کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس (قرآن) کی (تحریف و تبدیلی) حفاظت کریں گے۔"[2]

(1) النساء، 82:4

(2) الحجر، 9:15

چھٹا باب

ترتیب قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کا نقطۂ نگاہ

مستشرقین کے نقطۂ نگاہ کا تحقیقی جائزہ

عہد نبوی میں قرآن مجید کی توقیفی ترتیب پر دلائل

ترتیب قرآن مجید توقیفی ہے: اقوال وآثار علماء

کیا قرآن مجید کی ترتیب توقیفی نہیں ہے؟

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن کے مرتب ہونے پر عقلی دلائل

قرآن مجید کی آیات کا باہمی ربط

***

ترتیب قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کا نقطۂ نگاہ

(ا)

قرآن مجید کی صحت پر اعتراضات کرتے ہوئے مستشرقین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ شروع دن سے ہی قرآن کا متن غیر محفوظ، غیر مرتب اور غیر معیّن رہا ہے۔ ایک متعین متن کی بجائے قرآن مجید کے کئی متون رائج رہے جو ترتیب میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور قرآن مجید کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ یہ بات ہم محض عقیدے کے پس منظر میں ہی نہیں کہتے بلکہ جیسا کہ آئندہ ابواب میں تفصیلات پیش کی جائیں گی۔ قرآن مجید کی صحت اور اس کے متن کا عہد نبوی میں ہی معیّن ہونا ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نا ممکن ہے اس کا ایک ایک لفظ، آیت اور سورت اسی جگہ رکھی گئی ہے جہاں اسے رکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

مستشرقین نے قرآن مجید میں انسانی تصرّفات ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا اور قرآن مجید کی ترتیب کو بنیاد بنا کر یہ نتائج اخذ کیے:

ا۔ اس کی ترتیب کا بے ہنگم پن اس کے کلام الٰہی ہونے کے منافی ہے گویا یہ کلام الٰہی نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ترتیب میں بد نظمی انسانی تصرّفات کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ ان لوگوں نے کہا کہ اصل قرآن حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اسے اسی ترتیب سے مرتب کیا جائے جس میں یہ نازل ہوا تھا اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ نزولی ترتیب میں اسے مرتب کرنا اب ممکن رہا ہی نہیں۔ ان میں بہت سے لوگوں نے قرآن مجید کو اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن قدم قدم پر یہ کہتے چلے گئے کہ ہم کوشش تو کر رہے ہیں کہ قرآن مجید کو اس کی اصل شکل میں لے آئیں لیکن ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ناکام رہا ہے۔ [1] یہ تاثر پیدا کرنے کا اصل مقصد یہی تھا کہ ایک عام قاریِ قرآن کو یہ مغالطہ دیا جائے کہ اب اصل قرآن کا حاصل ہو سکنا بہت دور کی بات ہے۔

اس سلسلے میں ہم مستشرقین کی دی ہوئی قرآنی آیات کی ترتیب پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔ جن لوگوں نے اس سلسلے میں قلم اٹھایا ہے ان میں ولیم میور (Willuim Muir) 1819-1905، نولڈیکے (1836-1930) (Noldeke)، ویل (Weil)، گرم (Grimm)، Rodwell(1808-1900)

(1) ولیم میور اور نولڈیکے وغیرہ کے اقتباسات کے لیے دیکھیے کتاب ہذا کے آئندہ صفحات

فلوگل (Flugal)، ایچ ہر شفیلڈ (Hirschfeld) (1854-1934) اور بلاشر (R. Blachère) کے نام نمایاں ہیں۔

جہاں تک میور (1819-1905) کی کوششوں کا تعلق ہے اس نے محض قیاس آرائیوں اور ظن و تخمین سے کام لیتے ہوئے قرآنی آیات کو ترتیب دی ہے اس نے اپنے موقف کی بنیاد کمزور روایات اور غیر معتبر ماٰخذ پر رکھی ہے[1] چنانچہ وہ اتنی بڑی غلطی کا مرتکب ہوا کہ اس نے کہا قرآنِ مجید کی ابتدائی سورتیں ضائع ہو گئیں۔ اس نے کہا کہ ابتدائی کاتبانِ وحی میں ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ (40ھ) تھے۔ اس نے حضورؐ کی حیات طیّبہ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا اور اسی مناسبت سے قرآنِ مجید کے نزول کے ادوار بھی متعین کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اس نے قرآن مجید کی اکیس سورتوں کو اپنے بنائے ہوئے گروپوں میں سے کسی گروپ میں شامل نہیں کیا کیونکہ ان سورتوں کے نزول کا زمانہ معلوم نہیں ہو پایا۔[2]

میور (1819-1905) نے قرآن مجید کی سورتوں کے چھ ادوار قرار دئے ہیں پہلا دور اٹھارہ سورتوں پر مشتمل ہے۔ جس میں چھوٹی چھوٹی نغماتی یا نثر کے بیجوڑ ٹکڑے اس وقت کے لکھے ہوئے ہو سکتے ہیں جب ابھی آپؐ کو خدائی مشن (رسالت) کا خیال نہیں آیا تھا۔ کوئی ٹکڑا ابھی ایسا نہیں جو خدا کا پیغام کہلا سکے۔[3]

اس کے بیان کردہ ادوار میں دوسرا دور وہ ہے جب پہلی وحی نازل ہوئی قرأت کا حکم دیا گیا۔ رسالت کا آغاز ہوا یہ سورۃ نمبر ۹۶ سے شروع ہوتی ہے اس دور میں چار سورتیں ہیں۔ تیسرے دور میں انیس سورتیں ہیں۔ ان میں جزا و سزا کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس دور میں قریش کی مخالفت روز افزوں تھی۔ یہ دور ابتدائے رسالت سے ہجرت حبشہ تک کی سورتوں پر مشتمل ہے یعنی پہلے سال نبوّت سے پانچویں سال نبوت تک۔ اس کے بیان کردہ چوتھے دور میں ۲۳ سورتیں ہیں۔ یہ چھٹے سالِ نبوّت سے دسویں سالِ نبوّت تک ہیں۔ اس میں یہودیوں کی مقدس کتابوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ قدیم عرب اور قدیم اقوام کی کہانیوں کا ذکر ہے۔ بت پرستی سے عارضی سمجھوتہ کر لیا گیا۔ اس کا ذکر سورۃ نمبر ۵۴ میں کیا گیا ہے۔ پانچویں دور میں ۳۱ سورتیں

---

(1) اس سلسلہ میں اس کی کتاب Life of Mohomet میں Mohomet کا باب دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بنیادی مآخذ واقدی اور Weil ہیں۔

(2) Muir, William, Life of Mahomet, Smith, London, 1860,p. iii-iv

(3) اجمل، محمد، ڈاکٹر، ترتیب نزول قرآن مجید، کتب خانہ، عزیزیہ، دہلی، ۱۹۴۱ء، ص ۲۱

ہیں۔ یہ دسویں سالِ نبوّت سے لے کر ہجرتِ مدینہ تک حاوی ہیں۔ اس دور میں سورتوں کے اندر انجیل کے بیانات بھی ہیں۔ حج کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ قریش کے اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ حشر نشر، جنت دوزخ، توحید، قدرتِ الٰہی اور ربوبیت کی تصویریں پیش کی گئیں۔ سورتیں تدریجاً طویل ہونے لگیں۔ آخری دور (چھٹا دور) آخری بیس سورتوں پر مشتمل ہے۔ یہ مدنی سورتیں ہیں۔ زمانے کے اعتبار سے یہ دور ہجرت کے پہلے سال سے وصال نبوی تک ہے۔ میور (1905-1819) نے جو تاریخی اعتبار سے ادوار پیش کئے ہیں وہ مسلمانوں ہی کی تاریخ سے ماخوذ ہیں اور جیسا کہ نولڈیکے (1930-1836) کہتا ہے کہ اس میں میور (1905-1819) کے قیاسات ہی کار فرما نظر آتے ہیں۔[1]

نولڈیکے (1930-1836) (Noldeke) لکھتا ہے کہ قرآن مجید کو مرتب کر سکنا ناممکن ہے کیونکہ اس کی ترتیب کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ جب قرآن مجید لکھا گیا اس وقت اس بات کی پرواہ نہیں کی گئی کہ اس کی ترتیب خراب ہو رہی ہے۔ یہ اس طرح لکھا گیا ہے کہ اس میں کوئی نظام کار فرمانہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ طویل سورتوں کو پہلے اور چھوٹی سورتوں کو بعد میں رکھ دیا گیا۔[2] وہ کہتا ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب کے حوالے سے یہی بہتر ہوگا کہ قرآن مجید کو ہم مکہ کی سورتوں کے تین گروہوں کو کسی حد تک ایک خاص ترتیب کے ساتھ یکجا کر لینے پر اکتفا کر لیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں اسے نہ تو یہ معلوم ہو سکا کہ کب ایک مکی دور ختم اور کب دوسرا دور شروع ہوا اور نہ ہی وہ ان ادوار میں ان سورتوں کی ترتیب ہی معلوم کر سکا۔ ایک جگہ پر وہ لکھتا ہے کہ "وحی کا مدنی حصہ، خواہ وہ پوری سورت ہو یا مکہ کی سورۃ کا جزء ہو، ہم صاف طور پر معلوم کر سکتے ہیں اس لئے کہ ان کے مضامین مکی مضامین سے مختلف ہیں"[3] لیکن دو ہی جملوں کے بعد اس کے اس بیان کے برعکس بات ملتی ہے جہاں وہ لکھتا ہے:

---

(1) ایضاً

(2) اس سلسلہ میں اس کی جرمن کتاب Geschichte Des Korans کے حوالے سے محمد اجمل نے اس کی ترتیب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ Montgomery Watt(1909-2006) نے بھی اس کے نظریات کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے:

Watt, Montgomery,Mohammad at Makkah, Oxford, 1953, p.60; Watt, Montgomery, Mohammad at Madina, Oxford, 1953,p. 40-41,51

(3) Encyclopaedia Britannica, Encyclopaedia Britannica Ltd. London, 1950,p.xiii/483

"مدینہ کی سورتوں کے بارے میں بھی بہت سی غیر یقینی باتیں باقی رہ جاتی ہیں۔" (1)

نولڈیکے (1836-1930) مکی حصے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

۱۔ پہلا دور پہلے سال سے پانچویں سال تک ہے۔ یہ جذباتی دور ہے۔ سورتیں لمبی نہیں ہیں۔ آیات چھوٹی چھوٹی ہیں۔ اکثر سورتیں قسم سے شروع ہوتی ہیں ان میں قیامت، جنت، دوزخ کا ذکر ہے۔ لیکن یہ بات اس کے نزدیک مشکل ہے کہ ان سورتوں کی تاریخی ترتیب دی جاسکے۔ استہزاء کرنے والوں کو وعیدیں سنائی گئی ہیں۔

۲۔ دوسرے دور کی سورتوں میں پانچویں اور چھٹے سال کی سورتیں ہیں۔ تخیّل کی تیزی تدریجاً کم ہونے لگی۔ جس میں جوش موجود رہا۔ بیان میں سادگی آنے لگی سورتیں طویل ہونے لگیں۔ فطرت اور تاریخ سے مثالیں پیش کرکے اپنی بات سمجھائی جاتی ہے۔ "رحمٰن" کا استعمال اس دور میں زیادہ ہے۔

۳۔ مکہ کے تیسرے دور کی سورتیں ساتویں سال سے ہجرت تک کی ہیں۔ یہ موجودہ قرآن کا بہت بڑا حصہ ہیں ان میں زبان بالکل سادہ ہے۔ آیات و سورتیں لمبی ہیں۔ واعظانہ رنگ غالب ہے۔ (2)

نولڈیکے (1836-1930) نے یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد یہی کہا ہے کہ اس سلسلے میں ہماری تحقیقات حتمی نہیں ہیں۔ اور محض ظن و قیاس پر مبنی ہیں ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ظن و قیاس کی بنیاد پر کیا جانے والا فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ (3)

لہٰذا اس کے اپنے ہی بقول اس کے پیش کردہ نتائج ضروری نہیں کہ درست بھی ہوں۔ قرآن مجید کی تاریخی ترتیب کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ تاریخی ترتیب کا بس تصوّر ہی کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کے اندر تاریخی اشارات بہت کم ہیں کہ ان کی بنیاد پر اسے مرتب کیا جاسکے۔ (4)

نولڈیکے (1836-1930) ترتیبِ قرآن کے بارے میں لکھتا ہے: "حقیقت میں طویل سورتوں کے بہت سے ٹکڑوں کے بارے میں سننا پڑے گا کہ وہ ابتداء میں الگ الگ تھے حتیٰ کہ چھوٹی سورتوں میں بھی ایسے حصے ملیں گے جو ان میں پہلے نہ تھے۔ (5) انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مقالے میں وہ کہتا

---

(1) Ibid

(2) Noldeke,Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit, p. 40-42

(3) Ibid

(4) Ibid,p. 40-41,51

(5) Ibid

ہے کہ ہمیں اس چھان بین میں زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہیے وہ کہتا ہے کہ اس روایت میں بہت سے شبہات بلکہ غلط بیانات ہیں ان کی بنیاد پر تنزیلی ترتیب کیلئے کوشش کی جاسکتی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اس بات کی بھی کوئی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں کہ محمدؐ کے کسی ہمعصر نے اس قسم کی کوئی ترتیب قائم کی ہو اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی ہو گا تو اس کیلئے تقریباً نا ممکن ہو گا کہ ابتدائی سورتوں کے متعلق قابل اعتماد اطلاعات حاصل کر سکے"

نولڈیکے (1836-1930) نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد Weil اور ولیم میور (1819-1905) ہے۔ وہ میور پر تنقید کرتا ہے لیکن خود میور کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کہتا ہے کہ ابتدائی سورتیں ضائع ہو گئیں اس کا یہ بیان محض قیاس آرائی ہی ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ وائل سے وہ تین ادوار کا تصور تو مستعار لے لیتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ کون سا دور کہاں تک ہے۔ اس لئے کہ اس کے خیال میں وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کر پایا کہ انہیں کس دور سے منسلک کیا جائے۔ ان گروہوں میں بھی یہ قطعی نا ممکن ہے کہ کسی حد تک صحیح ترتیبِ نزول مختلف سورتوں کی بھی معلوم کی جاسکے [1] اسکی قرآن مجید کو مرتب کرنے کی کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی اور وہ اس کوشش سے کہاں تک مطمئن تھا، اس کا اندازہ اس کے مذکورہ بالا بیانات سے لگایا جاسکتا ہے وہ کہیں بھی اپنی کامیابی کا اظہار نہیں کر پایا۔ اسکے علاوہ ویل نے اپنی کتاب "Muhammad" میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اسی کے حوالے ولیم میور نے جگہ جگہ دئے ہیں۔ نولڈیکے (1836-1930) نے بھی اسی سے استفادہ کیا ہے اس نے حضورؐ کی حیات طیّبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ تقسیم آپؐ کے جذبات اور جوش و خروش کی بنیاد پر کی ہے۔ [2] ہر شفیلڈ نے اپنی کتاب New Research in to the composition and Exegeses of the Quran میں ویل کے نظریات پر بڑے عمدہ الفاظ میں تنقید کی ہے۔ [3]

ترتیبِ قرآن مجید کے بارے میں ویل کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ

ا۔ ابتدائی دور میں آپؐ ایک مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ آپؐ پر اس زمانے میں جوش و خروش غالب ہے۔ زبان مسجع ہے۔ شاعری کی سچی رنگینی ہے جس کے اختتام پر آپؐ کو یقین میسر آیا کہ آپؐ خدا کی طرف سے مامور ہیں۔ اور اپنی قوم کی پستی، شرک، بد اخلاقی کو انہیں ختم کرنا ہے۔ اب ایک قدیر اور بصیر خدا کی عبادت کا آغاز ہوتا ہے۔ جنت اور دوزخ کے نقشوں کو مادی رنگ دے کر پیش کیا گیا ہے۔ روزِ جزا کا تصور سامنے آتا ہے آپؐ نے مخالفین پر حملے کئے۔ سورتوں

(1) Encyclopaedia Britannica,p.xiii/483

(2) Noledke, ibid, p.42; Britannica, ibid.

(3) محمد اجمل، ڈاکٹر، ترتیب نزول قرآن، ص:22

میں دعائیں۔ بد دعائیں اور بھجن بھی نظر آتے ہیں۔ وئل نے ''جوش و خروش'' کو بنیاد بنایا ہے اور سورتوں کو ان کے اسلوب کی بنیاد پر کسی دور سے منسلک کیا ہے۔ جوش و خروش اور جذبات کی شدّت ہی کی بنیاد پر وہ آپؐ کو مصلح قرار دیتا ہے۔[1] ویل کا قائم کردہ اصول اس کے لئے چنداں مفید نہیں کہ وہ قرآن کو ترتیب دے سکے۔ کسی سورت کو محض اس لئے کہ اس میں جوش و خروش نہیں ہے یا یہ لمبی نہیں ہے، ابتدائی دور سے خارج کر دینا درست نہیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی دور کی سورتوں کے متعلق جو روایتیں ہیں وہ اتنی متضاد ہیں کہ ہمیں ان سورتوں کے اندر ہی کسی ایسی چیز کو تلاش کرنا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ سورتیں کس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔[2]

۲۔ ویل کے خیال کے مطابق دوسرا دور وہ ہے جب آپؐ ایک نئے مذہب کے بانی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ سنجیدہ غور و فکر بجائے بلند تخیّلی کے ظاہر ہونے لگتا ہے شاعری کی جگہ خطابت لے لیتی ہے۔ اب زبان سنجیدہ اور منطقی ہو جاتی ہے۔ اب پہلے کی طرح جوش باقی نہیں رہتا۔ سورتیں طویل ہونے لگتی ہیں۔ اجزائے ایمان، پہلے لوگوں کے واقعات اپنے زورِ خطابت سے بیان کئے گئے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کیلئے حوصلہ افزائی اور مخالفین کے لئے وعیدیں آگئیں۔ اب محمدؐ اپنے آپ کو پرانے انبیاء کا مثل سمجھتے ہیں معجزات طلب کرنے کے مطالبات کا جواب دیا گیا ہے۔ اور آپؐ وحی کو اپنی نبوّت کی صداقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی میں معراج کا واقعہ، نصرانیوں کی تثلیث کی نفی و ردّ اور اخلاقی ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ خدا، وحی، یوم آخرت اور حشر سے متعلق جو باتیں اس سے پہلے بیان ہو چکی تھیں اب دوبارہ ان کا ذکر ہوا۔ جب ہم ویل کی اس تقسیم کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے قرآن براہ راست پڑھنے کی بجائے تراجم سے استفادہ کیا ہے۔[3]

۳۔ ویل کے نزدیک تیسرا دور وہ ہے جب قرآن کی زبان بالکل معمولی بن گئی جب آپؐ قوانین و احکام جاری کرتے ہیں تو آپؐ کی زبان بد مزہ معلوم ہوتی ہے۔ غزوات کا حال بیان کرتے ہیں۔ صفات الٰہی، کائنات کا جمال، جزا و سزا، کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔[4]

ا۔ گرم نے مکی سورتوں کے پہلے گروہ کو ''قدیم سجع'' کہا ہے۔ اس نے نثر کی دو قسمیں کی ہیں۔

---

(1) اجمل: حوالہ مذکور

(2) ایضاً، ص ۲۶

(3) ایضاً

(4) ایضاً

حالانکہ اگر وہ اپنے اس نقطہ نگاہ میں درست ہوتا تو اس کو نثر کی دس قسمیں کرنی چاہئیں تھیں۔ کیونکہ نثر کی تو باتفاق ''ماہرین نثر'' دس اقسام ہیں لیکن اس نے اپنے طور پر اس کی دو قسمیں کر دی ہیں جبکہ اصول بدیع کے ماہرین، اشاعرہ اور باقلانی (403ھ) وغیرہ کہتے ہیں کہ قرآن میں سجع ہے ہی نہیں۔

۲۔ گرم کے نزدیک مکی سورتوں کا دوسرا دَور ڈھیلی سجع میں ہے۔ لیکن ڈھیلی سجع کی وضاحت اس نے نہیں کی اور نہ ہی ''ماہرین بدیع'' کے ہاں اس قسم کی کوئی اصطلاح پائی جاتی ہے۔

۳۔ اس کے نزدیک سورتوں کا تیسرا گروہ مدنی سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں غزوات کے حالات مذکور ہیں۔ اس کو بھی اس نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس نے ان مدنی سورتوں کو تاریخی حوالوں سے مرتب کیا ہے۔

گرم کے ہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اس کا ظن و تخمین کار فرما ہے۔ دوسری طرف ترتیبِ قرآن میں اسی کے خیالات دوسروں سے مختلف ہیں۔[1]

ہر شفیلڈ نے بھی ترتیبِ زمانی پر قلم اٹھایا ہے لیکن وہ بھی دیگر مستشرقین کی طرح دوسروں سے الگ اپنے نظریات کی بلند عمارت کو تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن نتیجہ وہی ہے جو ہونا تھا کہ قرآن کو ترتیبِ نزولی میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔

اس نے ان خیالات کا اظہار اپنی کتاب New Research in to the Composition and Exegeses of the Quran. میں کیا ہے۔ اس نے سورتوں کے علاوہ آیات کو بھی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ترتیب کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

اس نے سورتِ نمبر ۱۱۲ کو اپنی ترتیب میں چوتھے نمبر پر رکھا ہے۔ اس سورت کے بارے میں روایات و تاریخ اور اس کی داخلی شہادت بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ بعد کے زمانے کی سورت ہے۔ اس نے جو اسناد و حوالے دئے ہیں وہ یورپی تراجم ہی کے ہیں۔ وہ لکھتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ سورۃ نمبر ۱۱۲ کو ابتدائی وحیوں میں جگہ دوں۔ پھر وہ لکھتا ہے اب تک میں نے تین سورتوں کو ترتیب دینے کی جو کوشش کی ہے وہ ایک حد تک بری ابتداء ہے جس کے ذریعے سے میں نے قرآن کی سورتوں کی تنزیلی ترتیب کی چھان بین شروع کی ہے۔[2] میں پہلے سے یہ اقرار کیوں نہ کر لوں کہ اس سلسلے میں قابل اعتماد نتائج حاصل کر سکنے کی

(1) Hirschfeld, H,New Researches into the Composition and Exegeses of the Quran, University of London, 1902, p. 35

(2) Ibid

بہت ہی کم امید ہے۔۔۔۔بہت سی سورتوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب نازل ہوئیں۔[1] وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ قرآنی سورتوں میں باہم مماثل اجزاء ایک دوسری سورت میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں سورتوں کی تاریخی ترتیب دینے کے خیال کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ دینا چاہئیے۔[2]

ہرش فیلڈ نے دوسرے مستشرقین کے نظریات کا جائزہ پیش کیا ہے جنہوں نے اس میدان میں قلم اٹھایا ہے۔[3] اس کی ترتیبِ نزولی قرآن کا خلاصہ یہ ہے:

مکی دور سے متعلق اس کی ترتیب یوں ہے۔(اس کے چھ حصے ہیں)

۱۔ پہلا خطبہ۔ صرف سورۃ العلق کی پانچ آیات

۲۔ وہ سورتیں جن میں پہلے خطبے کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ فصیح وبلیغ زبان میں ترغیب وترتیب والی سورتیں۔

۴۔ بیانیہ سورتیں۔ جن میں قصص وحکایت انجیل کا ذکر ہے۔

۵۔ تشریحی خطبات یا سورتیں۔ جب کہانیوں کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہوتا اس وقت قدرت کی نیرنگیوں اور عظمت کا ذکر ہوتا۔

۶۔ مندرجہ بالا دور کے گزرنے پر قانونی خطبات دیئے جاتے ہیں۔ اور پکے مومنوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کیسے گزاریں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی ہرش فیلڈ دوسروں سے مختلف الرائے ہی ہے۔[4]

راڈویل نے بھی قرآن مجید کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس نے در حقیقت مکی سورتوں کو ترتیبِ نزولی کے مطابق مرتب کرتے ہوئے وائل کی اور مدنی سورتوں میں نولڈیکے-1836) (1930 کی خوشہ چینی ہی کی ہے۔[5]

---

(1) Ibid

(2) Ibid

(3) Ibid, p.7

(4) Ibid, p.33-36

(5) Rodwell, J.M. The Koran, Dentt, London, 1909, p.3;

Bell, Richard, Introduction to the Quran, Edinburgh University Press Edinburgh, 1958, p. 102

اسلوب اور مضمون کے تسلسل کا بالکل لحاظ رکھے بغیر ایک ایسا انداز اختیار کیا گیا جو پڑھا بھی نہیں جاسکتا اور جو کسی اصول کے بغیر پیوند کاری ہے۔ راڈویل نے اپنے ترجمہ قرآن کے شروع میں preface کے عنوان کے تحت ترتیب قرآن پر تفصیلی بات کی ہے۔ اس کا خلاصہ ان سطور میں پیش کیا گیا ہے:

جہاں تک مکی سورتوں کا تعلق ہے میور (1819-1905) اور وائل نے عام نقطہ نگاہ قائم کئے ہیں اور انہی کو نولڈیکے (1836-1930) نے اپنایا ہے تاکہ پیچیدگیوں کو سلجھایا جاسکے۔ یہ لوگ تمام سورتوں کو تین ادوار میں تقسیم کر دیتے ہیں:

۱۔ کم ہونے والے جوشِ نبویؐ والی سورتیں

۲۔ کم جذباتی خطبات

۳۔ آیات کی طوالت کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ لیکن ہم نے بیان کیا ہے کہ رسولؐ کی تقریروں میں سنجیدہ غور و فکر موجود ہے اور جوش و جذبات کا نظریہ ایسا ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم اس بیان کردہ جوش کا تجزیہ کریں تو ہمیں دو چیزوں میں امتیاز کر لینا چاہئے ایک جوش تو وہ ہوتا ہے جو حقیقی طور پر انسان کے دل میں قائم رہ کر کسی خیال کی دھن میں اسے لگا دیتا ہے اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ دوسرا جوش خالی خولی جذبہ ہے جو بات منہ سے نکلتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پہلا جوش محمدؐ کے دل میں اس وقت سے موجود تھا جبکہ آپؐ نے ابھی منہ بھی نہیں کھولا تھا۔ اور یہ اس وقت تک رہا جب تک کہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ کی تقاریر سنجیدہ اور ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ (1)

ہرش فیلڈ مزید لکھتا ہے:

> ''جوش و جذبات کے مختلف مدارج ہیں جو کم و بیش تقریروں میں ظاہر ہوتے ہیں ان کو صرف اس طرح جانچا جاسکتا ہے جس طرح انسان کے جذبات کی تبدیلیوں کو جانچا جاسکتا ہے خارجی حالات کا جذبات پر بہت اثر پڑتا ہے۔ وقتی جوش تو محض اتفاقیہ طور پر یا کسی ہمت افزاء بات سے بھی پیدا ہو جاتا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن آیات میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے صرف ابتدائی دور سے متعلق ہیں اگر ایسا نہ مانا جائے تو سورۃ اقراء ہی سے ہمیں ماننا چاہیے کہ محمدؐ میں اصلی جذبہ موجود نہ تھا۔ جو سراسر سورۃ

(1) New Researches into the Composition and Exegies of the Quran, University of London, 1902, p. 35,36

اقراء کی تاریخ کے منافی ہے۔"(1)

اس سلسلے میں ڈاکٹر منگانا نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔(اس کا ذکر آئندہ صفحہ پر کیا گیا ہے) مستشرقین کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسلوب میں حضور اکرم ﷺ کے جذبات واحساسات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تغیرات رونما ہوتے رہے۔ لیکن انہی کا ایک نامور ساتھی مار گولیتھ اس بات کے امکان کو رد کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مفروضہ نفسیاتی ارتقاء پر کسی سورۃ کی تاریخ کو منحصر سمجھنا فطری طور پر ایک غیر علمی طریقہ ہے اور نہ ہی یہ قرار دے کر کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔ مثلاً اسپرنگر کہتا ہے کہ 617ء میں حضرت محمدؐ کو معلوم ہوا کہ ہود اور صالح کی کہانیاں بعد میں گھڑی ہوئی داستانیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو آپؐ نے آئندہ ان واقعات کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے ان کا ذکر سورۃ نمبر ۹ کی آیت نمبر ۷۰ میں کیا۔(2) جبکہ احادیث کے مطابق یہ سورت قرآن مجید کی آخری یا اس سے پہلی سورت ہے۔(3) رچرڈ بل نے اس موضوع پر مستشرقین کے باہمی فکری تضادات کا ذکر کیا ہے۔(4) جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کی باتیں محض بے بنیاد ہی ہیں۔

A.J. Arberry کا نقطہ نگاہ اس سلسلے میں باقی مستشرقین سے بالکل ہم آہنگ ہے اس کے نقطہ نگاہ کا خلاصہ یہ ہے:

ا۔ حضورؐ کی وفات سے بیس برس بعد، حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے قرآن کا ایک نسخہ تیار کروایا اور اس نسخے میں انہوں نے ایک ترتیب کو پیشِ نظر رکھا۔ یہ ترتیب اسی اصول پر مبنی تھی کہ لمبی سورتیں پہلے اور چھوٹی سورتیں بعد میں۔ وہ لکھتا ہے:

In the vulgate the general procedure is to arrange the surahs roughly in order of their length. Begining with the longest and ending with the shortest.(5)

---

(1) IBID,p 36

(2) مکمل آیت یوں ہے: أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ۔ (سورۃ التوبۃ: ۷۰)

(3) Margoliouth D.S. Article "The Koran" in Encyclopedia of Religion and Ethics, vol x, p. 545

(4) Introduction to the Quran, Edinburgh University Press Edinburgh, 1958, p. 102

(5) Arberry, A.J. The Koran Interpreted, Allen and Unwin London, 1955, p. 18,19

۲۔ اس ترتیب میں ترتیبِ نزولی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

۳۔ مختلف اوقات میں نازل ہونے والی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔

ڈاکٹر نے منگانا نے بھی قرآن مجید کی ترتیب کو بنیاد بنا کر اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس نے اسی قسم کی کوئی کوشش تو نہیں کی کہ قرآن کو مرتب کرے۔ البتہ وہ مختلف اوراق کو پیش کرتے ہوئے قرآن کی ترتیب کو غلط رنگ دیکر اس مسئلے کو خوب اچھالتا ہے اور قرآن میں تحریف ثابت کرتا ہے۔

اس سلسلے میں اس کی کتاب Leaves from three ancient Korans اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر منگانا کے دلائل اور نقطہ نگاہ کا تفصیلی جائزہ ''متفرق اعتراضات'' والے باب میں لیا گیا ہے۔

ترتیبِ قرآن کے حوالے سے ڈاکٹر منگانا نے مستشرقین کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غالباً آخری بات ہے وہ لکھتا ہے:

جو کوششیں اہل یورپ نے کی ہیں کہ قرآن کو ترتیبِ نزولی کے مطابق کریں وہ اتنی ہی ناکام ہوئیں جتنی کہ مقامی لوگوں کی۔ مثال کے طور پر راڈویل کے ترجمہ کو لیجئے اس میں سورۃ نمبر ۱۶ کو ۷۳ نمبر پر رکھا گیا ہے اور سورۃ نمبر ۶ کو ۸۹ نمبر پر رکھا گیا ہے لیکن سورۃ نمبر ۱۶ کی ۲۹ آیت میں ہے ﴿فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ﴾ میں یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے اب سورۃ ۶ کی ۱۴۷ ویں آیت کو دیکھیں ﴿فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ ۔۔۔ گویا اس آیت میں اسی بات کا ذکر ہے جس کا سورۃ نمبر ۱۶ کی ۲۹ ویں آیت میں تھا اسی بات کا ذکر ہے یعنی بعض چیزوں کے یہودیوں پر حرام کرنے کا ذکر ہے لہٰذا اگر مختلف سورتوں کو تاریخی حیثیت سے جمع کرنا ممکن ہو تو سورۃ نمبر ۶ کو سورۃ نمبر ۱۶ سے پہلے جگہ دینی چاہیے۔[1]

R. Blachère نے اپنی کتاب Le Coran میں نولڈیکے (1836-1930) ہی کی خوشہ چینی کی ہے اس نے سورتوں کو مختلف تاریخوں کی بنیاد پر تقسیم کر دیا ہے۔ رچرڈ بل نے اس کی تقسیم کے

---

(1) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, Cambridge University Press, 1914, p. 40

بارے میں یوں تبصرہ کیا ہے۔

But this is vitiated by failure to discern the natural points of division.[1]

اس سلسلے میں De Lacy Johnstone لکھتے ہیں کہ ترتیبِ قرآن مجید کا کام آپؐ کے بعد دوسرے لوگوں نے سرانجام دیا۔

It is strange, however, that he gave no more regular form to the whole body of his oracles and left this to be done by his successors[2].

ترجمہ: یہ حیرانی والی بات ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی زبان سے کہی ہوئی سب باتوں کو کوئی باقاعدہ شکل نہیں دی اور اسے مرتب کرنے کا کام اپنے بعد آنے والوں پر چھوڑ دیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

Tradition is of no great value in determining their order," The most penetrating "higher criticism" is only partially successful and we regretfully admit that scarcely anything quite certain has been done to solve the riddle of the Quran".[3]

اگر ہم اس حدیث کو اعلیٰ تنقیدی زاویہ نگاہ سے دیکھیں تو اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ آیات کو ترتیب دینے میں جزوی طور پر کامیاب ہوئے اور ہم بڑی معذرت سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں شاید ہی کوئی چیز یقینی ہو کہ آپؐ نے قرآن کی ترتیب کی پہیلی کو سمجھانے کو کائی کام کیا ہو۔

پروفیسر نکلسن کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں مکی اور مدنی آیات کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔[4]

Stanley Lane Poole (1854-1931) اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ

☆ زید ابن ثابتؓ نے قرآن کو بغیر کسی اصول کے مرتب کیا۔ اس سے بہتر طور پر آیات مرتب کرنے

(1) Introduction to the Quran, Edinburgh University Press Edinburgh, 1958, p. 102

(2) Johnstone, De Lacy p. 197

(3) IBID

(4) Nicholson, Literary History of The Arabs, P.xv (Preface)

کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں کیا اصول کار فرما تھا؟ اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سورتوں کو ان کی طوالت کے اعتبار سے لکھ دیا گیا ہے۔

☆ زید ابن ثابتؓ کو اگرچہ مکی اور مدنی سورتوں کے بارے میں علم تھا اس کے باوجود اس میں شک کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ترتیبِ زمانی کو پیشِ نظر رکھا تھا یا نہیں؟

☆ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے محمدؐ کی زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق آیات کو باہم خلط ملط کر دیا۔

☆ وہ ترتیبِ قرآن کی موجودہ شکل کو Unscientific قرار دیتا ہے۔

☆ وہ لکھتا ہے کہ موجودہ ترتیب سے محمدؐ کے کردار پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جبکہ ہمارا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ قرآن سے محمدؐ کی زندگی کا پتہ چلے۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے تحت قرآن کو ترتیب دینی چاہیے۔ (اس مستشرق نے نولڈکیے (1836-1930) کی ترتیب کو پسند کرتے ہوئے اسے سائینٹیفک قرار دیا ہے۔[1]

Anthology of Islamic literature کے مصنف James Kritzeck نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ قرآنی سورتوں کو ان کی طوالت کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب بالکل الٹی ہے۔ اور موجودہ ترتیب سے قرآن پڑھنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص قرآن کو الٹا پڑھے۔ اور اس کے خیال میں یہ ترتیب قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔[2]

N.J.Dawood (1927-1914) اس سلسلے میں لکھتا ہے:

☆ قرآن کی موجودہ ترتیب، حضورؐ کی زندگی میں نہیں دی گئی۔ یہ کام آپؐ کی وفات کے بعد ہوا۔ اس ترتیب کے پیچھے کوئی سند نہیں ہے۔

☆ اس ترتیب میں کوئی روانی اور تسلسل نہیں ہے۔[3]

Rom Landau (1800-1974) اپنی کتاب Islam and The Arabs میں قرآن کی ترتیب کے بارے میں لکھتا ہے:

---

(1) Lane,Pool, Stanley, Studies in Mosque, Khayat, Beirut, 1966, p. 124-126

(2) Kritzeck, James,(ED) Anthology of Islamic Literature, Penguin Books Hormonds Worth, 1964, p. 29

(3) Dawood, N.J, The Koran, London, 1956, p. 11

☆ قرآن مجید کا مطالعہ جب مغربی لوگ کرتے ہیں تو انہیں اس سلسلے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ یہ ترتیب بڑی پُر پیچ ہے۔

☆ سورۃ الفاتحہ کے علاوہ باقی تمام سورتوں کو طوالت کی بنیاد بنا کر مرتب کیا گیا ہے۔

☆ قرآن کے مطالعے میں بائبل کی طرح تاریخی اعتبار سے تسلسل نہیں ہے۔ اس میں روانی کا فقدان ہے۔[1]

S.E. Frost(1899-1978) نے بھی یہی نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے کہ سورتوں کو طوالت کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔[2]

غرض مستشرقین نے ترتیبِ قرآن مجید میں غیر معقول انداز اپنایا۔ اس سلسلے میں ہر شخص کے نتائج ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نتیجے تک پورے اعتماد کے ساتھ پہنچنا ان کیلئے ممکن نہیں ہوسکا۔ وہ اسے غیر مرتب، بے ہنگم۔ اور غیر مربوط سمجھتے ہیں۔ وہ قیاس آرائیوں میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں اور انہوں نے اپنے پیش کردہ نتائج کی معقولیت یا غیر معقولیت کا جائزہ لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ورنہ بات ایسی نہ تھی کہ انہیں اس کی سمجھ ہی نہ آتی۔ وہ وہم و قیاس پر ایک بلند عمارت تعمیر کر لیتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ انہوں نے اس عمارت کی بنیادیں کس قدر کمزور رکھی ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اعتراضات میں آگے بڑھتے چلے گئے اور حقیقت سے بہت دور ہوگئے۔

Rodwell(1808-1900) اور Tritton نے حضرت زید ابن ثابتؓ کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے وہ تمام امکانات ختم کر دیے جن کی مدد سے قرآن کو ترتیبِ نزولی کی بنیاد پر مرتب کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ قرآن کو مرتب کرنے میں اکیلے حضرت زیدؓ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ عہد نبوی میں انہوں نے اسی ترتیب سے لکھا جس کا حکم حضور اکرم ﷺ دیتے تھے اور عہد صدیق اکبر میں ان کے ساتھ دیگر صحابہؓ بھی شامل تھے۔

حضرت زید ابن ثابتؓ نے قرآن کے متفرق اوراق کو محض یکجا کر دیا۔ اور کوئی اصول و معیار ملحوظ نہیں رکھا۔ جوں جوں انہیں ٹکڑے ملتے چلے گئے اسی طرح وہ انہیں اکٹھا کرتے رہے انہوں نے مضامین کے تسلسل کو پیشِ نظر نہیں رکھا اور نہ ہی اسلوب کی ہم آہنگی کا خیال رکھا۔ اس سلسلے میں Rodwell لکھتا ہے۔

With entire disregard to contiuity of subject and uniformity of

---

(1) Landau, ROM, Islam and the Arabs, George Allen and Unwin, London, N.D, p. 25

(2) Frost, S.E, The Sacred Writings of World's great Religions, p. 307

style, producing a most unreadable and uncongrous patchwork.[1]

ایک اور بے بنیاد نقطہ نگاہ یہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے حضورؐ کی وحی کو محض بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ آرتھر جیفری (1892-1959) لکھتا ہے۔

Though arranging it as they saw best and adding other material that came to them where it seemed appropriate.[2]

لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ان تمام متعصبانہ اور بے بنیاد نقطہ نگاہ ہائے کی تائید میں ایک دلیل، اشارہ یا کوئی استدلال پیش نہیں کیا۔ قرآن مجید میں حضرت زید ابن ثابتؓ نے (بقول ان کے) جو اضافے کئے ان کے بارے میں آرتھر جیفری لکھتا ہے۔

that all it contains is genuinely from the Prophet is fairly certain for very few passages are of doubtful authenticity.[3]

مستشرقین کا ایک گروہ وہ ہے جس کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ حضورؐ نے خود ہی قرآن کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ نزول کے اعتبار سے اب اسے مرتب کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔

Designedly mixed up later with earlier revelations not for the sake of producing that mysterious style which seems so pleasing to those who value trust least --- but for the purpose of softening down some of the earlier statements.[4]

آرتھر جیفری (1892-1959) کہتا ہے کہ قرآن مجید کی ابتدائی وحی کو بعد کی وحی کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ابتدائی زمانے کی وہ آیات جن میں سخت اور تند و تیز باتیں جو مخالفین کی مذمت میں کی گئی تھیں ان کے اثرات کو کچھ کم کیا جا سکے۔

آرتھر جیفری ترتیبِ قرآن مجید کے سلسلے میں بہت ہی افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔ اس سلسلے

---

(1) Rodwll, P.2

(2) Jeffery, Arthur, Material for the History of the Text of the Quran, E.J. Brill, London, 1937, p. 16

(3) Ibid

(4) ibid

میں اس کے نقطہ نگاہ کے اہم پہلو یہ ہیں۔

۱۔ وہ سورۃ الفاتحہ کو قرآن میں شامل قرار نہیں دیتا۔ اور دلیل یہ ہے کہ اس سورت کے اندر تو انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے جبکہ باقی قرآن میں خدا بندے سے مخاطب ہوتا ہے۔

۲۔ وہ سورۃ نمبر ۳ کو بھی اپنی ترتیب میں قرآن میں شامل قرار نہیں دیتا۔

۳۔ سورۃ نمبر ۱۱۱ کو مدنی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت کے دو برس بعد نازل ہوئی۔ حالانکہ اسلامی تاریخ میں یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اس سورت کا نزول ہجرت سے دس برس قبل مکہ میں ہوا تھا۔

۴۔ وہ سورۃ نمبر ۱۰۲ اور ۱۰۷ کو بھی مدنی سورتیں قرار دیتا ہے حالانکہ یہ تو مکی سورتیں ہیں۔

۵۔ اس نے سورۃ نمبر ۱۰۱، ۹۹، ۸۲، ۸۱، ۵۳، ۸۴ اور ۱۰۰ کی ترتیب پر بھی کلام کیا ہے۔[1]

سورۃ نمبر ۲۷ کی ترتیب و مقام کے بارے میں جیفری (1892-1959) لکھتا ہے۔

The concluding verses are quite different in style and are apparently an odd fragment which the compiler added.[2]

ترجمہ: "آخری سورتیں اپنے اسلوب میں بالکل مختلف ہیں اور واضح طور پر قرآن مدون کرنے والوں کی طرف سے کیے گئے اضافے ہیں۔"

جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مذکورہ سورۃ نمبر ۲۷ کی آیات کا مطالعہ کریں تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ جیفری کا یہ نتیجہ بالکل غلط ہے کہ اس کی آیات میں اسلوب کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سورۃ کی اٹھائیس آیات ہیں جن میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔[3]

اسی طرح Lammens (1862-1937) نے کوشش کی ہے کہ مدنی اور مکی سورتوں کی شناخت کیلئے کوئی معیار قائم کرے مگر وہ بھی اپنے ہم خیال لوگوں کی طرح غلط روش پر چل پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کی بے تکی اور بے بنیاد باتوں کی نشاندہی کرتے کرتے وہ خود بھی کئی ایک بے دلیل مفروضے گھڑ لیتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ آخرت کی تمام وعیدیں مدنی دور کی ہیں۔[4]

---

(1) ibid, p.23

(2) Ibid, p.49

(3) khalifa, Muhammad, The sublime Quran and Orientalism, p 56

(4) Lammens, H, Islam, Beliefs and Instituations, Frankcass, London, 1968, p 50

اسی طرح کئی ایک دیگر مستشرقین نے بھی تاریخی حقائق سے قطع نظر کرتے ہوئے قرآن مجید کی ترتیبِ زمانی قائم کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ان لوگوں کو اصل حقائق سے بہت دور لے گئی ہے اس کی ایک مثال Richard Bell (1876–1952) ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

It was only in Madina that Muhammad was intrested in maintaining the moral of a community; condemnation of fasad, corruption, treason is thus a mark of the Medinan origin of the passage.(1)

معاشرے کے اخلاق کی اصلاح کے کام میں محمد ﷺ نے مدینہ میں دلچسپی لی۔ فساد بدعنوانی اور غبن وغیرہ کی مذمت مدینہ میں ہی کی گئی۔

مارگولیتھ کا نقطہ نگاہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ آیات کی ترتیب کا مسئلہ خاصا مشکل ہے اور حضورؐ کے کم از کم ہم عصروں میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ قرآنی آیات کو مرتب کر سکے۔ اس کے الفاظ میں۔

It seems difficult to think of any theory of their construction which is not unnatural. The task of arranging the sacred texts in fixed groups might very well have appalled a Moslem; we could scarcly credit a contemporary of the Prophet with having the courage to attempt it.(2)

مستشرقین کے نقطہ نگاہ کا تحقیقی جائزہ:

مستشرقین نے اگرچہ ترتیبِ قرآن مجید پر اعتراضات کئے ہیں تاہم اس بارے میں یہ بات مکمل طور پر عیاں ہے کہ یہ لوگ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ہم ترتیبِ نزولی قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ اس سلسلے میں آپس میں ایک دوسرے سے مختلف الخیال بھی ہیں۔ ترتیب کے اصول بھی ہر ایک کے جدا جدا ہیں۔ کسی نے حضورؐ کی زندگی کے مختلف مراحل کی بنیاد پر قرآن کے اسلوب میں تبدیلی کی بنیاد پر سورتوں کی تقسیم کی۔ پھر کسی نے جذبات سے پُر آیات کو مکی آیات قرار دیا تو دوسروں نے انہیں مدنی دور سے متعلق قرار دے دیا۔ اس طرح مستشرقین کا آپس میں ہی بنیادی واصولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً عام مستشرقین کہتے ہیں کہ محمدؐ کے ابتدائی عہد میں جوش و جذبہ بہت زیادہ تھا جو آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔(3) لیکن ہر

(1) Bell, Richard, The Origin of Islam in its Christian Environment, p 109

(2) Margoliouth, D.S. Mohammadanism, Butterworth London, 1928,p.69-70

(3) Rodwell , Preface, P.8

شفیلڈ لکھتا ہے: یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سورتیں جن میں جوش و جذبہ پایا جاتا ہے صرف ابتدائی دور سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا مان لیا جائے تو سورۃ اقراء ہی سے ہمیں ماننا چاہیے کہ محمد ﷺ میں اصلی جذبہ موجود نہ تھا۔[1]

مستشرقین کے اعترافِ شکست کے بارے میں ہم مزید اقوال نقل کر سکتے ہیں۔

ولیم میور (1819-1905) اکیس سورتوں کو کسی دور سے متعلق نہیں کر سکا۔[2]

وئل (G.Weil) نے اگرچہ پانچ ادوار بیان کئے ہیں لیکن وہ بھی کہتا ہے کہ یہ ادوار یقینی نہیں ہیں۔[3]

ڈاکٹر منگانا لکھتا ہے کہ

''جو کوششیں یورپی لوگوں نے کی ہیں کہ قرآن کو نزولی اعتبار سے مرتب کریں۔ وہ اتنی ہی ناکام ہوئی ہیں جتنی کہ مقامی لوگوں کی''۔[4] نولڈیکے (1836-1930) نے اعتراف کیا:

اس طرح ظن و قیاس کو بنیاد بنا کر انسان داخلی مفروضات یا محض اوہام کو یقینی چیزیں مان لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔[5]

اہل مغرب نے مکی سورتوں کو گروپوں میں تقسیم کیا ہے لیکن خود ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ ترتیب اور تقسیم حتمی نہیں ہے۔ اس عدم اطمینان کا اظہار رچرڈ بل (1876-1952) نے یوں کیا ہے۔

The doubtful suras are 98 which Muir regards as Meccan, Grimme as doubtfully so and Noldeke as Medina; 22 which Noldeke classes as Medinan but with admixture of Meccan passages.[6]

کون کون سی سورتیں مکی ہیں اور کون سی مدنی، اس سلسلے میں 98 سورتیں مشکوک ہیں، ان سورتوں کو میور (1819-1905) مکی سورتیں کہتا ہے، گرم بھی اسی طرح مشکوک قرار دیتا ہے،

---

(1) New Researches into the Composition and Exegies of the Quran, University of London, 1902, p.35

(2) The sublime Quran and Orientalism, Longman London, 1983, p.42-44

(3) Ibid

(4) Leaves from Three Ancient Korans, Cambridge University Press, 1914, p. 40

(5) Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit, p.42-44

(6) Introduction to the Quran, Edinburgh University Press Edinburgh, 1958, p.113

نولڈیکے(1836-1930)ان سورتوں کو مدنی کہتا ہے، بائیس سورتوں کو نولڈیکے (1836-1930)مدنی لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ان میں مکی آیات خلط ملط ہوئی ہیں۔

مستشرقین کی مختلف آراء کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی جب وہ اس سلسلے میں خود ہی مختلف فیہ نقطہ نگاہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ کا نمبر ترتیب زمانی کے اعتبار سے ولیم میور (1905ء) کے نزدیک چھٹا ہے۔ راڈویل کے نزدیک اس کا آٹھواں اور نولڈیکے (1836-1930) کے نزدیک اڑتالیسواں نمبر ہے۔ جبکہ آرتھر جیفری اسے قرآن سے خارج ہی کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف مستشرقین کی گئی ترتیبوں کا تفصیلی جائزہ لینے کیلئے نقشہ منسلک کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مزید اہم بات یہ ہے کہ ہر مستشرق نے خود تحقیق سے گریز ہی کیا ہے۔ ایک شخص نے ایک نقطہ نگاہ پیش کیا تو بعد والوں نے اسی کی خوشہ چینی کی ہے۔ مثلاً ۱۸۶۰ء میں میور نے سورتوں کو نزولی اعتبار سے مرتب کیا۔ اس کا حوالہ ۱۸۹۴ء میں Hughes نے دیا۔ پھر ۱۹۵۸ء میں رچرڈ بل (1876-1952) نے اسی کی تقلید کی۔ یہی بات نولڈیکے (1836-1930) کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔[1]

Lammens(1862-1937) بالکل خلافِ حقیقت بات کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آخرت کی وعیدیں مدنی دور کی ہیں۔ قرآن مجید کے نزول کی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا یہ جانتا ہے کہ عقیدہ آخرت زیادہ تر مدنی دور میں نہیں ہے بلکہ مکّی دور میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مکّی اور مدنی آیات اور سورتوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس سے اس نقطہ نگاہ سے اس کے تاریخی مطالعے اور حقائق سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔[2] گزشتہ صفحات میں رچرڈ بل (1876-1952) کا نقطہ نگاہ بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ میں جا کر محمدؐ نے اپنے افراد کے اخلاق کی تعمیر کے کام کا آغاز کیا۔ اور فساد کی مذمت شروع کر دی۔[3]

رچرڈ بل کو مستشرقین میں بڑا بلند رتبہ حاصل ہے لیکن اس مذکورہ بالا نقطہ نگاہ سے اس کے مطالعہ قرآن کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ فساد کا ذکر تو مکّی سورتوں کے اندر بھی موجود ہے۔ ان باتوں کا ذکر تو حضورؐ کی مکی زندگی کے آغاز ہی میں موجود

---

(1) The sublime Quran and Orientalism, Longman London, 1983, p.43;
Introduction to the Quran, Edinburgh University Press Edinburgh, 1958, p.102
Watt, Montgomery, Mohammad at Makkah, Oxford, 1953,p.60,61

(2) The sublime Quran and Orientalism, 1983, p.43

(3) Introduction to the Quran, p.106

تھا۔ مثلاً سورۃ نمبر ۸۹ جو کہ مکی سورۃ ہے اس میں فساد کا ذکر موجود ہے اس حقیقت کے علاوہ باقی مستشرقین جن میں ولیم میور (1819-1905)، نولڈیکے (1836-1930)، گرم وغیرہ شامل ہیں نے اس سورۃ کو مکّی سورۃ قرار دیا ہے۔

قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی ترتیب پر آرتھر جیفری (1892-1959) نے جو کلام کیا ہے اس سلسلے میں محمد خلیفہ لکھتے ہیں:

Reading even in translation one can see that Jeffery's assumption is simply not true for the suras sounds perfactly self contained and inegrated.(1)

آرتھر جیفری (1892-1959) نے ایک Other Material کا ذکر کیا ہے اس کا کچھ پتہ نہیں اسے قرآن میں کہاں رکھا گیا اس سلسلے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرض کیا جائے کہ حقیقت میں اگر اس قسم کا کوئی مواد تھا بھی اور اسے زید ابنِ ثابت نے اپنی مرضی سے قرآن میں شامل کر لیا تو اس بارے میں دو امکانات ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اس کا انداز اور اسلوبِ بیان قرآن مجید سے مماثل ہونا چاہیئے۔

۲۔ یا اس مواد کا اسلوبِ بیان قرآن کے اسلوب سے مختلف ہو گا۔

اگر اس کا اسلوب اور انداز قرآن جیسا ہی تھا تو پھر دوسرے لوگ بھی اس طرح کا کلام گھڑ سکتے ہیں۔

جبکہ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن مجید کے واضح چیلنج کے باوجود اس کی مثال اور نقل پیش نہیں کی جا سکی۔ اگر اس کا اسلوب، قرآن کے اسلوب سے مختلف ہے تو پھر ہر صاحبِ فہم و فراست۔ ماہر لغت اس میں اور قرآن میں فرق کر سکتا ہے۔ اور قرآن اور غیر قرآن میں فرق کرنا بڑا آسان تھا۔ جبکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نسلیں گزر گئی ہیں کسی بھی ماہر سے ماہر شخص نے کبھی بھی ایک معمولی سے معمولی غلطی یا سقم کی نشاندہی نہیں کی۔

آرتھر جیفری کو اپنے اس نقطہ نگاہ کی تائید میں کوئی ایک مثال تو پیش کرنی چاہیئے تھی۔ ایک طرف اس نے ایک ایسی بات کی جو مسلّمہ تاریخی حقائق کے برعکس ہے اور دوسری طرف کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کیا۔ اس صورت میں اس کے نقطہ نگاہ کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔

---

(1) The sublime Quran and Orientalism,p.43

آرتھر جیفری نے یہ نقطہ نگاہ بھی اختیار کیا ہے کہ سورۃ الفاتحہ قرآن میں شامل نہیں ہے کیونکہ اس سورۃ میں انسان اللہ سے باتیں کرتا ہے اور باقی قرآن میں اللہ تعالیٰ، انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے۔(1)

حالانکہ یہ بات خود مستشرق مذکورہ کے مطالعے کو نقص کو ظاہر کرتی ہے۔ کیا یہی ایک سورت ہے جس میں یہ پیرا یہ اختیار کیا گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں انسان، خدا سے مخاطب ہوتا ہے۔

مثلاً سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر 286، ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 8 ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ﴾ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۲۳ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ سورۃ الحشر کی آیت نمبر 10﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ اور اس طرح کی دیگر آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین کے تمام تر دلائل محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں آرتھر جیفری (-1892 1959)، رچرڈ بل (1876-1952)، اور دیگر مستشرقین حتیٰ کہ نولڈیکے (1836-1930) جیسے لوگ بھی امکانات ہی کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ وہ Might be, Might Have, May be وغیرہ جیسے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ پھر ان کی ان قیاس آرائیوں میں بھی ہر مستشرق دوسرے مستشرق کی نفی کرتا ہے۔ ظاہر ہے جب استدلال کی کیفیت یہ ہو کہ نہ تو یقین و اعتماد ہو نہ دلائل ہوں، دلائل آپس میں متصادم ہوں۔ تو ان دلائل سے ثابت کیا جانے والا مضمون کس قدر تار عنکبوت ہوگا۔

مستشرقین میں سے بیشتر نے سورتوں کو ان کے اسلوب کی بنیاد پر گروپوں میں تقسیم کیا ہے۔ اسی طرح سورتوں میں پائے جانے والے جوش و جذبات کو بھی تقسیم کی بنیاد بنایا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مستشرقین میں سے بہت سے لوگ عربی زبان اور اس کی فصاحت و بلاغت سے آگاہ نہیں۔ بہت سے لوگ تراجم اور تقلید پر گزارا کرتے ہیں۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ کسی زبان میں مہارت اور اس کی گہرائی سے بے بہرہ شخص اس کی زبان کے بارے میں کس طرح فیصلہ کرسکتا ہے کہ قرآن میں کہاں جوش اور جذبات کا اسلوب ہے اور کہاں نہیں ہے۔

ہر زبان کی فصاحت و بلاغت کے اپنے قواعد و ضوابط اور ذوق ہوتا ہے۔ ان کے جانے بغیر کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ کوئی کتاب فصاحت و بلاغت کے کس مقام پر ہے۔ جن لوگوں کو مذکورہ بالا صلاحیتیں حاصل

(1) Jeffery, Arthur, The Koran; A Scripture, Heritage Press New York, 1952, p.16-23

تھیں انہوں نے تو قرآن کی زبان کو بھی معجزہ قرار دیا اور اس کے اسلوب کی بلندیوں کا بھی اعتراف کیا اور جو ان صلاحیتوں بے بہرہ تھے۔ وہ بزعم خویش اس پر اعتراضات کرتے ہیں۔

عہد نبوی میں قرآن مجید کی توقیفی ترتیب پر دلائل

قرآن مجید کے عہد نبوی میں مرتب شکل میں مرتب ہو چکنے پر دلائل:

احادیث وروایات سے بہت سے شواہد ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآن مجید کی سورتیں مرتب شکل میں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں چند روایات پیش کی جاتی ہیں:

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ وَقَرَأَ ثَلَاثَ آيَاتٍ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْحَشْرِ وَكَّلَ اللهُ بِهِ سَبْعِينَ أَلْفَ مَلَكٍ يُصَلُّونَ عَلَيْهِ حَتَّى يُمْسِيَ وَإِنْ مَاتَ فِي ذٰلِكَ الْيَوْمِ مَاتَ شَهِيدًا وَمَنْ قَالَهَا حِينَ يُمْسِي كَانَ بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ۔ (1)

معقل بن یسار (60ھ) سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا جس نے صبح تین بار اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم پڑھ کر سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پڑھیں تو ستر ہزار فرشتے اس پر ایسے مقرر ہوں گے کہ جو شام تک اس کیلئے دعائے رحمت کریں گے اور اگر وہ اس دن مر جائے گا تو وہ شہید مرے گا، اور اگر شام کو یہ پڑھے گا تو بھی ایسا ہی درجہ پائے گا۔

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ۔صلی اللہ علیہ وسلم۔ قَالَ: إِنَّ اللهَ خَتَمَ سُورَةَ الْبَقَرَةِ بِآيَتَيْنِ أُعْطِيتُهُمَا مِنْ كَنْزِهِ الَّذِي تَحْتَ الْعَرْشِ، فَتَعَلَّمُوهُنَّ وَعَلِّمُوهُنَّ نِسَاءَكُمْ، فَإِنَّهُمَا صَلَاةٌ وَقُرْآنٌ وَدُعَاءٌ۔ (2)

جبیر بن نفیر سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا خدا تعالیٰ نے سورۃ بقرۃ کو ایسی دو آیات پر ختم فرمایا ہے۔ جو مجھے اس کے عرش کے خزانے سے ملی ہیں تم انہیں خود بھی سیکھو اور اپنی عورتوں کو بھی سیکھاؤ کیونکہ یہ رحمت ہے اور دعاء ہے اور عبادت ہے۔

اس طرح کی ایک حدیث حضرت ابو الدرداءؓ (32ھ) سے مروی ہے کہ جس نے سورۃ الکہف کی تلاوت کی اس کی برکت سے اسے دجّال کے شر سے نجات ملتی ہے۔ (3)

---

(1) الترمذی: السنن، باب فی فضل قراءۃ سورۃ الحشر، حدیث نمبر ۲۹۲۲، ص ۱۹۴۵

(2) الدارمی: السنن، باب فضل اول سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر: ۳۴۵۳

(3) التبریزی، ولی الدین، محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوۃ المصابیح، المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، دمشق، ۱۳۸۰ھ ۶۵۸/۱، حدیث نمبر ۲۱۴۶، ۲۱۲۶

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ نَبِيَّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِأُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ إِنَّ اللهَ أَمَرَنِي أَنْ أُقْرِئَكَ الْقُرْآنَ قَالَ آللهُ سَمَّانِي لَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَقَدْ ذُكِرْتُ عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِينَ قَالَ نَعَمْ فَذَرَفَتْ عَيْنَاهُ۔
وفي رواية ''ان الله امرني أن أقرأ عليك (لم يكن الذين كفروا) قال وسماني قال: نعم '' فبكى۔ [1]

انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ابیؓ ابن کعبؓ سے فرمایا اللہ کا حکم ہے کہ میں سورۃ البینہ تمھیں سناؤں۔ ابیؓ نے عرض کیا، کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے آپؐ نے فرمایا: ''ہاں'' اس پر ابیؓ پر گریہ کی حالت طاری ہو گئی۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا فَكَانَ ابْنُ مَسْعُودٍ يَأْمُرُ بَنَاتَهُ بِقِرَاءَتِهَا كُلَّ لَيْلَةٍ۔ [2]
ابن مسعودؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا جو شخص ہر رات کو سورۃ الواقعہ پڑھے وہ کبھی محتاج نہیں ہو گا۔ لہٰذا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنی بیٹیوں کو اس سورہ کے ہر رات کو پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔

عن علیّ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لکل شیئٍ عروس وعروس القران الرحمٰن۔ [3]
حضرت علیؓ (40ھ) سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شے کی زینت ہوتی ہے اور قرآن کی زینت سورۃ الرحمٰن ہے۔

عن عقبة بن عامر قال قلت یا رسول ﷺ اقرء سورۃ هودٍ أوْ سورۃ یوسف قال لن تقرأ شیأ أبلغ عند اللہ من قل اعوذ برب الفلق [4]
عقبہ بن عامر سے روایت ہے میں نے حضورؐ سے عرض کیا سورۃ ہود اور سورۃ یوسف پڑھا کرو آپؐ نے فرمایا معوذتین اس سے زیادہ بلیغ ہے۔

عن انسٍ قال قال رسول اللہ ﷺ انّ لکلّ شیئٍ قلباً وقلبُ القران یٰس [5]
انسؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورۃ یٰس ہے۔

---

(1) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب مناقب الأنصار، باب مناقب أبی بن کعب، حدیث نمبر ۳۸۰۹، ص ۳۰۹، کتاب التفسیر، باب سورۃ لم یکن، حدیث نمبر: ۴۹۵۹ و ۴۹۶۱، ص ۴۲۹

(2) التبریزی: مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۶۷۰ حدیث نمبر: ۲۱۸۱

(3) ایضاً، حدیث نمبر: ۲۱۸۰

(4) ایضاً، ۱/۶۶۷، حدیث نمبر: ۲۱۶۴

(5) ایضاً، ۱/۶۷۰، حدیث نمبر: ۲۱۷۸

بخاری شریف میں روایت ہے:

عَنْ شَقِيقٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ :لَقَدْ تَعَلَّمْتُ النَّظَائِرَ الَّتِي كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَؤُهُنَّ اثْنَيْنِ اثْنَيْنِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ فَقَامَ عَبْدُ اللّٰهِ وَدَخَلَ مَعَهُ عَلْقَمَةُ وَخَرَجَ عَلْقَمَةُ فَسَأَلْنَاهُ فَقَالَ عِشْرُونَ سُورَةً مِنْ أَوَّلِ الْمُفَصَّلِ عَلَى تَأْلِيفِ ابْنِ مَسْعُودٍ آخِرُهُنَّ الْحَوَامِيمُ حم الدُّخَانِ وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ۔ (1)

ابن مسعودؓ نے کہا میں ان مماثل سورتوں کو جانتا ہوں جن کی دو دو سورتیں حضورؐ ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے۔ لوگوں نے علقمہ سے ان سورتوں کو دریافت کیا تو علقمہ نے جواب دیا کہ ابنِ مسعودؓ کی ترتیب کے مطابق اول مفصّل سے بیس سورتیں ہیں ان میں آخر حمٓ الدّخان اور عَمَّ یَتَسَاءَلُونَ ہے۔

عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَنَامُ حَتَّى يَقْرَأَ الٓمٓ تَنْزِيلُ وَتَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ (2)

جابر کہتے ہیں حضورؐ اس وقت تک سوتے نہیں تھے جب سورۃ السّجدہ اور سورۃ الملک کی تلاوت نہ فرما لیتے۔

بخاری شریف اور مسلم شریف دونوں میں روایت موجود ہے۔ اُمّ فضل کہتی ہیں:

سمعت رسول اللہ ﷺ یقرأ فی المغرب بالمرسلات عرفا۔ (3) میں نے حضورؐ کو مغرب کی نماز میں سورۃ المرسلات پڑھتے سنا۔ انہی دونوں کتابوں میں روایت ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: کان النبی ﷺ یقرءُ فی الفجر بقٓ والقرآن المجید ونحوھا۔ (4) حضور کا معمول تھا کہ فجر کی نماز میں سورۃ قٓ اور اس جیسی اور سورتیں پڑھتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ (58ھ) سے ایسی روایات ہیں جن میں حضورؐ کے مختلف نمازوں میں مختلف سورتیں تلاوت کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (5) مشکوٰۃ میں حضرت ابنِ عباسؓ کے جمعہ کی نماز میں سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقون پڑھنے کا ذکر ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضورؐ کو ایسا ہی کرتے سنا ہے۔ (6)

مسلم شریف میں ہے نعمان کہتے ہیں حضورؐ عیدین اور جمعہ میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پڑھا

---

(1) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر: ۴۹۹۶، ص ۴۳۳

(2) الترمذی: السنن، أبواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورۃ الملک، حدیث نمبر: ۲۸۹۲، ص ۱۹۴۲

(3) التبریزی، حوالہ مذکور، ۲۶۵/۱، حدیث نمبر ۸۳۲

(4) ایضاً، حدیث نمبر ۸۳۵

(5) ایضاً، ۲۶۶/۱، حدیث نمبر ۸۳۸

(6) ایضاً، حدیث نمبر: ۸۳۹

کرتے تھے۔[1]

اسی طرح کی ایک روایت مین ان اوقات میں سورۃ قٓ اور سورۃ القمر پڑھنے کا ذکر ہے۔[2]

حضرت عائشہؓ (57ھ) سے روایت ہے حضورؐ نے سورۃ الاعراف مغرب کی دو رکعتوں میں پڑھی۔[3]

عبداللہ ابنِ عقبہؓ بیان کرتے ہیں حضورؐ نے مغرب میں سورۃ الدخان پڑھی۔[4]

حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے رات کی نماز میں سورۃ بقرۃ، آل عمران اور سورۃ النساء پڑھیں۔[5]

ترتیب قرآن مجید توقیفی ہے: اقوال وآثار علماء

آئندہ سطور میں ہم علمائے اسلام کے اقوال نقل کریں گے جن کی روشنی میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی آیات وسورہ کی ترتیب توقیفی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ جلال الدّین سیوطی (911ھ) نے ایک فصل قائم کی ہے جس کا عنوان ہے:

الإجماع والنصوص المترادفة على أن ترتيب الآيات توقيفي لا شبهة في ذلك۔[6]

ترجمہ: اس اجماع اور ان مترادف نصوص کے بیان میں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آیات کی ترتیب بلاشبہ توقیفی یعنی حضورؐ کی ہدایات سے ثابت شدہ ہے۔ اس کے بعد علّامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں:

''اما الا جماع فقلہ غیر واحد منھم الزرکشي في البرھان وأبو جعفر بن الزبیر فی مناسبة وعبارته ترتیب الأیات فی سور ھا واقع بتوقیفه ﷺ و امرہ من غیر خلاف فی ھذا بین المسلمین انتھی وسیأتی من نصوص العلماء مایدل علیه''[7]

ترجمہ: اس بارے میں اجماع کو بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہے۔ مجملہ ان کے زرکشی (794ھ) نے اپنی کتاب البرھان میں اور ابو جعفر بن زبیر نے اپنے مناسبات مین اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی

(1) ایضاً، حدیث نمبر ۸۴۰

(2) ایضاً، حدیث نمبر: ۸۴۱

(3) ایضاً، ۱/۲۶۸، حدیث نمبر: ۸۴۷

(4) ایضاً، ۱/۲۷۴، حدیث نمبر: ۸۶۷

(5) السیوطی، الاِتقان فی علوم القرآن، النوع الثامن عشر فی جمعه وترتیبه، ۲/۳۹۷

(6) ایضاً، ۲/۳۹۴

(7) ایضاً

عبارت یہ ہے۔

"آیتوں کی ترتیب اپنی اپنی سورتوں میں رسول ﷺ کی توقیف (ہدایت) اور آپؐ کے حکم سے واقع ہوئی ہے۔ اور اس بارے میں مسلمانوں کا اختلاف نہیں۔"(1)

وہ لکھتے ہیں کہ "اس کے علاوہ آگے چل کر علماء کے ایسے صریح اقوال بیان ہوں گے جو اس بات (ترتیبِ قرآن توقیفی ہے) پر نہایت وضاحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں۔"(2)

اس کے بعد علامہ سیوطی (911ھ) نے مندرجہ ذیل نصوص بیان کئے ہیں۔

زید ابن ثابتؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

۱۔ ہم نبیؐ کے سامنے قرآن مجید کو پرچوں سے مرتّب کیا کرتے تھے۔(3) (91) نیز امام بیہقی کا قول ہے کہ تالیف کا معنی محض لکھنا ہی نہیں بلکہ ترتیب کے ساتھ رکھنا مراد ہے۔(4)

۲۔ دوسری نص وہ حدیث ہے جس کو احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن حبّان اور حاکم نے ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ آپؐ نے سورۃ الانفال کو جو "مثانی" میں سے ہے اور سورۃ برائۃ جو مئین میں سے ہے باہم ملا دیا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم" نہیں لکھی۔ پھر ان کو سات بڑی سورتوں میں شامل کر دیا؟ عثمانؓ نے جواب دیا: "کان رسول اللہ ﷺ تنزل علیہ السورۃ ذات العدد فکان اذا نزل علیہ الشیئ دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھؤلاء الأیات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا و کذا"(5)

یعنی نبی کریمؐ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب آپؐ پر متعدد سورتیں نازل ہوتیں تو جب بھی کچھ نازل ہوتا آپؐ فوراً کاتبانِ وحی میں سے کسی کو بلاتے اور فرماتے کہ اس کو اس سورت میں فلاں فلاں جگہ پر رکھو جہاں فلاں فلاں بات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے فرمایا کہ سورۃ انفال مدینہ میں نازل ہوئی اور سورۃ براءۃ سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ اس کے علاوہ سورۃ انفال کا مضمون بھی براءۃ سے ملتا جلتا تھا۔ اس لئے میں نے گمان کیا کہ سورۃ براءۃ، سورۃ انفال کا ہی حصہ ہے۔ رسول اکرمؐ ایسی حالت میں

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً، النوع الخامس والثلاثون، ۲/۳۰۷

(5) الاتقان فی علوم القرآن، النوع الثامن عشر فی جمعہ وترتیبہ، ۲/۳۹۵

انتقال کر گئے کہ آپؐ نے ہم سے بیان نہیں کیا تھا کہ براۃ، انفال کا حصہ ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر میں نے ان دونوں سورتوں کو ساتھ ساتھ کر دیا۔ اور ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی۔[(1)]

۳۔ اس سلسلے میں تیسری نص۔ وہ حدیث ہے جس کو احمد نے سند حسن کے ساتھ عثمان بن العاصؓ سے روایت کیا ہے کہ اس نے بیان کیا۔

"میں نبی کریمؐ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک آپؐ نے آنکھ پھیلا کر دیکھا اور پھر نظر جھکا لینے کے بعد فرمایا "میرے پاس جبرائیلؑ آئے اور مجھے کہا کہ میں اس آیت کو اس سورۃ کی اس جگہ پر رکھوں" ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ۔۔۔﴾۔[(2)]

۴۔ چوتھی نصؔ یہ ہے کہ بخاری (256ھ) نے ابن زبیر سے روایت کی ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے کہا کہ " والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً " اس آیت کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ اس لئے تم اس کو نہ لکھویا اس کو چھوڑ دو۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے جواب دیا: یا ابن أمی! لا اغیر شیئاً منه من مکانه[(3)] میں قرآن کی کسی شے کی جگہ کو نہیں بدلوں گا۔

۵۔ امام مسلم نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا میں نے نبی کریمؐ سے اس قدر کثرت کے ساتھ کوئی بات دریافت نہیں کی جس قدر "کلالہ" کی نسبت دریافت کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے میرے سینے میں اپنی انگشت مبارک لگا کر فرمایا۔ "تیرے لئے وہی موسم گرما کی نازل شدہ آیت کافی ہے جو سورۃ نساء کے آخر میں ہے"[(4)]

سورۃ نساء کی آخری آیت کلالہ ہی سے متعلق ہے۔ ایک آیت سورۃ نساء کے اندر ہے (آیت نمبر ۹۵)

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے آیات اور سورتوں کی ترتیب فرما دی ہوئی تھی۔ ورنہ روایت میں مذکورہ آپؐ کی گفتگو کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا۔

۶۔ علامہ سیوطی (911ھ) نے اس سلسلے کی چھٹی دلیل سورۃ البقرۃ کی آخری بارہ آیات کے بارے

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً، ۳۹۶/۲؛ النحل: ۹۰

(3) ایضاً

(4) مسلم: الجامع الصحیح، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، حدیث نمبر ۱۲۵۸، ص ۷۶۵، کتاب الفرائض، باب میراث الکلالۃ، حدیث نمبر: ۴۱۵۰، ص ۹۵۹؛ السیوطی: حوالہ مذکور، ۳۹۷/۲

میں احادیث ہیں۔ "حضورؐ نے جب آخری بارہ آیات کا ذکر فرمایا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ صحابہؓ ان کا تعین اس لئے کر پائے کہ انہیں معلوم تھا کہ وہ کون سی آیات ہیں"[1]

۷۔ امام مسلم نے ابی الدرداءؓ (32ھ) سے مرفوعاً روایت کی ہے: عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ۔[2]

"جو شخص سورۃ الکہف کے شروع کی دس آیات حفظ کر لے گا۔ وہ دجّال کے شر سے محفوظ رہے گا"۔

مسلم ہی کی ایک اور روایت مین یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص سورۃ الکہف کی آخری دس آیات پڑھے گا وہ دجال کے شر سے محفوظ رہے گا۔[3]

علامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں:

اور اس بات پر اجمالی طور پر دلالت کرنے والے نصوص میں وہ ثابت شدہ باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ نے متعدد سورتیں پڑھیں۔ مثلاً حدیفہ کی حدیث میں سورۃ البقرۃ۔ آل عمران۔ نساء کے پڑھنے کا ذکر ہے۔ بخاری شریف میں مروی ہے کہ آپؐ نے سورۃ الاعراف کی تلاوت مغرب کی نماز میں فرمائی۔ اور نسائی میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فجر کی نماز میں سورۃ المؤمنون کی تلاوت کی جب آپؐ ہارون کے واقعہ تک آیت نمبر تک پہنچے تو آپؐ کو کھانسی آگئی اور آپؐ نے رکوع فرمالیا۔ سورۃ الروم کی بابت طبرانی روایت کرتے ہیں کہ اس کو آپؐ نے صبح کی نماز میں پڑھا۔ سورۃ السجدۃ اور ھل اتی علی الانسان کی نسبت شیخین سے مروی ہے کہ آپؐ یہ سورتیں جمعہ کے دن صبح کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ سورۃ ق کی نسبت آیا ہے کہ آپؐ اسے خطبہ میں پڑھتے تھے۔ مستدرک وغیرہ میں سورۃ الرحمٰن کے بارے میں ہے کہ آپؐ نے جنوں کے روبرو پڑھی۔ سورۃ النجم کے بارے میں صحیح بخاری میں آیا ہے کہ اس کی تلاوت آپؐ نے کفار کے سامنے فرمائی اور اس کے آخر میں سجدہ فرمایا۔ مسلم شریف میں سورۃ القمر کے بارے میں ہے کہ حضورؐ اس کو سورۃ ق کے ساتھ ملا کر عید کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ مسلم میں ہی روایت ہے کہ آپؐ سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقون جمعہ کی نماز میں پڑھتے کرتے تھے۔ سورۃ الصفّ کے بارے میں مستدرک میں عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی تھی اس وقت حضورؐ نے اس کو مفصل کی سورتوں کے

---

(1) السیوطی: حوالہ مذکور

(2) مسلم: الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الکہف وآیۃ الکرسی، حدیث نمبر ۱۸۸۳، ص ۸۰۵

(3) السیوطی: حوالہ مذکور، ۲/۳۹۷، ۳۹۸

ساتھ ملا کر ان کے روبرو پڑھا یہاں تک کہ اسے مکمل کر دیا۔[1]

علامہ سیوطی (911ھ) فرماتے ہیں کہ "اس سورۃ کو جماعت صحابہ کے سامنے پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی آیات کی ترتیب توقیفی ہے اور صحابہؓ نے اپنی طرف سے ہر گز ایسی کوئی ترتیب نہیں دی جو حضورؐ کو قرأت فرماتے ہوئے سننے کے خلاف ہو۔"[2]

آخر میں فرماتے ہیں: "فبلغ ذالك مبلغ التواتر"[3] یعنی لہٰذا یہ بات حد تواتر کو پہنچ گئی۔

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے ایک روایت بیان کی ہے جس سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آیات کی ترتیب صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے قائم کی۔ لیکن وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کی روایت یا چند روایات شاذ ہیں اور ایسی لاتعداد روایات جن میں اس کے برعکس بات کی گئی ہے، اس طرح کی روایات کی حیثیت باقی نہیں رہتی اور انہیں شاذ ہی سمجھا جائے گا۔[4]

علامہ سیوطی (911ھ) فرماتے ہیں کہ البتہ وہ روایت ضرور اشکال پیش کرتی ہے جس کو ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں محمد ابن اسحاق (150ھ) کے طریق پر یحییٰ ابن عباد عبداللہ ابن زبیر سے بیان کیا اور یحیی اپنے باپ عباد بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا حارث بن خزیمہ سورۃ براۃ کے اخیر کی دو آیتیں لائے اور انہوں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ان دونوں آیات کو حضورؐ سے سن کر بخوبی یاد رکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے بھی ان کی گفتگو سن کر فرمایا:

"اور میں بھی شہادت دیتا ہوں کہ میں نے بیشک ان آیات کو سنا ہے"[5]

پھر فرمایا، اگر یہ تین آیات ہوتیں تو میں انہیں ایک سورت بنا دیتا۔ مگر اب قرآن کی سب سے آخری سورت کو دیکھو اور ان آیات کو ان کے آخر میں شامل کر دو۔[6]

اس اشکال کے خاتمے کے لئے علامہ سیوطی (911ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی (852ھ) کا بیان نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا: "قال ابن حجر ظاهر هٰذا انهم كانوا يؤلفون آيات السور باجتهاد

---

(1) ایضاً
(2) ایضاً
(3) ایضاً
(4) ایضا
(5) ایضا
(6) ایضاً

هم وسائر الاخبار قدل على انهم لم يفعلوا شيأ من ذالك الا بتوقيف۔ "[1]

(اس روایت سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ صحابہؓ سورتوں کی آیات کو اپنے اجتہاد سے ترتیب دیا کرتے تھے۔ مگر دیگر تمام احادیث اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ انہوں سورتوں کی آیات کی ترتیب توقیف کے سوا اور کسی طرح نہیں کی۔)

اس اشکال کے بارے میں علامہ سیوطی (911ھ) خود یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ

"میں کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا روایت جس سے یہ اشکال پیدا کیا گیا ہے اس کے مخالف بھی ایک زبردست روایت موجود ہے۔ کیونکہ ابن ابی داوٗد ہی نے ابی العالیہ کے طریق پر ابیؓ ابن کعبؓ سے روایت کی ہے کہ صحابہؓ نے قرآن جمع کیا اور جب وہ سورۃ براۃ کی آیت ثم انصرفوا صرف اللہ۔۔۔۔۔۔ پر پہنچے تو خیال کیا کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے۔ اس وقت ابیؓ نے کہا۔ بیشک حضورؐ نے اس کے بعد بھی مجھے دو آیات پڑھائی ہیں۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ۔۔۔ تا اختتام سورت "[2]

☆ علامہ مکی (م ۴۳۷ھ) اور دیگر علماء کا قول ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب نبیؐ کے حکم کے مطابق ہوئی۔[3]

☆ قاضی ابو بکر (م ۴۰۳ھ) کتاب "الانتصار" میں لکھتے ہیں:

"آیات کی ترتیب ایک واجب اور لازمی ہے کیونکہ جبریلؑ یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں جگہ رکھو۔"[4]

☆ قاضی ابو بکر کا قول ہے: ہم یہ بات مانتے ہیں کہ وہ تمام قرآن جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس کے لکھے جانے کا حکم دیا۔ اس کو منسوخ نہیں کیا۔ اور نہ اس کے نزول کے بعد اس کی تلاوت کو رفع کیا وہ یہی قرآن ہے جو ما بین الدفتین پایا جاتا ہے اور جس پر مصحفِ عثمانی مشتمل ہے۔ اس قرآن میں نہ کسی قسم کی زیادتی ہے اور نہ کمی۔ اس کی ترتیب اور نظم اسی انداز پر ثابت ہے جس طرح اللہ

---

(1) ایضاً، ۴۰۱/۲

(2) ایضاً

(3) ایضاً، القیسی: الکشف عن وجوه القراءات وعللها وحججها، تحقیق محی الدین رمضان، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۰۷ھ، ۲۰/۱

(4) الباقلانی: الانتصار للقرآن، تحقیق محمد عصام القضاة، بیروت: دار ابن حزم، ۱۴۲۲ھ، ۶۰/۱؛ السیوطی: حوالہ مذکور، ۴۰۲/۲

تعالیٰ نے اس کا نظم فرمایا اور حضورؐ نے اسے سورتوں کی آیتوں کے یکے بعد دیگرے رکھنے سے ترتیب دیا۔ نہ اس میں سے کسی پچھلی سورت کو اگلی بنایا اور نہ اگلی کو پچھلی کیا۔ پھر امت نے ہر ایک سورۃ کی آیتوں کی ترتیب، ان کی جگہوں اور موقعوں کو اس طریق پر ضبط (حفظ و تحریر) کیا جس طرح نبی کریمؐ سے خاص قرأتوں کو اور تلاوت کرنا سیکھا۔[1]

☆ ابنِ وھب (م ۱۹۷ھ) کہتے ہیں: میں نے امام مالک (م ۱۷۹ھ) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: إنما ألف القرآن علی ما کانوا یسمعون من النبی۔[2] (قرآن کی تالیف اسی انداز پر کی گئی ہے جس ترتیب و انداز پر صحابہ رضی اللہ عنہم اسے حضورؐ سے سنا کرتے تھے)

☆ علامہ بغوی (م ۵۱۶ھ) شرح السنۃ میں لکھتے ہیں:

الصحابة رضی الله عنهم جمعوا بین الدفتین القرآن الذی أنزله الله علی رسوله من غیر أن زادوا أو نقصوا منه شیئا خوف ذهاب بعضه بذهاب حفظته فکتبوه کما سمعوا من رسول الله صلی الله علیه وسلم من غیر أن قدموا شیئا أو أخروا أو وضعوا له ترتیبا لم یأخذوه من رسول الله صلی الله علیه وسلم وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم یلقن أصحابه ویعلمهم ما نزل علیه من القرآن علی الترتیب الذی هو الآن فی مصاحفنا بتوقیف جبریل إیاه علی ذلك وإعلامه عند نزول کل آیة أن هذه الآیة تکتب عقب آیة کذا فی سورة کذا فثبت أن سعی الصحابة کان فی جمعه فی موضع واحد لا فی ترتیبه فإن القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی هذا الترتیب أنزله الله جملة إلی السماء الدنیا ثم کان ینزله مفرقا عند الحاجة وترتیب النزول غیر ترتیب التلاوة۔[3]

''صحابہؓ نے اسی قرآن کو بین الدفتین جمع کیا ہے جسے خدا تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا ہے اور صحابہؓ نے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ پھر ان کے جمع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ قرآن کے حفاظ کی موت سے اس کے کسی حصے کے ضائع ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے جس طرح قرآن مجید حضورؐ سے سنا تھا اسی انداز پر بلا کسی تقدیم و تاخیر کے اس کو لکھ لیا یہاں تک کہ اسکی ترتیب میں بھی رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے علاوہ اپنی رائے کو ہرگز داخل نہیں کیا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو قرآن کے نازل شدہ حصوں کو پڑھنے اور تحریر کرنے کی تلقین اسی ترتیب پر فرمائی تھی جو

---

(1) الباقلانی: حوالہ مذکور؛ السیوطی: حوالہ مذکور

(2) السیوطی: حوالہ مذکور، ۲/۴۰۳

(3) البغوی، حسین بن مسعود: شرح السنۃ، تحقیق شعیب الأرنؤوط، زهیر الشاویش، بیروت: المکتب الإسلامی، ۱۴۰۳ھ، ۴/۵۲۱.

آج ہمارے مصاحف میں پائی جاتی ہے اور آپؐ کو اس ترتیب سے جبریل نے باخبر کیا تھا۔ جو ہر ایک آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت کی فلاں آیت کے بعد لکھی جائے۔ اس بیان سے ظاہر ہوا کہ صحابہؓ نے نہ صرف قرآن جمع کیا تھا بلکہ اسے ترتیب بھی دی تھی۔ کیوں کہ قرآن بلاشبہ اسی ترتیب کے ساتھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمانِ دنیا پر نازل فرمایا پھر اسے بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تلاوت کی ترتیب نزول کی ترتیب کے علاوہ ہے''۔

☆ ابن الحصار (م ٦١١ھ) کا قول ہے:

ترتیب السور ووضع الآیات مواضعہا إنما کان بالوحی کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "ضعوا آیة کذا فی موضع کذا سُوْرَةٌ وقد حصل الیقین من النقل المتواتر بھذا الترتیب من تلاوة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومما أجمع الصحابة علی وضعه ھکذا فی المصحف.[1]

"سورتوں کی ترتیب اور آیات کا ان کی جگہوں پر رکھنا محض وحی کے ذریعے سے ہے رسول اللہ ﷺ خود فرمادیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ پر رکھو اور اس ترتیب کا یقین رسول اللہ ﷺ کی تلاوت کی نسبت متواتر نقل کے ذریعے سے حاصل ہوا ہے اور اس بات سے بھی کہ صحابہؓ نے مصحف میں اسے یونہی رکھنے پر اجماع کیا''۔

☆ اگرچہ قاضی ابو بکر (م ۴۰۳ھ) کا ایک قول صحابہ کے اجتہاد سے قرآنی ترتیب کے حق میں ہے لیکن ان کا دوسرا قول توقیفی ترتیب کے حق میں ہے۔[2]

☆ ابو بکر ابن الانباری (م ۳۲۸ھ) کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے کہ یہ ترتیب جبریلؑ نے حضورؐ کو بتلائی جو کوئی اس میں مداخلت کرتا ہے وہ نظم قرآن میں خلل ڈالے گا۔[3]

☆ کرمانی (م بعد ۵۰۰ھ) اپنی کتاب "البرہان" میں کہتے ہیں کہ سورتوں کی یہ ترتیب اسی طرح اللہ کے نزدیک لوحِ محفوظ میں بھی ہے اور اسی طرح آپؐ ہر سال قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری سال میں آپؐ نے دو مرتبہ دور فرمایا۔ نزول میں سب سے آخری آیت " واتقو ایوماً ترجعون فیه الی اللہ'' ہے۔ اس کے بارے میں جبریلؑ نے حضورؐ کو بتایا کہ اسے "ربوا" اور

---

(1) السیوطی، حوالہ مذکور

(2) ایضاً، 405/2

(3) ایضاً، 406،407/2

آیت "دَین" کے درمیان رکھا جائے۔[1]

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے متعدد محققین کے اقوال بیان کئے ہیں، جو ترتیبِ توقیفی کے حق میں ہیں۔ ان حضرات میں امام مالک (م۱۷۹ھ) بیہقی (م۴۵۸ھ) علامہ الزرکشی (م۷۹۴ھ) حافظ ابن حجر (م۸۵۲ھ) ابو جعفر نحاس (م۳۳۸ھ) ابو جعفر بن الزبیر (م۷۰۸ھ) وغیرہ شامل ہیں[2] (۱۱۷) ان اقوال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی داخلی شہادت اور احادیث کے شواہد کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کے علماء وآئمہ کا اس پر تقریباً اجماع ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب، حضورؐ کے عہد مبارک میں بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے دی جاچکی تھی۔ شاہ ولی اللہ (م۱۱۷۶ھ) ازالتہ الخفاء میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جمع کرد قرآن! بحضور آنحضورؐ و ترتیب دادہ بود آں را۔"[3]

شاہ معین الدین کے ایک مقالے کا بالواسطہ حوالہ بھی ملتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"اس پر اجماع ہے اور یہ نصوصِ متواترہ سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب بغیر کسی شک وشبہات کے توقیفی ہے۔ اس کو بہت سے علماء نے نقل کیا ہے۔ زرکشی (794ھ) نے البرھان میں ابو جعفر بن زبیر نے مناسبات میں لکھا ہے کہ آیات کی ترتیب سورتوں میں رسولؐ اللہ کی توقیف اور حکم کے مطابق ہوئی۔ اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہے"۔[4]

علامہ سیوطی (911ھ) نے اس موضوع پر الاتقان میں پوری ایک نوع قائم کی ہے جو قرآن مجید کی توقیفی ترتیب پر علماء کے اقوال پر مشتمل ہے۔

کیا قرآن مجید کی ترتیب توقیفی نہیں ہے؟

قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ترتیب توقیفی نہیں بلکہ یہ صحابہؓ کے اجتہاد سے دی گئی۔ اس نقطہ نگاہ کی حمایت بھی کئی ایک علماء نے کی ہے لیکن جب ہم دونوں طرح کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات قرآنیہ کی ترتیب حضورؐ ہی نے دے دی تھی۔ صحابہ کرامؓ کے

---

(1) الکرمانی، محمود بن حمزۃ بن نصر، البرھان فی توجیہ متشابہ القرآن، تحقیق احمد عزالدین، بیروت دار صادر، 1417ھ، ص 115؛ السیوطی، حوالہ مذکور، 407/2

(2) السیوطی: حوالہ مذکور

(3) شاہ ولی اللہ، الدہلوی: ازالۃ الخفاء، ۵/۲

(4) بحوالہ صدیق حسن، سید، جمع وتدوین قرآن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ئ، ص ۶۶

اجتہاد کو اس میں دخل نہیں تھا۔ اس ثانی الذّکر موقف کی حمایت میں امام مالک اور قاضی ابو بکر ہیں۔ علامہ جلال الدّین سیوطی (911ھ) فرماتے ہیں کہ ان حضرات سے دو اقوال منقول ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ صحابہؓ نے اجتہاد سے سورتیں مرتب کیں۔ دوسرا قول ان حضرات سے بھی یہی ہے کہ یہ ترتیب توقیفی ہے۔[1]

☆ ابنِ فارس (م ۳۹۵ھ) کا قول بھی (جن کی رائے کو علامہ سیوطی (911ھ) نے اس فصل میں بیان کیا ہے جو "اجتہادی ترتیب" کی فصل ہے) یہی ہے کہ قرآن کو جمع کرنے کی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم سورتوں کی ترتیب ہے مثلاً سات بڑی سورتوں کو مقدم کرنا اور اس کے بعد مئین کو رکھنا۔ تو اس قسم کی ترتیب صحابہؓ ہی نے دی ہے۔ مگر دوسری قسم کی ترتیب یعنی آیات کا سورتوں کے اندر مرتب کرنا یہ توقیفی ترتیب ہے۔ اس کو حضورؐ نے خود اسی طریقے پر انجام دیا ہے جس طرح جبریل نے اللہ تعالیٰ کی جانب بتائی۔[2]

اس روایت کی روشنی میں کم از کم اتنی بات تو سامنے آتی ہے کہ یہ حضرات بھی آیات کی ترتیب کو بہر حال توقیفی ہی قرار دیتے ہیں۔

☆ اس سلسلے میں دوسری دلیل مختلف حضرات کے "مصاحف" ہیں جن میں سورتوں کی ترتیب ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ اختلافِ مصاحف کی بنیاد کیا ہے؟ اس کا تفصیلی جائزہ ہم نے "اختلاف مصاحف" کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ پہلے تو اس قسم کے مصاحف کا وجود ثابت کرنا ہوگا۔ اگر ان کی حیثیت، ان اصحاب کے ذاتی نسخوں کی تھی۔ (جیسا کہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے) تو پھر ذاتی نسخے کی بنیاد پر امّت کے اجماعی نسخے کی مخالفت کسی بھی اصول کے تحت جائز نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ جو مصاحف منسوب کئے گئے ہیں انہوں نے امّت کے اجماعی نسخے کی مخالفت نہیں کی۔ (مخالفت کی جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان کا تفصیلی جائزہ دوسرے مقام پر لیا گیا ہے) ان لوگوں کے ذاتی مصاحف میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ جب یہ بھی کسی ترتیب میں متفق نہیں تو پھر ان کے مصاحف کی حیثیت خبر واحد کی ہے۔ علامہ جلال الدّین سیوطی (911ھ) نے صحابہ کے اجتہاد سے قرآنی ترتیب کے مؤقف کے حق میں بہت کم دلائل دیے ہیں۔ انہوں نے علامہ زرکشی (794ھ) کا بیان بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ کو تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ علامہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) لکھتے ہیں:

---

(1) السیوطی: حوالہ مذکور

(2) ایضاً، ۴۰۵/۲

والخلاف یرجع إلی اللفظ لأن القائل بالثانی یقول: إنه رمز إلیهم بذلك لعلمهم بأسباب نزوله ومواقع كلماته ولهذا قال الإمام مالك إنما ألفوا القرآن علی ما كانوا یسمعونه من النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔[1]

”فریقین کا اختلاف محض لفظی ہے۔ دوسری شق کا قائل بھی یہی کہتا ہے کہ صحابہؓ چونکہ اسباب نزول اور کلمات قرآن کے مواقع کا علم رکھتے تھے اس لئے ان کو اس ترتیب کا راز معلوم ہو گیا۔ چنانچہ امام مالک کا قول ہے کہ صحابہؓ نے قرآن کی ترتیب محض اس انداز پر کی جسے وہ نبی کریمؐ سے سنتے آئے تھے“۔

عہد حاضر کے ایک مفسر مولانا حمید الدّین فراہی اس نقطہ نگاہ کے بہت بڑے داعی ہیں کہ قرآن مجید کی آیات اور سوَر میں باہم گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب تواتر و توارث کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی قطعی حقیقت ہے کہ اس کے متعلق ایسی روایات کی وجہ سے شک میں ہو جانا جن کی سند کو احادیث کی صحت کے مقررہ معیار پر پورا اترنا آسان نہیں ہے، محض جنون ہے۔[2]

الاتقان میں علامہ جلال الدّین سیوطی (911ھ) نے ایک روایت طبرانی کے حوالے سے نقل کی ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ عبد اللہ ابنِ مسعودؓ سے دریافت کیا گیا

”کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو قرآن کو الٹی ترتیب سے پڑھتا ہے اس کے جواب میں ابنِ مسعودؓ نے فرمایا ایسا شخص معکوس القلب (ٹیڑھے دل والا) ہے۔“[3]

عہد نبویؐ میں قرآن کے مرتب ہونے پر عقلی دلائل:

اگر ہم قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب پر غور کریں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ ترتیب محض چند لوگوں کی دی ہوئی نہیں بلکہ یہ بات تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن، عہد نبویؐ میں منتشر، بے ترتیب اور غیر یقینی شکل میں پڑا ہوا تھا۔ اور بعد میں لوگوں کو جو کچھ ملا اسے بے ربط اور بغیر کسی اصول کے اسے جوڑ کر اسے قرآن کا نام دے دیا گیا۔ بلکہ ہمارے پاس عقلی و نقلی، ہر

---

(1) الزرکشی، بدرالدین محمد بن عبداللہ، البرہان فی علوم القرآن، بیروت، داراحیاء الکتب العربیہ، 1376ھ، النوع الرابع عشر، معرفة تقسیمه بحسب سوره و ترتیب السورو آیات وعدھا، 257/1؛ السیوطی، حوالہ مذکور، 407/2

(2) فراہی، حمید الدین، مولانا، مجموعہ تفاسیر فراہی (اردو)، مکتبہ مرکزی جماعت اسلامی، لاہور 1955ء، ص 52

(3) الطبرانی، المعجم الکبیر، حدیث نمبر 8755/8846؛ السیوطی، حوالہ مذکور، 700/6

طرح کے دلائل موجود ہیں کہ قرآن عہد نبویؐ میں ہی موجودہ ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔

فرض کریں کہ دو اعداد ہیں۔ آپ انہیں دو طریقوں سے ترتیب دے سکتے ہیں یعنی (۱،۲) اور (۲،۱) اگر اسی طرح تین اعداد ہوں تو ان کی ترتیب دینے کے طریقے بڑھ جائیں گے۔ اب ہم ان کو چھ طریقوں سے مرتب کر سکیں گے یعنی (۱،۲،۳)(۱،۳،۲)(۲،۱،۳)(۲،۳،۱)(۳،۱،۲)(۳،۲،۱)۔ اسی طرح اگر ہم نے سات اعداد کو مرتب کرنا ہے تو ان کو مرتب کرنے کے ممکن طریقوں کی مجموعی تعداد (6x5x4x3x2x7)=5040 ہو جائے گی۔ جوں جوں اعداد کی تعداد زیادہ ہوتی چلی جائے گی۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ انہیں مرتب کرنے کے امکانات کی تعداد ہر عدد کے اضافے کے بعد ہزاروں کے حساب سے بڑھتی چلی جائے گی۔

اسی طرح اگر ہم ''سورۃ الفاتحہ'' کی آیات، جن کی تعداد سات ہے ترتیب دینا شروع کریں تو وہ پانچ ہزار چالیس طریقوں سے مرتب کی جاسکتی ہیں۔ اسی سے ہم سارے قرآن کریم کی آیات کے بارے میں قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں کہ اگر انسان اپنی اپنی مرضی سے قرآنی آیات کو ترتیب دینا شروع کریں اور یہ مان لیں کہ آیات کی ترتیب توقیفی نہیں ہے تو انہیں مرتب کرنے کے امکانات کی تعداد تو لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ جائے گی۔ اس صورت میں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہد صدیقی میں قرآن جمع کرتے وقت ایک ہی طریق ترتیب پر لوگوں کا اجماع کیوں کر ہو سکا۔ محض اٹھارہ ماہ کی مدّت میں یہ سارا کام نمٹا لیا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس وقت آیات کی ترتیب، ان کے نزدیک مسئلہ تھا ہی نہیں اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق حضورؐ خود ہی فرما گئے تھے۔

اگر ہم اس بات کا جائزہ ایک انسانی تصنیف کے حوالے سے لیں تو عقل بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ کسی مصنف کی ایسی کتاب بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے فقرات کو تو کسی نے بنایا ہو اور ان فقرات کو جوڑ کر عبارت کسی دوسرے نے بنائی ہو۔

قرآن مجید کی آیات و سور کے درمیان گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ ایک سورۃ کا اختتام اور اگلی سورت کا آغاز ایک ہی موضوع کا تسلسل ہے۔ مثلاً سورۃ نساء کا اختتام اور سورۃ المائدۃ کا آغاز ایک ہی موضوع ہے۔ اس کے اختتام پر اگر توحید ہے تو آغازِ "مائدۃ" میں ایفائے عہد کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الواقعہ کا اختتام اور الحدید کا آغاز، سورۃ الحجر کا اختتام اور سورۃ النّحل کا آغاز اس کی عام مثالیں ہیں اور ان کے علاوہ بھی ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ تمام سورتوں کے درمیان ربط پایا جاتا ہے اور اسی ربط کو بنیاد بنا کر ہی قرآن مجید کے عہدِ نبویؐ میں مرتب ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

ہم فرض کرتے ہیں کہ ہم نے چھ سورتوں "المائدۃ"، "النساء"، "الواقعہ"، "الحدید"، "الماعون"، "الکوثر" کو ترتیب دینی ہے اس اصول کے مطابق ہم انہیں آپس میں

(1×2×3×4×5×6)=720 طریقوں سے مرتب کر سکتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سورتوں کو قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں تو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ ہر ایک کا دوسری سورت سے باقاعدہ ربط پایا جاتا ہے تو پھر ان سات سو بیس طریقوں میں سے صرف ایک طریقہ کس اصول کی بنیاد پر ہاتھ لگا اور اسے اختیار کر لیا گیا جو ان کی ترتیب کا بہترین طریقہ تھا۔ اس ترتیب کو محض اتفاق تو نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اتفاق تو ایک یا چند مرتبہ پیش آسکتا ہے۔ مگر ایک ہی طرح کے لاکھوں واقعات کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سورتوں کی ترتیب میں کوئی باہمی ربط موجود ہے اور اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

یا تو ترتیب خود صاحبِ قرآن کی دی ہوئی ہو۔

یا یہ ترتیب محض ایک معجزہ ہو۔

دونوں صورتوں میں یہ امر یقینی ہے کہ یہ کام امت کا نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ یہ ترتیب انسانی نہیں ہے بلکہ الہامی ہے۔

قرآن مجید کی ترتیب کے الہامی ہونے کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بالفرض ایک شخص کو قرآن اس طرح یاد ہے کہ پہلے سورۃ النّاس، پھر سورۃ الفلق، پھر سورۃ الاخلاص، دوسرے شخص کو سورۃ الفلق اور پھر سورۃ الکوثر پھر سورۃ الاخلاص، تیسرے شخص کے پاس لکھی ہوئی ترتیب کچھ اور ہے۔ جب یہ ٹکڑے، حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے عہد میں "جمع قرآن کمیٹی" کے سامنے پیش کئے گئے تو انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے نسخے میں ان سورتوں کو کس ترتیب کے ساتھ لکھیں؟ یونہی رہنے دیں؟ قرعہ ڈالیں؟ استخارہ کریں؟ محض اتفاق کی بنیاد پر ترتیب دیں؟ یا اپنی ذہانت یا دیگر ساتھیوں کی اعانت سے ان کو ترتیب دیں؟ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترتیب سور کی ساری سکیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ہے۔

عقلی استدلال کیلئے ہمارے پاس لاتعداد دلائل موجود ہیں جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی ترتیب انسانی ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً

۱۔ عرضۂ اخیرہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ قرآن سنایا تو کیا دونوں مرتبہ آپؐ نے علیحدہ علیحدہ ترتیب سے قرآن سنایا۔ یا ایک ہی ترتیب سے سنایا۔[1]

۲۔ عرضۂ اخیرہ کے موقع پر حضرت ابیؓ ابن کعبؓ اور حضرت زید ابن ثابتؓ حضور ﷺ کے ساتھ

(1) البخاری، الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب کان جبریل یعرض القرآن علی النبی ﷺ، ص 433

دونوں موجود تھے۔(1)

جب انہوں نے حضورؐ سے قرآن سنا تو اگر ان کی ترتیب، حضورؐ کی بیان کردہ تریب سے مختلف تھی تو انہیں یہ بات کیوں نہ کھٹکی کہ جس ترتیب سے حضورؐ، قرآن سنا رہے ہیں اسی ترتیب سے اپنے نسخے بھی ترتیب کر لیں۔

۳۔ جو کلام لوگوں کے حافظوں میں موجود ہو۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی کوئی ترتیب بھی ہونی چاہیے۔ اگر اس کی ترتیب الٹ پلٹ ہو جائے تو حافظ کیلئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی یاد سے بدلی ہوئی ترتیب کے مطابق سنا سکے۔ یاداشت کی کمی بیشی کی کیفیت ٹیپ ریکارڈ کی طرح ہوتی ہے اس میں جس ترتیب سے آواز بھری جائے گی اسی ترتیب سے اسے سنا جا سکتا ہے۔

۴۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جس ترتیب سے کوئی چیز یاد ہو اگر وہ اسی ترتیب سے سنائی جائے تو اس کا امکان نہیں رہ جاتا کہ کوئی حصہ سنانے سے رہ گیا ہے۔ مذکورہ بالا ترتیب گڈمڈ کر کے سنانے سے یہ امکان باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ مثلاً ہر ایک شخص کو ایک سے سو تک گنتی زبانی یاد ہو گی۔ اس گنتی کو یاد سے بلا ترتیب لکھنے کی کوشش کریں تو دیکھتے ہیں کہ ہم کتنی مرتبہ پوری گنتی لکھ پاتے ہیں۔ اس عمل میں ہمیں بار بار یہ غور کرنا پڑے گا کہ کوئی عدد چھوٹ تو نہیں گیا۔ اعداد کے نہ چھوٹنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں کو ایک ساتھ سنا دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب یہ سب ایک سلسلے میں منسلک ہوں۔ پھر جب یہ سنایا بھی تین مرتبہ گیا ہو تو یہ بات بدیہی نظر آتی ہے کہ قرآن کی کوئی ترتیب ضرور قائم ہو چکی تھی۔ عرضہ اخیرہ میں حضورؐ نے دو مرتبہ قرآن سنایا اور زید ابن ثابتؓ نے ایک مرتبہ سنایا۔

اگر بے ترتیب سورتوں کو مکمل طور پر حضورؐ کے سنانے کو معجزہ بھی مان لیا جائے تب بھی زید ابنِ ثابتؓ تو معجزہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ انہیں قرآن سن کر کس طرح یقین ہو سکتا تھا کہ انہوں نے پورا قرآن بلا کم وکاست سن لیا ہے۔ ان کا اطمینان اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن، حضورؐ سے سن کر آپؐ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپؐ نے قرآن پورے کا پورا سنا دیا ہے یا نہیں؟ ہمیں اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملتی کہ انہوں نے حضورؐ سے اس قسم کا استفسار کیا ہو۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب

---

(1) الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، باب نسخ القرآن فی المصاحف، 237/1،
السیوطی؛ الاتقان فی علوم القرآن، النوع السادس عشر، 177/1،

حضور ﷺ، حضرت زید ابن ثابتؓ اور ابیّ ابن کعبؓ کے نسخوں کی ترتیب ایک ہی ہو۔

عہد نبویؐ میں قرآن کے مرتب نہ ہونے کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے نماز میں پہلی رکعت میں سورۃ آلِ عمران اور دوسری میں سورۃ بقرۃ پڑھی۔(1)

لیکن اس قسم کی روایات سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ عہد نبویؐ میں قرآن مجید کی کوئی ترتیب نہ تھی۔ راوی کا اس قسم کی بات بیان کرنا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے یہ بات کی ہی اس لئے تھی کہ اسے کچھ اچنبھا محسوس ہوا تھا۔ ورنہ تو روایت کرنے والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ اچنبھا یہ تھا کہ اس نے حضورؐ سے ایک وقت میں تو سورتوں کی ترتیب اس سے الٹ سن رکھی تھی اور اس پر لوگ عمل پیرا تھے۔ لیکن جب اس نے حضورؐ سے اس ترتیب کے الٹ سنا تو اسے حیرت ہوئی۔ راوی نے حضورؐ سے "من قرأ قراءۃً معکوسًا۔" والی روایت سنی ہو گی۔ یہ بات تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس دور میں سورتیں مرتب تھیں۔ اس روایت جس میں پہلی رکعت میں سورۃ آلِ عمران اور دوسری میں سورۃ بقرۃ پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے کے بارے میں یہ بات بھی ہو گی کہ یہ روایت کس عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) علامہ باقلانی (403ھ) کی بیان کردہ مذکورہ بالا روایت کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن شنع قول هذا الباقلانی فی کتابه المعروف "الانتصار للقرآن": إنّ تقسیم آیات القرآن و ترتیب مواضع سُوَرہٖ شیئٌ فعله الناس ولیس هو من عند الله تعالیٰ ولا من رسول الله ﷺ۔ قال أبو محمد: فقد کذب هٰذا الجاهل وأفك۔(2)

آیات کی تقسیم اور سورتوں کی موجودہ ترتیب انسانی کاوش کا نتیجہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نہیں ہے تو وہ شخص جھوٹا ہے اور جاہل ہے اور یہ بات اس کی اپنی اختراع ہے۔

امام موصوف فرماتے ہیں کہ اگر یہ ترتیب انسانوں کی دی ہوئی ہوتی تو اس کے تین طریقے ہو سکتے تھے یا تو ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے انہیں مرتب کیا جاتا۔ یا سورتوں کے سائز کے اعتبار سے پہلے بڑی اور پھر چھوٹی سورتیں رکھی جاتیں۔ یا اس کے برعکس چھوٹی سورتیں اور بڑی سورتیں بعد میں رکھی جاتیں۔ لیکن موجودہ قرآن میں اس قسم کی کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ ذیل میں قرآن کے ایک حزب کی سورتوں کی

(1) مسلم، الجامع الصحیح، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب تطویل القراءۃ، حدیث نمبر 1814، ص 1800؛ السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، النوع الخامس والثلاثون، 679/2

(2) ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد، الفصل فی الملل والاهواء والنحل، بیروت، دار الجیل، 1416ھ، شنع المرجئة، 91/5

آیات کی تعداد سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔	سورۃ الاسراء	آیات کی تعداد ۱۱۱
۲۔	سورۃ الکہف	آیات کی تعداد ۱۱۰
۳۔	سورۃ مریم	آیات کی تعداد ۹۸
۴۔	سورۃ طٰہٰ	آیات کی تعداد ۱۳۵
۵۔	سورۃ الانبیاء	آیات کی تعداد ۱۱۲
۶۔	سورۃ الحج	آیات کی تعداد ۷۸
۷۔	سورۃ المومنون	آیات کی تعداد ۱۱۸
۸۔	سورۃ النور	آیات کی تعداد ۶۴
۹۔	سورۃ الفرقان	آیات کی تعداد ۷۷

آیات کی تعداد کی اس مثال سے یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ مستشرقین کا یہ نقطہ نگاہ کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب میکانکی ہے۔ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔

اس سلسلے میں اگر یہ کہا جائے کہ صحابہؓ عام طور پر گنتی نہ جانتے تھے انہوں نے محض اندازے سے سورتیں گڈ مڈ کر دیں۔ آیات کی تعداد کو بعد والوں نے شمار کیا۔ یہ بات بھی بالکل خلافِ حقیقت ہے۔ مستشرقین یہ بات خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ترتیب سور ۱۲ھ میں ہوئی جب یمامہ کی لڑائی ہو چکی تھی۔ اس وقت تک زکوٰۃ و عشر کا نظام قائم ہو چکا تھا۔ اور اس کے کارندے سرکاری طور پر زکوٰۃ لینے کے لئے معیّن ہو چکے تھے۔ زکوٰۃ کی وصولی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ غلّہ۔ نقدی، جانور، وغیرہ کا حساب لگانا خاصا مہارت کا کام تھا۔ بیت المال بھی تھا خواہ اس کی باقاعدہ تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کے تھوڑا ہی عرصہ بعد حضرت عمرؓ کے دور میں تیس لاکھ مربع میل کے علاقے میں ایک منظم اور مربوط نیٹ ورک معرض وجود میں آیا تاہم کسی نہ کسی طرح کا نظام تو موجود تھا اور اس کا بھی حساب رکھا جاتا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ بیت المال کا حساب رکھ سکتے تھے کیا وہ یہ حساب نہ لگا سکتے ہوں گے کہ ۱۳۵ کا عدد بڑا ہے یا ۹۸ کا۔ اس طرح یہ نقطہ نگاہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے کہ صحابہؓ گنتی نہیں جانتے تھے۔ (1)

عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہ کرامؓ میں زکوۃ کی وصولی کا باقاعدہ نظام موجود تھا۔ حضورؐ کے زمانے میں باقاعدہ طور پر سرکاری احکام کے ساتھ لوگ زکوۃ وصول کرنے کیلئے جاتے تھے۔ قرآن مجید نے عاملین زکوۃ کا

---

(1) صدیق حسن، سید، جمع وتدوین قرآن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1964ء، ص 53-55

ذکر کیا ہے عہدِ خلافت راشدہ میں تو باقاعدہ محکمے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ خلافتِ راشدہ اور عہدِ نبویؐ کا زمانی اعتبار سے کوئی زیادہ بعد نہ تھا۔ اسی طرح دونوں ادوار میں جنگوں میں مصروفیت کے اعتبار سے بھی کچھ زیادہ فرق نہ تھا بلکہ خلافتِ راشدہ میں تو زیادہ مسائل درپیش ہوگئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت صحابہ کرامؓ کی ایک اچھی خاصی تعداد اس قابل تھی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کی طویل وعریض مملکت کے حسابات کا پورا ریکارڈ قائم کر سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت کی تفصیلات اور خصوصاً حضرت عمرو ابن العاصؓ (گورنر مصر) کے ساتھ آپؓ کی خط وکتابت کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور تک حساب کتاب رکھنے کیلئے بڑا فعال ادارہ معرضِ وجود میں آیا۔ گورنروں کیلئے لازم تھا کہ وہ پائی پائی کا حساب رکھیں اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کریں۔ زمینوں کی پیمائش ان سے حاصل شدہ محاصل اور سال بہ سال کی آمدنی میں کمی بیشی کا حساب رکھا جاتا تھا۔ حضرت عمرو ابن العاصؓ سے اسی مسئلے پر حضرت عمرؓ کی گرماں گرم خط وکتابت ہوتی رہتی تھی۔[1]

ان تفصیلات کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مدینہ طیّبہ میں اب مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد لکھنے پڑھنے اور حساب کتاب رکھنے کے قابل ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ وہ گنتی کے تصور سے ناآشنا تھے، خلاف واقعہ ہے۔

قرآن مجید کی آیات کا باہمی ربط

قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کے درمیان عظیم الشان ربط اس کا اعجاز ہے لیکن مستشرقین قرآن مجید کا براہ راست مطالعہ کرنے کی بجائے اپنے ساتھیوں ہی کی کتب پر اکتفاء کرتے ہوئے ربط قرآن پر اعتراض کرتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی (606ھ) لکھتے ہیں کہ قرآنی حکمت کا سب سے بڑا حصہ ترتیب ونظم کے اندر مخفی ہے۔[2]

---

(1) اس سلسلہ میں تفصیلات کے لئے دیکھئے: ابو یوسف، امام، کتاب الخراج، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ص 14،21

بلاذری، ابو جعفر احمد بن یحی، فتوح البلدان، مکتبہ النہضۃ المصریہ، قاہرہ، سن، ص316؛ المقریزی، 18-79/1

(2) فراہی، حمید الدین، مولانا، نظام القرآن، صفحہ 56،

اصلاحی، امین احسن، مولانا، مبادی تدبر قرآن، صفحہ 6،

ایضا، تدبر قرآن، مقدمہ

مولانا حمید الدین فراہی لکھتے ہیں کہ

نظم قرآن کے بارے میں دو مکاتبِ فکر ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات سوَر میں ربط نہیں ہے دوسرا گروہ نظم قرآن کی موجودگی کا حامی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اس نقطہ نگاہ کا حامی ہوں کہ قرآن مجید میں نظم موجود ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ نظم قرآن کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے بارے میں علماء نے سکوت اختیار کیا ہو۔ بلکہ ایک گروہ نے اس کی طرف نہایت اہتمام کے ساتھ توجہ کی ہے یہ ایک تنگ راہ ہے جس پر چلنے والوں کی تعداد تھوڑی ہے لیکن یہ ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ اب تک دریافت ہوا ہے۔[(1)]

علامہ سیوطی (911ھ) ابن عربی کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

آیات قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم نے اس علم کی طرف توجہ کی۔ اس اصول پر اس نے پوری سورۃ بقرۃ کو منظم کر دیا۔ ہم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کا دروازہ کھولا لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدردان نہیں پائے۔[(2)]

امام فخر الدین رازی (606ھ) بھی ابن عربی کی طرح اپنی تفسیر میں جگہ جگہ اس نعمت کے عطاء کرنے پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے نظم قرآن کو واضح کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت عطا کی۔[(3)]
برّصغیر کے بہت بڑے قدیم مفسر علاّمہ مہائمی نے اپنی تفسیر میں نظمِ قرآن کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے وہ بھی اس علم کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور بخشش قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اس نعمت کی عظمت کا ذکر اپنی تفسیر میں خصوصی طور پر کیا ہے۔ اسی مناسبت سے انہوں نے اپنی تفسیر کا نام تبصیر الرّحمٰن وتیسیر المنّان رکھا ہے۔ شیخ ولی الدّین لکھتے ہیں کہ: جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی آیات میں نظم اس لئے تلاش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مختلف اوقات میں مختلف حالات کے تحت نازل ہوئی تھیں وہ غلط کہتے ہیں۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ نزول کے اعتبار سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے اعتبار سے بالکل حکمت کے مطابق ہیں۔[(4)]

مولانا حمید الدین فراہی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہر سورت کے اندر ایک مخصوص نظام ہے اور سورتوں کے مطالب میں جو بظاہر بے نظمی نظر آتی ہے محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا

---

(1) ایضاً

(2) السیوطی، حوالہ مذکور، النوع الثانی والستون، 1837/5

(3) ایضاً

(4) فراہی، حوالہ مذکور، ص 58

ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ ہر سورۃ میں اگر ایک معین مقصد نہ ہوتا جس کے پورے ہونے سے سورۃ مکمل ہوتی ہو تو سورتوں کی اس الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی۔(1)

نیز جب سورتوں کیلئے کوئی خاص طوالت مقرر نہیں کی گئی بڑی چھوٹی ہر قسم کی سورتیں موجود ہیں تو ہر سورت کے اندر اگر نظمی وحدت مد نظر نہیں تو آیات کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی اجزاء یوں ہی بکھرے رہتے اور اگر اجزاء ایک ایک سطر کے ہوتے تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورۃ کے اندر رکھا گیا اور اسے سورت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ گویا ایک شہر بسا کر اس کے گرد شہر پناہ بنادی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایک شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے آباد ہوسکتے ہیں۔(2)

مولانا فراہی فرماتے ہیں کہ معانی کے اعتبار سے معوذ تین ایک دوسری سے بہت مشابہت رکھتی ہیں، تاہم ان دونوں کو بھی ایک سورت قرار نہیں دیا گیا اسی طرح سورۃ التکویر، الانشقاق، المرسلات، النازعات، الذاریات، سب ہم معنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوبِ قرآنِ پاک ان میں مختلف ہے۔(3)

مولانا فراہی ہر ایک سورت کو ایک الگ منظّم کلام قرار دیتے ہیں کیونکہ قرآنِ نے مشرکین کو دعوتِ معارضہ دی تھی تو پہلے دس سورتیں اور پھر ایک ہی سورت لانے کو کہا تھا۔ لیکن ایک سورت سے کم کی بات نہیں کی گئی۔(4)

قرآن کی ہر چھوٹی سورت ربط و نظم کے محاسن کے اعتبار سے بڑی سورتوں کی ہم سر ہے۔ چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ چھوٹی سورتوں مثلاً ماعون، کوثر اور العصر وغیرہ میں بے نظمی ہے۔ سخت غلطی ہے۔ اس طرح بڑی سورتوں کے اندر آیات کے ایسے مجموعے ہیں جن کا نظم و ربط بالکل واضح ہے مثلاً سورۃ البقرۃ کی ابتدائی بیس آیات میں مکمل نظم پایا جاتا ہے۔ ان میں جس قدر غور و تدبر کیا جائے اس طرح نظم کا دقیق نظم سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے۔(5)

قرآن میں تکرار پایا جاتا ہے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے مولانا فراہی لکھتے ہیں:

قرآن میں ایک چیز کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے اور کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے۔ کبھی ایک چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے کبھی تفصیل کے ساتھ۔ کبھی ایک بات مقدّم ہوتی ہے کبھی مؤخر۔ کبھی تنہاء

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

(5) ایضاً

اسی کا ذکر کیا جاتا ہے کبھی اس کے مقابل کے ساتھ۔ اس کا جوڑ کبھی کسی کے ساتھ ہوتا ہے کبھی کسی کے ساتھ۔ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اگر ایک موقع پر ایک طرح سے بات کرتے ہوئے اصل بات سمجھ میں نہیں آتی تو دوسرے مقام پر دوسرے انداز سے بات سمجھائی گئی ہے۔ قرآن کریم نے اس خصوصیت کو اپنے ایک مثبت وصف کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کا ذکر یوں کیا ہے۔

﴿كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ﴾[1]

ترجمہ:" اور اسی طرح ہم آیات کو بار بار بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھ جائیں۔ "

آپ فرماتے ہیں کہ ہر ترتیب میں ایک خاص حکمت پیشِ نظر ہوتی ہے۔ ہر سورۃ کا ایک عمود ہوتا ہے۔ عمود سورۃ کا جامع موضوع ہوتا ہے۔ وہ سورت کے سارے مضامین کیلئے شیرازے کا کام کرتا ہے۔ عمود سورۃ کے اندر سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ سورۃ نور کے اندر دیکھیے اس میں آیتِ نور۔ سورت کا بہت بڑا موضوع ہونے کے باوجود سورۃ کا عمود نہیں ہے بلکہ یہ ضمنی مضمون ہے۔ اس سورۃ کا حقیقی عمود عورتوں سے حسنِ سلوک کی تعلیم ہے۔ بسا اوقات عمود بہت سی باتوں اور پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اسکی مثال سورۃ الحجرات ہے اس میں ایک ہی بات ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سورۃ میں بد خلقی کی مذمت کی گئی ہے۔[2]

مولانا فراہی کے خیال کے مطابق عمود دراصل ایک مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور ساری سورت اسی کے گرد گھومتی ہے۔ ان کے الفاظ میں عمود کی شکل میں ہم وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔

قرآن مجید کے تکرار کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایک موضوع بطور مثال یا بطور دلیل آتا ہے یا بعد میں آنے والے دعویٰ کیلئے مثال یا حجت سے تمہید باندھی جاتی ہے یا پہلے بیان ہونے والے موضوع کی توسیع یا تحدید کی جاتی ہے یا کسی سوال کا جواب دیا جاتا ہے یا کسی بات کا ذکر بر سبیل تذکرہ کیا گیا ہو، تو ایسی صورت میں ایک بات کا کئی بار آجانا قطعاً نقص کلام نہیں ہوتا۔[3]

غرض قرآن مجید ایک بے نظم و بے ربط کتاب نہیں بلکہ اس میں یہ باتیں کمال کے درجے میں پائی جاتی ہیں۔ مولانا فراہی فرماتے ہیں کہ نظمِ قرآن سے بے اعتنائی برتنے سے کتاب اللہ کے بڑے حصے سے محروم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں سے جو جہاد کیا اس کی دلیل انہیں نظمِ قرآن ہی سے ملی۔ ان کے استدلال کی ترتیب گویا یوں تھی کہ جو

---

(1) الانعام: ٦٥

(2) ایضاً، ص 61-58

(3) ایضاً

لوگ نماز نہیں پڑھتے از روئے شریعت وہ ہم سے الگ ہیں اور ہمیں ان سے قتال کا حکم ہے تو جو لوگ زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ان کیلئے بھی یہی حکم ہونا چاہیے کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر ہمیشہ نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ جب قرآن میں اس کی جگہ نماز کے بعد ہے تو لازماً یہی جگہ اسکی دین کے اندر بھی ہونی چاہیے۔ (1)

مولانا حمید الدین فراہی نے سورۃ الفاتحہ کے نظم کی ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ سورت قرآن کے سہ گونہ علوم کی جامع ہے۔ اس میں پورے قرآن کا نظم بھی جامعیّت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا آئینہ ہے جس کے اندر قرآن عظیم کا ایک پورا عالم جھلکتا ہے۔ مولانا فراہی لکھتے ہیں کہ اگر ہم قرآن پر مجموعی طور پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حمد سے شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ اسلام کے اصولِ ظاہری و باطنی کی تفصیل کرتا ہوا کمال فتح و نصرت، مخالفین کی ہلاکت، تکمیل فرضِ نبوت تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد سورۃ اخلاص آخری عہد کی حیثیت سے آتی ہے۔ جب اس ترتیب کے ساتھ اس شہر قدسی کی تکمیل، اس کی شہر پناہ اور اس کے برجوں کی تعمیر ہو چکتی ہے تو ہم اس دیکھتے ہیں کہ اس کے دروازے پر دو پہرے دار کھڑے کر دیئے جاتے ہیں یا دو تلواریں لٹکا دی گئی ہیں جو اس کی حفاظت کر رہی ہیں یعنی معوّذ تین۔ گویا قرآن کریم ایک باغ ہے جس پر دو کرّوبی چمکدار تلواریں لئے ہوئے نگرانی کر رہے ہیں۔ (2)

مولانا فراہی لکھتے ہیں کہ یہ تصویر نگاہوں کے سامنے رکھو اور پھر سورۃ فاتحہ میں غور کرو اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر بھی معانی کا وہ پورا شہر نظر آئے گا جو قرآن کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ پھر عدل کا مضمون ہے۔ پھر عبادات کی دو اصلیں سامنے آتی ہیں۔ اس کے بعد صراطِ مستقیم (توحید و رسالت) کا ذکر ہے اس کے بعد تعوذ ہے اور معوّذ تین کی طرح یہاں بھی تعوّذ ظاہری و باطنی دونوں ہیں۔ اس روشنی میں دیکھیں تو مجموعی قرآن کی طرح یہ سورۃ بھی جنت عدن کے مثل ہے جس پر دو کرّوبی پہرہ دے رہے ہیں۔ (3)

غرض قرآنِ مجید کی آیات و سور کے درمیان بڑا گہرا اور معجز نما ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان علماء نے تاریخ کے ہر دور میں اس پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ شیخ ابو بکر نیشا پوری۔ امام فخر الدین۔ علامہ ابو جعفر الزبیر۔ شیخ برہان الدین بقاعی۔ علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ)۔ علامہ مہائمی۔ اور بہت سے دیگر محققین نے اس موضوع پر مفید کتب لکھیں۔ علامہ ابو جعفر الزبیر کی کتاب "البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" شیخ برہان الدین بقاعیؒ کی "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" علامہ سیوطیؒ (911ھ) کی اسرار التنزیل اور علامہ مہائمی کی تفسیر

(1) ایضاً
(2) ایضاً، ص 124-125
(3) ایضاً، ص 125

"تبصیر الرّحمٰن و تیسیر المنان" اس موضوع کی قابل قدر کتب ہیں۔ برصغیر کی اردو تفاسیر میں مولانا اشرف تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن۔ مولانا عبدالحق حقانی (1052ھ) کی تفسیر حقانی۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبّر قرآن۔ مولانا حمید الدین فراہی کی نظام القرآن تاویل الفرقان بالقرآن اس موضوع کی اہم تصانیف ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا اصلاحی تو ترتیب و ربط آیات اور ربطِ سور کو قرآن مجید کے اعجاز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں اس موضوع پر ابھی مزید سے مزید تحقیقات کی ضرورت اور گنجائش موجود ہے تاکہ ہم مستشرقین کے بے بنیاد اعتراضات کا جواب بھی دے سکیں[1] اور قرآن مجید کی عظمت کا بھی اظہار ہو۔

علماء نے ربط و مناسب مضامین کی کئی اور صورتیں بھی بیان کی ہیں۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہ مناسبت و ربط کسی مقام پر ایسا لطیف ہوتا ہے کہ سطحی نگاہ رکھنے والا اس کو سمجھنے نہیں پاتا۔[2] مثلاً

ا۔ تنظیر: یعنی ایک شے کیلئے نظیر و مثال بنانا۔ بظاہر دو باتوں کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ لیکن درحقیقت ان کے درمیان گہرا ربط ہوتا ہے۔ اس کی مثال سورۃ انفال کی آیت

﴿كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِٱلْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ لَكَـٰرِهُونَ﴾[3]

ترجمہ: "یہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ جس طرح آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر سے نکالا اور مومنوں میں سے ایک گروہ ہجرت کرنے کے سلسلے میں ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔" اس آیت کا اس سے پچھلے مضمون سے کوئی ربط بظاہر نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک مسلسل مضمون ہے وہ اس طرح سے کہ جنگ بدر میں جب مسلمانوں کو مال غنیمت ہاتھ لگا تو جنہیں مال ملا تھا ان کی خواہش تھی کہ جسے جو مال ملا ہے وہ اسی کے پاس رہے لیکن نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق تقسیم فرمائیں بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھے اس کے فوراً بعد کہا گیا ہے جس طرح اللہ نے آپ کو مکہ سے اپنے گھر سے نکالا اور لوگوں پر یہ بات بوجھ بن رہی تھی اسی طرح مال غنیمت بھی ان کی طبیعت کی گرانی کے باوجود آپ اللہ کے حکم کے مطابق تقسیم فرمائیں۔ یوں بظاہر ابتدائی دو آیات کا تیسری کے ساتھ ربط نظر نہیں آرہا لیکن درحقیقت ربط موجود ہے۔

۲۔ مضادت: یعنی ایک چیز کے بعد اس کی ضد کا بیان کرنا تاکہ اس تقابل اور تضاد سے اس کی پوری حالت منکشف ہو جائے۔ اس کی مثال سورۃ البقرۃ آیت نمبر 2 تا 4 میں ہے " هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ " کے ساتھ مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اسی جگہ آیت نمبر 6 تا 21 میں اس کے بعد "إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا"

---

(1) کاندھلوی، مالک، محمد، منازل العرفان، ناشران قرآن، لاہور، ص 337 (حاشیہ)

(2) السیوطی، حوالہ مذکور، النوع الثانی والستون، 1841/5

(3) الانفال: ۵

کے ساتھ فریق مخالف کا ذکر کیا گیا ہے۔ عام زندگی میں بھی ہم سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کی حقیقت کو اس کی ضد اور اس کے الٹ سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن نے سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں متقی لوگوں کی خصوصیات بیان کی تو متقی لوگوں کے برعکس کافروں کی خصوصیات کا بھی البقرۃ 6 تا 21 میں تفصیل سے ذکر کر دیا تاکہ دونوں کے تقابل سے متقی لوگوں کے ساتھ ساتھ کافروں کو بھی سمجھا جا سکے۔ اسکی بے شمار مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ النحل آیات 24 تا 29 میں کافروں کے اسلام کے بارے میں رویے کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ قرآن کو پہلی کتابوں کی نقل قرار دیتے ہیں، اسلام کے بارے سازشیں کرتے ہیں اس سے اگلی آیات 30 تا 31 میں اس کے متصل مومنوں کے اسلام کے بارے میں رویے کا ذکر کیا وہ قرآن کو سراپا خیر مانتے ہیں۔

۳۔ استطراد: ایک مضمون کی مناسبت سے دوسرا مضمون ضمناً ذکر کرنا۔ اسکی مثال

﴿ يَابَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَلِكَ خَيْرٌ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴾ (1)

"اے آدم کی اولاد! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا ہے جو تمہارے جسم کے ان حصوں چھپاتا ہے جن کا کھولنا برا ہے اور وہ ایسا لباس ہے جو خوشنمائی کا ذریعہ بھی ہے۔ اور تقویٰ کا بھی۔ یہ وہ لباس ہے جو سب سے بہتر ہے۔"

اسی آیت سے قبل سورۃ الاعراف کی آیات 12 تا 22 میں شیطان کی سرکشی اور انسانوں کو گمراہ کرنے کے اعلان اور اس کی چال کی وجہ سے آدم و حوّا کے جنت سے نکالے جانے کا ذکر ہوا۔ پھر ان کی توبہ قبول ہوئی اسی توبہ کے صلے میں اللہ نے ان پر عنایت کی کہ انہیں نہ صرف ستر ڈھانپنے کے لئے لباس دیا بلکہ یہ لباس ان کی زیب و زینت کا بھی سامان مہیا کرتا ہے۔ درمیان میں آیات 23 تا 27 میں توبہ کے ان ثمرات کے بعد پھر شیطان کے ان حربوں کا ذکر آیات 27 تا 33 میں کیا۔ جن کا تعلق انسانی زندگی کے اس پہلو سے ہے۔ جو ستر اور حیاء سے تعلق رکھتا ہے۔

زمخشری (538ھ) فرماتے ہیں کہ آیتِ "لِبَاسُ التَّقْوَى" استطراد کے طور پر ذکر کی گئی ہے۔

۴۔ حسن تخلّص: اس کا مطلب ہے ایک مضمون کے بیان کے ساتھ دوسرے ایک بیانِ مقصود کی طرف ایسے حسنِ اسلوب سے منتقل ہو جانا کہ سامع کو مضمون کے تبدیل ہونے کا احساس بھی نہ ہو۔ قرآن کا یہ طرزِ بیان ایسا عجیب اور حیرت انگیز ہے کہ اس خوبی اور کمال پر دنیا کے فصحاء و بلغاء حیران ہیں۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں انبیاءؑ اور اقوام ماضی کا تذکرہ چل رہا تھا۔ اس ذیل میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر شروع ہو گیا کہ وہ اپنی قوم کے ستّر آدمیوں کو لے کر کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ جب شرفِ

(1) الاعراف: ۲۶

ہمکلامی حاصل ہوا تو حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کیلئے دعا مانگی ﴿ وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ﴾(1)
اے اللہ لکھ دے ہمارے واسطے بھلائی اس دنیا اور میں آخرت میں۔۔۔۔۔(اسکے جواب میں کہا گیا)

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾(2)

ترجمہ: یعنی میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے بعد فرمایا:
"مگر میرا عذاب بھی ہے جس کو چاہوں میں وہ عذاب پہنچادوں۔"

اس مقام پر قرآن نے کلام کا رخ موڑ کر حضورؐ اور آپؐ کی اُمّت کے مناقب وفضائل بیان کرنے شروع کر دیئے اس موقع پر محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی آیتوں کا اگلی آیتوں اور اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں فرمایا۔ اے موسیٰؑ! یہ رحمت جو ہر شے کو محیط ہے، محض آپؐ اور آپؐ کی امت سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک آنے والے نبی اور رسول کیلئے بھی ہے۔ جن کے اوصاف و کمالات اس کے بعد آگے والی آیات

﴿ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ سے لیکر أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾(3) بیان ہوئے۔

ان آیات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے ان کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطی(911ھ) فرماتے ہیں۔

اس کے بعد کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بیان کردہ صفات اور نبی اُمّی کی خصوصیات اس مرحلہ پر پہنچ گئیں، فلاح ونجات کا انحصار اتباعِ محمدیؐ میں کر دیا گیا۔

فوراً ہی حضورؐ کی طرف سے پیغامِ نبوت اور اعلانِ رسالت کا مضمون شروع ہو گیا۔ اس کے بعد
﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴾(4) میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

گویا یہ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم اپنے عہد میں تحریفات کر کے گمراہ ہو چکے ہو۔ تم اپنے مذہب کو چھوڑ چکے ہو۔ اب نبی آخر الزمان ہی کے ذریعے تمھیں ہدایت مل سکے گی۔

اصل بات موسیٰؑ کی چل رہی تھی۔ درمیان میں نبی کریمؐ کے تخصصات کا ذکر کیا گیا۔ اب ان کے ذکر کے بعد دوبارہ موسیٰؑ کی بات شروع کر دی گئی۔ اور کہا گیا کہ ومن قوم موسیٰ أمة یهدون بالحق۔ یعنی

---

(1) اعراف: ۱۵۶

(2) الاعراف: ۱۵۶

(3) الاعراف: ۱۵۷۔۱۵۶

(4) الاعراف: ۱۵۸

اس قوم میں سے بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو حق کی راہنمائی کرتے ہیں اور خود بھی حق پر چلتے ہیں۔ عدل و انصاف کا طریق اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ عبداللہ ابن سلام اور کعب احبار کہ تورات و انجیل کی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے حضورؐ پر ایمان لے آئے۔

اس سے یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کے اندر کس طرح ربط پایا جاتا ہے اور مضمون کس طرح تسلسل کے ساتھ چلتا ہے۔ اس حسن تخلص اور استطراد پر غور کریں یہ تمام موتیوں کی طرح نظر آتے ہیں جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ استطراد اور حسن تخلص میں فرق یہ ہے کہ استطراد دوسرے مضمون کے فوراً بعد ہی اصل کی طرف کلام کا رُخ پلٹتا ہے کہ سامع کو محسوس تک نہیں ہوتا اور دوسرا مضمون اس طرح مسلسل بیان ہوتا ہے کہ ہر دو مضامین میں ایسا اتّحاد اور ارتباط ہوتا ہے کہ مخاطب دونوں کو ایک ہی مسلسل اور مربوط مضمون خیال کرتا ہے۔

غرض قرآن کریم کا یہ خصوصی طرزِ بیان ایسا نرالا ہے کہ اس کی عظمت و برتری کا صحیح اندازہ لگانا انسانی عقل کے بس سے باہر ہے۔[1]

اسی طرح سورتوں کے ابتدائی اور آخری کلمات میں بھی ایک عجیب ربط اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ دنیا کے فصیح و بلیغ ترین کلام میں کہیں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس پہلو سے مختلف سورتوں میں اس قدر ربط پایا جاتا ہے کہ یہ ربط مستقل طور پر مسلمانوں کی کتب کا موضوع بن گیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے کتاب "مراصد المطالع فی تناسب المقاطع اوا لمطالع" اور علامہ کرمانی نے "العجائب" لکھی۔ سورتوں کے مفاتیح (سورتوں کا آغاز) اور مقاطیع (سورتوں کا آخر) میں ربط و مناسبت کی ایک مثال سورۃ البقرۃ کے آغاز میں "هُدًى لِلْمُتَّقِينَ" کے بعد مومنین کی صفات کا ذکر، پھر کفار کے خصائل کا بیان اور پھر اسی سورت کے اختتام پر ﴿ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ﴾ کا ذکر ہے جس میں کتاب کے ہدایت ہونے اور پرہیز گاری کے دنیوی اور آخروی نتیجہ کا بیان ہے کہ تقویٰ اور ایمان کا اخروی ثمرہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خطائیں اور لغزشیں معاف فرمائے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی پرہیز گار ہو جائے۔ اس سے غلطی کا امکان بہر حال باقی رہتا ہے اسی لئے ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ﴾ کی تعلیم دی گئی۔[2]

اسی طرح سورۃ آلِ عمران اور دیگر سورتوں کے آغاز و اختتام میں ایک ربط پایا جاتا ہے۔ سورتوں کے آغاز کے کلمات بھی ایسے لائے گئے ہیں کہ سورۃ کے اندر بیان شدہ مضامین سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ محققین نے قرآنی سورتوں کے آغاز کے کلمات میں غور و خوض کیا اور وہ اس نتیجے تک پہنچے ہیں۔

کہ وہ کلمات دس قسم کے ہیں:

---

(1) ایضاً

(2) فراہی، حوالہ مذکور، ص 59؛ شمس علوم القرآن، امجد اکیڈمی، لاہور، سن، ص 50

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور ہر قسم کے عیوب سے خدا تعالیٰ کی پاکی کا اعلان۔

۲۔ حروف تہجی۔ مثلاً الٓمٓ۔ حٰمٓ۔ وغیرہ

۳۔ حروف نداسے۔ اس طرح دس سورتوں کا آغاز ہوا ہے۔ پانچ میں نداء حضورؐ کی طرف ہے اور پانچ میں امت کی طرف ہے۔ اوّل الذّکر میں سورۃ الاحزاب، الطّلاق۔ التحریم۔ المزمل۔ المدثر ہیں جبکہ ثانی الذکر میں النساء۔ المائدۃ۔ الحج۔ الحجرات۔ الممتحنہ شامل ہیں۔

۴۔ قرآن مجید کی تیئس سورتیں ایسی ہیں جو جملہ خبریہ سے شروع ہوئی ہیں

۵۔ پندرہ سورتیں قسموں سے شروع ہوئی ہیں۔

۶۔ سات سورتوں کا آغاز حروفِ شرط کے ساتھ ہوا ہے۔

۷۔ چھ سورتوں کا آغاز صیغہ امر سے ہوا ہے۔ ان میں سورۃ الجن۔ الکافرون۔ الاخلاص۔ الفلق اور الناس ہیں۔

۸۔ چھ سورتیں صیغہ استفہام سے شروع ہوئی ہیں۔ ان میں الغاشیہ۔ الانبیاء۔ الدھر۔ الم نشرح۔ الفیل اور الماعون ہیں۔

۹۔ تین سورتوں کا آغاز تنبیہی کلمات سے ہوا ہے ان میں المطففین۔ الھمزۃ۔ اللّھب ہیں۔

۱۰۔ ایک سورت، سورت قریش تعلیل (کسی چیز کی علت یا سبب بیان کرنا) کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔

اگر ہم ان فواتح اور سورتوں کے مضامین کو دیکھیں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ الفاظ ساری سورت کے مضامین کا خلاصہ ہیں۔ (1)

آخر میں اس موضوع پر شاہ ولی اللہ کی وضاحت بیان کرتے ہیں جو بڑی جامعیت اور حکمت پر مبنی ہے۔

قرآن مجید عرب کی زبان پر اترا ہے اور مخاطبِ اول اس کے عرب ہیں اس لئے ضرور تھا کہ طرزِ بیان میں اسلوبِ عرب کی رعایت رکھی جائے۔ قدیم عرب کی جس قدر نظم و نثر موجود ہے سب کا یہی طرز ہے کہ مضامین کو یکجا بیان نہیں کرتے۔ بلکہ ایک بات کہتے ہیں ابھی وہ ختم نہیں ہوئی ہوتی کہ دوسری بات کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ پھر پہلی بات کی طرف رجوع کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح پھر دوسری بات شروع کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کا ایک مقصود یہ بھی ہے کہ توجّہ الی اللہ اور اخلاص و عبادت کے مضامین اس قدر بار بار کہے جائیں کہ مخاطب پر ایک حالت طاری ہو جائے۔ اس قسم کی تکرار اس ترتیب کی صورت میں ممکن نہ تھی۔ (جس سے ہم واقف ہیں۔) (2)

---

(1) ایضاً

(2) جامع الترمذی، کتاب القراءات، باب ماجاء کیف کانت قراءۃ النبی ﷺ: رقم الحدیث 2923

مولانا عبدالکلام آزاد نے مستشرقین کے ان اشکالات کا بڑے جامع انداز سے جواب دیا ہے۔

فرماتے ہیں:

قرآن کے مختلف حصوں اور آیات کے مناسبات وروابط کے سارے الجھاؤ صرف اس لیے ہیں کہ فطرت سے بعد ہو گیا ہے اور وضعیت ہمارے اندر بسی ہوئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو بھی ایک ایسی مرتب شکل میں دیکھیں جیسی کتابیں ہم مرتب کرتے ہیں۔ (1)

خود مستشرقین نے اپنے تحقیقی نتائج کے مبنی ہر مفروضات اور غیر یقینی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ آخری عمر میں جب نولڈیکے (1836-1930) سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو اس پر شرمندگی نہیں ہے کہ آپ نے اتنی طویل عمر انسانیت کے لیے مفید علوم جیسے میڈیکل اور کیمیا وغیرہ میں صرف کرنے کی بجائے مذہب، زبان و ادب اور فلسفہ میں کھپادی، تو اس نے جواب دیا "اگر کوئی ندامت ہے تو وہ یہ کہ میں اپنی تحقیقات سے کوئی یقینی نتائج اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" (2)

خلاصہ بحث

جیسا کہ ہم نے آغاز میں ذکر کیا تھا۔ مستشرقین کسی صورت بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ وہ قرآن مجید کی ترتیب کے اعجاز کا اقرار کرلیں۔ انہوں نے ہر سمت سے ہر طریق استدلال اختیار کرتے ہوئے موجودہ ترتیبِ کو قرآن کا ایک نقص شمار کیا ہے۔ انہوں نے حقائق کو مسخ بھی کیا ہے۔ حقائق کو چھپایا بھی ہے۔ واقعات کی من مانی تشریح بھی کی ہے یک طرفہ استدلال بھی کیا ہے۔

لیکن ان کے استدلال میں نہ تو کوئی منطق ہے اور نہ ہی حقیقت بیانی۔

ہم نے مختلف طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب ایک اعجاز ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب قرآن کا نقص نہیں بلکہ قرآن کیلئے وجۂ امتیاز و فخر ہے عقلی و نقلی استدلال سے یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ

۱۔ نقلی استدلال کے اعتبار سے علمائے امت کے اقوال اس پر دال ہیں کہ ساری امت ترتیبِ قرآن کو توقیفی سمجھتی چلی آ رہی ہے۔

۲۔ عقلی اعتبار سے حقائق کی کڑیاں ملانے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب واقعی اللہ تعالیٰ کے حکم سے دی گئی ہے۔

ترتیبِ قرآن کے اعتبار سے ہمارے موضوع کے دو حصے تھے۔

۱۔ کیا موجودہ ترتیب توقیفی ہے یا صحابہؓ یا کسی اور کی اجتہادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

---

(1) آزاد، ابوالکلام، مولانا، ترجمان القرآن، (مقدمہ) ص 41

(2) بدوی، عبدالرحمٰن، موسوعۃ المستشرقین، طبع دار العلم للملایین، بیروت، 1989، ص:82

۲۔ کیا ترتیبِ قرآن ایک نقص ہے یا وصف۔

ان دونوں پہلوؤں پر ہم نے استدلال کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ مستشرقین کے موقف میں کوئی حقیقت کار فرما نہیں ہے۔ تمام امت کا اس بات پر تو مکمل طور پر اتفاق رائے ہے کہ سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب حضورؐ کی دی ہوئی ہے۔ اگر کسی کو اختلاف ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ کیا سورتوں کی موجودہ ترتیب صحابہؓ کے اجتہاد سے عمل میں آئی ہے۔ لیکن ہم نے اس استدلال کا بھی تنقیدی جائزہ لے کر واضح کر دیا ہے کہ اس مکتبِ فکر کے دلائل زیادہ مضبوط نہیں۔ علامہ زرکشی (794ھ) کا بیان جو دونوں (توقیفی اور اجتہادی) نقطہ نگاہ کو تطبیق دیتا ہے بیان کر کے واضح کیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں نقطہ نگاہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔

ساتواں باب

نسخ فی القرآن کی بنیاد پر مستشرقین کے صحت قرآن پر اعتراضات

۱۔ نسخ کا مفہوم اور حکمت

۲۔ عدم صحت قرآن کی بنیاد بنائی جانے والی روایات کا تحقیقی جائزہ

***

ناسخ و منسوخ آیات

قرآن مجید تقریباً تئیس برس کے عرصے میں نازل ہوا۔ اس دوران کئی ایک آیات اور احکام ناسخ و منسوخ کے مرحلے سے گزرے۔ کئی ایک احکام یا آیات ابتداء میں قرآن مجید میں موجود تھیں پھر ان کی جگہ نئی آیات اور نئے احکام نے لے لی اور پہلی آیات منسوخ کر دی گئیں۔ قرآن مجید کی کچھ آیات کے منسوخ ہو جانے کا تذکرہ خود قرآن میں موجود ہے۔[1]

مشرکین مکہ اور آج کے مستشرقین، ہر دو نے احکام وآیات کی اس تبدیلی کو قرآن مجید کا نقص قرار دیا اور اسے اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ قرآن، اللہ کا کلام نہیں بلکہ یہ بھی عام کتابوں کی طرح ایک انسانی تصنیف ہی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ کے عمل کو وہ اس انداز سے مسخ کر کے پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ تحریف قرآن ہے۔ وہ نسخ آیات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے حضور ﷺ کا ذاتی فعل قرار دیتے ہیں کہ آپ ﷺ جس آیت یا حکم کو چاہتے قرآن میں شامل کر لیتے، جسے چاہتے نکال دیتے۔ اس طرح ان کے بقول قرآن مجید کا بہت سا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ بہت سے مستشرقین نے اس موضوع کو اپنی تحقیقات کی بنیاد قرار دیا۔ ان لوگوں میں خاص طور پر آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) (1892-1959) اور جان برٹن (John Burton) (1921-2005) قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے ان روایات کو خوب اچھالا ہے جن میں ناسخ و منسوخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ (اس موضوع پر مکمل بحث کتاب کے متعلقہ باب میں موجود ہے۔)

نسخ کا مفہوم اور حکمت

قرآن مجید کے تمام احکام ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہو گئے بلکہ نفاذ احکام میں سہولت اور تدریج کو ملحوظ رکھا گیا۔ کیونکہ آہستگی، تدریج اور مہلت کے ساتھ جو احکام نافذ کئے جائیں ان پر عمل کرنا آسان بھی ہوتا ہے اور دائمی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت کی تکمیل کا مرحلہ آنے تک مختلف اوقات میں اس وقت کی

---

(1) سورۃ البقرۃ:۱۰۶؛ سورۃ النحل:۱۰۰؛ سورۃ الاعلیٰ:۶ ؛ نیز دیکھیے :السیوطی : حوالہ مذکور، ص۴۵۵ (النوع السابع والأربعون فی ناسخه ومنسوخه

مناسبت اور ضرورت کے مطابق احکام نازل فرمائے جب وہ وقت گزر گیا تو ارتقائی مرحلے کا اگلا حکم جاری فرمادیا۔ اس طریقے سے کئی ایک ایسے احکام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے رہے جن پر عمل کرنے کی اب ضرورت نہ تھی۔ احکام کے بدلنے اور نئے احکام نافذ کرنے کو ایک طبیب اور مریض کی مثال سے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ مریض کی بیماری کی مناسبت سے طبیب ایک دوائی تجویز کرتا ہے لیکن جب مریض بہتر ہو جاتا ہے تو اب اس کی حالت کے مناسب حال نئی دوائی تجویز کر دی جاتی ہے۔ علماء نے نسخ کی حکمتوں اور مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید میں اس سلسلے میں واضح آیات موجود ہیں:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (1)

''جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ ویسی ہی یا اس سے بہتر آیت اتارتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (2)

''جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل کر لاتے ہیں تو اللہ کو بہتر علم ہے کہ اس نے کیا نازل کرنا ہے۔ یہ کافرلوگ آپ ﷺ سے کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید آپ ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ (آیات کے بدلنے جانے کی حقیقت و مقصد کو) جانتے ہی نہیں ہیں۔''

ایک مقام پر قرآن مجید کہتا ہے:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى﴾ (3)

''ہم آپ کو پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں مگر جو اللہ چاہے۔'' گویا نسخ اللہ کا اختیار ہے۔

مستشرقین نے نسخ کی بنیاد پر قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

i. آیات کے منسوخ ہو جانے اور نئی آیات کے آجانے کو وہ اس بات کا نتیجہ سمجھتے ہیں کہ قرآن نبی کریم ﷺ کا کلام ہے کہ آپ جب چاہتے ہیں قرآن سے کچھ نکال دیتے جب چاہتے ہیں اس میں

---

(1) سورۃ البقرۃ: ۱۰۶

(2) سورۃ النحل: 101

(3) سورۃ الاعلیٰ: ۶،۷

شامل کر دیتے ہیں۔

ii. منسوخ ہو چکنے والی عبارات کے بارے میں وہ یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ یہ قرآن کا حصہ تھیں اور ان کے غائب ہو جانے سے گویا قرآن کے حصے غائب ہو گئے۔ گویا موجودہ قرآن ادھورا ہے۔

iii. چونکہ (ان کے خیال میں قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد نہیں رہتا تھا کہ آپ اس سے قبل ایک بات کہہ چکے ہوتے، پھر دوبارہ یہی بات دہرا دیتے اور اسے قرآن میں شامل کر دیتے۔ بعد میں جب آپ کو یاد دلایا جاتا تو آپ ان میں سے ایک بات کو خارج کر دیتے۔

مستشرقین میں سے بیشتر چونکہ یہودی یا عیسائی ہیں اس لئے نسخ کی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سابقہ انبیاء کی شریعتوں میں ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے مثلاً نماز کسی پیغمبر کے زمانے میں صرف تسبیح و تہلیل اور دعاء تھی تو کسی دوسرے پیغمبر کے عہد میں اس میں رکوع و سجود اور بعض دیگر ارکان کا اضافہ کر دیا گیا۔ سابقہ انبیاء کی شریعتوں میں نماز کی دو رکعتیں مشروع رہی ہیں جبکہ ہماری شریعت میں اس سلسلے میں نماز پنجگانہ لازم کی گئی۔ تورات اور انجیل دونوں سے فروعی احکام اور عملی جزئیات میں نسخ کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں بیک وقت دو بہنوں سے نکاح جائز تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اسے ممنوع قرار دے دیا گیا۔[1] حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں ہر چلتا پھرتا جانور حلال تھا[2] لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں کچھ جانور حرام قرار دے دیے گئے۔[3] حضرت موسیٰ کی شریعت میں طلاق کی عام اجازت تھی[4] لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں صرف زنا کی صورت میں ہی طلاق کی اجازت تھی۔[5] اس طرح مستشرقین کیلئے ناسخ و منسوخ کی اصطلاح یا یہ عمل کوئی اجنبی تصور نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جن مذاہب کے پیروکار ہیں ان میں یہ تصور موجود رہا ہے اور عقل بھی اس کے وجود کی نفی نہیں کرتی۔ لیکن مستشرقین نے ان تمام باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہ نسخ کی حقیقت کیا ہے، قرآن مجید کے متن کی صحت پر اندھا دھند اعتراضات کی بوچھاڑ کی ہے۔ اس حوالے سے کئے گئے مندرجہ ذیل اعتراضات کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

---

(1) بائبل، کتاب پیدائش، 39: 23 تا 30؛ احبار 18:18

(2) پیدائش، 3:9

(3) احبار، 7:11؛ استثناء 7:14

(4) استثناء 201:24

(5) انجیل متی 15:19

1. یہ روایت کہ اگر بنی آدم کے پاس مال سے بھری دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی خواہش رکھتا ہے اور اس کی اس خواہش کو قبر کی مٹی ہی پورا کرے گی۔

2. حضرت عمر رضی اللہ عنہ (23ھ)، عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کے موقع پر زانی کو سنگ سار کرنے سے متعلق آیت لے کر کمیٹی کے پاس آئے، لیکن بقول ان کے وہ آیت "قرآن کمیٹی" نے قرآن میں شامل نہیں کی۔

3. صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب " التحریم بخمس رضعات " میں حضرت عائشہؓ (57ھ) سے یہ روایت ہے:

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهُنَّ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ (1)

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (57ھ) سے روایت ہے کہ رضاعت ثابت ہونے کے بارے میں جو قرآن میں نازل کیا گیا وہ دس مقرر شدہ گھونٹ تھے جو حرام کر دیتے تھے پھر ان کو پانچ مقرر گھونٹوں سے منسوخ کر دیا گیا رسول اللہ ﷺ کو وفات دے دی گئی اور یہ اسی طرح قرآن میں پڑھا جاتا تھا۔"

4. مستشرقین نے مسلمان علماء کی کتب میں بیان شدہ وہ روایات جو انہوں نے اپنی کتابوں میں منسوخ شدہ آیات کے عنوان کے تحت بیان کی ہیں، انہیں بھی قرآن کا حصہ ظاہر کرتے ہوئے اس کے نامکمل ہونے پر دلیل تراشی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید میں ایک حکمت کے تحت ناسخ و منسوخ کا عمل عرضہ اخیرہ تک جاری رہا ہے۔

ناسخ و منسوخ کے عمل کو نہ صرف مسلمانوں نے تسلیم کیا بلکہ اس علم میں لاتعداد کتب لکھیں۔ ان کتب میں امام ابو عبید القاسم بن سلام (224ھ)، امام ابو داؤد (203ھ) سجستانی، ابو جعفر النحاس، ابن الانباری، مکی بن ابی طالب، ابو الفرج ابن الجوزی (597ھ) اور ابو بکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہم (543ھ)۔ وغیرہ کی کتب شامل ہیں۔ لہٰذا نسخ فی القرآن کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کی بنیاد پر قرآن مجید کی صحت پر اعتراض کیا جاسکے یا قرآن مجید کا کوئی عیب نکالا جائے۔ اس صورت میں مستشرقین کی طرف سے یہ شور مچانا کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی تھیں جو اب موجود نہیں ہیں، بالکل بے مقصد بات ہے۔

---

(1) مسلم: الجامع الصحیح، حدیث نمبر ۳۵۹۷، باب التحریم بخمس رضعات، کتاب الرضاع، ص ۹۲۳

مسلمانوں کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ عرضہ اخیرہ کے بعد قرآن مجید میں نسخ کا کوئی عمل نہیں ہوا۔ جو کچھ اس سلسلے میں ہونا تھا وہ عرضہ اخیرہ سے پہلے پہلے ہو چکا ہے۔ اب موجودہ متن ہی حقیقی قرآن مجید ہے جو کچھ منسوخ ہو چکا وہ قرآن مجید نہیں ہے اور اس سے قبل جو ناسخ و منسوخ کا عمل جاری تھا وہ بھی خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضا تھا اور عقل اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ ایک حکیم اور طبیب مریض کے حالات کی موافقت سے مریض کیلئے وقتاً فوقتاً دوائی تبدیل کرتا رہے۔

عہد نبوی میں حفاظت قرآن اور اس کے بعد عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کی تمام تفصیلات کتاب کے متعلقہ ابواب میں بیان کر دی گئی ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات مسلم ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ فوراً کسی کاتب وحی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے۔ اس طرح تمام نازل شدہ وحی بے کم و کاست آپ کی زندگی میں ہی متفرق چیزوں پر لکھی جا چکی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) کے زمانے میں قرآن کے تمام متفرق اجزاء اس طرح اکٹھے کر لیے گئے کہ ایک آیت تو کیا ایک حرف کی بھی فروگذاشت نہیں ہوئی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) کے عہد میں ان کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن کو جس احتیاط سے جمع کیا تھا اس کے متعلق الاتقان نوع 18 میں تفصیل موجود ہے: اس تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قرآن کو محض لکھا ہوا پانے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ کسی آیت کو شامل قرآن کرنے کے لیے دو شہادتیں بھی حاصل کی جاتی تھیں۔ "یہ تفصیل اس کتاب کے باب نمبر 4 میں بیان ہو چکی ہے۔"

ابن اشتہ نے اپنی کتاب المصاحف میں لیث بن سعد سے روایت کی ہے کہ "سب سے پہلے قرآن کو حضرت ابو بکرؓ (13ھ) نے جمع کیا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ کام سرانجام دیا۔ لوگ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس قرآن کے اجزاء لاتے تھے اور وہ دو معتبر شہادتوں کے بغیر اسے لکھتے نہ تھے۔ سورۃ براءۃ کے آخر والی آیت صرف حضرت ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس سے ملی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) نے کہا اسکو لکھ لو کیونکہ رسول ﷺ نے حضرت ابو خزیمہؓ کی شہادت دو گواہوں کے برابر بتائی ہے۔ چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اسے لکھ لیا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ (23ھ) نے آیت رجم پیش کی تو اسے نہیں لکھا کیونکہ اس بارے میں تنہا حضرت عمرؓ (23ھ) کے سوا اور کوئی شہادت نہیں ملی۔"[1] حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) کے اس کو رد کر دینے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے خاموش رہنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آیتِ رجم قرآن کی آیت نہ تھی ورنہ حضرت زیدؓ جو حافظ قرآن تھے خود اس آیت کی تلاش کرتے یا اگر وہ بھول بھی

(1) السیوطی: الاتقان، النوع الثامن عشر فی جمعه وترتیبه (۵)

گئے ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کی تائید کرنے سے تو نہ رکتے تھے۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو صحیفوں سے مصحفوں میں نقل کروانا شروع کیا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قرآن میں آیتوں کے درج کرنے کی نسبت توجہ دلائی تو آپ نے صاف انکار کر دیا۔ مثلاً بخاری میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾[1] کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے اس لیے اسے لکھیں یا اس کو چھوڑ دیں تو عثمان نے فرمایا "اے میرے بھتیجے میں قرآن کی کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں بدلوں گا۔"

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) زانی کو سنگ سار کرنے کے بارے میں ایک آیت عہد صدیقؓ میں جمع قرآن کمیٹی کے پاس لیکر آئے، لیکن کمیٹی نے یہ آیت قرآن میں شامل نہیں کی۔ اور یہ آیت اب قرآن کا حصہ نہیں ہے، اور قرآن ادھورا ہے۔ عہد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کے موقع پر اختیار کردہ معیار کو ذہن میں رکھیں تو یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ رجم کی مذکورہ آیت قرآن کی آیت نہیں ہے ورنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) کی کمیٹی اسے قرآن میں شامل کرلیتی۔ سورۃ التوبہ کی آخری آیت قرآن کا حصہ تھی تو سب کو معلوم تھا کہ ابھی یہ آیت قرآن میں شامل ہونا باقی ہے صرف دو شہادتوں کے میسر آنے کی انتظار تھی، جب یہ تقاضا پورا ہو گیا تو اسے شامل قرآن کر دیا گیا۔ اس طرح یہ مسلم ہے کہ قرآن جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے بے کم وکاست وہی قرآن ہے جس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا تھا اور اس میں وہ تمام وحی بغیر کسی کمی زیادتی کے اسی طرح موجود ہے جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ (516ھ) اپنی کتاب شرح السنۃ میں لکھتے ہیں: "صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی قرآن کو بین الدفتین جمع کر دیا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں کی۔"[2]

---

(1) سورۃ البقرۃ: ۲۴۰ و ۲۳۴؛ دیکھیے: البخاری: الجامع الصحیح، حدیث نمبر ۴۵۳۰، باب والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا، ص ۳۷۱

(2) البغوی، الحسین بن مسعود، م ۵۱۶ھ: شرح السنۃ، بیروت: المکتب الاسلامی، ط ۱۹۸۳ء، ۲، ۱۵۲۱/۴؛ السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، النوع الثامن عشر، ۲۰۳/۲

صحیح البخاری باب من قال لم یترک النبی الإمابین الدفتین میں عبدالعزیز بن رفیع سے مروی ہے وہ کہتے ہیں: "میں اور شداد بن معقل حضرت ابن عباس (68ھ) کے پاس گئے۔ شداد نے ان سے کہا کہ آیا رسول ﷺ نے کچھ مال ومتاع چھوڑا تو ابن عباس (68ھ) نے کہا کچھ نہیں چھوڑا مگر جو بین الدفتین ہے (یعنی دو فیتوں کے درمیان جو قرآن ہے وہی آپ نے چھوڑا ہے)۔"

عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں: "ہم محمد بن حنفیہ کے پاس گئے اور ان سے بھی سوال کیا تو انھوں نے بھی کہا نبی کریم ﷺ نے نہیں چھوڑا مگر وہی جو دو دفتیوں کے درمیان ہے" قاضی ابو بکر کتاب الانتصار میں لکھتے ہیں: "ہم اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ وہ تمام قرآن جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور اس کے لکھے جانے کا حکم دیا اس کو منسوخ نہیں کیا اور نہ اس کے نزول کے بعد اس کی تلاوت کو رفع کیا۔" وہ یہی قرآن ہے جو ما بین الدفتین پایا جاتا ہے۔ اور جس کو مصحفِ عثمانی حاوی ہے اس قرآن میں نہ کسی طرح کی کمی ہے اور نہ کوئی زیادتی۔ (1)

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حفاظت قرآن کے اہتمام کی موجودگی میں کسی آیت کا جبکہ وہ قرآن کا حصہ ہو قرآن میں شامل نہ ہو سکنا یا غیر قرآن کا اس میں شامل ہو جانا امکان سے بہت بعید ہے۔

عدم صحت قرآن کی بنیاد بنائی جانے والی روایات کا تحقیقی جائزہ

جن روایات کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے قرآن مجید پر اعتراضات کئے ہیں وہ مسلم شریف کی کتاب الزکوۃ میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے:

حَدَّثَنِي سُوَيْدُ بْنُ سَعِيدٍ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ عَنْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي حَرْبِ بْنِ أَبِي الْأَسْوَدِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ بَعَثَ أَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ إِلَى قُرَّاءِ أَهْلِ الْبَصْرَةِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ ثَلَاثُ مِائَةِ رَجُلٍ قَدْ قَرَءُوا الْقُرْآنَ فَقَالَ أَنْتُمْ خِيَارُ أَهْلِ الْبَصْرَةِ وَقُرَّاؤُهُمْ فَاتْلُوهُ وَلَا يَطُولَنَّ عَلَيْكُمْ الْأَمَدُ فَتَقْسُوَ قُلُوبُكُمْ كَمَا قَسَتْ قُلُوبُ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ وَإِنَّا كُنَّا نَقْرَأُ سُورَةً كُنَّا نُشَبِّهُهَا فِي الطُّولِ وَالشِّدَّةِ بِبَرَاءَةَ فَأُنْسِيتُهَا غَيْرَ أَنِّي قَدْ حَفِظْتُ مِنْهَا لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى وَادِيًا ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَكُنَّا نَقْرَأُ سُورَةً كُنَّا نُشَبِّهُهَا بِإِحْدَى الْمُسَبِّحَاتِ فَأُنْسِيتُهَا غَيْرَ أَنِّي حَفِظْتُ مِنْهَا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ

(1) البخاری: الجامع الصحیح، حدیث نمبر ۵۰۱۹، باب من قال لم یترک النبی ﷺ الا ما بین الدفتین، ص ۴۳۵

تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ فَتُكْتَبُ شَهَادَةً فِي أَعْنَاقِكُمْ فَتُسْأَلُونَ عَنْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ (1)

"سوید بن سعید، علی بن مسہر، حضرت ابوالاسود رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو اہل بصرہ کے قراء کی طرف بھیجا گیا آپ ان کے پاس پہنچے تو تین سو فارسیوں نے قرآن پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ تم اہل بصرہ کے سب لوگوں سے افضل ہو اور ان کے قاری ہو تم ان کو قرآن پڑھاؤ اور بہت مدت تک تم تلاوت قرآن پڑھاؤ اور بہت مدت تک تم تلاوت قرآن سے غافل نہ ہوا کرو ورنہ تمہارے دل اسی طرح سخت ہو جائیں گے جس طرح تم سے پہلے لوگوں کے ہو گئے تھے اور ہم ایک سورت پڑھتے تھے جو لمبائی میں اور سخت وعیدات میں سورۃ براءت کے برابر تھی پھر میں سوائے اس آیت کے سب بھول گیا: (لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ) کہ اگر ابن آدم کے لئے مال کے دو میدان ہوں تو بھی وہ تیسرا میدان طلب کرے گا اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے کوئی نہیں بھر سکتا اور ہم ایک سورۃ اور پڑھتے تھے جس کو ہم مسبحات میں سے ایک سورت کے برابر جانتے تھے میں اس کو بھول گیا سوائے اس کے کہ اس میں سے میں نے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ کو یاد رکھا ہے یعنی اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں تو تمہاری گردنوں میں شہادت کے طور پر لکھ دی جاتی ہے قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔"

اس خطبے کے الفاظ صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ اس میں ایسی عبارات کا ذکر ہے جو لوگوں کے ذہنوں سے اس لئے محو کر دی گئیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں منسوخ فرما دیا تھا، کیونکہ صرف وہی آیات بھلائی جاتی ہیں جو منسوخ ہو جائیں۔ (2) اس روایت کے بارے میں خود مسلم شریف میں جو اندرونی اور بیرونی شہادت ملتی ہے وہ بھی اسے مردود ٹھہراتی ہے۔ بیرونی شہادت کیلئے سب سے پہلے اس کے سلسلہ روایت کو دیکھنا ہو گا۔

روایت میں سب سے پہلے سوید بن سعید ہیں۔ اس راوی کے بارے میں علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں: (3)

---

(1) مسلم، الجامع الصحیح، حدیث: ۲۴۱۹ (کتاب الزکوۃ)

(2) سورۃ الاعلیٰ: ۷،۶

(3) مسلم، الجامع الصحیح، حدیث: ۲۴۱۹ (کتاب الزکوۃ)

"بعض لوگوں نے جن میں مسلم بھی شامل ہیں اس کی روایات کو لیا ہے۔ لیکن اکثر لوگوں نے اس کی روایت کو مردود ٹھہرایا ہے۔ اور اس بات پر لوگوں کا اتفاق ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور آخر کار اندھا ہو گیا اس وقت وہ بعض ایسی روایات بیان کرنے لگا جو اس کی احادیث میں شامل نہ تھیں۔ اسی راوی کے بارے میں امام ترمذی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول روایت فرماتے ہیں کہ "إنه ضعيف جدا" یعنی وہ بہت ضعیف راوی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں: حديثه منكر۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اسے ضعیف قرار دیتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے اس کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا میلان شیعہ مذہب کی طرف تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ اس کے پاس ایک شخص کتاب الفضائل لایا تو اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب سے اول اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کو سب سے آخر میں کر دیا۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ متہم بالزندقہ ہے۔ امام ترمذی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں: "إنه ضعيف جدا"۔ مرّہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ بعض لوگوں نے اسے "متروک الحدیث" قرار دیا ہے جبکہ بہت سے لوگوں نے اسے کذاب کہا ہے۔" [1]

جب امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) کے اس ایک راوی کے بارے میں یہ واضح ہو گیا کہ وہ متروک الحدیث، متہم بالزندقہ اور متہم بالکذب ہے تو پھر نہ تو اس راوی کی بیان کردہ روایت کا کوئی اعتبار ہو گا اور نہ ہی سند کے باقی راویوں کے پرکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ وہ الفاظ جو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اس روایت کے جھوٹا ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کہتے ہیں: "كنا نقرأ سورة" [2] یعنی ہم ایک سورت پڑھا کرتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یا سورۃ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد ہو گی۔ یہ بات تو تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ کوئی آیت یا سورۃ قرآن کا حصہ ہو اور وہ صرف ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) ہی کو یاد ہو۔ یہ سورۃ یقیناً صحابہؓ میں معروف ہو گی۔ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کو ساری سورت بھول گئی اور صرف ایک آیت یاد رہی تو یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کی طرح تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کو وہ سورۃ بھول گئی۔ کسی دوسرے صحابیؓ نے نہ اس سورت کا نام لیا ہے اور نہ ہی اس کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ لامحالہ ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ اس کا تعلق نسخ سے ہے قرآن نے اسی کی نشان دہی سورۃ الاعلیٰ کی آیت نمبر ۶ میں کی ہے کہ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰٓ ۝ إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾

(1) الذہبی، شمس الدین، میزان الاعتدال فی نقد الرجال (ترجمہ نمبر: ۲۱۳۶)، ۲/۲۴۸
(2) السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن: ۲/۵۲

یعنی ہم آپ کو پڑھائیں گے کہ آپ کو یہ بھولے گا نہیں مگر جسے اللہ بھلانا چاہے۔

☆ جب عہد صدیق رضی اللہ عنہ میں زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کی زیر نگرانی تدوین قرآن کا کام ہوا تو اس وقت اعلان عام کیا گیا کہ جس جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو، وہ مسجد نبویؐ میں اسے "تدوین کمیٹی" کے سامنے پیش کرے۔[1] اس وقت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) نے اور نہ ہی کسی اور صحابیؓ نے اس سورت کا ذکر کیا۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی ہوا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے عہد سے لے کر جب قرآن مجید جمع کیا گیا کسی قاری نے، اس کے باوجود کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بہت سے لوگ حفاظ قرآن تھے، کبھی بھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ جو قرآن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے جمع کروایا ہے اس میں اتنی لمبی سورت کا نام ونشان تک نہیں پایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) سے بھی اسی طرح کی روایت ہے کہ انہوں نے ایک آیت تدوین کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی۔ اگر ابو موسیٰ بھی اس عبارت کو قرآن کا حصہ سمجھتے ہوتے تو وہ بھی اس موقع پر پیش کر دیتے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ سورت، عہد صدیقیؓ میں تدوین قرآن کی کارروائی سے قبل ہی صحابہؓ کے حافظوں سے محو ہو چکی تھی اور جن جن جگہوں پر یہ سورۃ لکھی ہوئی تھی وہ تحریرات بھی تلف ہو چکی تھیں تو کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا کہ یہ چند الفاظ جو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کو یاد رہ چکے تھے یعنی لوکان لابن ادم...... الخ تو کم از کم قرآن میں شامل کروادیتے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ)، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد دلاتے کہ ہم فلاں سورت پڑھا کرتے تھے۔ اس کے الفاظ یہ تھے اور ہم سب کو باقی سورت بھول چکی ہے اور ایک ٹکڑا مجھے یاد رہ گیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی امامت بھی کرواتے رہے ہیں۔

☆ یہ بات بذات خود بڑی دلچسپ ہے کہ ابن مسعودؓ (32ھ) اور ابی ابن کعبؓ (22ھ) کے بارے میں جو کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس بھی الگ نسخے موجود تھے، ان میں سے بھی کسی ایک میں اس سورت کا نام ونشان نہیں ملتا۔

☆ پھر جب ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) نے یہ آیت پیش کی تو اس وقت بھی ہزاروں صحابہؓ میں سے کسی نے اس کی تائید نہیں کی۔

یہ روایت دراصل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) کا ایک خطبہ ہے جو انہوں قراء بصرہ کے سامنے ارشاد فرمایا تھا اس خطبے کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ (ابو موسیٰ) اور دیگر صحابہؓ دو سورتیں پڑھا کرتے تھے جس میں سے ایک فقرہ ہی انہیں یاد رہ گیا ہے۔ پہلی سورت کے فقرے کا مضمون یہ تھا کہ اگر ابن آدم کیلئے مال کی

---

(1) ایضاً: 1، 61

دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کی خواہش کرتا ہے۔

ایک اور قسم کی خارجی شہادت جو خود مسلم سے ملتی ہے جس سے زیر بحث حدیث کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس حدیث سے پہلے خود امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) نے اس مضمون کی چارا اور احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں فرق صرف اس قدر ہے کہ سوید کی روایت سے جو الفاظ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ قرآن مجید کی سورتوں کے ٹکڑے ہیں۔ لیکن ان چاروں احادیث میں اس بات کا نشان تک نہیں ملتا۔ چنانچہ مسلم شریف کتاب الزکوۃ باب لوان لابن آدم وادیین لابتغی ثالثا میں سب سے پہلے یہ حدیث بیان کی گئی ہے:

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ يَحْيَى وَسَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ وَقُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ يَحْيَى أَخْبَرَنَا وَقَالَ الْآخَرَانِ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى وَادِيًا ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللهُ عَلَى مَنْ تبه

"حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر بنی آدم کے پاس مال و دولت کی دو وادیاں ہوں تو وہ ایک تیسری وادی کی خواہش کرتا ہے اور اس کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے علاوہ کوئی چیز نہیں بھرتی۔ اور توبہ اس کی ہے جو توبہ کرے۔"

یہاں صاف نظر آرہا ہے کہ یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں نہ کہ قرآن مجید کے گویا امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) کی دونوں روایات میں تصادم ہے "یعنی سوید" کی روایت میں ان الفاظ کو قرآن کی بھولی ہوئی آیت کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف یحیی بن سعید بن منصور اور قتیبہ بن سعید کی متفقہ روایت ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں۔

گزشتہ سطور میں ہم نے علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سوید کے بارے میں، نقل کئے ہیں۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ان تینوں راویوں میں سے سعید بن منصور [1]، یحیی بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہم [2] دونوں کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہے اور قتیبہ بن سعیدؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ بہر حال اس روایت کی حالت پہلی روایت سے بہت وزنی ہے۔ کیونکہ وہاں تو صرف ایک آدمی کی روایت ہے اور وہ بھی ایسا کہ جسے اکثر محدثین نے ناقابل اعتبار، ضعیف متروک الحدیث قرار دیا ہے بعض نے اسے زندیق

---

(1) الذہبی، میزان الاعتدال ۱۵۹/۲ (ترجمہ نمبر: ۳۲۷۷)

(2) ایضاً ۴۱۳/۴ (ترجمہ نمبر: ۹۶۴۹)

اور کذاب کہا ہے اور یہاں پر کم از کم دو راوی تو ایسے ہیں جنہیں اکثر نے ثقہ قرار دیا ہے۔ جب موٴخر الذکر روایت کی شہادت ثقہ ہے تو پہلی روایت مردود ٹھہرے گی۔

اس کے علاوہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) نے تین مزید احادیث اسی مضمون کی بیان کی ہیں اور ان سب میں ان الفاظ ''لوکان لابن آدم الخ'' [1] کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ قرار دیا ہے۔ کسی ایک میں بھی نہیں کہا گیا کہ یہ قرآن کے الفاظ تھے۔ ان تین میں سے ایک حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہ (68ھ) کی طرف، جو اس کے پہلے راوی ہیں۔ یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں:

(فلا أدری أمن القرآن هو أم لا) [2]

یعنی میں نہیں جانتا کہ یہ جزو قرآن ہیں یا نہیں۔

وَحَدَّثَنِي زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ وَهَارُونُ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَا حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ سَمِعْتُ عَطَاءً يَقُولُ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَقُولُ لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ مِلْءَ وَادٍ مَالًا لَأَحَبَّ أَنْ يَكُونَ إِلَيْهِ مِثْلُهُ وَلَا يَمْلَأُ نَفْسَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَاللهُ يَتُوبُ عَلَى مَنْ تَابَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَلَا أَدْرِي أَمِنَ الْقُرْآنِ هُوَ أَمْ لَا وَفِي رِوَايَةِ زُهَيْرٍ قَالَ فَلَا أَدْرِي أَمِنَ الْقُرْآنِ لَمْ يَذْكُرِ ابْنَ عَبَّاسٍ [3]

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ابن آدم کے پاس مال سے بھری ہوئی ایک وادی ہو تو وہ چاہے گا کہ اس جیسی ایک اور وادی ہو اور ابن آدم کے نفس کو مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی اور جو توبہ کر لے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ (68ھ) کہتے ہیں کہ یہ بات قرآن سے ہے یا نہیں۔ اور زُہیر سے مروی ہے کہ ابن عباس (68ھ) نے یہ الفاظ نہیں کہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ الفاظ قرآن کے ہیں یا نہیں؟''

مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری روایت میں انہی الفاظ ''فلا أدري أمن القران'' کے تعلق میں ابن عباس رضی اللہ عنہ (68ھ) کا ذکر نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بعد کے راوی کے الفاظ ہیں۔ اس تمام تفصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) نے یہ روایت بیان

---

(1) مسلم، الجامع الصحیح، حدیث: ۲۴۱۵ (کتاب الزکوۃ) ص: ۸۴۲

(2) ایضا

(3) ایضا، حدیث: ۲۴۱۸ (کتاب الزکوۃ)

کر کے اس کے خلاف چار اور احادیث بیان کر دی ہیں اور ایک حد تک اس روایت کو نا قابل اعتبار قرار دے دیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کتاب میں ہم پانچ احادیث ایسی پاتے ہیں جن میں چار کی شہادت پانچویں کے مخالف ہے اور پھر ان چاروں احادیث کو پانچویں حدیث کی نسبت راویوں کے اعتبار سے زیادہ قابل اعتبار پاتے ہیں تو ان چار احادیث کی شہادت کے مقابلے مین پانچویں حدیث کو رد کرنا پڑے گا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) نے ان چار احادیث کو پہلے اور اس پانچویں حدیث کو جو ان کے مخالف ہے، سب سے آخر میں بیان کر کے یہ جتا دیا ہے کہ ان کے مقابل بہت کم وزن رکھتی ہے۔ یہ بات محض قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

فَأَمَّا الْقِسْمُ الْأَوَّلُ فَإِنَّا نَتَوَخَّى أَنْ نُقَدِّمَ الْأَخْبَارَ الَّتِي هِيَ أَسْلَمُ مِنَ الْعُيُوبِ مِنْ غَيْرِهَا وَأَنْقَى مِنْ أَنْ يَكُونَ نَاقِلُوهَا أَهْلَ اسْتِقَامَةٍ فِي الْحَدِيثِ وَإِتْقَانٍ لِمَا نَقَلُوا لَمْ يُوجَدْ فِي رِوَايَتِهِمْ اخْتِلَافٌ شَدِيدٌ وَلَا تَخْلِيطٌ فَاحِشٌ كَمَا قَدْ عُثِرَ فِيهِ عَلَى كَثِيرٍ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ وَبَانَ ذٰلِكَ فِي حَدِيثِهِمْ فَإِذَا نَحْنُ تَقَصَّيْنَا أَخْبَارَ هٰذَا الصِّنْفِ مِنَ النَّاسِ أَتْبَعْنَاهَا أَخْبَارًا يَقَعُ فِي أَسَانِيدِهَا بَعْضُ مَنْ لَيْسَ بِالْمَوْصُوفِ بِالْحِفْظِ وَالْإِتْقَانِ كَالصِّنْفِ الْمُقَدَّمِ قَبْلَهُمْ عَلَى أَنَّهُمْ وَإِنْ كَانُوا فِيمَا وَصَفْنَا دُونَهُمْ فَإِنَّ اسْمَ السَّتْرِ وَالصِّدْقِ وَتَعَاطِي الْعِلْمِ يَشْمَلُهُمْ (1)

یعنی جن احادیث کو انہوں نے زیادہ قابل اعتبار سمجھا ہے ان کا ذکر بھی پہلے ہی کیا ہے اور جن احادیث کو کمزور سمجھا ہے ان کا ذکر بعد میں کیا ہے۔

اس عبارت کا مکمل ترجمہ یوں ہے:

"ہم نے اس اصول کی پیروی کہ ہے کہ ان احادیث کو پہلے رکھیں جو دوسری احادیث کی نسبت عیبوں سے زیادہ محفوظ ہیں اور ان کو نقل کرنے والے حدیث میں اہل استقامت اور اہل اتقان ہیں ان باتوں میں جنہیں انہوں نے نقل کیا اور ان کی روایت میں شدید اختلاف یا بڑا خلط نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ اکثر محدثین کو ان کے بارے میں اطلاع ہوئی ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ جب ہم اس قسم کی احادیث کو بیان کر چکتے ہیں تو اس قسم کی احادیث کو لاتے ہیں جن کی اسناد میں اس قسم کے راوی بھی ہیں جو حفظ اور اتقان میں

---

(1) مسلم، الجامع الصحیح، مقدمۃ الکتاب، ص ۶۷۳ (کتب الستۃ)

پہلے لوگوں جیسے نہیں۔"

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) کی اس وضاحت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے بعد والی روایت کو وہ مقام اور وقعت نہیں دی جو پہلی احادیث کو دی ہے۔

ہم نے یہ تینوں روایات اس لئے بیان کر دی ہیں کہ حقیقت حال مکمل طور پر واضح ہو سکے۔ ہم دیکھتے ہیں:

1. ان تینوں روایات میں عبارات مختلف ہیں۔ جب قرآن کے متن (بقول معترضین) میں اس قدر مختلف روایات بیان کی جاتی ہوں تو ان میں کس روایت کے متن کو اختیار کیا جائے گا۔

مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات میں سے ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت ہے کہ "ہم ایک سورۃ پڑھا کرتے تھے جو سورۃ توبہ کے برابر تھی اب اس کی فقط یہ ایک آیت یاد رہ گئی ہے:

" لوکان لابن آدم وادیان من ذھب لابتغی إلیھما ثالثاً ولو أن له ثالثاً لا بتغی إلیه رابعا ولا یملا جوف ابن آدم لا اکتراب فیتوب اللہ علی من تاب۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں جو جملہ بطور آیت کے بیان ہوا ہے وہ بخاری میں مختلف طریقوں سے مروی ہے مگر کسی ایک طریقے کی روایت میں بھی یہ نہیں پایا جاتا کہ مذکورہ جملہ آیتِ قرآنی ہے، بلکہ بخاری کے ان مختلف طریقوں کی روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ جملہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ان مختلف طریقوں کی روایات میں ایک طریقے کے آخری راوی خود حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ان کی مذکورہ روایت کے بالکل خلاف ہے۔ ذیل میں وہ روایات درج ہیں:

2. ابنِ شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو انس بن مالک نے خبر دی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قَالَ أَخْبَرَنِي أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللهُ عَلَى مَنْ تَابَ [1]

3. عطا کی ایک روایت میں ہے وہ کہتے ہیں میں نے عباس رضی اللہ عنہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: "لوان لابن آدم مثل وادٍ مالا ...... الخ" [2]

4. عطا کی ایک روایت میں ہے وہ کہتے ہیں میں نے عباسؓ سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

(1) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب مایتقی من فتنة المال، حدیث نمبر: ۶۴۳۹، ص ۵۴۱

(2) ایضاً

سنا آپ ﷺ فرماتے تھے: ''لو کان لابن آدم وادیان......الخ'' (1)

5. سہیل بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے مکہ میں ابن زبیر کو منبر پر اپنے خطبے میں یہ کہتے سنا کہ لوگو! نبی ﷺ فرماتے تھے: لوأن ابن آدم اعطي واديا الخ(2)

صحیح بخاری سے بطریقہ ابن شہاب حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جو روایت اوپر نقل کی گئی ہے اس روایت کے ساتھ بخاری میں یہ بھی مروی ہے:

> ''اور ہم سے ابو ولید نے کہا کہ ہم سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی، انھوں نے ثابت سے، ثابت نے انس سے انس نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہم (22ھ) سے روایت کی ہے کہ ابی بن کعب (22ھ) کہتے تھے کہ ہم اس کو (یعنی لوأن لابن آدم وادیا...... الخ کو) قرآن کی آیت سمجھتے تھے یہاں تک کہ سورۃ أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔''
> (3)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (22ھ) کے اس صاف صاف بیان کے بعد اس قسم کی روایات کے متعلق بعض صحابہؓ کی غلط فہمی کے بارے میں کچھ بھی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

ان تمام روایات کا اصل اور حقیقی جواب یہ ہے کہ سیوطیؒ (911ھ) نے ان روایات کا ذکر جس جگہ کیا ہے اس کا عنوان ہے ''وہ آیات جن کی تلاوت منسوخ ہوگئی لیکن حکم منسوخ نہیں ہوا۔''

لو کان لابن آدم وادیا من مال والی روایت کا جائزہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مندرجہ ذیل نکات پیش کئے ہیں:

☆ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ یہ تھا کہ شاگردوں کے سامنے درس کے دوران قرآنی آیات کا مضمون اور مطلب اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے اس قسم کی روایات میں اس قسم کے الفاظ کو قرآن کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ مطلب عربی زبان میں ہی ہوا کرتے تھے۔ (4)

☆ مذکورہ بالا الفاظ بعینہٖ قرآن میں موجود نہیں ہیں۔

ہم روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں علماء و واعظین کسی قرآنی آیت کے مفہوم کو بیان کرنے کے بعد

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) گیلانی، مناظر احسن، تدوین قرآن، ص: ۱۰۴، ۱۰۳

فرماتے ہیں کہ "ایسا قرآن میں آیا ہے۔" حالانکہ جن الفاظ میں وہ قرآنی آیت کا مفہوم بیان کر رہے ہوتے ہیں وہ قرآن کے الفاظ نہیں ہوتے۔ اس مثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات حماقت ہوگی کہ کوئی سننے والا شخص قرآنی آیت کے مفہوم کو قرآنی آیت سمجھ لے، اور اسے قرآن میں تلاش کرنے لگے۔ کسی صحابی نے کسی موقع پر کوئی آیت پڑھی، درمیان میں اس کی تشریح کے طور پر چند الفاظ کہے اور شاگرد نے جو یہ جانتا تھا کہ قرآن اور تشریح کے الفاظ کون کون سے ہیں، اگر اس نے اپنے ذاتی نسخے میں دونوں کو لکھ لیا تو اس کا تعلق تو محض نوٹس لینے کا ہے، نہ کہ اس سے تحریف قرآن ثابت ہوتی ہے۔ (1)

اس کی مثال حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ (22ھ) کا یہ واقعہ ہے کہ آپ سورۃ البینۃ سنا رہے تھے جب وہ ﴿وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ تک پہنچے تو (مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ) کا مطلب سمجھانے لگے کہ اللہ کی مرضی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا بھی "الدین" اور مذہب کی خالص روح اور منشا ہے۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر الفاظ ارشاد فرمائے:

إن الدين عند الله الحنيفية المسلمة لا اليهودية ولا النصرانية ولا المجوسية (2)

"دین خدا تعالی کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں حنیفیت کی طرف یکسوئی کی گئی ہو اور مسلم ہو یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دیا گیا ہو نہ یہودیت نہ عیسائیت نہ مجوسیت۔"

مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں: "ثم ختم بما بقي من السورة" (3)

اس طرح مختلف قسم کے اضافوں سے مغالطے پیدا ہوتے چلے گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"پھر جس قسم کے الفاظ کا اضافہ بیان کیا جاتا ہے ان کی حیثیت بھی زربفت میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کے مترادف ہے۔" (4)

مولانا شبیر احمد عثمانی، قرطبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "یہ منسوخ آیات میں سے ہے اور اس کا

---

(1) گیلانی، تدوین قرآن، مکتبۃ البخاری، کراچی، ۲۰۰۵، ص: ۱۰۳-۱۰۹

(2) ابن الاثیر، مجد الدین ابو السعادات، جامع الاصول فی احادیث الرسول، (تحقیق: عبد القادر الارناؤوط) ۱۹۶۹ء، حدیث نمبر ۹۷۲، ۲/۵۰۰؛ گیلانی، حوالہ مذکور، ص: ۱۰۵

(3) احمد بن حنبل: المسند، حدیث نمبر ۲۰۳، ۵/۲۲۰؛ ۱۳۲؛ گیلانی حوالہ مذکور، ص ۱۰۶، ۱۰۵

(4) گیلانی، تدوین قرآن، صفحہ 103

اسلوب بھی قرآن مجید کے اسلوب سے مختلف ہے۔"[1]

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے الاتقان میں اس طرح کی مزید روایات بھی بیان کر دی ہیں یعنی جو یا تو تفسیری نوٹس تھے یا وہ پہلے قرآن مجید میں موجود تھیں، پھر منسوخ ہو گئیں۔

1. إنا أنزلنا المال لإقام الصلاة وإيتاء الزكاة ولو أن لابن آدم واديا لأحب أن يكون إليه الثاني ولو كان له الثاني لأحب أن يكون إليهما الثالث ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب ويتوب الله على من تاب[2]

2. امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ (22ھ) سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بے بیشک مجھے اللہ نے تمھیں قرآن پڑھ کر سنانے کا حکم فرمایا ہے پھر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلاوت فرمائی:

﴿ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ ﴾ ومن بقيتها: «لو أن ابن آدم سأل واديا من مال فأعطيه سأل ثانيا وإن سأل ثانيا فأعطيه سأل ثالثا ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب ويتوب الله على من تاب، وإن ذات الدين عند الله الحنيفية غير اليهودية ولا النصرانية ومن يعمل خيرا فلن يكفره»[3]

3. امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (911ھ) نے اس سلسلے میں ایک تیسری روایت بھی بیان کی ہے ابو عبید (224ھ) نے کہا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) سے روایت ہے انہوں نے فرمایا ایک سورۃ، سورۃ براۃ کے مثل نازل ہوئی تھی مگر وہ اٹھالی گئی اور اس میں اتنا حصہ محفوظ رکھا گیا:

أن الله سيؤيد هذا الدين بأقوام لا خلاق لهم ولو أن لابن آدم واديين من مال لتمنى واديا ثالثا ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب ويتوب الله على من تاب[4]

آیت رجم اور مستشرقین:

آیت رجم منسوخ التلاوۃ آیات میں سے ہے اس کی بنیاد پر قرآن مجید کے متن پر ایک اعتراض یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) آیت رجم لے کر تدوین کمیٹی کے پاس آئے۔ لیکن انہیں یہ اجازت نہیں دی

---

(1) عثمانی، شبیر احمد، اعجاز القرآن، ادارہ اسلامیات، ۲/۷۰،۶۹

(2) سیوطی، الاتقان، النوع السابع والاربعون فی ناسخہ ومنسوخہ، 33/2

(3) ایضاً

(4) ایضاً

گئی کہ وہ اسے قرآن میں شامل کر سکیں۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ قرآن کا متن عہد نبوی ﷺ میں متعین نہیں تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں :

ان عمراتی بآیۃ الرجم فلم یکتبھا لأنہ کان وحدہ

اور جن الفاظ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن مجید میں شامل تھے اور اب نہیں ہیں وہ الفاظ یہ ہیں:

الشیخ والشیخۃ إذا زنیا فارجموھما البتۃ[1]

ا۔ اگر اس روایت کے الفاظ کے صحیح معانی وہی ہوں جو معترضین نے عام طور پر بیان کیے ہیں، تو یہ الفاظ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ثابت نہیں ہو سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں زنا کی سزا کے متعلق یہ حکم نازل ہوا تھا:

﴿وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ﴾

اور تمہاری عورتیں اگر فحش کام کریں تو اپنے میں سے چار گواہ ان پر لاؤ۔ پس اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو ان کے گھروں میں بند کر دو یہاں تک کہ اللہ اس سلسلے میں کوئی نیا راستہ بتلا دیں۔ یہ نیا راستہ سورۃ النور کی آیت نمبر ۲ میں بتلا دیا گیا کہ (شادی شدہ زانیوں کو سنگسار کر دو اور) غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارو۔

زنا کے اس حکم کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس سزا کی تفصیل بیان فرمائی تھی وہ مسلم، ابو داؤد اور ترمذی میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ نے ان کے لئے رستہ نکالا کہ غیر شادی شدہ مرد غیر شادی عورت کے ساتھ (زنا کرے تو دونوں کو) سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت کے ساتھ (زنا کرے تو دونوں کو) سو کوڑے اور سنگساری کی سزا دی جائے۔" اس حدیث کے متعلق کوڑوں کی سزا والی آیت کے بارے میں علامہ خطابی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے کوڑوں کی سزا والی آیت کی وضاحت ہو گئی۔ غالباً رسول اللہ ﷺ کے اسی بیان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رجم کے متعلق قرآنی آیت ہونے کا اشتباہ ہو گیا ہو گا۔ غرض کہ رجم کا حکم کتاب اللہ سے کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا البتہ سنتِ رسول اللہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بخاری (باب رجم المحصن) میں شعبی سے روایت ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ایک عورت کو رجم کیا تو اس کو کوڑے مارے اور اس کو رجم کیا اور فرمایا کہ اس کو کوڑے تو کتاب الٰہی کے مطابق مارے اور

---

(1) ایضاً

سنت رسول ﷺ کے مطابق رجم کیا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کو عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کی ساری کاروائی میں بنیادی عمل دخل حاصل تھا۔ انہوں نے ہی اس کاروائی کیلئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو رضامند کیا تھا۔ جب حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کے کام کا آغاز کیا تھا تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے بھی یہ معیار جامعین کو بتایا تھا:

اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاھدین علی شیئ من کتاب اللہ فاکتباہ[1]

"تم مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص قرآن کا کوئی حصہ لے کر آئے اس سے دو گواہیاں لے کر لکھ لو۔"

اس نسخے کی تیاری کے بعد اسے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کے پاس اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کے ہی پاس رکھا گیا تھا اور ان کی وفات تک ان کے پاس ہی رہا۔

جس آیت کے بارے میں مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) اسے عہد صدیقی میں جمع قرآن کمیٹی کے سامنے لائے اور شامل قرآن (بقول مستشرقین) کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ اگر یہ واقعی قرآن کی آیات ہوتیں تو یہ بھی نزول کے ساتھ ہی لکھوائی گئی ہوتیں اور ان متفرق چیزوں پر لکھی ہوئی وحی میں ضرور پائی جاتیں اور متعدد صحابہ یا کم از کم مشہور کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جنھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ (13ھ) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زمانے میں ان کے حکم سے قرآن کو جمع کیا تھا ان کے قرآنی آیات ہونے کا علم ہوتا مگر حالت یہ ہے کہ ایک آیت کے بارے میں ہے کہ اس کی نشاندہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے کی کسی اور ایک آیت کو کسی دوسرے صحابی سے منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ اسے حصہ قرآن سمجھتے تھے اس صحابی کے سوا کوئی دوسرا اصحابیؓ اس سے واقف نہیں۔

جس دوران یہ نسخہ آپؓ کے پاس تھا، آپ اسی دوران خلیفہ بھی تھے۔ آپؓ ایک مضبوط خلیفہ تھے۔ تمام امور مملکت میں انہیں مکمل اختیارات حاصل تھے۔ خصوصاً دینی امور میں وہ ذرا سی نرمی کے بھی روادار نہ تھے۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیت رجم حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کے خیال کے مطابق شامل قرآن تھی تو پھر اس دس برس کے دور حکومت میں انہوں نے اسے قرآن میں شامل کیوں نہیں کیا۔ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا نقطہ نگاہ بھی اگر یہی تھا کہ یہ آیت قرآن ہے تو پھر انہیں بھی کوئی امر مانع نہ تھا کہ وہ اسے قرآن میں داخل کرتے۔

---

(1) ایضاً

جب زید بن ثابت رضی اللہ عنہم قرآن جمع کر رہے تھے اس وقت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو کھلی اجازت تھی کہ جس جس کے پاس قرآن کا جو جو حصہ بھی ہو، وہ اسے جامعین کے سامنے پیش کر دے۔ شرط صرف یہ تھی کہ اس کے ساتھ دو گواہیاں بھی پیش کی جائیں۔

کیا حضرت عمر کے علاوہ کسی بھی صحابی کا ایسا کوئی بیان کہیں ملتا ہے کہ وہ آیت رجم، کمیٹی کے پاس لے کر گئے ہوں اور کمیٹی نے اس آیت کو قرآن میں شامل نہیں کیا؟

تاریخ کے عظیم ذخیرے سے ہمیں مستشرقین کی مذکورہ روایت کے علاوہ اور کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ کسی کو یہ اعتراض ہو کہ آیت رجم کو قرآن میں شامل نہیں کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ انہوں نے شہادتیں پیش کر دی تھیں کہ یہ حصہ، قرآن میں شامل ہے۔ اس صورت میں مذکورہ بیان، حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کا ذاتی خیال ہو سکتا ہے۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس ذاتی خیال کی بھی کیا حیثیت تھی، تو کسی ابہام کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی بھی شخص کا اس میں کوئی مفاد نہ تھا کہ اس آیت کو قرآن میں شامل نہ کیا جائے، تو یہ بات بالکل بے بنیاد نظر آتی ہے کہ اس آیت کو قرآن کا حصہ سمجھتے ہوئے بھی لوگوں نے اسے قرآن میں شامل نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کا بھی اس میں کوئی مفاد نہ تھا وہ اسے قرآن میں شامل کرواتے اگر یہ قرآن کا حصہ ہوتی تو وہ اپنے دور حکومت میں یہ اعلان فرما دیتے کہ "جمع قرآن کمیٹی" سے یہ آیت قرآن میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی لہٰذا اب میں حکم دیتا ہوں کہ اسے قرآن کا حصہ گردانا جائے۔ نہ ہی اس کمیٹی کا کوئی مفاد اس میں مضمر تھا کہ وہ اس حصے کو قرآن میں شامل نہ کرتی۔

حضرت سعید بن المسیبؒ (م ۹۴ھ) سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ (م ۲۳ھ) نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لولا ان یقول الناس: زاد عمر بن الخطاب ﷺ فی کتاب اللہ تعالیٰ لکتبتھا بیدی: ﴿الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ﴾ فانا قد قرانا ھا"[1]

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر لوگوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا تو میں اپنے ہاتھ سے لکھ دیتا: "بوڑھا اور بوڑھی (اگر زنا کریں) تو انہیں ضرور رجم کرو"، کیونکہ ہم نے اس آیت کو خود پڑھا ہے۔"

---

(1) المؤطا، رقم 846، ابن ماجہ رقم 2553۔

اس روایت میں جو الفاظ نقل ہوئے ہیں، ان کا تعلق حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کے ایک مشہور خطبے سے ہے جسے امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اور امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) نے بھی نقل کیا ہے، لیکن شیخین (بخاریؒ و مسلمؒ) میں سے کسی نے بھی ان الفاظ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی بخاری و مسلم کی روایت میں حضرت عمرؓ کی طرف سے قرآن کریم میں کسی اضافے کے ارادے کا ذکر ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کے اس خطبے کے جو الفاظ منقول ہیں، وہ درج ذیل ہیں :

"لقد خشیت ان یطول بالناس زمان حتی یقول قائل : لانجد الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترک فریضة انزلها اللہ، الا ، و ان الرجم حق علی من زنی وقد احصن ، اذا قامت البینة او کان الحمل او الاعتراف ، الا ، وقد رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و رجمنا بعدہ "(1)

"مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر طویل زمانہ گزر جائے تو وہ یہ کہنے لگیں کہ ہم رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے اور اس طرح اللہ کے نازل کیے ہوئے ایک فریضے کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ خوب سن لو کہ رجم اس شخص پر ضروری ہے جو محصن ہونے کے بعد زنا کرے، جبکہ اس کے زنا پر گواہی قائم ہو گئی ہو، یا حمل ظاہر ہو جائے یا مجرم اعتراف کر لے۔ خوب سن لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا اور آپ ؐ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے۔"

قابل غور بات یہ ہے کہ بخاری و مسلم کی روایت میں رجم کے ایک حکم الٰہی ہونے کی بات کی گئی ہے، نہ کہ اس کو الشیخ و الشیخة فارجموهما البتة کے الفاظ میں قرآن کو کوئی باقاعدہ آیت بتایا گیا ہے۔ یہ روایت شیخین نے نہیں لی، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شاید امام بخاریؒ نے اس حصے کو عمداً حذف کر دیا ہے، کیونکہ امام نسائیؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ میرے علم میں اس حدیث کے اندر الشیخ والشیخة کے الفاظ ذکر کرنے والا سفیان کے سوا کوئی نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کو نقل کرنے میں ان سے وہم ہوا ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو بڑے بڑے ائمہ نے امام مالکؒ، یونسؒ، معمرؒ، صالح بن کیسانؒ وغیرہم جیسے حفاظ کی سند سے نقل کیا ہے جو اسے امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے مذکورہ اضافہ روایت نہیں کیا۔ ہاں اس حدیث میں یہ اضافہ مؤطا میں یحییٰ بن سعید از سعید بن مسیب کی سند سے مروی ہے۔(2)

---

(1) بخاری، رقم 6829، مسلم، رقم 4418۔

(2) فتح الباری، جلد بارہ، صفحہ 143

ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کے اس تجزیہ کا حاصل یہ ہے کہ امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اور امام نسائیؒ (م ۳۰۳ھ) جیسے محدثین نے خطبے کے اس حصے کو جس میں قرآن میں رجم کی آیت کے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں، مستند نہیں سمجھا اور امام بخاریؒ نے باوجود اس کے کہ "باب رجم الحبلی" میں یہ طویل خطبہ روایت کیا ہے، اس کا وہ حصہ جو الشیخ والشیخة فارجموھما البتة کے الفاظ پر مشتمل ہے، نقل نہیں فرمایا۔

گو یا جب خطبے کا یہ حصہ ہی مستند نہیں تو پھر زیر بحث اعتراض کی بنیاد ہی سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم اگر حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کی طرف ان الفاظ کی نسبت ثابت ہو جائے، جیسا کہ مؤطا کی روایت میں بیان کیا گیا ہے، تب بھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمرؓ ﴿الشیخ والشیخة فارجموھما البتة﴾ کے الفاظ کو قرآن کریم کی ایک آیت کے طور پر لکھنا چاہتے تھے، کیونکہ اگر ان کے نزدیک یہ فقرہ قرآن کریم کا جزو ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس کا اعلان کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ قرآن کریم کے حاشیے پر یہ فقرہ اس بات کے اظہار کے لیے لکھ دیں کہ زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اب بھی واجب العمل ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) نے حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کے مذکورہ خطبہ میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں :

"لولا ان یقول قائلون : زاد عمرؓ فی کتاب اللہ ما لیس منہ لکتبتة فی ناحیة من المصحف"[1]

"اگر کہنے والوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمرؓ نے اللہ کی کتاب میں اس بات کا اضافہ کر دیا جو اس کا حصہ نہ تھی تو میں رجم کا یہ حکم مصحف کے ایک کونے میں لکھ دیتا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ رجم کے حکم کو نہ تو قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے اور نہ قرآن کریم کے متن میں اس کا اضافہ کرنے کا کوئی خیال ان کے دل میں آیا تھا، بلکہ انہوں نے محض مسئلہ رجم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ایک تشریحی اضافے کے طور پر اس کو حاشیے پر لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا جس پر انہوں نے عمل نہیں کیا، کیونکہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

علامہ زرقانیؒ (م ۱۱۲۲ھ) اس روایت کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی مراد ظاہری معنی نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد اس مسئلے کی اہمیت کو واضح کرنا اور رجم کی سزا کو زندہ رکھنے پر ابھارنا تھا۔ حضرت عمرؓ کی مراد یہ نہیں تھی کہ الفاظ منسوخ ہو جانے کے باوجود یہ آیت باقی رہنے والی ہے۔ آپؓ جیسے فقیہہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے الفاظ منسوخ ہو جانے کے باوجود اس آیت کو قرآن مجید میں لکھنے کا حکم دیا ہو گا،

(1) المسند، رقم 157

لہٰذا اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔[1]

حضرت عمرؓ کی دور اندیشی ملاحظہ فرمائیں کہ حد رجم کے بارے میں آپؓ نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہ درست ثابت ہوا اور صدر اول میں ہی خوارج نے زانی محصن کے لیے رجم کی سزا کا اسی بنیاد پر انکار کر دیا کہ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں۔ امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اندیشہ خوارج اور ان کی موافقت کرنے والوں کے حق میں پایہ ثبوت کو پہنچ گیا۔[2]

اس روایت کو محدثین نے مختلف اسناد سے نقل کیا ہے اور یہ حدیث زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ)، عمرو بن العاصؓ (م ۴۲ھ)، عبد الرحمن بن عوفؓ (م ۳۲ھ) وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بطور آیت قرآنی نہیں، بلکہ یہ آپ ﷺ کے اپنے الفاظ ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی اس مقولے کو قرآن کی آیت قرار دیا۔[3]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کا اصل ماخذ تورات ہے اور چونکہ اس کے بنیادی مفہوم کو اسلامی شریعت میں باقی رکھا گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق فیصلے بھی فرمائے تھے۔ اس لیے یہ فقرہ ایک واجب العمل حکم الٰہی کی طرح زبان زد عام ہو گیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کبھی قرآنی آیت کی حیثیت سے نہ پڑھا اور نہ لکھوایا۔ ہمارے اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

بعض روایات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے کو بطور آیت رجم لکھنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اسے ناپسند فرمایا۔ چنانچہ ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک محفل میں مسئلہ رجم اور یہی فقرہ موضوع بحث تھا۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ، اکتبنی آیة الرجم، قال: لا استطیع ذاك"[4]

"یارسول اللہ، مجھے آیت رجم لکھوا دیجیے۔ آپ نے فرمایا: میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ (م ۴۲ھ) فرماتے ہیں:

---

(1) شرح الزرقانی علی مؤطا امام مالک، جلد چہارم، صفحہ 193

(2) المنہاج، جلد گیارہ، صفحہ 191

(3) البیہقی، السنن الکبریٰ، رقم 16912؛ المستدرک، رقم 198،354، 8238،8239۔

(4) البیہقی، السنن الکبریٰ، رقم 16913

"لما نزلت اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت: اکتبہا فکانہ کرہ ذالک"[1]

"جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اس آیت کو لکھوا دیجئے، لیکن آپ نے اس بات کو گویا ناپسند فرمایا۔"

اگر یہ قرآن کریم کی آیت ہوتی تو آپ اس کو دوسری آیات کی طرح ضرور لکھواتے، لیکن ان دونوں واقعات سے واضح ہے کہ آپ نے ابتدا ہی سے اس کو لکھوانے سے انکار فرمایا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ قرآن کریم کا جزو کبھی نہیں رہے اور جن روایات میں اس کو نازل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے جزو کے طور پر نازل ہوئی تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا تھا کہ یہ آیت تورات میں موجود ہے اور مسلمانوں کے لیے اب بھی قابل عمل ہے۔[2]

اس آیت کے شامل قرآن ہونے کے بارے میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

1. یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اتفاق تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔
2. یا یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کی یہ رائے تھی کہ یہ قرآن کی آیت ہے لیکن دیگر صحابہؓ اس رائے سے متفق نہ تھے۔
3. یا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) اور نہ ہی دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے شامل قرآن ہونے پر متفق تھے۔ پہلے قیاس کے بارے میں گذشتہ سطور میں ذکر کر دیا گیا ہے کہ اگر یہ آیت قرآن کا حصہ ہوتی تو جہاں ایک معیار سے گزرنے کے بعد باقی آیات شامل ہیں وہیں یہ بھی شامل ہو جاتی۔ دوسرا قیاس بھی غلط ہے کیوں کہ اس بات کی کہیں ذرا بھی شہادت نہیں ملتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے کبھی یہ بات بیان کی ہو اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی تردید کی ہو۔ اور اگر بالفرض یہ مانا جائے کہ واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کے ایسے بیان کی دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے تردید کی تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) جب کسی دوسری صحابی کو اپنا مؤید نہ پاتے تو خود ہی اپنی غلطی سے رجوع کر لیتے۔

ایک تیسرا قیاس ہی رہ جاتا ہے جس کی بنا پر کچھ کہا جا سکے۔ لیکن اس قیاس کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قیاس اس حدیث کے ساتھ کس طرح موافق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں دونوں میں تضاد

---

(1) المستدرک، رقم 8238

(2) کتاب الاستثناء، 22:22؛ انجیل یوحنا، 3:8

نظر آتا ہے۔ لیکن در حقیقت معاملہ یوں نہیں ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اس روایت کا معنیٰ تیسرے قیاس کے ساتھ موافق نہ ہو تو یہ روایت ہی بے معنیٰ اور عبث ٹھہرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے تو یہ فرمایا تھا کہ جب زمانہ گزر جائے گا تو لوگ یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ زانیوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب اللہ میں نہیں۔ حالانکہ زانی مردوں اور زانی عورتوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب میں صحیح طور پر موجود ہے۔[1]

اگر ہم کتاب اللہ سے مراد قرآن سمجھیں تو یہ ایک صریح تضاد ہے اور اس لئے روایت مذکور سراسر بے معنیٰ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں معنیٰ یہ ہو گا کہ سنگساری کا حکم قرآن میں موجود ہے مگر مرورِ زمانہ کے بعد لوگ کہیں گے کہ ایسا کوئی حکم قرآن میں موجود نہیں۔ اگر ہم کتاب اللہ کے مفہوم کو ذرا سی وسعت دیں تو یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے ضروری نہیں کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن حکیم ہی ہو۔

قرآن مجید میں "کتاب" کا لفظ "خط"[2]، "نوشتہ تقدید"[3]، "فریضہ"[4]، "صحیفہ"[5] وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ کے معنی "اللہ کے حکم" کے بھی ہیں، اگرچہ وہ حکم قرآن مجید میں واضح طور پر موجود نہ ہو۔ کتاب اللہ کا اطلاق جس طرح قرآن پر ہوتا ہے، اسی طرح اللہ کے احکام اور فرائض پر بھی کتاب اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ بندوں پر جس قدر فرائض، خواہ وہ قرآن میں مذکور ہیں یا سنت میں، ان سب پر کتاب اللہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ مفہوم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث سے ثابت ہے۔ صحاح ستہ میں یہ واقعہ مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: یارسول اللہ! میں آپ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کر دیجیے۔ دوسرا فریق جو پہلے سے زیادہ سمجھدار تھا، کہنے لگا کہ ہاں یارسول اللہ! ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق فرمایئے اور مجھے بات کرنے کی اجازت دیجیے۔ آپ نے فرمایا: اچھا بیان کرو۔ اس نے کہا: میرا بیٹا اس شخص کے پاس ملازم تھا اور اس نے اس شخص کی بیوی سے زنا کیا ہے۔ میں نے سو بکریاں اور ایک غلام دے کر اپنے بیٹے کو چھڑا لیا۔ اس کے بعد میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تیرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے جبکہ اس شخص کی بیوی کو سنگسار کیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] البخاری: الجامع الصحیح، حدیث نمبر ۶۸۲۹، کتاب الحدود، باب الاعتراف بالزنا، ص ۵۶۹

[2] النمل: 28،27

[3] آل عمران، 3: 145؛ الانفال، 6:68

[4] النساء، 4:103، البقرۃ، 2:183

[5] الطور، 3:52

نے یہ سن کر فرمایا:

''والذی نفسی بیدہ لا قضین بینکما بکتاب اللہ جل ذکرہ، المائة شاة والخادم رد، علی ابنك جلد مائة و تغریب عام، واغد یا انیس علی امراءة ھذا، فان اعترفت فارجمھا، فغدا علیھا فاعترفت فرجمھا''[1]

''اس پروردگار کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تم دونوں کے درمیان ''کتاب اللہ'' کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ سو بکریاں اور غلام (جو تونے دیے) تجھے واپس ہوں گے اور تیرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اے انیسؓ! اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ۔ اگر وہ زنا کا اعتراف کر لے تو اسے رجم کر دو۔ انیسؓ اس کے پاس گئے تو اس نے اعتراف کر لیا، چنانچہ انہوں نے اسے رجم کر دیا۔''

علامہ عینیؒ (م ۸۵۵ھ) نے مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

''بکتاب اللہ ای بحکمه اذلیس فی الکتاب ذکر الرجم و قد جاء الکتاب بمعنی الفرض، قال تعالیٰ: کتب علیکم الصیام ای فرض''[2]

''کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم ہے، کیونکہ قرآن میں رجم کا حکم نہیں ہے۔ کتاب کا لفظ فرض کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''کتب علیکم الصیام'' یعنی تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔''

اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا فیصلہ حکم الٰہی کے مطابق دیا تھا، اگرچہ قرآن میں رجم کا حکم نہیں ہے۔ گویا حدیث رسول پر ''کتاب اللہ'' کا اطلاق کرنا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، لہٰذا حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خطبہ دیتے ہوئے جب یہ فرمایا کہ ''الرجم فی کتاب اللہ حق''[3] تو ''کتاب اللہ'' سے ان کی مراد قرآن مجید نہ تھی، جیسا کہ عام طور پر معترضین نے سمجھا ہے، بلکہ پوری شریعت بشمول حدیث رسول مراد تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عقیدہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات بھی وحی الٰہی کے تابع ہیں، اس لیے وہ احادیث پر بھی ''کتاب اللہ'' کا اطلاق کر دیا کرتے تھے۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۲۴ میں یہ لفظ ''احکام الٰہی'' کیلئے استعمال ہوا ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

---

(1) بخاری، رقم 6827۔

(2) عمدۃ القاری، جلد بیس، صفحہ 404

(3) بخاری، رقم 6830۔

﴿وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ﴾ (1)

"اور ان عورتوں سے نکاح بھی حرام ہے جو پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہیں سوائے اس کے کہ وہ تمہاری مملوکہ ہو جائیں اللہ نے یہ احکام تمہارے اوپر فرض کر دیا ہے گویا کتب اللہ علیکم کا معنٰی ہے تم پر فرض کر دیا گیا ہے۔"

گویا اگر اس روایت کو درست بھی تسلیم کیا جائے کہ آیت رجم کتاب اللہ میں سے ہے، تب بھی ضروری نہیں کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن حکیم ہی ہے۔ سورۃ النساء ہی میں یہ لفظ قرآن کی بجائے فرض کئے جانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (2)

"بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کر دی گئی ہے۔"

اس صورت میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس روایت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مطلب ہر گز وہ نہیں جو معترضین نے بیان کیا ہے۔

اس نقطہ نگاہ کی اس اعتبار سے بھی کوئی حیثیت نہیں کہ ایک طرف تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت ہے اور دوسری طرف ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کی یہ روایت ہے۔ ان کی اکیلی اس روایت کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ ترجیح دینا تو درکنار اس روایت کو تو شمار میں ہی نہیں لایا جاسکتا۔ (3)

مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"آیت رجم اور آیت متعہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب بیان کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کو پتہ چلا کہ لوگ ان کی وفات کے بعد خلافت کے بارے میں منصوبے بنا رہے ہیں۔ اس پر آپ نے مدینہ طیبہ میں ایک تقریر ارشاد فرمائی۔ آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کا بھی ذکر فرمایا۔ آپ نے فرمایا: میرا ٹھکانہ کیا ہے آج ہوں کل نہ ہوں گا۔ اس لئے چند باتوں کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں رجم کا قانون اگرچہ قرآن میں نہیں پایا جاتا مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ "کان عما أنزل الله" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا طرف سے نازل شدہ احکام میں سے ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دراصل یہ فرمایا کہ کسی کو مغالطہ نہ ہو کہ قرآن میں یہ حکم نہیں ہے اس لئے یہ کوئی حکم ہی نہیں ہے بلکہ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے دکھایا۔ اس سلسلے میں اصل مغالطہ "کان مما أنزل الله" کے الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ درحقیقت اسلام کے تمام احکام منزل من اللہ ہی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألا إني أوتيت القرآن

---

(1) سورۃ النساء: ۲۴

(2) سورۃ النساء: ۱۰۳

(3) گیلانی، حوالہ مذکور

ومثله معه آگاہ ہو جاؤ کہ مجھ پر قرآن نازل کیا گیا اور اس جیسی ایک اور چیز۔ قرآن وحی جلی ہے جس کے الفاظ اللہ کی طرف سے ہیں اور حدیث وحی خفی ہے اس کے مفاہیم اللہ کی طرف سے ہیں اور الفاظ حضور ﷺ کے ہیں۔ لہٰذا مما انزل اللہ سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قرآن کے الفاظ تھے بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رجم ایک شرعی حکم ہے جو رسول ﷺ پر نازل ہوا تھا جو نافذ بھی کیا گیا۔ لیکن یہ تمام قرآن مجید میں تو نہیں۔ حضور ﷺ کے فرامین کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾(1)

اس سے معلوم ہوا کہ احکام کی دو صورتیں ہیں:

1. وہ احکام جو قرآن میں موجود ہیں۔
2. وہ جو قرآن میں موجود نہیں لیکن ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ دونوں احکام منزل من اللہ ہیں۔ بالکل اسی نقطہ نگاہ کا اظہار شیعہ عالم علامہ علی نقی نے بھی کیا ہے۔(2)

مولانا مناظر احسن گیلانی کی اس تشریح سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ آیت رجم قرآن تھی اور اب اسے قرآن سے نکال دیا گیا ہے۔ اس روایت میں سفیان راوی کا یہ بیان بھی ہے کہ کذا حفظت میں اس نے اسی طرح یاد کیا ہے گویا یہ قرآن کا حصہ تھا اور میں نے حفظ اسی طرح کیا تھا۔ یعنی حفظ تو قرآن ہی کو کیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کا تجزیہ علماء نے کیا ہے۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن عبد اللہ المدینی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اس نے سفیان ثوری سے نقل کیا ہے، اس نے ابن شہاب زہری (50-124ھ) سے نقل کیا ہے اس نے عبید اللہ سے نقل کیا ہے، اس نے عبد اللہ بن عباس سے نقل کیا ہے اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) سے نقل کیا ہے، درمیان میں قال سفیان کذا حفظت کا لفظ آیا ہے اس کے بارے میں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

یہ الفاظ اولا عتراف اور قدرجم کے درمیان جملہ معترضہ ہے اس روایت کو اسماعیلی نے (مستخرج میں) جعفر فریابی سے نقل کیا ہے اور فریابی نے بخاری کے شیخ علی بن عبد اللہ المدینی سے نقل کیا ہے۔ اسماعیلی کی اس روایت میں اولا عتراف کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کا قول نقل ہوا ہے:

وَقَدْ قَرَأْنَاهَا الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ وَقَدْ رجم رسول الله و رجمنا بعده

(1) سورۃ النجم: ۴،۳؛ گیلانی حوالہ مذکور

(2) علی نقی، مقدمہ تفسیر القرآن، ص ۸۵

"ہم نے یہ آیت پڑھی تھی کہ بوڑھا اور بوڑھی جب زنا کریں تو دونوں کا لازماً سنگسار کرو۔ رسول ﷺ نے بھی رجم کی سزا دی تھی اور ہم نے بھی آپ کے بعد زنا کرنے والوں کو سنگسار کیا۔"

مگر بخاری کی روایت میں و قرءناھا سے البتۃ تک کے الفاظ ساقط ہو گئے ہیں۔ شاید بخاری نے خود ہی ارادۃً ان الفاظ کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ امام نسائی نے اس حدیث کو محمد بن منصور عن سفیان کی سند کے ساتھ جعفر فریابی کی روایت کی طرح نقل کیا ہے لیکن اسکے بعد کہا ہے کہ مجھے سوائے سفیان کے دوسرا کوئی معلوم نہیں ہوا ہے جس نے اس حدیث میں الشیخ و الشیخۃ الخ کے الفاظ نقل کئے ہوں اور مناسب و صحیح بات یہی ہے کہ سفیان کو اس کے نقل کرنے میں وہم ہو گیا ہے، ابن حجر کہتے ہیں کہ آئمہ حدیث نے اس حدیث کو امام مالک (179ھ)، یونس، معمر، صالح بن کیسان، عقیل اور دوسرے حفاظ حدیث سے نقل کیا ہے جو سب کے سب زہری (50-124ھ) سے نقل کرتے ہیں مگر ان سب کی روایت یہ الفاظ نقل نہیں ہوئے۔[1]

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ اس روایت میں الشیخ و الشیخۃ کے الفاظ اسماعیلی نے جعفر فریابی کی روایت میں نقل کئے ہیں گمان یہی ہے کہ بخاری نے ان کو قصداً حذف کر دیا ہے اس لئے کہ نسائی نے اپنی سند کے ساتھ ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد کہا کہ ان کے نقل کرنے میں سفیان سے وہم ہو گیا ہے اور نسائی کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سفیان کے علاوہ زہری (50-124ھ) کے دوسرے شاگردوں میں سے کسی نے بھی یہ الفاظ نقل نہیں کئے بلکہ یہ صرف سفیان کا شذوذ ہے اور شاذ الفاظ کو نقل کرنا بخاری نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے ان کو درمیان سے قصداً حذف کر دیا ہے۔ ابن حجر نے نسائی کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ نسائی سنن کبری کتاب الرجم باب تثبیب الرجم میں نقل ہوئی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

قال أبو عبد الرحمن لا أعلم أحدا ذکر فی ھذا الحدیث الشیخ و الشیخۃ فارجموھما البتۃ غیر سفیان وینبغی انه وھم[2]

"ابو عبد الرحمن یعنی نسائی کہتا ہے کہ مجھے سفیان کے علاوہ دوسرا کوئی راوی معلوم نہیں ہے جس نے اس حدیث میں الشیخ والشیخۃ إذا زنیا فارجموھما البتۃ کے الفاظ نقل کیے ہوں اور مناسب بات یہی ہے کہ ان کو وہم ہو گیا ہے۔"

---

(1) فتح الباری شرح بخاری کتاب الحدود باب الاعتراف بالزنا طبع حلبی مصر ۱۹۵۹ء، ص ۱۰۰، ج ۱۰

(2) النسائی: السنن الکبری، طبع ملتان ص: ۲۸۳/ج: ۴

اس کے بعد نسائی نے یہ روایت مالک، یونس، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم اور عقیل سے نقل کی ہے جو زہری (50-124ھ) کے شاگرد ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی مذکورہ الفاظ نقل نہیں کیے ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں زہری (50-124ھ) سے سفیان کی بجائے صالح بن کیسان نقل کرتے ہیں مگر اس میں بھی الشیخ و الشیخة کا اضافہ مروی نہیں ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ بعث محمدا ﷺ بالحق وأنزل علیه الکتاب فکان مما أنزل اللہ آیة الرجم فقرأناها وعقلناها ووعیناها رجم رسول اللہ ﷺ ورجمنا بعده فاخشی ان طال بالناس زمان أن یقول قائل واللہ مانجد آیة الرجم فی کتاب اللہ فیضلوبترک فریضة أنزلها اللہ والرجم فی کتاب اللہ حق سلی من زنی إذا أحصن من الرجال والنساء إذا قامت البینة أو کان احبل أو لاعتراف (1)

"اللہ نے محمد کو دین حق کے ساتھ بھیجا تھا اور ان پر کتاب نازل کی تھی اور اللہ کی نازل کردہ آیات میں سے رجم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے پڑھا تھا، سمجھا تھا اور یاد کیا تھا رسول ﷺ نے رجم کی سزا دی تھی اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کی سزا دی تھی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ لمبی مدت گزرنے کے بعد کوئی کہنے والا کہے گا کہ واللہ ہم نے اللہ کی کتاب میں رجم کی سزا نہیں پائی تو لوگ اللہ کے نازل کردہ فریضے کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں گے۔ اللہ کی کتاب میں اس شخص پر رجم کی سزا حق ہے جس نے زنا کیا ہو اور وہ شادی شدہ ہو خواہ مرد ہو یا عورت ہو جب کہ اس پر گواہ قائم کیے گئے ہوں یا اس کا حمل ظاہر ہو چکا ہو یا اس نے اعتراف کر لیا ہو۔"

الاتقان میں موجود روایت "أن عمراتی بآیة الرجم فلم یکتبها لأنه کان وحده"(2) کی بنیاد پر مستشرقین نے یہ استدلال کیا ہے کہ "ممکن ہے اور بھی کئی ایک ایسی آیات ہوں جو اسی طرح قرآن مجید میں لکھے جانے سے رہ گئی ہوں اور یوں قرآن مجید کا متن نامکمل رہ گیا ہوگا۔"

1. سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ علامہ سیوطی (911ھ) نے اس روایت کا ذکر کس سیاق وسباق

---

(1) صحیح بخاری کتاب المحاربین باب رجم الحبلی، صحیح مسلم کتاب الحدود باب رجم الثیب فی الزنا، سنن ابوداود کتاب الحدود باب فی الرجم، سنن ترمذی کتاب الحدود باب فی الرجم، سنن حمیدی طبع مدینه منورة، ص:۱۶/ج:ا رقم الحدیث ۲۵

(2) سیوطی، الاتقان، 30/2، دار النشر الکتب الاسلامیہ، لاہور

اور کس عنوان کے تحت کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اس کا ذکر جلد دوم میں ''مانسخ تلاوتہ'' کے عنوان کے تحت کیا ہے۔[1] نورالانوار میں بھی اسی طرح کی روایت موجود ہے۔[2]

2. مختلف علماء نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کے آیت رجم لانے کا مقصد بیان کیا ہے۔ ان کے اس فرمان کا خلاصہ اور مقصد یہ ہے کہ آئندہ نسلیں کہیں رجم کا حکم بھلا ہی نہ دیں۔ اس لئے وہ اسے (حکم رجم کو) قرآن مجید کے حاشیے پر لکھوانا چاہتے تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت مروی ہے اس میں یہ الفاظ موجود ہیں: ''فی ناحیۃ من المصحف''،[3] ''یعنی مصحف کے کنارے پر (گویا وہ اس عبارت کو مصحف کے حاشیے پر لکھوانا چاہتے تھے)۔''

علامہ اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ناسخ منسوخ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ موجود ہیں:

''علی ناحیۃ المصحف''،[4]

علامہ آلوسی (1270ھ) روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے فرمایا:

لولاك أن يقال أن عمرزاد في الكتاب لكتبتها في حاشية المصحف الشريف[5]

''مجھے اگر ڈر نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے قرآن میں اضافہ کر دیا ہے تو میں اس حصے کو قرآن کے حاشیے پر لکھوا دیتا۔''

یہی الفاظ ابن کثیر میں بھی ہیں۔ انہی سے تفسیر مظہری کی جلد ششم میں یہی الفاظ ہیں۔[6]

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) لکھوانے کے ارادے سے یہ آیت لائے ہوتے تو انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) نے بھی اسے لکھوانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

الاتقان کے الفاظ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ چونکہ 'جمع قرآن' کیلئے جو معیار مقرر کیا گیا تھا، یہ ٹکڑا اس معیار پر پورا نہ اترتا تھا، اس لئے اسے شامل قرآن نہ کیا گیا۔

---

(1) سیوطی، الاتقان، 30-31/2

(2) ملاجیون، نورالانوار، ص: ۲۸۰

(3) احمد، احمد بن حنبل، المسند، دائرۃ المعارف، دکن، ۱۳۴۰، ۲/ ۲۹۹

(4) بحوالہ گیلانی، ص: ۶۷؛ مزید: ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد ۱۵، صفحہ ۱۵۶

(5) آلوسی، محمد آفندی، سید، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار احیاء التراث الاسلامیہ، بیروت، دوسرا ایڈیشن، ۱۸/ ۷۹؛ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳/ ۳۱۹

(6) سیوطی، الاتقان 30-31/2؛ نیز قاضی ثناء اللہ پانی پتی: التفسیر المظہری، ۶/ ۴۲۳

مولانا مناظر احسن گیلانی آیت رجم کے بارے میں لکھتے ہیں:

روایت الشیخ والشیخة إذا زنیا فارجموهما، جس میں البتۃ کے لفظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے بخاری یا مسلم کسی میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ ابوداؤد اور ترمذی میں بھی نہیں پائی جاتی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ اور اس روایت کے الفاظ میں کوئی یک رنگی نظر نہیں آتی۔ قرآن مجید کے الفاظ ہر اعتبار سے معجزہ ہیں۔ ان الفاظ میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے کہ انہیں قرآن کے الفاظ کہا جا سکے۔[1]

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کے الفاظ یہ ہیں کہ "رجم کا قانون شادی شدہ مردوں اور عورتوں کیلئے ہی ہے۔" مگر جب ہم روایت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو الشیخ (بوڑھا) الشیخة (بوڑھی) ایسے الفاظ ہیں جن کیلئے ضروری نہیں کہ وہ شادی شدہ ہی ہوں۔[2]

☆ اس صورت میں نتیجہ کیا ہوا؟ ایسے بوڑھے اور بوڑھی عورت جن کی شادی نہ ہوئی ہو ان الفاظ کی بنیاد پر چاہیے کہ ارتکاب جرم میں سنگسار نہ کئے جائیں۔ چونکہ الشیخ اور الشیخۃ کے الفاظ ان پر صادق نہیں آتے۔ اس لئے رجم کا قانون ان کیلئے باقی نہ رہا۔

☆ صرف اتنی بات ہی نہیں بلکہ رجم کا قانون اس روایت کی بنا پر صرف اسی زنا سے متعلق ہوگا جب طرفین بوڑھے ہوں۔

☆ لیکن اگر ایک طرف بوڑھا اور دوسری جانب جوان یا بالعکس ہو تو اس پر بھی یہ قانون عائد نہ ہوگا۔[3]

☆ حقیقت یہ ہے کہ "شیخوخت" عربی زبان میں عمر کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں عموماً جنسی خواہش کا زور کم یا بسا اوقات مفقود بلکہ حد نفرت کو پہنچ جاتا ہے جب وہ عمر کے اس حصہ میں ہوں تو زنا کے صدور کا امکان ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔[4]

☆ یہاں بھی مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسی بنیاد پر استدلال کیا ہے جس بنیاد پر حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) سے منسوب روایت کے جائزے میں کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہاں ابہام "کان مما أنزل الله" کے علاوہ کان مما یقرأ کے الفاظ سے پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ ان الفاظ کا

---

(1) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، تدوین قرآن، ص ٦٧

(2) ایضاً ١/٥٥

(3) ایضاً

(4) ایضاً ٦٨

لازمی مطلب یہی نہیں کہ یہ قرآن کا حصہ تھا۔[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ یمامہ کے شہید حفاظ نے پہلے یہ دعا کی تھی کہ انہیں شہادت نصیب ہو۔ ان کی دعا کے الفاظ یوں تھے۔

اللھم ابلغ منا نبینا أن قد یقنٰاک فیناعنک و رضیت عنا[2]

"اے اللہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم مل گئے پس ہم آپ سے راضی اور خوش ہوئے اور آپ ہم سے راضی ہوئے۔"

اس روایت کا ذکر کر کے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم ان الفاظ کو یعنی ان شہدا کی دعا کے ان الفاظ کو جس کی خبر جبریل کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تھی، "کنا نقرأ" یعنی ہم پڑھا کرتے تھے۔

پس نقرأ کے لفظ سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ شاید یہ بھی قرآن کا جزء تھا، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی نوعیت بھی وہی ہے جو "فیما أنزل من القرآن" یا "کنا نقرأ فیما نقرأ من کتاب اللہ" کی ہے۔ یعنی جبریل کی وساطت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ پہنچا تھا۔ قرآن کی وحی میں تو جبریل ضرور واسطہ کا کام کرتے تھے لیکن ہر وہ چیز جو جبریل لیکر آئے اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا۔ یہی حالت ان زیر بحث الفاظ کی ہے۔[3]

اس روایت کے ضمن میں گذشتہ سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے بھی صاف واضح ہو رہا ہے کہ اگر ایک آیت ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ مطلوبہ معیار کے مطابق مل نہیں رہی تھی تو سب کو پتہ تھا کہ یہ آیت مل نہیں رہی، ایسا نہیں ہوا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قرآن جمع کر کے کام مکمل کر لیا تھا اور بعد میں خذیمہ رضی اللہ عنہ آگئے اور کہا کہ آپ تو بھول گئے ہیں، میرے پاس تو ایک آیت قرآن موجود تھی اور آپ کو تو وہ یاد ہی نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

اسی طرح اگر آیت رجم بھی قرآن کا حصہ ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا علم ہوتا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تو ہو سکتا ہے "آیت رجم" کو قرآن میں شامل کرنے سے انکار کیا ہو، لیکن اس کے حصہ قرآن ہونے کی صورت میں باقی صحابہ کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا تھا۔

لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ آیت رجم قرآن مجید کا حصہ نہ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) کا مقصد بھی اسے قرآن مجید کے باقاعدہ متن میں شامل کرنا نہ تھا۔ اگر آپؓ نے فرمایا کہ "ہم اس کی تلاوت کیا کرتے

---

(1) ایضاً، ص ۶۷

(2) علی، نقی، مقدمہ تفسیر القرآن، ص: ۸۵

(3) سیوطی، الاتقان، 33/2

تھے۔" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اب یہ آیت تلاوت کے اعتبار سے منسوخ ہو چکی ہے۔ اس طرح کی بہت سی ایسی آیات اور بھی تو ہیں جو پہلے قرآن مجید میں موجود تھیں لیکن اب منسوخ ہو چکیں۔ آیات کے نسخ کے بارے میں تو مسلمانوں کے ہاں کبھی دو آراء رہی ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ آیات کبھی کسی زمانے میں پڑھی جاتی تھیں تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اب بھی یہ قرآن کا حصہ" ہونی چاہییں۔ ہمیں یہ روایت ذہن میں رکھنی چاہیے عرضہ اخیرہ سے قبل کئی ایک آیات منسوخ ہو گئیں۔

منسوخ آیات میں سے ایک "آیت رضاعت" ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) فرماتی ہیں:

کان فیما أنزل عشر رضعات معلومات فنسخن بخمس معلومات فتوفی رسول اللہ ﷺ وھن مما یقرأ من القرآن[1]

"جو کچھ قرآن میں نازل ہوا اس میں یہ تھا کہ دس بار دودھ چوسنے سے حرمت واقع ہو جاتی ہے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور پانچ بار دودھ چوسنے سے حرمت کے واقع ہونے کا حکم نازل ہو گیا۔"

اس میں بھی ناسخ و منسوخ کا مسئلہ درپیش ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) کی طرف منسوب آیت رضاعت کا تنقیدی جائزہ مختلف محققین نے لیا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اس روایت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مندرجہ ذیل نکات پیش کئے ہیں:

1. روایت میں "فی ما أنزل من القرآن فی ما یقرأ من القرآن" کے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ سے یہ کس طرح سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ قرآن کے اجزاء تھے۔[2]

2. اس بات سے سبھی واقف ہیں کہ حضور ﷺ نے امت کو جو فرامین پہنچائے ان میں ایک سلسلہ تو ان احکام کا تھا جن کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل، حضور ﷺ کو دیا کرتے تھے۔ احکام کا دوسرا سلسلہ وہ تھا جس میں حضور ﷺ خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ بعد میں ان اجتہادات کو وحی کی تائید حاصل ہو جاتی تھی۔ اس طرح یہ اجتہادات بھی ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ کے تحت آجاتے تھے۔

---

(1) ایضاً 33/2

(2) گیلانی، ص: 67

3. پھر وحی کی بھی دو صورتیں تھیں ایک وحی متلّو یعنی قرآن مجید اور دوسرے وحی غیر متلّو یعنی قرآن کے علاوہ وحی۔ لیکن اسے بھی وحی ہی کہا جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھ لیا جائے کہ قرآن تو وہ ہے جو جبریل کے ذریعے نازل ہوا۔ لیکن ہر وہ چیز جو جبریل سے آئی اس کا قرآن ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً جبریل آئے اور حضور ﷺ نے بتایا:

((أتاكم جبريل ليعلمكم دينكم)) (یعنی حدیث احسان) ظاہر ہے جبریل نے جو کچھ کہا وہ قرآن تو نہیں تھا۔[1]

4. مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ اسی بنیاد پر "في ما أنزل من القرآن" سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ حضورؐ کے اجتہادی مسائل میں سے نہ تھا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ جس راہ سے قرآن نازل ہوا اسی راستے سے یہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچا تھا اور یہ قرآن کو جس راہ کی چیز سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے اور یہی معنی ہے: ''مما يقرأ من القرآن''[2]

اس سلسلے میں جو باقی روایات بیان کی جاتی ہیں ان کی حیثیت بھی اسی قسم کی ہے۔ مسلم کی کتاب الرضاعۃ میں حضرت عائشہ (57ھ) سے مروی روایت کا مضمون یہ ہے کہ قرآن میں ایک ایسی سورت تھی جس میں کہا گیا تھا کہ دس بار دودھ چوسنے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اور یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اور اس کی بجائے یہ پڑھا گیا کہ پانچ بار دودھ چوسنا حرمت کا سبب ہے۔ اور یہ آخری حکم حضورؐ کی وفات تک قرآن مجید میں پڑھا جاتا رہا۔[3]

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کا علم حضرت عائشہؓ (57ھ) کے سوا دوسروں کو بھی تھا اور وہ اسے قرآن مجید میں پڑھا کرتے تھے اگر ہم اس بات کا تحقیقی جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ایک اہم حکم تھا۔ اس کی شہرت عام ہونی چاہئے تھی۔ عرب میں بچوں کو عموماً دایہ دودھ پلاتی تھیں۔ اس اعتبار سے تو اس حکم کو عرب میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے اگر اس قسم کی کوئی آیت نازل ہوتی تو حضرت عائشہؓ (57ھ) قطعاً ایک شخص تک محدود نہ رکھ سکتی تھیں۔

محدثین کا اصول ہے کہ اگر کسی حدیث میں ایسے واقعہ کا ذکر ہو جس کی اطلاع عام ہونی چاہیے مگر وہ لوگ جنہیں اس واقعے کا علم ہونا چاہئے تھا۔ اس کے متعلق کچھ اطلاع نہ دے رہے ہوں اور اس سے لاعلمی کا اظہار کر رہے ہوں تو ایسی روایت پر موضوع کا حکم لگاتے ہیں۔[4]

---

(1) المسند ۲/۲۹۹

(2) بحوالہ گیلانی ص: ٦٧

(3) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ۷۹/۱۸

(4) ابن کثیر، حوالہ مذکور، ۶۲۱/۳، ۶۲۰

لہٰذا رضاعت کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) کی بیان کردہ اس روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ حضور ﷺ کی وفات تک یہ پڑھی جاتی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) نے جب قرآن کو یکجا کیا اس وقت حضور ﷺ کے وصال کو ابھی چھ ماہ گزرے تھے۔ کسی بھی شخص نے اتنا قلیل عرصہ گزرنے کے باوجود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) یا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع نہ دی۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) نے بھی ان حضرات کو خبر نہ دی۔ اگر وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو براہ راست مطلع نہ کر سکتی تھیں تو بالواسط طور پر تو بتایا جاسکتا تھا کہ یہ آیت بھی نازل ہوئی تھی۔ خلیفہ وقت ان کے والد گرامی تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت بھی انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے علاوہ بھی کسی نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

☆ خود امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (261ھ) کی اسی باب کی دوسری روایات سے اس حدیث کے جھوٹا ہونے کی شہادت ملتی ہے کیونکہ ان احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی کو ایسی کسی آیت کی کوئی خبر نہ تھی بلکہ اسی باب میں حضرت عائشہؓ (57ھ) اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مزید روایات مروی ہیں جن میں حضور ﷺ سے یہ سوال کئے گئے ہیں کہ کتنی بار کی رضاعت سے حرمت قطعی ہوجاتی ہے۔ [1] اگر کوئی واضح آیت قرآن میں نازل ہو چکی ہوتی تو حضور ﷺ سے اس مسئلے پر سوال پوچھے جانے کی ضرورت نہ تھی۔

☆ یہ بات بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ انہی سوالات کے وقت یہ آیات نازل ہوئیں کیونکہ اس کا تذکرہ احادیث میں نہیں ملتا۔ حالانکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس کا ذکر حدیث میں ضرور ملتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ روایت خبر واحد ہے۔

1. احادیث کی جانچ پڑتال کے لئے اصولِ روایت کے علاوہ روایت کے بھی چند اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ اکثر محدثین نے اصولِ درایت کو اصول روایت سے بھی زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ اور صاف صاف لکھ دیا ہے کہ جو روایت اصول درایت کے خلاف ہو (یہ اصول موضوع کی شناخت کے لئے بنائے گئے تھے صحیح حدیث کی پہچان کے لئے نہیں۔) اس میں مطلق کدوکاوش کی حاجت نہیں۔ فتح المغیث میں ہے:

> "اور جو حدیث عقل کے خلاف اور اصول کے مخالف دکھائی دے تو جان لو کہ وہ واقعی موضوع (یعنی من گھڑت) ہے اس کے متعلق اس تکلیف میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ ان راویوں کہ نسبت کوئی کدوکاوش کی جائے۔" [2]

---

(1) مسلم، کتاب الرضاعۃ، حدیث نمبر 3464-3502

(2) فتح المغیث، مطبوعہ شمس المطابع، صفحہ ۱۱۶

یہ بھی ایک اصول روایت ہے کہ ایسی حدیث بھی قابل اعتبار نہیں جس کو صرف ایک ہی راوی نے بیان کیا ہو اور وہ روایت ایسی ہو کہ اس سے لوگوں کو بھی واقف ہونا ضرور تھا۔[1] قرآن کی اہمیت مسلم ہے۔ رسول ﷺ نزول آیات کے بعد نہ صرف ان کو لکھوا دیتے تھے بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کی تعلیم بھی دیتے اور ان کے پڑھنے، پڑھانے کی ترغیب و تاکید فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ستر سورتیں کو خود رسول ﷺ کی زبانِ مبارک سے سن کر یاد کی ہیں۔[2] اس کے علاوہ آپ ﷺ نے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن کی تعلیم میں لگا دیا تھا۔ اصحابِ صُفّہ رات دن قرآن کی تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ مدینہ کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے مدینہ بھیجے گئے تھے۔ عمالِ حکومت کے فرائض میں بھی قرآن کی تعلیم داخل تھی۔

رسول ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (18ھ) کو یمن کا قاضی اس غرض سے بنا کر بھیجا تھا کہ وہ وہا ں کے لوگوں کو قرآن اور احکام قرآن کی تعلیم دیں۔[3] قرآن کی اس قدر اہمیت کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عشر رضعات اور خمس رضعات کا آیات قرآنیہ ہونا اور پھر ان کا منسوخ التلاوۃ ہو جانا سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (57ھ) کے اور کسی صحابی سے مروی نہیں ہے۔ اسی سے اس روایت کی قدر و قیمت ظاہر ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (911ھ) اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت شیخین نے کی ہے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا (57ھ) کے قول ''وھن مما یقرأ من القرآن'' میں کلام کیا ہے۔ کیونکہ اس قول کے ظاہر سے تلاوت کے باقی رہنے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے یعنی اس کی قرأت ختم ہو گئی تھی اور حکم بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ان الفاظ (وھن مما یقرأ) کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا (57ھ) کی فتوٰی سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کا وقت قریب آ گیا تھا یا یہ کہ تلاوت بھی منسوخ ہو گئی تھی مگر تمام لوگوں کو یہ بات حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہی معلوم ہو سکی۔ اس لئے آپ ﷺ کی وفات کے وقت کچھ لوگ اس منسوخ قرآن کو نادانستگی کی وجہ سے پڑھتے بھی تھے۔[4] علامہ نووی نے بھی یہی بات بیان کی ہے[5]

علامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں کہ ''ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) فرماتے ہیں کہ یہ آیت

---

(1) فتح المغیث، مطبوعہ شمس المطابع، صفحہ 117

(2) البخاری: الجامع الصحیح، باب القراء من اصحاب النبی ﷺ، کتاب فضائل القرآن، حدیث نمبر ۵۰۰۰، ص ۴۳۴

(3) الاستیعاب، حالات معاذ ابن جبل (18ھ)

(4) سیوطی، الاتقان، حوالہ مذکور، 64/۲، النوع السابع والاربعون،

(5) نووی، المنہاج، جلد دہم، ص: 29

نازل ہوئی اور پھر اٹھائی گئی۔' علامہ سیوطی (911ھ) "مکّی بن طالب القیسی" کا قول نقل کرتے ہیں کہ منسوخ غیر متلو ہے اور ناسخ بھی غیر متلو ہے۔" لیکن مجھے اس قسم کی کوئی اور مثال معلوم نہیں ہے۔[1] علامہ نووی کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے۔[2]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ سیوطی (911ھ) نے اس روایت کا ذکر جس عنوان کے تحت کیا ہے اس کا نام ہے۔ "وہ نسخ جس کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو چکے ہیں۔"[3]

صاف ظاہر ہے کہ جب علامہ سیوطی (911ھ) اس کا ذکر ہی اس باب میں کر رہے ہیں تو اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عبارت قرآن مجید کا حصہ" ہے۔ اس روایت کی ایک توضیح یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے منسوب الفاظ فتوفی رسول اللہ ﷺ، انہوں نے نہیں کہے تھے بلکہ یہ الفاظ بعد کے کسی راوی نے یہ الفاظ حضرت عائشہ سے منسوب کر دئے ہوں، اور راوی کو یہ الفاظ حضرت عائشہ سے منسوب کرتے ہوئے مغالطہ لگ گیا ہو۔ چنانچہ امام مسلم نے اس روایت کے بعد یحییٰ بن سعید کی سند سے جو دوسری روایت بیان کی ہے اس میں فتوفی رسول اللہ کے الفاظ نہیں ہیں۔[4]

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ روایت جس میں فتوفی رسول اللہ ﷺ کے الفاظ منقول ہیں، عبداللہ بن ابو بکر کے علاوہ کسی بھی اور راوی سے مروی نہیں ہیں اور اگر یہ الفاظ قرآن کے ہوتے تو ان کی تلاوت نماز میں بھی کی جاتی۔ ان کی تلاوت نماز میں کئے جانے کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

قرآن میں اس کی ناسخ آیت بھی کوئی نہیں ہے۔ اس سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ یہ راوی کا وہم ہے اور اس کے شامل کردہ الفاظ ہیں۔ اس کے بعد امام طحاوی نے دو مختلف اسناد کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے۔ ایک روایت قاسم بن محمد، عمرہ بنت عبدالرحمنٰ اور وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں۔

کان مما نزل من القرآن ثم سقط لایحرم من الرضاع الاعشر رضعات ثم نزل بعد اوخمس رضعات

دوسری روایت یحییٰ بن سعید، عمرہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا۔

انزل فی القرآن رضعات معلومات ثم انزل خمس رضاعات

ان دونوں روایات میں فتوفی رسول اللہ کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے

---

(1) مکی بن ابی طالب القیسی الایضاح لناسخ القرآن منسوخہ جدہ، دار المنارہ، 1986، نیز سیوطی، الاتقان، حوالہ مذکورہ

(2) المنہاج، جلد دہم، صفحہ 29

(3) ایضاً، ص: ٦٩

(4) حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا جاچکا ہے۔

کہ اس کے علاوہ الفاظ راوی کے اضافی الفاظ ہیں۔[1]

آئندہ سطور میں جو اعتراضات پیش کئے جائیں گے ان کے جواب کے حوالے سے چند بنیادی باتیں یہاں دوبارہ مختصراً پیش کی جاتی ہیں:

1. نسخ اللہ تعالیٰ کا فعل تھا جس نے اپنی مرضی سے کوئی حکم نافذ کیا وہ اس بات کا بھی اختیار رکھتا ہے کہ اس حکم کو واپس لے لے۔ ﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا﴾[2] اس میں تمام صیغے جمع متکلم کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی نے قرآن نازل کیا وہی اس میں نسخ کرتے ہیں یا لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیتے ہیں یہی بات سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱۰۱ سے ۱۰۳ میں بھی ہے۔

2. مسلم محققین نے اپنی کتب میں منسوخ شدہ حصے بھی نقل کر دئے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں ان حصوں سے آگاہ رہیں۔

3. ان کتب میں سے کسی کتاب میں اگر کوئی منسوخ شدہ آیت بیان کی گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کتاب کا مصنف اس حصے کو اب بھی قرآن مجید کا حصہ" قرار دے رہا ہے بلکہ دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ اسے کس عنوان کے تحت بیان کر رہا ہے۔

4. آیات کو منسوخ کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہمیں ناسخ اور منسوخ آیات کی خبر دی۔

5. قرآن مجید ہم اسی مواد کو کہتے ہیں جو عرضہ اخیرہ کے وقت حضور ﷺ کے ساتھ جبریل نے دور کیا تھا۔ اس قبل جو کچھ منسوخ ہو گیا وہ قرآن نہیں رہا۔

اس قسم کے مزید اعتراضات اور ان کا تحقیقی جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (911ھ) لکھتے ہیں:

عن حميدة بنت أبي يونس قالت قرأ علىّ أبي وهو ابن ثمانين سنة في مصحف عائشة ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا﴾ وعلى الذين يصلون الصفوف الأول قالت: قبل أن يغير عثمان المصاحف[3]

گویا اس روایت کی رو سے اس آیت کریمہ میں خط کشیدہ حصہ" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نکال دیا تھا۔

---

(1) طحاوی، مشکل الآثار، جلد سوم، ص: 6

(2) البقرۃ:۱۰۶

(3) الاتقان، حوالہ مذکور، النوع السابع والاربعون فی ناسخہ ومنسوخہ، 33/2

یہ اعتراض الاتقان کے جزوی مطالعہ کا نتیجہ ہے ورنہ اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ روایت ''منسوخ التلاوۃ کی بحث الثالث مانسخ تلاوتہ ''[1] کے تحت درج کی گئی ہے۔ گویا یہ الفاظ منسوخ ہیں نہ کہ محرف۔

عملی طور پر صورت حال ممکن ہے یوں ہو لوگوں کے ذاتی نسخوں میں ابھی تک یہ منسوخ عبارت موجود ہو اور ان نسخوں کے مالک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یقینی طور پر معلوم ہو گا کہ کون سا حصہ" منسوخ ہے اور کونسا حصہ اصل متن قرآن مجید۔ قرآن مجید انہوں نے زبانی یاد کرر کھا تھا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساری دنیا کیلئے ایک متفقہ نسخہ تیار کروایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذکورہ بالا قسم کی (محض یادگار کے طور پر لکھی ہوئی) عبارات کو اگر نکال دیا تو اس سے قرآن مجید کے اصل متن پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اس طرح کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے ستر منافقین کا قرآن مجید میں ذکر کیا تھا۔ لیکن اب یہ نام موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ایک سورۃ الولایۃ تھی وہ بھی اب موجود نہیں ہے۔ سورۃ الاحزاب کا بہت سارا حصہ" ختم کر دیا گیا اس حصہ میں اہل بیت رضی اللہ عنہم کے مناقب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں احکام تھے۔ آیت مبارکہ ﴿وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَّسْئُولُونَ﴾ سے آگے "بعلی بن ابی طالب" کے الفاظ بھی تھے۔ اسی طرح سورۃ آل عمران کی آیات ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ .... وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ تک ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (13ھ) کا کلام ہے۔[2]

جواب: ان اعتراضات کا جواب مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ اس جواب کے چند پہلو یہ ہیں:

1. اگر اہل بیت کے مناقب قرآن مجید سے نکال دیئے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تو حضرت عثمان کی شہادت کے بعد واقع ہوئی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی اور نے لوگوں کے حافظوں سے بھی قرآن مجید نکال لیا ہو گا۔ خود اہل بیت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حافظ قرآن مجید تھے۔ ان کے پاس عہد علوی میں کمال موقع تھا کہ ان تبدیلیوں کی اصلاح کرتے۔
2. قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اور قرآن مجید کا حتمی متن (جس پر درحقیقت لفظ قرآن کا اطلاق ہوتا ہے اور جو حقیقی قرآن مجید ہے) وہ ہے جس کا عرضہ اخیرہ میں حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دور فرمایا تھا۔ اس سے قبل

---

(1) ایضاً، 33/2

(2) الزرقانی، عبدالعظیم: مناہل العرفان، بیروت: دارالکتاب العربی، ۱۹۹۵ء، ۲۲۸/۱؛ گیلانی: حوالہ مذکور، ص: ۹۹

تک ناسخ و منسوخ کا عمل جاری رہا لیکن عرضہ اخیرہ کے بعد یہ عمل ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا گیا۔ اس سے قبل جو کچھ ختم ہو گیا وہ منسوخ سمجھا جائے گا اور ناسخ و منسوخ کا اقرار خود مسلمان کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی بنیاد قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اگر منافقین کے نام تھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر ان کے نام (اس بنا پر کہ اب ان کی اولادیں مسلمان ہو چکی تھیں اور اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ ان لوگوں کی مذمت جاری رکھی جائے) قرآن مجید سے حضور ﷺ کی موجودگی میں خارج کر دئے گئے تو یہ قرآن نازل کرنے والے کا تصرف ہے۔ جس کا جواز ہر اعتبار سے موجود تھا۔

اس سلسلے میں ایک اعتراض یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ) فرماتے ہیں:

لا يقولن أحد كم قد اخذت القرآن كله و ما يدريه ما كله، قد ذهب منه قرآن كثير[1]

"تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ (جو قرآن مجید نازل ہوا) وہ پورے کا پورا میں نے حاصل کر لیا ہے۔ تحقیق قرآن مجید کا بہت سارا حصہ جاتا رہا۔"

اس بیان سے مستشرقین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا مکمل متن ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اگر ہم اصل قرآن مجید حاصل کرنا بھی چاہیں تو ایسا عملاً ناممکن ہے۔ کیونکہ متن کا ایک بہت بڑا حصہ تو ضائع ہو چکا ہے۔[2]

اس عبارت کی حقیقت یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ) درحقیقت ناسخ و منسوخ کے حوالے سے وضاحت کر رہے ہیں۔ جو اصل قرآن مجید ہے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝﴾[3]

"بے شک ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

اور ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ﴾ "ہم آپ کو ایسا یاد کروائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں۔"

لیکن جو حصے منسوخ ہوئے ان کے بارے میں ثانی الذکر آیت کے ساتھ ہی فرمایا:

﴿إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾[4] مگر جسے اللہ چاہے۔" (اسے بھلا دیا جائے گا)

---

(1) السیوطی: حوالہ مذکور، النوع السابع والاربعون، 33/2

(2) Jeffery, Arthur, Material for the History of the Text of the Quran, 2, 3 Prefaces.

(3) الحجر: ۹

(4) الاعلیٰ: ۶ و ۷

اس طرح اصل قرآن مجید کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ (1)

"بے شک اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔"

اس لئے اصل قرآن مجید کے چلے جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ تھوڑا سا غور کریں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ) کا اس بات پر بھی یقین ہو کہ "اللہ تعالیٰ ہی اس ذکر کو نازل فرمانے والے ہیں اور وہی اس کی حفاظت کریں گے۔" اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جمع کرنا اور پڑھانا اپنے ذمہ لیا ہوا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ کہیں کہ "قرآن مجید کا بہت سا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔" واضح طور پر ایک دوسرے سے متصادم بات نظر آ رہی ہے۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ آپؓ نے دراصل یہ بات بتلائی ہے کہ ناسخ و منسوخ کا عمل دوران نزول قرآن مجید جاری رہا ہے اور اس سلسلے میں بہت سارا حصہ اب منسوخ ہو چکا ہے۔

نیز علامہ باقلانیؒ کہتے ہیں کہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں نے قرآن سارے کا سارا جمع کر لیا ہے؛ کیونکہ قرآن بہت سے حروف پر نازل ہوا ہے اور اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ (2)

اس بات کی واضح دلیل یہ ہے کہ جہاں سے مستشرقین نے یہ قول حاصل کیا ہے (یعنی الاتقان فی علوم القرآن) اسی کتاب سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ علامہ سیوطیؒ (911ھ) نے اس قول کا ذکر منسوخ کی اس قسم کے تحت کیا ہے جس میں آیت کی عبارت بھی منسوخ ہو گئی اور اس کا حکم بھی۔ (3)

اس کے علاوہ سند کے اعتبار سے بھی یہ روایت بہت ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی اسماعیل بن ابراہیم ہے۔ اس کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ یہ "ضعیف جداً" یعنی بہت ضعیف ہے۔

علامہ ابن المدینیؒ کہتے ہیں: "ضعیف جدا وکذا ضعفه غیر واحد" (4)

اسماعیل ضعیف ہے اور بہت سے لوگوں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے اس روایت کی سند اگر قابل اعتبار بھی ہوتی تب بھی قرآن مجید کے تواتر کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ بیان تو عبداللہ ابن عمرؓ (73ھ) کا انفراد ہے۔ انفراد اور تواتر کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

اس روایت میں لفظ "ذھب" آیا ہے۔ اگر ابن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ) کا اشارہ تحریف کی طرف ہوتا تو آپؓ یوں فرماتے: "قد اسقط المحرفون قرانا کثیرا" ذھب کا مفہوم یہاں منسوخ (نسخ) کیا جائے گا۔

الاتقان میں روایت ہے:

---

(1) القیامہ: ۱۷

(2) الباقلانی: الانتصار، ۱/۲۰۸

(3) السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، النوع السابع والاربعون فی ناسخه ومنسوخه، 33/2

(4) ابن حجر العسقلانی: لسان المیزان، ۱/۲۱۲

عن عمر بن الخطاب مرفوعا: القرآن ألف ألف حرفِ وسبعة وعشرون ألف حرف فمن قرأه صابرا محتسبا كان له بكل حرف زوجة من الحور العين[1]

یعنی قرآن مجید کے حروف کی تعداد دس لاکھ تھی۔ اب تو ان کی تعداد دس لاکھ نہیں ہے۔

3. اس روایت کے راویوں میں ایک شخص "محمد بن عبید"[2] ہے۔ اس راوی کے بارے میں علامہ ذہبی کی رائے ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ منیران الاعتدال میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

محمد بن عبید تفرد بخبر باطلٍ۔ کہ محمد بن عبید اکیلا ہی اس روایت باطل کو بیان کرتا ہے۔

4. اس روایت کے بارے میں لکھا ہے:

"قد حمل ذلك على مانسخ رسمه من القرآن"[3]

گویا یہاں ناسخ و منسوخ کا ذکر ہو رہا ہے اور اسی ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ (33ھ) فرمادیتے ہیں کہ بہت سے حصے منسوخ ہو چکے۔

اس سلسلے میں باب کے آغاز میں ہم نے واضح کر دیا ہے کہ نسخ فی القرآن کو تو مسلمانوں نے خود تسلیم کیا ہے بلکہ منسوخ ہو چکنے والی آیات کو محفوظ کیا ہے۔ نسخ تصرف الٰہی ہے نہ کہ انسانی تصرف۔ متکلم کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام میں خود تصرف کر سکے۔ جس چیز کا اظہار خود مسلمان کریں اور اسے چھپانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں، مستشرقین ڈھنڈورا پیٹتے چلے جاتے ہیں کہ ہم نے ایک بہت بڑی کمزوری تلاش کر لی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی منسوخ قرائتوں کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مستشرقین نے ان مقامات کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ یہ قرآن مجید میں پیدا ہونے والے تغیرات ہیں۔ اس قسم کی چند مثالیں: الاتقان میں منقول ہے:

حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) کے مصحف میں قرآن مجید کی آیت (اِنَّ اللهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ) یوں لکھی جاتی تھی:

"ان الله وملئكته يصلون على النبى وعلى الذين يصلون الصفوفَ الأُول"[4]

اس روایت کی راوی حمیدہ بنت ابی یونس کہتی ہیں کہ ثانی الذکر عبارت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن سے پہلے تھی۔ اب بعد میں صرف اول الذکر عبارت رہ گئی ہے۔

---

(1) السیوطی: النوع التاسع عشر فی عدد، جلد اول، صفحہ 93

(2) ذہبی: میزان الاعتدال، ۳/۹۹؛ ابن حجر: لسان المیزان، ۴/۲۷۶

(3) ایضاً

(4) السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، النوع السابع والاربعون فی ناسخه ومنسوخه، 33/2

جواب: یہ بحث علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے "الاتقان" میں عنوان " بحث الثالث مانسخ تلاوتہ " کے تحت کی ہے۔ گویا علامہ موصوف بغیر کسی ابہام کے واضح طور پر فرمارہے ہیں کہ یہ عبارت منسوخ مقامات میں سے ہے۔ ناسخ و منسوخ اور تحریف میں کوئی مشابہت نہیں ہے ناسخ و منسوخ متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے کلام میں تصرف ہے جبکہ تحریف تو تب ہو اگر متکلم کے علاوہ کوئی اور شخص اس عبارت میں کمی بیشی کرے۔

اس قسم کی مثالوں میں ایک مثال یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت: ﴿ وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴾[1]

"اے نبی ﷺ اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اس پیغام کے ذریعے ڈرائیں۔"

کسی صحابی کے ذاتی نسخہ میں ان الفاظ کے بعد وضاحت کے طور پر یہ الفاظ بھی تھے دراصل وأنذر عشیرتك الأقربین و رھطك منھم المخلصین ہے۔[2]

اب وأنذر عشیرتك الأقربین کے الفاظ باقی ہیں لیکن باقی الفاظ قرآن مجید میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات محض غلط فہمی یا غلط بیانی ہے کہ یہ باقی کے الفاظ قرآن مجید کا کبھی حصہ اور جزء رہے ہیں۔

بخاری شریف میں ہے: رھطلك منھم المخلصین جو دراصل عشیرتك کی تفسیر ہے۔ حاشیہ پر لکھا ہے:

وقراءۃ قرأھا ابن عباس ثم نسخت تلاوتھا[3]

اس طرح کی ایک مثال سورۃ الاحزاب میں ہے:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ اَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ ﴾[4]

"نبی کریم ﷺ مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔"

اس میں اُمَّھٰتُھُمۡ کے بعد "وھوأب لھم" کے الفاظ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ "وھوأب لھم" کے الفاظ اب قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں۔

جواب: وھوأب لھم کے الفاظ نہ تو قرآن مجید میں اضافہ تھا اور اب ان کا موجود نہ ہونا، اس میں تحریف بھی نہیں ہے۔

---

(1) الشعراء: ۲۱۴

(2) ملاجیون، حوالہ مذکور، ص: ۲۱۱؛ السیوطی، حوالہ مذکور

(3) البخاری، الجامع الصحیح، باب سورۃ تبت یدا ابی لھب، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۹۷۱، ص ۴۳۱

(4) الاحزاب: ۶

حضرت ابیؓ ابن کعب رضی اللہ عنہ (22ھ) وغیرہ کی قرأت میں یہ اضافی الفاظ دراصل تفسیری جملہ تھا۔ جس کے تفسیری ہونے کو ''وھو'' کا لفظ ''أزواجه أمّھتم'' کے بعد واضح کرتا ہے۔

یہ آیت سورۃ الاحزاب میں سے ہے اور اس سورت میں سے بہت سا حصہ ''منسوخ ہو چکا ہے اور یہ سورہ سورۃ البقرہ جتنی تھی۔ [1] ان الفاظ کو تفسیری نوٹ سمجھیں یا اصل عبارت، ہر صورت میں یہ الفاظ اب منسوخ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا تحریف کا کوئی اطلاق یہاں ہوتا ہی نہیں ہے۔

حضرت علقمہؒ (م ۶۲ھ) سے مروی ہے:

''قدمنا الشام، فاتانا ابو الدرداء فقال: افیکم احد یقرأ علی قراءۃ عبد اللہ؟ فقلت: نعم، انا، قال: فکیف سمعت عبد اللہ یقرأ ھذہ الآیۃ ﴿واللیل اذا یغشیٰ﴾ قال: سمعتہ یقرأ: ﴿واللیل اذا یغشیٰ والذکر والانثیٰ﴾ قال: انا واللہ ھکذا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرؤھا، ولکن ھؤلاء یریدون ان اقرأ: ﴿وما خلق﴾ فلا اتابعھم'' [2]

''ہم شام گئے تو حضرت ابو الدرداءؓ ہمارے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پاس کوئی آدمی ہے جو عبد اللہؓ بن مسعود کی قراءت کے مطابق پڑھنے والا ہو؟ میں نے کہا: میں ہوں۔ انہوں نے پوچھا: تم نے اس آیت کو حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے کس طرح سنا ہے: ﴿واللیل اذا یغشیٰ﴾؟ میں نے کہا: عبد اللہؓ بن مسعود اس طرح پڑھتے تھے: ﴿واللیل اذا یغشیٰ والذکر والانثیٰ﴾۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم، میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ﴿وما خلق﴾ پڑھوں، لیکن میں ان کی بات نہیں مانتا۔''

سورۃ اللیل کی ابتدائی آیات اسی طرح ہیں ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى (۱) وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى (۲) وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى (۳)﴾ جبکہ اس باب میں ابن مسعودؓ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿وما خلق الذکر والانثیٰ﴾ کی جگہ ﴿والذکر والانثیٰ﴾ کے الفاظ ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ قراءت قرآن مجید کی متواتر قراءت کے خلاف ہے۔ اس اشکال کی کئی حوالوں سے توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

زیر تبصرہ روایت، شاذ قراءت پر مشتمل ہے جو اب منسوخ ہو چکی ہے اور چونکہ یہ قراءت خبر واحد سے ثابت ہے جبکہ قرآن خبر متواتر سے ثابت ہے، اس لیے اس روایت سے قرآن مجید کی حقانیت پر کوئی اثر

---

(1) السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، النوع السابع والاربعون فی ناسخہ ومنسوخہ، 33/2

(2) مسلم، رقم 1916؛ بخاری، رقم 4944

نہیں پڑتا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت ابو الدرداءؓ نے اس شاذ قراءت کو قرآن کے طور پر کیوں نقل کیا؟ اس کی وجہ ابن حجرؒ نے یہ بیان کی ہے کہ ممکن ہے یہ قراءت بھی ان قراآت میں سے ہو جن کی تلاوت عرضہ اخیرہ کے وقت منسوخ کر دی گئی تھی اور ابو الدرداءؓ کو اس کے منسوخ ہونے کا پتہ نہ چل سکا ہو۔ مزید فرماتے ہیں کہ حفاظِ کوفہ نے اس قراءت کو ابن مسعودؓ اور علقمہؒ سے نقل کیا ہے اور کوفہ میں قراءت کی سند انہی تک پہنچتی ہے، لیکن اس کے باوجود حفاظِ کوفہ میں سے کسی نے بھی اس کو ﴿والذکر والانثی﴾ نہیں پڑھا۔ یہی معاملہ اہل شام کا ہے۔ انہوں نے قراءت کا علم ابو الدرداءؓ سے لیا ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کے مطابق قراءت نہیں کی۔ ان قرائن کی روشنی میں ابن حجر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ قراءت منسوخ ہو چکی تھی۔ [1]

گویا رسم عثمانی کے خلاف اور بطریق آحاد نقل ہونے کی وجہ سے یہ قراءت قرآن نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ قرآن ہوتی تو بطریق تواتر منقول ہوتی اور رسم عثمانی کے مطابق ہوتی۔

نسخ تلاوت کی روایت کو جو دلائلِ عقلی قرائن حالی اور دیگر مسلمات کے خلاف ہیں محض روایت ہونے کی بنا پر آنکھ بند کر کے قبول کر لیا جائے تو ایسے ایسے جملوں کو آیات قرآنیہ تسلیم کرنا پڑیگا جو کسی لحاظ سے بھی قرآن کی معجزانہ فصیح و بلیغ آیات کو ذرہ برابر بھی لگا نہیں کھا سکتے۔ ان میں کوئی ایک روایت بھی جرح وتعدیل تحقیق و تنقید کے معیار پر ٹھیک نہیں اترتی۔ دور جانے کی ضرورت نہیں خود حضرت عائشہؓ (57ھ) کی مذکورہ روایت کو پرکھ لیجئے یہ روایت مختلف وجوہ سے ناقابلِ تسلیم ہے۔

(1) فتح الباری، جلد آٹھ، صفحہ 707

آٹھواں باب

سبعہ احرف، اختلاف قراءات اور مستشرقین

سبعہ احرف کا مفہوم

مصاحف عثمانیہ میں سبعہ احرف کا وجود

مستشرقین اور سبعہ احرف

***

سبعہ احرف، اختلاف قراءات اور مستشرقین

سبعہ احرف کی بنیاد پر مستشرقین یہ نقطہ نگاہ اختیار کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں ہی قرآن مجید کے پڑھنے میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ جب اس ابتدائی دور میں قرآن کے متن پر اتفاق نہ تھا، تو آج ہم کس طرح قرآن کے متن کے حتمی تعین کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اس کی مثال میں وہ حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے درمیان اختلاف قراءت کے واقعہ کو بیان کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی مصلحت کی بنا پر دونوں کو درست قرار دے دیا تھا۔ (1)

لوگ مختلف طریقوں سے ہی قرآن مجید پڑھتے رہے، حتّٰی کی عہد عثمان رضی اللہ عنہ بھی گزر گیا، جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا ٦/٧ حصہ بھی ضائع کر دیا۔

آرتھر جیفری کہتا ہے کہ

"عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور پھر عہد عثمان رضی اللہ عنہ بھی گزر گیا، لیکن ان مختلف مصاحف اور سبعہ احرف کی وجہ سے لوگوں میں متن قرآن مجید میں اختلافات موجود رہے۔ ان اختلافات کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اختلافات کم کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ختم کر سکنا ان کے بس میں تھا ہی نہیں۔ انہوں نے کوشش کی لیکن بے سود۔ یہ کام بعد میں ابن مجاہد (م ٣٢٤ھ) نے کیا۔ آرتھر جیفری بڑے اعتماد کے ساتھ سبعہ احرف اور اختلاف مصاحف کو خوب اچھال کر انہیں غلط معانی پہناتے ہوئے، متن قرآن مجید کے اختلافات بیان کرتا ہے۔" (2)

(1) البخاری: الجامع الصحیح، (الکتب الستۃ) الریاض: دار السلام، ١٤٢١ھ، ح: ٤٩٩٢، ص ٤٣٣، (باب أنزل القرآن علی سبعۃ أحرف) و ح: ٥٠٤١، ص ٤٣٦، (باب من لم یر بأسا أن یقول: سورۃ البقرۃ) و ح: ٧٥٥٠، ص ٦٣٠ (باب قول اللہ تعالیٰ: فاقرءوا ما تیسر منہ)؛ مسلم: الجامع الصحیح، ح: ١٨٩٩، ص ٨٠٥ (باب بیان أن القرآن أنزل علی سبعۃ أحرف وبیان معناها)؛ أبوداود، ح: ١٤٧٥، ص ١٣٣٢ (باب أنزل القرآن علی سبعۃ أحرف)؛ الترمذی: السنن، حدیث نمبر: ٢٩٤٣، ص ١٩٤٧ (باب ماجاء أن القرآن أنزل علی سبعۃ أحرف)

(2) Jeffery, Arthur: Material for the History of the Text of the Quran, p.8 ; Bell, Richard: Introduction to the Quran, p.47-49

سبعہ احرف کے حوالے سے مستشرقین کا اعتراض یہ بھی ہے کہ مسلمان آج تک یہ بات ہی طے نہیں کر سکے کہ "سبعہ احرف" سے کیا مراد ہے۔ کسی نے سات قراء تیں مراد لی ہیں تو کسی دوسرے نے کہا ہے کہ اس سے مراد قبائل کے مختلف لہجے ہیں۔ اسی طرح سبعہ سے مراد سات کا معین عدد ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ بہت سارے حروف۔ اس سلسلے میں مستشرقین کے بقول مسلمان ابھی تک فیصلہ نہیں کر پائے۔ مستشرقین کا رجحان یہی ہے کہ سات سے مراد لاتعداد ہے۔ چنانچہ وہ عملاً اسی کو خوب اچھالتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"قرآن مجید کے لاتعداد متون کو خود مسلمان (احادیث نبویہ کی روسے) تسلیم کرتے ہیں۔"[1]

اختلاف قراءت کے بارے میں جارج سیل (George Sale) لکھتا ہے۔

"Having mentioned the different editions of the Koran, it may not be amiss here to acquaint the reader that there are seven principal editions, if I may so call them, or ancient copies of the book; two of which were published and used at Medina, a third at macca, a fourth at Cufa, a fifth at Basra, a sixth at Syria and seventh called the common or vulgar edition."[2]

ترجمہ: "قرآن کے ایڈیشنوں کا ذکر کرنے کے بعد قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کے سات بنیادی ایڈیشن ہیں، اگر ان کو ایڈیشن کہنا مناسب ہو، یا ہم ان کو اس کتاب کی سات نقلیں کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے دو مدینہ میں شائع کی گئیں اور وہاں استعمال ہوتی تھیں۔ تیسری مکہ میں، چوتھی کوفہ میں، پانچویں بصرہ میں، چھٹی شام میں اور ساتویں نقل کو عام اور رائج ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔"

جارج سیل (George Sale) نے سات قراءتوں اور حضرت عثمان غنیؓ (م ۳۵ھ) کے مختلف شہروں کی طرف قرآن مجید کی نقول بھیجنے کی روایات کو ملا کر ایک افسانہ گھڑا ہے۔ مستشرق گولڈ زیہر (Goldzihr) (م 1921ء) نے اختلافِ قراءات کو بنیاد بنا کر قرآن مجید کے متن میں اضطراب اور نقص کا

---

(1) عثمانی، محمد تقی، علوم القرآن، کراچی: مکتبہ دار العلوم، ۱۹۳۶ء، ص ۱۴۰ (قرآن کے سات حروف کی بحث)

(2) The Kuran, P.45, London, 1812, A.D

دعوی کر دیا۔[1] گولڈ زیہر (Goldzhir) نے اپنی کتاب 'مذاہب التفسیر الاسلامی' کے پہلے باب میں سبعہ احرف اور اختلاف قراءات کی قطعیت اور حجیت پر بہت سے اعتراضات وارد کیے ہیں۔[2]

اسی طرح آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) نے قرآن مجید کی قراءات میں صحابہ کرامؓ کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو بنیاد بنا کر قرآن مجید کے متن میں ارتقا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مستشرق موصوف نے مصحفِ عثمانی کے مقابل پندرہ بنیادی (Primary Codices) اور تیرہ ثانوی نسخہ جات (Secondary Codices) پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔[3]

سبعہ احرف کا مفہوم:

سبعہ احرف کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے قرآن مجید کی صحت پر اعتراضات کیے ہیں۔ سبعہ احرف کے مفہوم کے بارے میں مسلمان علماء کے ہاں اختلاف رائے اگرچہ موجود ہے تاہم ان کے بیان کردہ مفاہیم میں سے کوئی سا مفہوم بھی اختیار کیا جائے، قرآن مجید میں تحریف کسی صورت میں بھی ثابت نہیں ہوتی ۔سبعہ احرف سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں ایک نقطہ نگاہ تو یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کے بعض الفاظ کو ایک سے زیادہ انداز سے پڑھنے کے طریقے ہیں۔ عربوں کے بعض قبائل کیلئے قرآن کے بعض الفاظ کی ادائیگی مشکل تھی ان کی سہولت کی خاطر انہیں دوسرے طریقے سے ان الفاظ کو پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ ایک نقطہ نگاہ یہ بھی ہے کہ کسی کو سہولت فراہم کرنے سے قطع نظر اللہ تعالیٰ نے خود ہی بعض الفاظ کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ سبعہ احرف کی بنیاد، مندرجہ ذیل روایت ہے۔ ابو بکرہؓ فرماتے ہیں:

> عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، أَنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ اقْرَأِ الْقُرْآنَ عَلَى حَرْفٍ، قَالَ مِيكَائِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اسْتَزِدْهُ، فَاسْتَزَادَهُ، قَالَ: فَاقْرَأْ عَلَى حَرْفَيْنِ، قَالَ مِيكَائِيلُ: اسْتَزِدْهُ، فَاسْتَزَادَهُ حَتَّى بَلَغَ سَبْعَةَ أَحْرُفٍ، قَالَ: كُلٌّ شَافٍ كَافٍ مَا لَمْ تَخْتِمْ آيَةَ عَذَابٍ بِرَحْمَةٍ، أَوْ آيَةَ رَحْمَةٍ بِعَذَابٍ نَحْوَ قَوْلِكَ تَعَالَ وَأَقْبِلْ، وَهَلُمَّ وَاذْهَبْ، وَأَسْرِعْ وَأَعْجِلْ.[4]

---

(1) Goldzhair, Islam ,Muhammad and his religion, Indiana, 1979, P.47

(2) گولڈ زیہر، مذاہب التفسیر الاسلامی، ترجمہ وتقدیم ڈاکٹر عبدالحلیم النجار، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، قاہرہ، 1955

(3) Jaffery, A., The Koran: Selected Suras, New Yark, Heritage Press, 1958, P.20, Lieden

(4) مسند احمد: 20788

جبرئیلؑ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا پڑھیے ایک حرف پر۔ میکائیل نے کہا ان کیلئے زیادہ کیجیے۔ جبریل نے کہا پڑھیے دو حرفوں پر۔ میکائیل نے پھر کہا ان کیلئے اضافہ کیجیے تو حروف میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ سات حروف تک پہنچ گیا اور جبریل نے کہا کہ ان کے مطابق پڑھیں۔ ہر ایک حرف ان کیلئے کافی وشافی ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی رحمت والی آیت عذاب والی آیت کے ساتھ مخلوط ہو جائے یا آیت عذاب رحمت والی آیت کے ساتھ خلط ملط کر دی جائے۔ مثلاً تعال، هلم او راقبل (کہ یہ الفاظ مختلف ہیں لیکن معانی سب کے ایک ہی ہیں) اور مثل اذهب اور اسرع اور عجل (کہ ان سب الفاظ کا معنیٰ جلدی کرنے کے ہیں۔)

اس سلسلے میں ایک روایت کے آخری حصے میں لکھا ہے کہ ورقا بن ابی نجیح ابن عباسؓ (68ھ) سے بیان کرتے ہیں کہ ابی ابن کعبؓ (22ھ) قرآن مجید کی آیت الذین آمنوا انظرونا میں انظرونا کی جگہ امهلونا اور اخرونا جیسے الفاظ سے پڑھنے کی اجازت دے دیا کرتے تھے۔ ان تینوں کا معنیٰ ایک ہی ہے کہ "مہلت دو"(1) اس سلسلے میں ایک روایت میں ہے۔

عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال: اقرانی جبریل علی حرف فراجعته فلم ازل استزیده ویزیدنی الی سبعة احرف(2)

ابن عباس (68ھ) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبریل نے مجھے قرآن مجید ایک حرف کے مطابق پڑھایا۔ میں نے ان سے مراجعت کی یعنی بار بار اس بات کو دہرایا کہ زیادہ حروف میں پڑھیں۔ پس وہ حروف کی تعداد بڑھاتے گئے یہاں تک کہ حروف کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔

اس روایت کے ساتھ ابن شہاب زہری (50-124ھ) کے یہ الفاظ بھی ہیں:

بلغنی ان تلك السبعه الاحرف انما هی فی الامر الذی یکون واحد الا یختلف فی حلال ولا حرام(3)

(ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ یہ سات حروف ایسے امر کے بارے میں ہیں جو دراصل ایک ہی ہے یعنی ایک سے زیادہ حروف سے پڑھنے سے معنوں میں کوئی فرق نہیں آتا)

بخاری شریف میں ہی ایک اور روایت یوں ہے:

---

(1) القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، 1-42 (مقدمہ)

(2) البخاری، الجامع الصحیح: 3219، ص261 و 4991، ص433 (کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعہ احرف)

(3) مسلم: الجامع الصحیح، ح: 1902، باب انزل القرآن علی سبعہ احرف، ص806

ابن مسعود قال سمعت رجلا قرا ایه و سمعت النبی ﷺ یقرا خلافها فجئت به النبی ﷺ فاخبرت فعرفت فی وجهه الکراهیه، وقال کلا کما محسن فلا تختلوا فان من کان قبلکم اختلفوا فھلکوا۔ (1)

ابن مسعود(32ھ) کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو ایک آیت پڑھتے سنا اور میں نے حضور اکرم ﷺ کو بھی یہی آیت اس کے برخلاف پڑھتے سنا تھا پس میں اسے حضور ﷺ کے پاس لے آیا۔ اور آپ کو اس بات کی خبر دی۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے چہرہ انور پر ناراضگی کے آثار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔ پس آپس میں اختلاف مت کرو۔ کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے تھے وہ اس لئے ہلاک ہوئے کہ آپس میں اختلاف کرتے تھے۔

عن ابی بن کعب قال: لقی رسول اللہ ﷺ، جبریل صلی اللہ علیہ، فقال لہ رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم: انی بعثت الی امة امیة، منھم الغلام والجاریہ، والعجوز والشیخ الفانی، قال: مرھم فلیقرؤوا القرآن علی سبعہ احرف (2)

حضرت ابیؓ ابن کعب(22ھ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حضرت جبریل سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا: میں ایک امی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں جن میں بچے، بچیاں، بوڑھی عورتیں، انتہائی بوڑھے مرد بھی ہیں، تو انہوں نے کہا کہ انہیں حکم دیجیے کہ قرآن کو سات حرفوں پر پڑھ لیں۔

اس سلسلے میں چند مزید روایات بھی ہیں:

عن ابی بن کعب قال: کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرا قراءة انکرتھا علیه ثم دخل آخر فقرأ قراءة سوی قراءة صاحبه فلما قضینا الصلاة دخلنا جمیعا علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقلت ان ھذا قرأ قراءة انکرتھا علیه ودخل آخر فقراء سوی قراءة صاحبه فامرھما رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقرا افحسن النبی صلی اللہ علیه وسلم شانھما فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذ کنت فی الجاھلیة فلما رای رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ما قد غشینی ضرب فی صدری ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ عزوجل فرقا فقال لی یا ابی ارسل الی ان اقرا القرآن علی حرف فرددت الیه ان

(1) البخاری: الجامع الصحیح، ح:2410، کتاب الخصومات باب مایذکر فی الاشخاوالخصومة

(2) ابن حبان: الصحیح، ح:7397، باب قراءة القرآن، بیروت: مؤسسة الرسالة، 1993ء، 14/3

هون على امتي فرد الى الثانيه اقراه على حرفين فرددت اليه ان هون على امتي فرد الى الثالثة اقراه على سبعة احرف فلك بكل ردة رددتكها مسالة تسالنيها فقلت اللهم اغفر لامتي اللهم اغفر لامتي واخرت الثالثة ليوم يرغب الى الخلق كلهم حتى ابراهيم صلى الله عليه وسلم [1]

حضرت ابی ابن کعب (22ھ) فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا کہ ایک آدمی آیا اور نماز پڑھنے لگا اس نے قراءت کی جس پر میں نے اعتراض کیا پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے پہلے شخص سے مختلف انداز سے قراءت کی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہو چکے تو ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے قراءت کی جو اس کے ساتھی کی قرأت سے مختلف تھی ۔ حضور اکرم ﷺ نے ان دونوں کو حکم دیا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا تو آپ ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور میرا پسینہ جاری ہو گیا کہ خوف کے مارے میں اللہ تعالی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابی مجھے ایسا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی حرف پر قرآن مجید پڑھوں۔ پھر میں نے اس بات کو لوٹایا اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی کی جائے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ دو حرفوں پر پڑھوں۔ میں نے پھر بات کو لوٹایا اور کہا کہ میری امت پر آسانی کی جائے، پھر تیسری مرتبہ مجھے اجازت دی گئی کہ سات حرفوں سے پڑھوں۔

مسلم شریف میں ایک اور روایت بھی ہے لیکن اس میں صرف اس مقام (اضاءۃ بنی غفار) کا ذکر ہے جہاں سبعہ احرف کی اجازت نازل ہوئی تھی۔ [2]

اس سلسلے میں مسند ابویعلیٰ میں ایک اور روایت یوں بھی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے برسر منبر فرمایا

''اذكر الله رجلاً سمع النبي ﷺ قال ''ان القرآن انزل على سبعة احرف كلها شاف كاف'' لما قام۔ فقاموا حتى لم يحصوا فشهدوا بذلك فقال عثمان: وانا أشهد معهم'' [3]

میں اللہ کی یاد دلا کر کہتا ہوں کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو کر شہادت دیں کہ انہوں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا جس میں ہر حرف شافی اور کافی ہے۔ چنانچہ اتنی بڑی جماعت کھڑی ہو گئی کہ اس کا شمار نہیں کیا سکتا انہوں نے اس کی گواہی دی۔ حضرت عثمان نے فرمایا میں بھی ان کے ساتھ اسی بات کی گواہی دیتا ہوں۔ یہ حدیث، حضور ﷺ سے اکیس صحابہ کرامؓ نے بیان کی

---

(1) مسلم: الجامع الصحیح، ح:1904، باب انزل القرآن علی سبعہ احرف، ص806

(2) ایضا، ح:1906

(3) ابویعلی: المسند، ح:9، 153/1، السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، 308/1 (النوع السادس عشر)

ہے۔امام ابو عبید (224ھ) نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ متواتر کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔[1] اس حدیث کی شرح میں علامہ سیوطی (911ھ) نے چالیس اقوال[2] اور علامہ آلوسی (1270ھ)[3] نے سات اقوال نقل کئے ہیں (کہ اس سے مراد کیا ہے؟) جن صحابہ کرامؓ سے یہ روایت مروی ہے ان کے سمائے گرامی یہ ہیں۔

ابی ابن کعبؓ (22ھ)، انسؓ، حذیفہؓ، زید بن ارقمؓ، سمرۃ بن جندبؓ، سلیمان بن صردؓ، ابن عباسؓ (68ھ)، ابن مسعودؓ (32ھ)، عبدالرحمن بن عوفؓ، عثمان بن عفانؓ، عمر بن الخطابؓ، عمرو بن ابی سلمہؓ، عمرو بن العاصؓ، معاذ بن جبلؓ (18ھ)، ہشام بن حکیمؓ، ابی بکرۃؓ، ابو جہمؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو طلحہ انصاریؓ، ابو ہریرۃؓ (58ھ)، اُمّ ایوبؓ۔[4]

سبعہ احرف کے بارے میں اور بھی زیادہ واضح اور مستند روایات موجود ہیں:

عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ يَقُولُ: سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَمَعْتُ لِقِرَاءَتِهِ فَإِذَا هُوَ يَقْرَأُ عَلَى حُرُوفٍ كَثِيرَةٍ لَمْ يُقْرِئْنِيهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكِدْتُ أُسَاوِرُهُ فِي الصَّلَاةِ فَتَصَبَّرْتُ حَتَّى سَلَّمَ فَلَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ فَقُلْتُ مَنْ أَقْرَأَكَ هَذِهِ السُّورَةَ الَّتِي سَمِعْتُكَ تَقْرَأُ قَالَ أَقْرَأَنِيهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ كَذَبْتَ فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَقْرَأَنِيهَا عَلَى غَيْرِ مَا قَرَأْتَ فَانْطَلَقْتُ بِهِ أَقُودُهُ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ إِنِّي سَمِعْتُ هَذَا يَقْرَأُ بِسُورَةِ الْفُرْقَانِ عَلَى حُرُوفٍ لَمْ تُقْرِئْنِيهَا فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْسِلْهُ اقْرَأْ يَا هِشَامُ فَقَرَأَ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةَ الَّتِي سَمِعْتُهُ يَقْرَأُ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَلِكَ أُنْزِلَتْ ثُمَّ قَالَ اقْرَأْ يَا عُمَرُ فَقَرَأْتُ الْقِرَاءَةَ الَّتِي أَقْرَأَنِي فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَلِكَ أُنْزِلَتْ إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔[5]

---

(1) ابو عبید القاسم بن سلام: فضائل القرآن، المغرب: وزارۃ الاوقاف والشئوون الاسلامیہ، 2، 1995-168

(2) السیوطی: الاتقان، 309/1

(3) الآلوسی، محمود ابو الفضل: روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، 20،21/1

(4) ابن الجوزی، النشر فی القراءات العشر، جلد اول صفحہ ۲۱، دمشق، ۱۳۴۵ھ

(5) البخاری، ح: 4992، ص 433

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے دوران حضرت ہشام بن حکیمؓ کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ وہ اس کی تلاوت ایسے طریقوں سے کر رہے تھے جن کے مطابق ہم نہیں پڑھا کرتے تھے۔ مجھے ان کا اس طرح پڑھنا بڑا گراں گزرا۔ لیکن اس بات کا انتظار کیا کہ وہ نماز سے فارغ ہو جائیں۔ جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے ان کی گردن میں کپڑا ڈال لیا۔ اور پوچھا کہ آپ کو یہ سورت اس انداز سے کس نے پڑھائی ہے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ رسول ﷺ نے پڑھائی ہے۔ پھر میں انہیں اسی حالت میں حضور ﷺ کی خدمت میں پکڑ کر لے گیا اور آپؐ سے کہا کہ ہشام بن حکیمؓ سورۃ الفرقان اس انداز سے پڑھتے ہیں کہ ہم اس طرح تلاوت نہیں کرتے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ مجھے تم اس طرح سے سورۃ الفرقان سناؤ جس طرح تم اس کی تلاوت کر رہے تھے۔ یہ سن کہ حضور ﷺ نے فرمایا یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "یہ قرآن مجید سات حروف میں نازل ہوا ہے ان میں سے جس حرف میں چاہو پڑھو۔"

علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں: وذهب جماهير العلماء من السلف والخلف وأئمة المسلمين إلى أنها مشتملة على ما يحتمله رسمها من الأحرف السبعة فقط جامعة للعرضة الأخيرة عرضها النبي ﷺ على جبريل متضمنة لها لم تترك حرفا منها۔[1]

علامہ ابو بکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) فرماتے ہیں کہ یہی رائے اختیار کرنے کے قابل ہے۔[2] وہ فرماتے ہیں:

> "الصحيحُ أنّ هذه الأحرف السبعة ظهرت واستفاضت عن رسول ﷺ وضبطها عنه الائمة وأثبتها عثمان والصحابة في المصحف وأخبروا بصحّتها وإنما حذفوا منها ما لم يثبت متواترًا۔"[3]
>
> "صحیح بات یہ ہے کہ حروف سبعہ، حضور ﷺ سے منقول و مشہور ہیں آئمہ حدیث نے انہیں ضبط کیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے انہیں درست قرار دے کر انہیں مصحف میں درج کیا اور ان کی صحت کی خبر دی اور اسی حرف کو حذف کیا جسکی صحت ثابت نہ تھی۔"

---

(1) السیوطی: حوالہ مذکور، 334/1

(2) الزرکشی: البرہان فی علوم القرآن، النوع الحادی عشر 224/1

(3) ایضاً، 223/1

مختلف قراء تیں مثلاً سورۃ الفاتحہ میں الصراط کا لفظ "س" اور "ز" سے پڑھنا مختلف قبائل کا تلفظ تھا۔ یا ابن مسعودؓ کا سورہ نمبر ۱۲ کی آیت نمبر ۳۵ میں "حتی" کی بجائے "عتی" پڑھنا[1] یہ بھی عربی زبان کے دوسرے لہجے کو ظاہر کرتا ہے یعنی عربوں کے بعض قبائل میں "ح" کی جگہ "ع" پڑھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مختلف عربی لہجوں میں "ح" اور "عین" کے علاوہ "الف" اور "ق" کے حروف بھی باہمی طور پر قابل مبادلہ ہیں[2] اس طرح سورۃ الفاتحہ میں ایاک ویاک اور ھیاک مختلف لہجے ہیں کیونکہ مختلف عربی لہجا بات میں "الف"، "و" اور "ۃ" باہم قابل تبادلہ ہیں[3] سورۃ الفاتحہ میں نستعین پہلے نون پر زیر کے ساتھ بھی ایک لہجہ ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۶۵ میں یعلمـــون کی بجائے یعلمـــون سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۶ میں تسود کی بجائے تسود بنو اسد کے تلفظ کے مطابق ایک لہجہ ہے[4] سورۃ الفاتحہ میں مالک کو ملاک، ملک، ملیک پڑھنا ایک ہی لفظ کے مختلف تلفظ ہیں۔ جو ان سات طریقوں میں شامل ہیں جن کو پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے اور یہ سب کے سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں کہ آپؐ اس لفظ کو دیگر تلفظ اور لہجوں میں بھی ادا کیا کرتے تھے ۔[5] اگر ان اختلافی قراءتوں کو اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو صحابہ کرامؓ اس بار بار تلاوت کی جانے والی سورۃ کی قراءات میں ہر گز کوئی اختلاف نہ کرتے سورۃ الفاتحہ میں "اھدنا" اور "لا" کے قریبی متبادل الفاظ "ارشدنا" اور غیر بھی لہجے کے اختلاف پر مبنی ہیں۔ اور ان کا شمار ان الفاظ میں ہوتا ہے جس کی تلاوت کرنے کی اجازت تھی۔ "متبادل مسودات قرآن" متعارف کرانے کی دھن میں جیفری اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ دن کی پانچ نمازوں میں سے تین میں باواز بلند پڑھی جاتی ہے۔ اگر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے خلاف بلکہ ذرہ بھر بھی مختلف ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ اس کی تلاوت جاری رہتی۔ مزید بر آں جیفری کسی ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی پیش نہیں کر سکا جس نے دعوی کیا ہو یا یہ رائے ظاہر کی ہو کہ مصحف عثمانی میں درج سورۃ الفاتحہ کسی بھی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کردہ سورۃ الفاتحہ سے ذرہ بھر بھی مختلف نہیں ہے۔

جیفری نے اپنے مضمون "سورۃ الفاتحہ کی مختلف نص" جو کہ دی مسلم ورلڈ کی جلد ۲۹ میں ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا، میں سورۃ الفاتحہ کی مزید قراءتوں کی بھی نشاندہی کی ہے اس مضمون میں جیفری سورۃ الفاتحہ کی اس

---

(1) Arthur,Jeffery, Materials,P.49

(2) آرتھر جیفری، مقدما تان، صفحہ 230

(3) ابن منظور، لسان العرب، جلد 15، صفحہ 427، 438-441

(4) آرتھر جیفری، مقدمتان، ص 220

(5) ابن خالویہ، اعراب ثلثین سورۃ من القرآن الکریم، صفحہ 24-22

خصوصیت کے پیش نظر کہ وہ قرآنی تعلیمات کی جامع اور اسلام کے نظریہ توحید کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے اسے خداوند (حضرت عیسیٰؑ) کی دعا (Lord,s Prayer) کے مماثل قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

> "جب ہم سورۃ الفاتحہ کے مشتملات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سورۃ الفاتحہ قرآن حکیم کے دیگر حصوں سے لئے گئے مضامین و تعلیمات کی جامعیت کا منظر پیش کرتی ہے یہ عین ممکن ہے کہ اسے دعا کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنایا ہو مگر اس کا استعمال اور اس کی موجود قرآن میں حیثیت قرآن کے مدون کرنے والوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے تدوین قرآن کے وقت اسے قرآن کے آغاز میں لکھ دیا۔"(1)

پھر جیفری سورۃ الفاتحہ کا ایک اور غیر مصدقہ متن جو کہ مصحف عثمانی سے مختلف اور متعدد قراءتوں پر مشتمل ہے، بڑے ہی عامیانہ اور صحافیانہ رنگ میں متعارف کراتا ہے۔ اس نئے متن کی روایت متصل نہیں ہے۔ مزید برآں مسودہ جس میں سورۃ الفاتحہ کا یہ متن مذکور ہے کی تاریخ اشاعت اور اس کے ناسخ کا تعین بھی ممکن نہیں ہے۔ جیفری خود لکھتا ہے۔

"پچھلے موسم گرما میں قاہرہ میں مجھے اس طرح کا اختلافی متن ملا۔ یہ فقہ کے ایک چھوٹے سے رسالے میں درج ہے۔ بد قسمتی سے اس رسالہ کے شروع کے صفحات غائب ہیں۔ جس کی بنا پر ہم اس رسالہ کے مصنف کا نام نہیں جان سکتے۔ یہ شافعی فقہ کی قطعی غیر اہم تلخیص پر مبنی تحریر ہے۔ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک سو پچاس سال یا اس سے کچھ قبل کا شکستہ خط میں لکھا ہوا مسودہ ہے۔ اور اس میں قراۃ شاذۃ لالفاتحہ کے زیر عنوان سورۃ الفاتحہ کی دوسری قراءت اندرونی صفحہ پر درج کی گئی ہے۔ مسودہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہے۔ اگرچہ مسودے کا مالک مجھے اس عبارت کی نقل مہیا کرنے پر رضامند تھا۔ اور اس امر کی اجازت دینے پر بھی معترض نہ تھا کہ اگر یہ میرے کام کے لیے مناسب ہو تو میں اس کو استعمال کر لوں۔ مگر وہ اپنا نام ظاہر کرنے پر تیار نہ تھا کہ مبادا اس کے دقیانوسی ہمسایوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ اس نے اپنی مقدس کتاب کی قبل از جمع و تدوین نسخے کی ابتدائی سورۃ کی تحریر ایک غیر مسلم کو فراہم کر دی ہے۔ اس قراءت شاذہ کا متن اس متن سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو کہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

---

(1) Arthur ,Jaffery, The Koran:selected Suras,P.23,15

الحمدلله سید العالمین، الرزاق الرحیم مالك یوم الدین انالك نعبد وانالك نستعین، ارشدنا سبیل المستقیم، سبیل الذین مننت علیهم سوی المغضوب علیهم ولا الضالین[1]

وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ متن کے نیچے اس کی اسناد اس طرح درج ہے۔

''روایة ابی الفتح الجبائی عن شیخ دسوسی عن النهروانی عن ابی العاداتی المیدانی عن المرزبانی عن الخلیل بن احمد۔''

اس روایت کو بیان کرنے کے بعد آخر میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''اس بات کا قوی امکان ہے کہ دور اولین میں تلاوت کی جانے والی سورۃ الفاتحہ کی دیگر پرانی قراءات کے ساتھ ساتھ خلیل کو اس قراءت تک بھی رسائی حاصل ہو۔ اس قراءت کی سند کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ الخلیل سے لے کر الجبائی تک تو اس کی سند ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سند کا کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ خلیل سے نقل ہونے والے متن سے بہت متاخر ہو۔''[2]

جیفری مغرب کا باشندہ تھا۔ اور عربی زبان میں مہارت نہ ہونے کی بنا پر اس کی باریکیوں سے آگاہی کی سہولت سے بہرہ ور نہ تھا وہ مصحف عثمانی کے نفاذ سے قبل مختلف نسخہ جات میں لہجوں کے اختلاف کی وسعت اور ان کے استعمالات کا ادراک نہ کر پایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ قرآن حکیم کی متعدد قراءتیں ہیں اور وہ سب کی سب کسی نہ کسی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہیں تو اس نے مصحف عثمانی کے مقابلے میں دیگر مسودات قرآنی کو سامنے لانے کا فیصلہ کر لیا۔

جیفری کا یہ دعویٰ کہ ابی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے مسودہ ہائے قرآنی میں سے مختلف قراءتوں کا جو بھاری ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل وہ حقیقی متن کا اختلاف ہے نہ کہ مختلف لہجوں کا اور تلفظ کا معمولی اختلاف[3] ظاہر کرتا ہے کہ اختلافی نسخہ جات میں استعمال ہونے والے الفاظ کی بجائے مصحف عثمانی میں اس مفہوم کے دوسرے مترادف الفاظ کے استعمال کو دیکھ کر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوا ہے۔ مزید برآں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی اس اجازت کی حقیقت کو بھی نہیں جان سکا جو آپ نے اپنے ان پیروکاروں کو دی تھی۔ جن کی بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جو لکھنا

---

(1) آرتھر جیفری، سورۃ الفاتحہ کی مختلف قراءآت The Moslem World صفحہ 159

(2) ایضاً، صفحہ 160-162

(3) Arthur, Jeffery, The Koran as Scripture, P.97

پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ بوڑھے اور بدو تھے۔ اور ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر وہ عربی زبان سے قطعی نابلد تھے۔

اس امر کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ جیفری نے غیر تصحیح شدہ نسخہ جات سے جن اختلافی قراءات کو نقل کیا ہے ان سب کی اسناد غیر مصدقہ ہیں۔ وہ ایسی محکم و متواتر اسناد کے ساتھ کوئی ایسی قابل ذکر اختلافی قراءت بھی نہ لا سکا جس کی سند محکم و متواتر ہو جیسی محکم و متواتر اسناد کے ذریعے ہم تک مصحف عثمانی پہنچا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض اختلافی قراءتیں جو ہم تک پہنچی ہیں وہ لسانی اعتبار سے بھی ناممکن نظر آتی ہیں۔ اور بعض اختلافی روایات میں ان کی سند ناممکن الوجود اور محال ہے۔ جو زمانی اعتبار سے درست تسلیم نہیں کی جا سکتیں یا وہ روایت کے معروف اصولوں کے مطابق نہیں ہے[1] جیفری مزید اعتراف کرتا ہے کہ ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے منسوب اختلافی قراءتوں کے جانچنے کے بعد پروفیسر برجسٹراسر نے بجا طور پر یہ رائے قائم کی: یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص ان نسخوں کو مصحف عثمانی کے مقابلے میں صحیح تر کہنے کی جراءت نہیں کر سکتا۔[2]

سبعہ احرف کی شکل میں مختلف جگہوں پر جو اختلاف تھا وہ محض لفظی اختلاف تھا مفہوم اور نتیجہ کے اعتبار سے تمام حروف کے مابین کوئی تضاد نہیں تھا۔ لہذا اگر کسی شخص نے قرآن کریم صرف ایک قراءت یا حرف کے مطابق پڑھا ہو تو اسے پورا قرآن اور قرآنی مضامین حاصل ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ نے جو نسخہ تیار کروایا تھا وہ کمال احتیاط سے تیار ہوا اور یہ وہی نسخہ تھا جو حضور ﷺ نے عرضہ اخیرہ کے بعد امت کو دیا تھا۔ اس لئے سبعہ احرف کی موجودگی میں قرآن کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ قرآن میں اب اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ جب پوری امت اس بات پر متفق ہو چکی ہے کہ قرآن کریم مصاحف عثمانی میں ٹھیک اسی طرح لکھا جا چکا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا اور اس کی تمام متواتر قراءتیں صحیح اور منزل من اللہ ہیں تو اس کے بعد اس قسم کے نظری اختلافات قرآن مجید کو مختلف فیہ نہیں بنا سکتے۔ سبعہ احرف کے بارے میں جو احادیث و روایات ملتی ہیں ان کی روشنی میں اس بات کے سمجھنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی کہ سبعہ احرف کچھ حروف کی ادائیگی کا فرق در حقیقت الفاظ کا اختلاف تھا اس کی بنیاد پر قرآن کو مختلف فیہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

---

(1) Arthu, Jeffery, Materials, P. 16

(2) IBID

مصاحف عثمانیہ میں سبعہ احرف کا وجود:

دلائل کی روشنی میں محققین کی ایک بڑی تعداد نے اسی تحقیقی نقطہ نگاہ کو تسلیم کیا ہے کہ سبعہ احرف سے مراد اختلاف قراءت ہی کی سات مختلف نوعتیں ہیں۔ یہ ساتوں حروف آج بھی موجود اور محفوظ ہیں۔ ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔[1]

مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ اتنا فرق ضرور پڑا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قراءتوں کے اختلاف کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان میں مترادف الفاظ کے استعمال کی کثرت تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لغت قرآن کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے انہیں زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے۔ بعد میں جب اہل عرب لغت قرآن کے عادی ہو گئے تو مترادفات کے بہت سے اختلاف ختم ہو گئے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے جبرئیل نے جو آخری دور کیا تھا اس وقت بہت سی قراءتیں منسوخ کر دی گئیں۔ لیکن جتنی قراءتیں باقی رکھی گئیں وہ سب کی سب آج تواتر کے ساتھ چلی آ رہی ہیں اور ان کی تلاوت جاری ہے۔[2]

آئندہ سطور میں اس بات میں دلائل پیش کیے جائیں گے کہ سبعہ احرف "اس وقت موجود ہیں۔

ا۔ محقق ابن الجزری (م ۸۳۳ھ) لکھتے ہیں:

وَأَمَّا كَوْنُ الْمَصَاحِفِ الْعُثْمَانِيَّةِ مُشْتَمِلَةً عَلَى جَمِيعِ الْأَحْرُفِ السَّبْعَةِ، فَإِنَّ هٰذِهِ مَسْأَلَةٌ كَبِيرَةٌ اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِيهَا: فَذَهَبَ جَمَاعَاتٌ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَالْقُرَّاءِ وَالْمُتَكَلِّمِينَ إِلَى أَنَّ الْمَصَاحِفَ الْعُثْمَانِيَّةَ مُشْتَمِلَةٌ عَلَى جَمِيعِ الْأَحْرُفِ السَّبْعَةِ، وَبَنَوْا ذٰلِكَ عَلَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ عَلَى الْأُمَّةِ أَنْ تُهْمِلَ نَقْلَ شَيْءٍ مِنَ الْحُرُوفِ السَّبْعَةِ الَّتِي نَزَلَ الْقُرْآنُ بِهَا، وَقَدْ أَجْمَعَ الصَّحَابَةُ عَلَى نَقْلِ الْمَصَاحِفِ الْعُثْمَانِيَّةِ مِنَ الصُّحُفِ الَّتِي كَتَبَهَا أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَإِرْسَالِ كُلِّ مُصْحَفٍ مِنْهَا إِلَى مِصْرٍ مِنْ أَمْصَارِ الْمُسْلِمِينَ وَأَجْمَعُوا عَلَى تَرْكِ مَا سِوَى ذٰلِكَ، قَالَ هٰؤُلَاءِ: وَلَا يَجُوزُ أَنْ يَنْهَى عَنِ الْقِرَاءَةِ بِبَعْضِ الْأَحْرُفِ السَّبْعَةِ وَلَا أَنْ يُجْمِعُوا عَلَى تَرْكِ شَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ، وَذَهَبَ جَمَاهِيرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ وَأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ إِلَى أَنَّ هٰذِهِ الْمَصَاحِفَ الْعُثْمَانِيَّةَ مُشْتَمِلَةٌ عَلَى مَا يَحْتَمِلُهُ رَسْمُهَا مِنَ الْأَحْرُفِ السَّبْعَةِ فَقَطْ جَامِعَةٌ لِلْعَرْضَةِ الْأَخِيرَةِ الَّتِي عَرَضَهَا النَّبِيُّ ۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ عَلَى جِبْرَائِيلَ ۔ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔ مُتَضَمِّنَةٌ لَهَا لَمْ تَتْرُكْ حَرْفًا مِنْهَا.

---

(1) اکرم چوہدری، ڈاکٹر، (مقالہ) اختلاف قراءآت قرآنیہ اور مستشرقین، مجلہ فکر و نظر، اسلام آباد، جلد 34، شمارہ 3 (ملخصاً)

(2) عثمانی، محمد تقی: علوم القرآن، ص 137

قُلْتُ : وَهٰذَا الْقَوْلُ هُوَ الَّذِي يَظْهَرُ صَوَابُهُ ، لِأَنَّ الْأَحَادِيثَ الصَّحِيحَةَ وَالْآثَارَ الْمَشْهُورَةَ الْمُسْتَفِيضَةَ تَدُلُّ عَلَيْهِ وَتَشْهَدُ لَهُ ۔[1]

ترجمہ: ”(رہا یہ مسئلہ کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف تیار کروائے تھے وہ ساتوں حروف پر مشتمل ہیں یا نہیں؟ سو یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ فقہا قراء اور متکلمین کی جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساتوں حروف پر مشتمل ہیں اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ امت کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کو نقل کرنا ترک کر دے جن پر قرآن نازل ہوا۔ اور صحابہؓ نے اجماعی طور پر عثمانی مصاحف ان صحیفوں سے نقل کئے تھے جو حضرت ابو بکرؓ (13ھ) اور حضرت عمرؓ نے لکھے تھے اور ان میں سے ہر ایک مصحف عالم اسلام کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تھا اور ان کے ماسوا جتنے صحیفے تھے ان کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہ یہ بات جائز ہے کہ ”حروف سبعہ“ میں سے کسی حرف کی قراءت روک دی گئی اور نہ یہ کہ صحابہؓ قرآن کے کسی حصے کے چھوڑنے پر متفق ہو گئے اور سلف وخلف کے علماء کی اکثریت کا قول یہی ہے کہ یہ عثمانی مصاحف ان حروف پر مشتمل ہیں جو ان کے رسم الخط میں سما گئے اور حضور ﷺ سے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا اس کے تمام حروف ان مصاحف میں جمع ہیں ان میں کوئی حرف ان مصحف میں نہیں چھوٹا، میرا خیال یہ ہے کہ یہی وہ قول ہے جس کی صحت ظاہر ہے کیونکہ صحیح احادیث اور مشہور آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں اور اسی کی شہادت دیتے ہیں۔“

اس نقطہ نگاہ کے حامل دیگر بہت سے علمائے متقدمین و متاخرین کے اقوال و آراء پیش کیے جاسکتے ہیں جن کا نقطہ نگاہ یہی ہے کہ سبعہ احرف آج بھی جاری، محفوظ اور موجود ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں:

”أما قول من قال أبطل الأحرف الستة فقد كذب من قال ذلك و لو فعل عثمان ذلك أو أراده لخرج عن الإسلام ولما مطل ساعة، بل الأحرف السبعة كلها موجودة عندنا قائمة كما كانت مثبوتة في القراءات المشهورة المأثورة“۔[2]

---

(1) ابن الجزری، شمس الدین ابو الخیر: النشر فی القراءات العشر، المطبعہ التجاریہ الکبریٰ، تصویر دار الکتاب العلمیہ، تحقیق علی محمد الضباع، 31/1

(2) ابن حزم: الفصل فی الملل والاھواء والنحل، مصر: مطبع الادبیہ، 1320ھ، 2/77، 78، من الکذب والکفر والھوس

"رہا یہ قول کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو منسوخ کر دیا تو جس نے یہ بات کہی ہے اس نے بالکل غلط کہا ہے۔ اگر آپؓ ایسا کرتے یا اس کا ارادہ فرماتے تو ایک ساعت کے توقف کے بغیر اسلام سے خارج ہو جاتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں کے ساتوں حروف ہمارے پاس بعینہٖ موجود و مشہور اور قراءتوں میں محفوظ ہیں۔" علامہ بدرالدین عینی (م ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:

"قال أبوالحسن علی الأشعری أجمع المسلمون علی أنه لایجوز حظر ما وسعه الله تعالیٰ من القراءة بالأحرف التی أنزلها الله تعالیٰ ولا یسوغ للأمة أن تمنع ما یطلقه الله تعالیٰ بل هی موجودة فی قراءتنا۔"(1)

ترجمہ: "امام ابوالحسن علی اشعریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حروف نازل کر کے امت کو سہولت عطاء فرمائی تھی اسے روکنا کسی کیلئے جائز نہیں اور امت اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ جس چیز کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہو اسے روک دے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ قراءات میں موجود ہیں۔" ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

"وکانه علیه الصلوٰة والسلام کشف له أنّ القراءة المتواترة تستقر فی أمته علی سبع وهی الموجودة الآن المتفق علی تواترها، والجمهور علی أنّ ما فوقها شاذّ لا یحل القراءة به"(2)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر منکشف ہو گیا تھا کہ متواتر قراءتیں آپکی امت میں آخر کار سات رہ جائیں گی چنانچہ وہی سات قراءتیں آج موجود ہیں اور ان کے تواتر پر اتفاق ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس کے علاوہ جو قراءتیں ہیں وہ شاذ ہیں اور ان کی تلاوت جائز نہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"فاعلم ان ما قراء جبرئیل علیه السلام فی العرضة الاخیرة علی البنی ﷺ کله ثابت فی مصحف عثمان ولما یتیعن منها وبقی واحد فقط۔"(3)

---

(1) العینی، علامہ بدرالدین: عمدة القاری شرح صحیح البخاری، کتاب الخصومات باب کلام الخصوم بعضهم ببعض، مصر: الطباعه المنیریه، 1348ھ، 12/258

(2) علی القاری: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن، باب فی توابع اخری، 5/16

(3) انور شاہ، علامہ، فیض الباری شرح صحیح البخاری، کتاب الخصومات، باب التوثق ممن تخشی معرتہ، 3/321

پس جان لیجئے کہ جبریل علیہ السلام نے جتنے حروف حضور ﷺ کے ساتھ قرآن مجید کے دور میں پڑھے تھے وہ سب حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود ہیں۔ اور چونکہ علامہ ابن جریر طبری (310ھ) پر حروف کے معنیٰ واضح نہیں ہوسکے اس لئے انہوں نے یہ موقف اختیار کرلیا کہ چھ حروف ختم ہوگئے اور صرف ایک حرف باقی رہ گیا۔ علامہ زاہد الکوثری (م ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں :

بہت سے لوگوں نے محض علامہ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کے مقام سے متاثر ہو کر یہ رائے اختیار کرلی ہے کہ اس وقت صرف ایک ہی حرف میں قرآن مجید موجود ہے۔ ان لوگوں کے نقطہ نگاہ کا رڈ علامہ ابن حزم (456ھ) نے نہایت سخت انداز سے اپنی کتاب "الفصل" اور الاحکام میں کیا ہے۔ لہذا ابن جریر طبریؒ (310ھ) کی رائے نہایت سنگین اور خطرناک ہے۔[1]

عہد جدید کے مصنف علامہ زرقانی (1122ھ) نے بھی اپنی کتاب مناہل العرفان میں یہی نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے کہ مصحف عثمانؓ میں ساتوں حروف موجود ہیں اور یہ موقف غلط ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم کروادیے تھے۔[2]

شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے بلکہ وہ تو قراءتوں کو سات کے عدد میں محدود نہیں فرماتے۔[3]

مصحف عثمانؓ میں ساتوں حروف موجود ہیں۔ اس سلسلے میں علماء نے دلائل کے ساتھ اس نقطہ نگاہ کو درست ثابت کیا ہے۔ ان میں اہم دلائل یہ ہیں: قرآن مجید کے بارے میں خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾[4]

"بے شک ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صحیح احادیث سے ثابت شدہ ہے کہ "سبعہ احرف" اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ لہذا منزل من اللہ چیز کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اس طرح یہ ساتوں حروف قیامت تک باقی رہیں گے۔

علامہ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ "سبعہ احرف" کو حضرت عثمانؓ نے ختم فرمادیا تھا۔ تاہم وہ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا مصحف حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) والے نسخے کے عین

---

(1) الکوثری، محمد زاہد: مقالات الکوثری، القاہرہ: المکتبۃ التوفیقیہ، ص 39

(2) الزرقانی: مناہل العرفان فی علوم القرآن، 1/151

(3) شاہ ولی اللہ، دہلوی: المصفّٰی شرح المؤطا، مطبع مرتضوی س ن، ص 187

(4) الحجر: 9

مطابق تھا، دوسری طرف طبریؒ (310ھ) کا یہ موقف بھی ہے کہ عہد ابو بکر صدیقؓ (13ھ) میں سبعہ احرف موجود تھے۔[1]

حالانکہ حضرت زید بن ثابتؓ کا قول بھی ہے:

وَأَرْسَلَ عُثْمَانُ إِلَى حَفْصَةَ أَنْ تُعْطِيَهُ الصَّحِيفَةَ وَحَلَفَ لَهَا لَيَرُدَّنَّهَا إِلَيْهَا، فَأَعْطَتْهُ، فَعَرَضْتُ الْمُصْحَفَ عَلَيْهَا فَلَمْ يَخْتَلِفَا فِي شَيْءٍ۔[2]

"اور حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ ان کو اپنا مصحف عطاء کردیں اور انہوں نے واپس لوٹانے کا وعدہ بھی کیا، تو حضرت حفصہؓ نے دیدیا۔ میں نے مصحف کا مقابلہ ان صحیفوں سے کیا تو دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مصحف عثمانؓ میں بھی ساتوں حروف موجود تھے۔ مولانا تقی عثمانی نے مذکورہ بالا دلائل کے علاوہ مزید دلائل بھی پیش کیے ہیں جن سے اس موقف کا اثبات ہوتا ہے کہ مصحف عثمانؓ (دوسرے لفظوں میں ہمارے ہاتھوں میں موجود قرآن مجید) ان سات حروف پر مشتمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے تھے۔

اس نقطہ نگاہ کے برعکس بعض علماء نے مختلف قراءتوں اور سبعہ احرف میں باہم فرق کرتے ہوئے کہا ہے کہ مختلف قراءتیں تو حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود ہیں۔ لیکن سبعہ احرف یا تو عہد نبویؐ میں عرضہ اخیرہ (حضور ﷺ کا حضرت جبرئیل کے ساتھ قرآن مجید کا آخری دور) کے وقت ختم ہو گئے تھے یا حضرت عثمانؓ نے اپنے متفقہ سرکاری نسخے میں انہیں ختم کردیا۔ اس نقطہ نگاہ کو سب سے پہلے علامہ طبریؒ (310ھ) نے پیش کیا اور بعد کے لوگوں نے ان کے مرتبے سے متاثر ہو کہ اس نظریے کو اختیار کرلیا۔[3]

اس مکتب فکر کے نقطہ نگاہ کے مطابق حرف سے مراد سات لغات ہیں۔ یہ سات لغات مندرجہ ذیل ہیں:

قریش، ثقیف۔ طی۔ ہوازن و بکر تمیم۔ ازدو ربیعہ۔ لغت اہل یمن۔[4]

---

(1) عثمانی، محمد تقی: علوم القرآن، ص137

(2) الطحاوی، ابوجعفر: شرح مشکل الاثار، باب بیان مشکل ما روی عن رسول اللہ ﷺ من قولہ نزل القرآن علی سبعہ احرف، 8/128

(3) عثمانی، حوالہ مذکور

(4) الزرکشی: البرہان، 1/219-217

ان سات لغات پر قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت دی گئی جبکہ ان میں مرادف الفاظ استعمال ہوں۔ ان مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت صرف ابتدائی عہد میں بعض ایسے لوگوں کی وجہ سے دی گئی تھی جن کیلئے لغت قریش کا تلفظ ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً ہذیل کو یمن کا لغت دشوار تھا۔ مگر الفاظ کی یہ وسعت صرف اسی حد تک تھی کہ معنی متحد ویکساں رہیں۔ اس رخصت واجازت کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ لوگوں کے باہمی میل جول اور روابط کے بڑھنے کی وجہ سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی لغات کے مطابق الفاظ ادا کرنے پر قادر ہو گیا اور ایک وہ وقت آ گیا کہ تمام لوگ حضور ﷺ کے لغت کے مطابق پڑھنے کے قابل ہو گئے۔ اسی لغت کے مطابق قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ اس وقت باقی لغات کو منسوخ کر دیا گیا۔ کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ علامہ طحاویؒ کی اس توضیح کی رو سے حضرت عثمانؓ نے اس وقت جب کہ سب لوگ ایک ہی لغت، (لغت قریش) کے مطابق پڑھنے پر قادر ہو گئے تو باقی لغت کی بجائے سب لوگوں کو لغات قریش پر اکٹھا فرما دیا۔(1)

سبعہ احرف کی اجازت کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے مولانا شمس الحق افغانی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ انسانوں کیلئے سہل اور واضح کلام بنا کر نازل کیا گیا ہے لیکن عرب کے کچھ قبائل کی زبان قریش کی زبان (جس میں کہ قرآن مجید نازل ہوا) سے مختلف تھی اور انہیں قریش کا محاورہ اختیار کرنے میں دقت ہو سکتی تھی اس لئے وقتی طور پر اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ کچھ الفاظ اپنے لغت میں ہی ادا کر لیا کریں بشرطیکہ معانی کا فرق نہ پڑتا ہو۔ دوسری طرف عرب کا مزاج قبائلی خصوصیات کا تحفظ بھی تھا۔ اس سلسلے میں وہ تعصب کی حد کو پہنچے ہوئے تھے۔ لہذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ قرآن کے محدود الفاظ میں جہاں عرب کے قبائل کی لغات میں فرق تھا ہر قبیلہ کو اپنی اپنی لغت کے مطابق تلفظ کرنے کی اجازت دی جائے تا کہ ایک طرف عربی زبان کی تمام شاخیں کلام الٰہی کی برکت سے بہرہ یاب ہوں اور عرب قبائل کی زبانیں عمومی شکل میں عربی زبان کے ساتھ نزول کلام الٰہی کی برکت سے فیض یاب ہو سکے، دوسری طرف عرب قبائل کو اپنی لغت خاصہ کی محرومی کا احساس نہ ہو اور لسانی تعصب کا اندیشہ بھی نہ رہے۔ جمع عثمانی کے وقت جب دائرہ اسلام وسیع ہو گیا اور قبائلی خصوصیات ختم ہو کر وحدت عرب بلکہ وحدت اسلامی کے رنگ میں تمام قبائل پورے طرح رنگے جا چکے تو سبعہ احرف یا قبائل کی خصوصیات کی ضرورت باقی نہ رہی۔ لہذا صرف لغت قریش پر مصحف عثمانی میں اکتفا کیا گیا۔ یہ اجماع صحابہؓ لغت قریش پر حکم نبوی سے تھا یا انتہائے حکم با انتہائے علت کی شکل تھی۔ اس کی مثال مؤلفۃ القلوب سے دی جاسکتی ہے کہ عہد نبوی میں یہ موجود تھا لیکن عہد فاروقی میں اسے مصارف زکوٰۃ سے خارج کر دیا گیا۔(2)

---

(1) ایضاً، السیوطی: حوالہ مذکور

(2) افغانی، شمس الحق: علوم القرآن، ص129

مولانا تقی عثمانی نے علامہ ابن جریری طبری (310ھ) اور علامہ طحاوی کے نقطہ نگاہ میں فرق کیا ہے۔ ابن جریر کے نقطہ نگاہ کی رو سے سبعہ احرف حضرت عثمانؓ نے ختم کئے جبکہ علامہ طحاوی کے نقطہ نگاہ کی رو سے سبعہ احرف، عرضہ اخیرہ تک منسوخ کئے جا چکے تھے۔[1]

سبعہ احرف کی ایک تشریح یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد سات لغات قبائل عرب ہیں جو عرب کے فصیح تر سات قبائل کے لغت تھے۔

یہ قبائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قریش ۲۔ ہذیل ۳۔ تمیم ۴۔ ازد ۵۔ ربیعہ

۶۔ ہوازن ۷۔ سعد بن بکر[2]

اسی نقطہ نظر کو راجح قرار دیا گیا ہے۔ روح المعانی میں علامہ آلوسی (1270ھ) اور الاتقان میں علامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں کہ یہ قول عام لوگوں نے اختیار کیا ہے اور ابو عبید (224ھ)، ثعلب، ابن عطیہ، نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[3]

پادری برکت اللہ نے اس پہلو سے اعتراض کرتے ہوئے قرآن مجید کے "سبعہ احرف" کو متن قرآن کے تضادات پر محمول کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ عرب کے قبائل کے سات لغات تھے تو پھر حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کا تلاوت قرآن مجید میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا کہ یہ دونوں حضرات تو قریشی تھے۔[4]

اس اشکال کی وضاحت مولانا شمس الحق افغانی یوں فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے ایک قبیلہ کی لغت کے مطابق سنا ہوا ہو اور ہشامؓ نے اس کے علاوہ دوسرے قبیلہ کی لغت کے مطابق۔ اور نزاع کی نوبت اسی لئے آئی ہو۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کے اختلاف والے واقعے سے مولانا شمس الحق یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "سات حروف" سے مراد عرب کی سات لغت ہیں نہ کہ صرف قبیلہ قریش کی سات لغات۔[5]

---

(1) عثمانی، حوالہ مذکور

(2) السیوطی، حوالہ مذکور

(3) آلوسی: روح المعانی، 21/1، السیوطی، حوالہ مذکور

(4) برکت اللہ، پادری: صحت کتب مقدسہ، عربیک سوسائٹی لاہور، 1964ء، ص162

(5) افغانی، شمس الحق: علوم القرآن، ص129

سبعہ احرف کی تشریح کے بارے میں علماء میں جو اختلاف نقل کیا گیا ہے ان میں سے یہ نقطہ نگاہ کہ سبعہ احرف اس وقت ختم ہو چکے ہیں، ابن جریر طبری (310ھ) نے پیش کیا اور بعد میں ان کے مقام کے پیش نظر لوگوں نے اسے اختیار کر لیا۔ لیکن جب اس مسلئے پر تحقیقی انداز سے نظر ڈالی جائے تو اصل نقطہ نگاہ سامنے آتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ کے پس منظر میں مضبوط دلائل بھی موجود ہیں اور اس کے اختیار کرنے سے قرآن مجید کے متن پر کیے جانے والے کئی ایک اعتراضات خود بخود ہی رفع ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس "سبعہ احرف" کے ختم ہو چکنے پر کئی ایک اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ آئندہ سطور میں واضح کیا جائے گا کہ "سبعہ احرف" ختم نہیں ہوئے بلکہ مصحف عثمانؓ میں موجود ہیں۔

ا۔ اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ "سبعہ احرف" جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام حضور ﷺ خواہش پر عطاء کئے گئے، صحابہ کرامؓ نے اپنی مرضی سے انہیں ختم کر دیا ہو گا۔ صحابہؓ نے اس چیز کو جو قرآن تھی اور جس کی منسوخی کا حکم بھی نہیں آیا تھا محض اپنی مرضی سے اس کا خاتمہ کر دیں سبعہ احرف کو ختم کر دینے کا جواز ابتدائی طور پر علامہ ابن جریر طبری (310ھ) وغیرہ نے یوں دیا ہے کہ ان کی وجہ سے اختلافات پیدا ہونے لگے تھے۔ لیکن یہ سوال فوراً ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ مختلف قراء تیں تو موجود رہیں اور ان کے موجود رہتے ہوئے کسی قسم کے اختلافاتِ امت کا خدشہ نہ ہوا۔ لیکن سبعہ احرف سے اختلافات جنم لینے لگے تھے؟ اس لئے قرین عقل یہی ہے کہ سبعہ احرف ختم نہیں کئے گئے۔

ان مذکورہ بالا دلائل کے ساتھ ساتھ یہ بات بڑی اہم ہے کہ سبعہ احرف کے ختم کر دیے جانے کے حامی حضرات کا نقطہ نگاہ محض ظنی وقیاسی ہے۔ وہ کوئی صریح دلیل اس میں پیش نہیں کرتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ (13ھ) کو جب حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قرآن مجید کا ایک سرکاری نسخہ تیار کروائیں تو انہیں اس پر تردد ہوا کہ جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں۔ یہی حال حضرت زید بن ثابتؓ کے ساتھ ہوا اور وہ بڑی مشکل سے اس کام کیلئے آمادہ ہو سکے۔ جبکہ اس کام میں قرآن مجید میں کسی کمی بیشی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ محض منتشر اوراق کو ایک دھاگے میں پرونا تھا۔ لیکن سبعہ احرف کا جواز اور وجود تو صحیح احادیث سے ثابت شدہ تھا۔ وہ قرآن مجید کا حصہ تھا۔ صحابہ کرامؓ سے یہ بات بعید از امکان ہے کہ انہوں قرآن کے حصوں کو قرآن سے نہ صرف نکلوا دیا بلکہ انہیں ہمیشہ کیلئے فراموش کروا دیا۔ یہ بات قرآن مجید کی آیت:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾ (1)

---

(1) الحجر: 9

(بے شک ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کے خلاف جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن آیات کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی صحابہ کرامؓ اور بعد کے محققین نے وہ آیات کم از کم تاریخی حیثیت میں باقی رکھ کر امت میں موجود رکھا۔ لیکن وہ "حرف" جن کے بارے میں سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ وہ منسوخ نہیں ہوئے تھے۔ ان بنیادوں پر یہ نقطہ نگاہ محل نظر ہے کہ "سبعہ احرف" مٹا دیے گئے ہیں۔

امام طحاوی اور علامہ ابن جریر طبری (310ھ) کے نقطہ نگاہ کو اگرچہ ابتدائی طور پر درست تسلیم کیا جاتا رہا لیکن اس کی زیادہ تر وجہ علامہ موصوف کا علمی مقام ہی تھا جب اس نقطہ نگاہ پر تنقید کی گئی تو علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس کے برعکس نقطہ نگاہ اختیار کر لیا۔ صحابہ کرامؓ کے معاشرے میں اس بات کا تصورؒ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سب مل کر کوئی فیصلہ کر لیں کہ قرآن مجید سے یہ بات نکال دیں اور یہ بات شامل کر دیں ۔حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ کے سامنے ایک عام شہری کھڑا ہو کہ سوال کر سکتا تھا کہ آپؓ کا کرتہ اتنا لمبا کیسے بن گیا؟ ایک عورت بر سر منبر حضرت عمرؓ کو ٹوک سکتی تھی کہ آپ عورتوں کے مہر کم کرنے کا کیونکر کہہ سکتے ہیں جبکہ قرآن ہمیں ڈھیر بھر مہر دینے کی اجازت دیتا ہے۔[1]

مستشرقین اور سبعہ احرف :

مستشرقین نے قرآن مجید میں اختلافات کی موجودگی ثابت کرنے کیلئے "سات حروف" سے قرآن مجید پڑھنے کی اجازت کو بطور دلیل پیش کیا ہے، لیکن یہ نقطہ نگاہ درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ کلام نازل فرمایا، اسی لیے بعض الفاظ ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی، تو اسے متن کا اختلاف نہیں کہا جاسکتا۔ ایک سے زیادہ طریقوں سے بعض الفاظ ادا کرنے کی اجازت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں دی اور نہ ہی لوگوں نے اپنی مرضی سے ایسا کیا۔ اس سلسلے میں اُصولی بات کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں فرمادیا:

قل مایکون لی ان ابدله من تلقاء نفسی ان اتبع الا مایوحی الی[2]

"ان سے کہہ دیجیے کہ میں اپنی مرضی سے قرآن مجید میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میں تو اسی کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ سے وحی کیا جاتا ہے۔"

قرآن کے دوسرے مقامات پر اس بات کا واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ اس اجازت میں اللہ کے علاوہ کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ مثلاً سورۃ المعارج کی آیت نمبر 44 تا 48۔

---

(1) شبلی نعمانی: سیرت النبی، 1/60-70

(2) یونس: 15

سات حرفوں والی حدیث کی ایک اور تشریح سات قراءات متواترہ سے کی گئی ہے اگر یہ تشریح بھی درست تسلیم کی جائے تو بھی قرآن مجید میں تحریف ثابت نہیں کی جاسکتی۔ یہاں بھی یہی اصول کارفرما ہے کہ متکلم اپنے کلام میں خود کوئی تصرف کرتا ہے تو یہ تحریف نہیں ہوتی۔ ان قراءتوں سے پڑھنے کی اجازت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہوئی ہے۔ علامہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) فرماتے ہیں "قرآن مجید الفاظ کا نام ہے اور قراءت قرآنی الفاظ کے طرز تلفظ کا نام ہے۔ لہذا قراءات کے تعدد سے قرآن مجید کے الفاظ میں تحریف کا کوئی سوال نہیں ہے۔ علامہ زرکشی (794ھ) لکھتے ہیں کہ قرآن مجید وحی الٰہی کا نام ہے۔ سات قراءتیں اس کے الفاظ کی ادائیگی کا طریقہ ہیں۔ سات قراءتیں سات قراء تک متواتر طریقہ سے ثابت ہیں۔ آئمہ سبعہ سے حضور ﷺ تک کی سند تو کتب قراءت میں موجود ہے جو ایک راوی نے دوسرے سے نقل کی ہے۔[1] الاتقان میں لکھا ہے کہ ابن الجزری (م ۸۳۳ھ) کہتے ہیں کہ قراءاتِ سبعہ حضور ﷺ تک متواتر ہیں،

چنانچہ علامہ سیوطی (911ھ) لکھتے ہیں:

وقد نصّ علی تواتر ذٰلك کلّه أئمة الأصول کالقاضی أبی بکر وغیره و هو الصّواب لأنه إذا ثبت تواتر اللفظ ثبت علی تواتر أدائِه لأنّ اللفظ لا یقوم إلّا به ولا یصح إلّا بوجوده۔[2]

ائمہ اصول جیسا کہ قاضی ابو بکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) وغیرہ نے تصریح کی ہے، اور یہ ہی درست ہے کہ سات قراءات از اول تا آخر حضور ﷺ تک متواتر ہیں کیونکہ جب الفاظ متواتر ہیں تو طرز ادائے الفاظ بھی متواتر ہے کیونکہ الفاظ کا تلفظ طرز اداء کے بغیر ممکن نہیں۔

سبعہ احرف کی بحث کے حوالے سے مولانا تقی عثمانی نے بڑی تفصیلی معلومات مہیا کی ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "سبعہ احرف" کے بارے میں مسلمان علماء کے افکار میں اختلاف موجود ہے لیکن یہ اختلاف محض نظریاتی نوعیت ہی کا ہے اور عملی اعتبار سے قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت اور اس کی محفوظیت پر کوئی ادنیٰ سا اثر بھی نہیں پڑتا۔ ان تمام نظری اور لفظی اختلافات کے باوجود کہیں بھی یہ نقطہ نگاہ موجود نہیں کہ قرآن مجید میں کوئی سر مو تبدیلی ہوئی ہے۔ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کی جتنی قراءتیں تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچتی ہیں وہ سب صحیح ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت ان میں سے کسی ایک میں کی جاسکتی ہے۔ سب علماء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ متواتر قراءتوں کے علاوہ جو شاذ قراءتیں مروی ہیں انہیں قرآن مجید کا جزء قرار

(1) الزرکشی: البرہان 226،227/1

(2) الباقلانی، القاضی ابو بکر: الانتصار للقرآن، 121/1، ابن الجزری: النشر فی القراءات العشر، 30/1، السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، 524/2

نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ "عرضہ اخیرہ" یا اس سے قبل جو قراءتیں منسوخ کر دی گئیں وہ خود حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق قرآن کا جزء نہیں رہیں۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ سات حروف میں کسی طرح کا معنوی اختلاف موجود نہ تھا۔ لہذا یہ تمام بحثیں نظری ہیں حقیقی نہیں۔[1]

سبعہ احرف کے حوالے سے مستشرقین کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ قراءات دراصل حدیث بالمعنی کی طرح ہیں۔ یعنی جس طرح کسی حدیث کے مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے اسی طرح قرآن کے کسی مفہوم کو بھی اپنے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح قراءات کا آغاز ہوا۔ یہ نظریہ حد درجہ خطرناک ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جیسا چاہتا قرآن مجید کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتا۔[2]

اس نقطہ نگاہ کا رد یوں کیا جاسکتا ہے:

سبعہ احرف سے یہ مفہوم اخذ کرنا دراصل نصوص کی غلط تاویل بلکہ تحریف کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں قراءت بالمعنی کا مفہوم وہ ہرگز نہیں جو حدیث بالمعنی میں پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی قراءت میں اس طرح کا مفہوم اخذ کرنا بے محل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور قراءت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن مجید اسی وحی کا نام ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی جب کہ قراءت اس کے تلفظ اور ادائیگی الفاظ کا نام ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں یہ بات تو دلائل سے ثابت شدہ ہے کہ آپؐ نے ابتدائے اسلام میں اجازت تھی کہ کچھ مقامات پر لوگوں کی سہولت کی خاطر الفاظ کو اپنی زبان میں ادا کر لیا کریں کیونکہ دوسری زبان میں ادائیگی ان کیلئے مشکل تھی۔ اس کا مقصد محض لوگوں کو سہولت بہم پہنچانا تھا۔ لوگوں نے اپنے مصاحف میں اسی مناسبت سے ایک دوسرے سے مختلف الفاظ لکھ رکھے تھے۔ لیکن اختلافات تعداد میں بہت تھوڑے تھے جو آج بھی بطریق تواتر محفوظ ہیں۔ کسی آیت کے جزو قرآن ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ تواتر سے ثابت ہو۔ اس لئے انفرادی نسخوں میں مذکورہ سہولت کی خاطر بعض جگہوں پر انفرادیت کو حروف سبعہ سے قرار دے کر قراءت بالمعنی پر محمول کرنے کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔[3]

قرآن مجید کی مختلف قراءتیں عہد رسالت میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں، لیکن ان قراءتوں کی نوعیت وہ نہیں جو مستشرقین ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اختلاف قراءات سے مراد ایسا اختلاف ہرگز نہیں ہے۔ جس کو معروف معنوں میں تضاد یا تناقض کہا جاسکے بلکہ یہ اختلاف تغایر اور تنوع کا ہے جو قرآنی اعجاز کی علامت ہے۔ امام ابن قتیبہؒ (م ۲۷۶ھ) اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں:

---

(1) عثمانی: علوم القرآن، ص 156،158

(2) صبحی صالح: علوم القرآن، 107،108/1

(3) ایضا

ایک اختلاف کسی چیز کے دوسری چیز سے محض مختلف ہونے کی نوعیت کا ہے، جبکہ دوسرا اختلاف تضاد پر مبنی ہوتا ہے۔ تضاد پر مبنی اختلاف کا قرآن میں پایا جانا جائز نہیں اور تمہیں بحمد اللہ یہ اختلاف قرآن میں نہیں ملے گا، سوائے اس کے کہ کسی امر یا نہی کو منسوخ کر کے کوئی دوسرا حکم دے دیا گیا ہو۔ البتہ پہلی نوعیت کا اختلاف (قرآن میں) پایا جاسکتا ہے۔(1)

امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مابین اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن مجید جن سات حروف پر نازل ہوا ہے ان کے مابین معنی و مفہوم کے لحاظ سے تناقض نہیں پایا جاتا، بلکہ ان کا مفہوم ایک جیسا یا ایک دوسرے کے قریب قریب ہوتا ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا ہے کہ اس کی مثال ایسے ہی جیسے کوئی شخص اقبل (آؤ) کہے یا ھَلُمَّ کہہ دے یا تعال کا لفظ استعمال کرے (جبکہ تینوں کا معنی ایک ہی ہے)۔(2)

قرآن مجید کی مختلف قراءتیں کوئی گورکھ دھندا نہیں کہ جسے سمجھنے سے مستشرقین قاصر ہوں۔ ان کی بہت بڑی جماعت نے اس بارے میں ایسا پروپیگنڈا کیا ہے کہ اس سے قرآن حکیم میں کئی ایک نقائص و عیوب نکالنے کیلئے استدلال کر سکیں۔ نولڈیکے، گولڈزیہر اور آرتھر جیفری وغیرہ نے قرآن کے اس پہلو کو غلط رنگ دے کر اسے خوب اچھالا ہے۔(3) ان لوگوں نے لکھا ہے کہ قراءتوں کا اختلاف درحقیقت سماعی نہیں تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے جو نسخے تیار کئے تھے ان پر نقطے اور حرکات نہیں تھے۔ اس لئے اسے مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جس شخص نے جس طرح چاہا پڑھ لیا۔ اور وہ اس شخص کی قراءت بن گئی۔(4)

مستشرقین کے اس دعوے کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراءتیں معروف ہیں وہ حضورؐ سے ثابت نہیں بلکہ مصحف عثمانی کو پڑھنے میں لوگوں کا جو ختلاف ہوا اس کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں۔ یہ دعویٰ بے بنیاد اور بالکل غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانی کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا قراءتوں کے وجود میں آنے کا سبب نہیں بنا۔ بلکہ ان مصاحف عثمانی کو نقطوں اور حرکات سے جان بوجھ کر اس لئے خالی رکھا گیا کہ

---

(1) تاویل مشکل القرآن، صفحہ 33

(2) مجموع الفتاویٰ، جلد تیرہ، صفحہ 193

(3) Noldeki, Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit, P.128; Jeffery, Arthur, Material for The History of The Text of The Quran, P.6

(4) عثمانی: علوم القرآن، ص 233

قرآن حکیم کی جتنی قراءتیں حضورؐ سے ثابت ہیں وہ سب اس رسم الخط میں سماسکیں۔ ہر دور میں قرآن مجید کی کسی قراءت کو قبول کرنے کیلئے تین شرائط کو لازمی سمجھا گیا۔ ایک یہ کہ مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش موجود ہو۔ دوسری یہ کہ وہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔ تیسری یہ کہ حضورؐ تک اس کی سند میں کوئی سقم نہ ہو۔[1]

لہذا کوئی قراءت اس وقت تک جائز سمجھی ہی نہیں گئی جب تک کہ اس کی سند حضورؐ تک ثابت نہ ہو۔ اگر قراءتوں کے وجود میں آنے کا سبب محض رسم الخط عثمانی ہوتا تو ہر اس قراءت کو درست تسلیم کرلیا جاتا، جو اس رسم الخط میں سماسکتی اور اسے قبول کرنے کیلئے سند کی شرط عائد نہ کی جاتی۔ تھوڑے سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عثمانی رسم الخط میں ایک لفظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی گنجائش موجود تھی، لیکن جو طریقے حضورؐ سے ثابت نہ تھے۔ انہیں اختیار نہیں کیا گیا۔ اس بات کو عملی طور پر مصحف عثمانی کے نمونے دیکھ کر بآسانی واضح کیا جاسکتا ہے، ملاحظہ ہو مشہد حسینی قاہرہ میں رکھا ہوا ایک قدیم مصحف جو کہ اعراب اور نقطوں وغیرہ سے بالکل خالی ہے۔ ان صفحات میں سورۃ البقرۃ کی آیات میں موجود اختلاف قراءات کا بخوبی ادراک کیا جاسکتا ہے کہ وہ محض مصاحف کے اعراب اور نقطوں سے خالی ہونے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی ہیں بلکہ ہر ہر قراءت کی باقاعدہ ایک متصل سند ہوتی ہے، جس کے بغیر کوئی بھی قراءت قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ۔[2]

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ۔[3][4]

مذکورہ آیات میں کلمہ لاتقبل میں دو قراءتیں ہیں:

۱۔ لَا تُقْبَلُ

۲۔ لَا يُقْبَلُ

---

(1) ابن الجزری: النشر فی القراءات العشر، 1/9

(2) البقرۃ: 48

(3) البقرۃ: 123

(4) یہ مکمل مصحف جمهوریه مصر العربیه کی وزارت الاوقاف، المکتبه المرکزیه للمخطوطات الاسلامیه نے انٹرنیٹ پر جاری کیا ہے۔

اور ان دونوں قراء توں کی گنجائش مصحف عثمانی میں موجود ہے۔ جبکہ دوسری آیت کا کلمہ وَلَا تَنفَعُهَا میں بھی مصحف عثمانی میں تو گنجائش موجود ہے لیکن یہاں وَلَا يَنفَعُهَا کسی قاری کی قراءت نہیں ہے۔[1]

پوری امت میں صرف ایک شخص ابو بکر بن مقسم نحوی (م ۳۵۴ھ) کا ذکر ملتا ہے جن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ عثمانی مصاحف میں اعراب اور نقاط نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی شخص قراءات کو اپنے اجتہاد کی بنا پر اخذ کر سکتا ہے۔ اس کی سند کا حضور ﷺ تک پہنچنا ضروری نہیں ہے۔[2]

لیکن علماء نے ان کے اس نظریے کو رد کر دیا، ان پر سخت تنقید کی گئی۔ تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی (463ھ) نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ابن مقسم کو قراء اور فقہاء کی ایک مجلس میں سرکاری طور پر خلیفہ کی طرف سے بلایا گیا اور ان سے توبہ کا مطالبہ کیا گیا چنانچہ انہوں نے اپنے اس نظریے سے رجوع کیا اور تحریری طور پر اس نظریے سے توبہ کر لی۔[3]

خطیب نے ان کے بارے میں یہ لطیفہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کی وفات کے بعد ابو احمد لقرضی نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھ رہے ہیں۔ قرضی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ انہوں نے قرآن مجید کی قراءت میں علماء کی مخالفت کی۔[4]

ابن مقسم کا سرکاری دربار میں طلب کیا جانا اور ان کا اس مسئلے سے رجوع کرنا اس بات کی ٹھوس شہادت ہے کہ امت نے کبھی یہ بات روا نہیں رکھی کہ مصحف عثمانی سے اپنے اجتہاد کے مطابق قراءت اختیار کر لیں بلکہ اس قسم کے نظریے کو امت نے گمراہی قرار دیا ہے۔ اور اسی عقیدے پر امت کا اجماع ہے۔

مستشرقین نے قرآن کریم کی بعض شاذ قراء توں کو بنیاد بنا کر غلط مفروضات کا قلعہ تعمیر کر لیا ہے۔ ان لوگوں میں خصوصاً گولڈ زیہر اور آرتھر جیفری ہیں۔ وہ مختلف شاذ قراءتیں بیان کر کے ان سے من مانے معانی اور نتائج نکالتے ہیں۔ ان قراء توں کا ڈاکٹر عبد الحلیم نے خوب جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے گولڈ زیہر کی کتاب کے حاشیے پر اس کے نقطہ نگاہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ حضرت عثمانؓ یا کسی اور نے نہ تو قرآن مجید میں سے کوئی چیز خارج کی اور نہ ہی اس کا امکان ہو سکتا تھا

---

(1) ابن الجزری: النشر فی القراءات العشر، 2/،: نیز دیکھیے مصحف الصحابہ فی القراءات العشر المتواترہ من طریق الشاطبیہ والدرة: دار الصحابہ، 1425ھ، ص7 وص119

(2) ابن الجزری: النشر فی القراءات العشر، 17/1

(3) البغدادی، ص208-206

(4) ایضا

سبعہ احرف کی تشریح کچھ بھی کی جائے، کسی صورت میں بھی قرآن مجید میں سے کچھ خارج کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

قرآن مجید کی قراءتوں کے بارے میں بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ حضور ﷺ سے ثابت شدہ تمام قراءتیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ امت نے متفقہ طور پر یہی طرز عمل اختیار کیا ہے کہ صرف ان تین شرائط پر پوری اترنے والی قراءت کو ہی جائز قراءت تسلیم کیا ہے۔ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے اس کے علاوہ وہ امت نے شاذ قراءتوں پر بھی تحقیق کی ہے ان میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی بات موجود ہو تو اسے شاذ قراءت کہا جاتا ہے۔

(۱) بعض اوقات وہ قراءت بالکل موضوع ہوتی ہے جیسے ابوالفضل محمد بن جعفر خزاعی کی قراءتیں۔ جن کو اس نے امام ابوحنیفہ ؒ (150ھ) کی طرف منسوب کیا ہے امام دار قطنی اور تمام علماء نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ یہ تمام قراءتین موضوع ہیں۔

(۲) بعض اوقات اس کی سند بالکل ضعیف ہوتی ہے۔ جیسے ابن السمیفع اور ابوالسمال کی قراءتیں۔ یا وہ بہت سی قراءتیں جن کا ذکر ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں کیا ہے، اور انہیں کسی صحابی یا تابعی کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۳) بعض اوقات قراءت کی سند تو صحیح ہوتی ہے مگر در حقیقت وہ قرآن حکیم کی قراءت نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی صحابیؓ یا تابعیؒ کی عام گفتگو ہوتی ہے جو انہوں نے قرآن کے کسی لفظ کی تشریح کیلئے ایک دو الفاظ کی شکل میں کی ہوئی ہے۔ قرآن کریم چونکہ متواتر ہے اور ہر دور میں اس کے حفاظ موجود رہے ہیں اس لئے ان تشریحی الفاظ کے قرآن کے ساتھ خلط ملط ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس طرح تشریحی الفاظ بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً سعد ابن ابی وقاص سے مروی ہے کہ انہوں نے وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ میں مِنْ اُمٍّ پڑھا۔ اس میں من ام کا لفظ تشریحی مقصد کے تحت تھا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ انہوں ولتكن منكم امة يدعون میں عن المنكر کے بعد ويستعينون الله على ما اصابهم۔ کے الفاظ تفسیری مقصد کے تحت کہے۔ اگر یہ الفاظ ان کے نزدیک قرآن کے الفاظ ہوتے تو وہ انہیں اپنے مصحف میں لکھواتے۔ ان کے مرتب کروائے ہوئے نسخوں میں سے کسی ایک میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں تھے۔ اس طرح جن لوگوں نے ان الفاظ یا اس قسم کے الفاظ کو قرآن سمجھا وہ شاذ قراءت کو قرآن سمجھ بیٹھے۔

(۴) بعض اوقات، کوئی قراءت بعد میں منسوخ کر دی گئی کسی کو اس کی منسوخی کا علم نہ تھا۔ اور وہ اس کے مطابق قرآن پڑھتے رہے۔

(۵) بعض شاذ قراءتوں کو پڑھ کر ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی تابعی سے قرآن کریم کی تلاوت میں کوئی بھول چوک ہوگئی۔ کسی مقتدی سننے والے نے اس کو ہی یاد کر لیا۔

قرآن مجید کی شاذ قراءتیں عام طور پر انہی قراءتوں میں سے کسی نہ کسی قسم سے متعلق رہی ہیں۔ امت کے سامنے اصل قرآن اور شاذ قراءتوں کا معاملہ بالکل واضح تھا اس لئے کسی خلط ملط کا سوال ہی نہ تھا۔ (1)

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے مختلف قراءتوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ یہ اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ متواتر

۲۔ مشہور

۳۔ احاد

۴۔ شاذ

۵۔ موضوع۔ (2)

وہ موضوع قسم کی قراءتوں کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مجھ پر ایک اور قسم عیاں ہوئی جو احادیث کی انواع سے مشابہ ہونے کے باعث "مدرج" کہلا سکتی ہے۔ یہ اس قسم کی قراءت ہے جو دیگر قراءتوں میں تفسیر کے طور پر زیادہ کر دی گئی ہو۔ مثلاً سعد ابن ابی وقاص کی قراءت "ولہ أخ أو أخت من أم"۔ (3)

اور حضرت ابن عباسؓ (68ھ) کی قراءت "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم فی مواسم الحج"۔ (4)

---

(1) النجار، عبدالحلیم: مذاہب التفسیر الاسلامی، مصر، مطبع الجانجی، 1955، ص 12-25

ابن الجزری: النشر فی القراءات العشر، 1/16

(2) ایضا

(3) النساء: 12، دیکھیے: الخطیب، عبداللطیف: معجم القراءات، القاہرہ: دار سعد الدین، 1422ھ، 2/32، 31 اس آیت میں اخیافی اور علاتی بھائی بہنوں کی وراثت کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ آیت میں مذکور بھائی اور بہن سے اخیافی یا علاتی کون سے مراد ہیں؟ من ام کے تفسیری الفاظ سے وضاحت کی گئی کہ اخیافی یعنی صرف ماں کی طرف سے بھائی بہن مراد ہیں۔

(4) البقرۃ: 198، الخطیب، عبداللطیف: معجم القراءات، 1/273، 274، یہاں بھی فی مواسم الحج کے الفاظ تفسیری ہیں

مستشرقین کی طرف سے وقتاً فوقتاً قرآن مجید کی حقانیت پر جو اعتراضات کئے گئے ان میں سے بہت سے اعتراضات اس کی صحت اور حفاظت کے بارے میں ہیں۔ پھر اس پہلو سے خاص طور پر اختلاف قراءات اور سبعہ احرف کو بنیاد بناتے ہوئے طرح طرح کی بدگمانیاں قرآن مجید کی حفاظت کے ساتھ منسوب کر دی ہیں۔ دوسری طرف ہر شخص کے بس کا معاملہ نہیں کہ وہ سبعہ احرف اور اختلاف قراءات کی حقیقت کو جان سکے۔ لہذا وہ مستشرقین کے اعتراضات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس قسم کی بدگمانیوں میں سے ایک بدگمانی یہ ہے کہ مستشرقین کہتے ہیں کہ سات قراءتیں ابن مجاہد نے ایجاد کیں۔

مولانا تقی عثمانی نے منٹگمری واٹ (Montgomery Watt(1909-2006)) اور رچرڈ بل (Richard Bell) کے نقطہ نگاہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جس میں انہوں نے ابن مجاہد پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابن مجاہد نے سات قراءتیں جمع کر کے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ حدیث میں قرآن کریم کے جن "سات حروف" کا تذکرہ ہے ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں، دوسری طرف ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان سات قراءتوں کے علاوہ دوسری کوئی قراءت قابل اعتماد نہیں، چنانچہ دوسرے علماء نے بھی ان کے اس نظریہ کو قبول کر لیا اور اسی بنا پر علماء نے ابن مقسم اور ابن شنبوذ کو اپنے نظریات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا، کیونکہ وہ دوسری قراءتوں کو بھی قابل اعتماد سمجھتے تھے۔ (1)

مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ واٹ کے مذکورہ بالا بیان میں ایک بات بھی درست نہیں۔ اس زمانے میں مختلف علماء اور قراء نے اپنی اپنی سہولت کے لحاظ سے کئی کئی قراءتیں ایک ایک کتاب میں جمع کر رکھی تھیں۔ ان میں کسی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کے علاوہ دوسری قراءتیں ناقابل اعتماد ہیں۔ خود امام ابن مجاہد نے بھی ان سات قراءتوں کو جمع کرتے وقت کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ "سات حروف" کی تشریح ہے اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ صحیح قراءتیں انہی سات میں محدود ہیں۔ دوسرے علماء نے بھی ان کے عمل سے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ دوسری قراءتوں کو ناقابل اعتماد قرار دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے تمام محقق علماء اس خیال کی ہمیشہ تردید کرتے آئے ہیں۔ علم قراءت کے مستند ترین عالم علامہ ابن الجزری نے جو محقق کے لقب سے مشہور ہیں اپنی کتابوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے اس بحث کو اس لئے طول دیا ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض بے علم لوگ صرف انہی سات قراءتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد صرف یہی سات قراءتیں ہیں۔ اسی بنا پر بہت سے آئمہ متقدمین نے ابن مجاہد پر یہ تنقید کی ہے انہیں سات قراءتیں جمع کرنے کے

(1) Watt, Introduction of Bell's Translation of the Quran, P.48,49

بجائے سات سے کم یا سات سے زائد قراء تیں ذکر کرنی چاہییں اور انہیں اپنی مراد واضح کر دینی چاہیے تھی تاکہ بے علم لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔" [1]

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے بہت سے ائمہ قراءت کے اقوال نقل کئے ہیں۔ [2]

اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے ائمہ قراءت کے اقوال نقل کئے ہیں جن میں واضح کیا گیا ہے کہ ابن مجاہدؒ نے صرف "مصاحف سبعہ" کے عدد کی رعایت سے "سات قراء تیں" جمع کر دیں۔ ورنہ ان کا مقصد باقی قراء توں کو غلط یا نا قابل اعتماد قرار دینا نہیں تھا۔ [3]

ابن مقسمؒ اور ابن شنبوذؒ کی جو تردید علماء نے کی ہے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان سات قراء توں کے علاوہ دوسری قراء توں کو کیوں صحیح سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ امت کے تمام علماء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ کسی قراءت کے صحیح ہونے کیلئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ عربی صرف و نحو کے قواعد کے مطابق ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ متصل سند کے ساتھ منقول اور رائمہ قراءت میں مشہور ہو۔ یہ شرائط جس قراءت میں پائی جائیں وہ قابل قبول ہوگی خواہ وہ سات قراء توں میں شامل ہو یا نہ ہو اور جہاں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ نا قابل اعتماد ہے خواہ وہ ان سات قراء توں میں شامل ہی کیوں نہ ہو۔ [4] لیکن ابن مقسم اور ابن شنبوذ نے اس اجماعی اصول کی خلاف ورزی کی تھی۔ [5] محمد بن مقسم کا کہنا یہ تھا کہ قراءت کے صحیح ہونے کے لئے پہلی دو شرطیں ہی کافی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی قراءت مصحف عثمانیؓ کے رسم الخط کے مطابق ہو اور عربیت کے اعتبار سے بھی صحیح ہو تو اسے قبول کر لیا جائے گا خواہ اس کی کوئی سند موجود نہ ہو اور ابن شنبوذ نے اس کے برعکس کہا تھا کہ اگر کوئی قراءت صحیح سند کے ساتھ منقول ہو اور رسم الخط عثمانی میں خواہ اس کی گنجائش نہ نکلتی ہو اسے پھر بھی قبول کر لیا جائے گا۔ اس بنا پر امت کے تمام علماء نے ان دونوں کی تردید کی۔ بحث و تمحیص کے بعد ان لوگوں کو جمہور علماء کے قول کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ [6]

---

(1) ابن الجزری، النشر فی القراءات العشر، 35،36/1

(2) العسقلانی، ابن حجر، فتح الباری، 9/25-27

(3) السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن،

(4) عثمانی: حوالہ مذکور 208

(5) ایضا

(6) ایضا

نواں باب

اختلاف مصاحف اور مستشرقین

اختلاف مصاحف

اختلافِ مصاحف کی حقیقت

اختلافِ مصاحف اور مستشرقین

مصحفِ ابن مسعودؓ کا تحقیقی جائزہ

معوذتین کے شامل قرآن نہ ہونے والی روایات کا جائزہ

عبدالرحمن بن یزید کی روایت کا جائزہ

مذکورہ بالا روایات کا تنقیدی جائزہ

علقمہ کی روایت

علقمہ سے مروی روایات کا تنقیدی جائزہ

***

اختلاف مصاحف

مستشرقین کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا متن کبھی بھی متعین نہیں کیا جاسکا۔ اختلاف مصاحف کی بنیاد پر انہوں نے مندرجہ ذیل موقف اختیار کیا ہے:

1. عہد نبوی ﷺ میں قرآن مجید کا کوئی باقاعدہ نسخہ موجود نہ تھا۔ لوگ اپنے اپنے ذاتی مصاحف سے تلاوت کیا کرتے تھے۔[1]
2. عہد صدیق رضی اللہ عنہ میں بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوشش کے باوجود سب لوگ ایک نسخے پر جمع نہ ہوئے بلکہ ذاتی مصاحف زیر تلاوت رہے۔[2]
3. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اگرچہ ایک نسخہ سرکاری طور پر رائج کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا، تاہم پتہ چلتا ہے کہ آپ کی اس کاروائی کے بعد بھی کئی ایک مصاحف موجود رہے۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا ایک ہی نسخہ سرکاری طور پر ساری مملکت میں رائج فرما دیا تھا، اس واقعے سے مستشرقین متضاد قسم کے فیصلے اور نتائج اخذ کرتے ہیں، مثلاً:

4. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ جلا ڈالا۔ اصل قرآن مجید تو اس مواد پر مشتمل تھا جسے جلا ڈالا گیا۔ گویا یوں قرآن مجید کا لا محدود اور نامعلوم حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ موجودہ قرآن ادھورا ہے۔[4]
5. احراق مصاحف کی کاروائی مکمل طور پر نہیں ہو پائی اور عہد عثمانؓ کے بعد بھی کئی ایک مصاحف موجود رہے۔ ان مصاحف کی موجودگی میں قرآن مجید کے موجودہ متن کو کس طرح حتمی حیثیت دی جاسکتی ہے؟[5]

آرتھری جیفری نے ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف کی مدد سے ان مصاحف کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے ان کے خصائص بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو جمع قرآن کے بعد بھی موجود رہے۔

---

(1) Bell,Richard: Introduction to the Quran,p.38

(2) Ibid,p.39

(3) Ibid,p.40-43

(4) Ibid,p.44

(5) Jeffery,Arthur, p.8

بعض کو تو حضرت عثمانؓ نے ضائع کروا دیا اور بعض زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مفقود ہو گئے۔ (1)

اس سلسلے میں ڈاکٹر منگانا (Mingana) نے تو ایک کتاب لکھی، جس کا نام Leaves From Three Ancient Korans ہے۔ اس کتاب میں منگانا نے ایک عورت Agnes Smith Lewis سے حاصل کردہ قرآنی اوراق کو اکٹھا کر کے قرآن مجید میں تحریف اور اختلاف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان اوراق کے بارے میں مذکورہ لیڈی کا خیال ہے کہ یہ اوراق عہد عثمانؓ سے پہلے کے اوراق ہیں اور یہ احراق مصاحف کی کاروائی سے بچ گئے تھے۔ (2)

لیکن اس نے اپنے دعویٰ کی کوئی ایک دلیل بھی نہیں دی۔ اختلاف مصاحف کے ضمن میں مستشرقین نے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منسوب ان بیانات کو خوب اچھالنے کی کوشش کی ہے جو ان کی اس وقت کی گفتگو پر مشتمل ہیں جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنا ذاتی مصحف جلا ڈالنے کو کہا گیا۔ روایات میں یہ بات موجود ہے کہ اس موقع پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (32ھ) نے فرمایا تھا کہ میں اپنا مصحف نہیں جلاؤں گا کیونکہ یہ اس کے مطابق ہے جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہا تھا کہ وہ بھی اپنے مصاحف چھپالیں اور جلنے نہ دیں۔ اور انہوں نے اپنے ذاتی مصحف کو جلنے سے بچا لیا تھا۔ (3)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (32ھ) کے بارے میں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ پر اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا میں نے جب ستر سورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ لی تھیں، اس وقت زید بن ثابت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس روایت کی تفصیل یوں ہے:

وَقَدْ شَقَّ عَلَى ابْنِ مَسْعُودٍ صَرْفُهُ عَنْ كِتَابَةِ الْمُصْحَفِ حَتَّى قَالَ مَا أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ فِي آخِرِ حَدِيثِ إِبْرَاهِيمَ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ مِنْ طَرِيقِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ مَهْدِيٍّ عَنْهُ، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَأَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ

---

(1) Ibid

(2) Mingana, A.: Leaves from Three Ancient Korans, Cambridge Universty, Manchester University Press, 1914, p.v-vll (Preface)

(3) العسقلانی، ابن حجر: فتح الباری شرح البخاری، حدیث نمبر: ۴۶۱۶ (کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ؛ مسند احمد، حدیث نمبر: ۳۹۲۹

بْنِ مَسْعُودٍ كَرِهَ لِزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ نَسْخَ الْمَصَاحِفِ وَقَالَ: يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ أُعْزَلُ عَنْ نَسْخِ كِتَابَةِ الْمَصَاحِفِ وَيَتَوَلَّاهَا رَجُلٌ وَاللهِ لَقَدْ أَسْلَمْتُ وَإِنَّهُ لَفِي صُلْبِ رَجُلٍ كَافِرٍ، يُرِيدُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ۔ وَأَخْرَجَ ابْنُ أَبِي دَاوُدَ مِنْ طَرِيقِ خُمَيْرِ بْنِ مَالِكٍ بِالْخَاءِ مُصَغَّرٌ: سَمِعْتُ ابْنَ مَسْعُودٍ يَقُولُ لَقَدْ أَخَذْتُ مِنْ فِيِّ رَسُولِ اللهِ ﷺ سَبْعِينَ سُورَةً وَإِنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ لَصَبِيٌّ مِنَ الصِّبْيَانِ [1]

اختلافِ مصاحف کی حقیقت

مصحف کا مادہ ص۔ح۔ف ہے۔ مصحف ایسی کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں متعدد رسائل اور اوراق جمع ہوں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی موجود ہے مثلاً ﴿فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ [2] ﴿إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ﴾ [3] مصحف کی جمع مصاحف اور صحیفہ کی جمع صحف اور صحائف ہے۔ یہ لفظ اِصحاف کا صیغہ اسم مفعول ہے جس کا مادہ ص ح ف ہے۔ اسی سے لفظ صحیفہ منتشر اوراق کے جمع کرنے کو کہا جاتا ہے قرآن مجید پر اس اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق یوں ہوا کہ یہ ان تمام اوراق کو بین الدفتین جمع کرنے سے معرض وجود میں آیا جن پر عہد نبویؐ میں آیات قرآنیہ لکھی گئی تھیں۔ [4]

علامہ جلال الدین سیوطی نے کتاب المصاحف کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کے عہد میں جب قرآن مجید کا باقاعدہ (سرکاری) نسخہ مرتب کیا گیا تو اس نسخے کے نام کے تعین میں مختلف آراء پیش کی گئیں۔ کسی نے کہا کہ اس کا نام سفر (کتاب) رکھا جائے۔ لیکن یہ نام چونکہ یہود کی کتاب توراۃ کے حصوں کے لئے مستعمل تھا اس لئے اسے پسند نہ کیا گیا۔ پھر عبد اللہ ابن مسعودؓ یا سالم مولیٰ حذیفہؓ نے بتایا کہ انہوں نے حبشہ میں لوگوں کو اس طرح کی کتاب کو مصحف کہتے سنا ہے۔ لہذا یہ نام پسند کیا گیا اور اسی کو اتفاق رائے سے اختیار کر لیا گیا۔ [5] لیکن جب لفظ مصاحف یا اختلاف مصاحف استعمال کیا جائے تو اس سے مراد قرآن مجید کے وہ نسخے ہیں جو عہد نبویؐ میں صحابہ کرامؓ نے نزولِ وحی کے ساتھ ہی انفرادی طور پر اپنے لئے تیار کیے تھے۔ یہ نسخے انہوں نے ذاتی یادداشت کیلئے تیار کئے تھے۔ ان نسخوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ

---

(1) العسقلانی: فتح الباری، حدیث نمبر: ۴۶۰۴ (کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن)

(2) عبس: 13-14

(3) الاعلیٰ: 18-19

(4) ابن منظور، لسان العرب، جلد 9، ص: 186

(5) سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، مطبعہ حجازی، قاہرہ، س،ن جلد 1، ص: 62

تھی جتنی تعداد میں صحابہ کرامؓ تھے۔ جب عہد صدیقؓ میں تمام صحابہ کرامؓ کے اجماع کے ساتھ قرآن کا سرکاری نسخہ تیار کیا گیا تو اس نسخے کو بھی مصحف کہا گیا۔ قرآن مجید کے وہ نسخے جو صحابہ کرامؓ نے اپنے ذاتی نسخوں کے طور پر لکھے تھے عہدِ صدیقؓ کے نسخے کی تیاری کے بعد بھی موجود رہے۔ کیونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے ان نسخوں سے کوئی تعرض نہیں فرمایا تھا۔

ہر صحابیؓ نے اپنے اپنے انداز سے قرآنی آیات اپنے پاس لکھ رکھی تھیں۔ یہ نسخے ذاتی یاداشتوں کی حیثیت رکھتے تھے ان میں ضروری نہیں کہ کوئی ایک ہی ہمہ گیر اور متفقہ اصول کارفرما ہوتا۔ مختلف ذاتی نسخوں میں معمولی فرق بالکل فطری بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک صحابیؓ نے پورے کا پورا قرآن جمع کرنے کا التزام کیا ہو۔ کسی دوسرے نے صرف وہ آیات لکھ رکھی ہوں جو اس نے زبانی یاد کرلی ہوں۔ کسی تیسرے شخص نے صرف وہ آیات ہی لکھی ہوں جو ابھی اسے زبانی یاد نہیں ہوئیں اور یاد کرنے کی غرض سے ہی اس نے آیات لکھی ہوں کسی چوتھے شخص نے صرف وہ آیات لکھی ہوں جن سے احکام و فرائض مستنبط ہوتے ہوں۔ غرض ہر شخص نے اپنے اپنے طور پر جس طرح چاہا اپنا اپنا مصحف لکھ رکھا تھا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بہت سے صحابہؓ نے تو قرآن اوّل تا آخر جمع فرمایا لیکن بعض نے کچھ ایسی آیات جو دعاؤں کے طور پر روزانہ پڑھی جاتی ہیں اور ہر شخص کو ازبر تھیں، اپنے ذاتی نسخے میں درج نہ کی ہوں۔ اسی طرح قرآن مجید " سات حروف " (سبعہ أحرف) میں نازل ہوا تھا۔ کسی صحابیؓ نے قرآن کے سات حروف میں سے ایک حرف پر قرآن جمع کیا ہو گا تو دوسرے نے کسی دوسرے حرف پر۔ بعض اوقات تشریحی نوٹس کے طور پر بھی حاشیے یا درمیان میں عبارت لکھ لی جاتی۔ جب کوئی صحابیؓ اپنا مصحف تیار کرتے تو وہ نبی کریمؐ کی طرف سے بیان کردہ وضاحتی الفاظ بھی متن کے درمیان یا سطروں کے درمیان لکھ لیتے اگر دوسرے کوئی صحابیؓ سمجھتے کہ انہیں یہ وضاحتی الفاظ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے تو وہ یہ وضاحتی الفاظ نہ لکھتے۔ لکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ کون سے الفاظ متن کے ہیں اور کون سے وضاحتی الفاظ ہیں۔ یہ وضاحتی الفاظ صحابہؓ کے ذاتی مصاحف میں موجود رہے۔ صحابہؓ نے ان الفاظ کو اس لئے بھی لکھ رکھا تھا کہ یہ رسول ﷺ کے بیان کئے ہوئے الفاظ ہیں۔ بعد میں لوگوں نے جس چیز کو اختلاف کا نام دیا، اس کی اصل نوعیت ایسی ہی تھی۔ قرآن مجید کی زبان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ اس اختلاف یا فرق کے ساتھ ساتھ بہت سے صحابہؓ کے پاس قرآن کا مکمل متن لکھا ہوا بھی موجود تھا اور حافظوں میں بھی موجود تھا اس سلسلے میں تفصیلات علوم القرآن کی کتب میں موجود ہیں۔[(1)]

یہ تمام حقائق واضح کرتے ہیں کہ مختلف صحابہؓ نے ذاتی طور پر اپنا اپنا مصحف تیار کر رکھا تھا۔ لیکن

---

(1) ایضاً: ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد 9، ص 10

اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآن مکمل حالت میں لوگوں کے سینوں میں بھی محفوظ ہو رہا تھا۔ اور حضورؐ کی زیر نگرانی ایک نسخہ مرتب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس بنا پر صحابہ کرامؓ کے پاس جو ذاتی نسخے تھے۔ انہیں بھی مصاحف کا نام دیا گیا۔ اور مذکورہ بالا نوعیت کے جو اختلاف تھے، انہیں اختلاف مصاحف کہا گیا۔

اختلاف مصاحف اور مستشرقین:

اختلاف مصاحف کو مستشرقین نے من مانے معانی و مفاہیم دے کر اور حقیقت کو ایک خود ساختہ رخ دے کر قرآن مجید کے متن میں اختلافات ثابت کرنے کیلئے اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اصل حقائق کو مسخ کر کے پورا زورِ استدلال اسی پر صرف کر دیتے ہیں کہ

(i) جب عہد نبویؐ میں لوگوں کے پاس مختلف نوعیت کے نسخے موجود تھے تو پھر اس کے بعد اور آج کس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اصل قرآن حاصل کیا جا سکے۔

(ii) موجودہ قرآن مجید کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اصل اور حقیقی قرآن ہے۔ قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا کیونکہ مختلف صحابہؓ کے پاس جو نسخے موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ نے وہ نسخے جلوا دیئے اس طرح قرآن مجید کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔[1]

(iii) آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) نے بطور خاص اس پہلو کو خوب اچھالا ہے اس کا کہنا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف ضائع کروا دیئے، اگر وہ موجود ہوتے تو آج ہم قرآن کا اصل متن حاصل کر لیتے۔ اب جبکہ یہ مصاحف ضائع ہو چکے ہیں تو اس بات کا امکان نہیں ہے کہ قرآن کا اصل متن حاصل کیا جا سکے۔[2]

آرتھر جیفری نے منتخب قرآنی سورتوں کا خود اپنی تیار کردہ نئی ترتیب نزولی کے مطابق ترجمہ کیا اور اس نے تقریباً ۶۰۰۰ چھ ہزار ایسے مقامات کی نشاندہی کی جو کہ مصحف عثمانی سے مختلف تھے۔ اس نے قراءات کے یہ سارے اختلاف تفسیر، لغت، ادب اور قراءات کی کتابوں میں سے جمع کیئے۔ اس کام کے لیے ابن ابوداود کی کتاب "کتاب المصاحف" اس کا بنیادی ماخذ رہی۔

---

(1) Bell, Richard, Introduction To The Quran , Edinburgh, university press, Edinburgh, 1958 p 39-40

Jeffery, Arthur, Material For the History of The Text of The Quran, E.J. Brill, London, 1937.p.3

(2) IBID. P.3

دراصل جیفری اپنے خودساختہ تنقیدی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآن کا ایک تنقیدی نسخہ اس طرح مرتب کرنا چاہتا تھا کہ ایک صفحے پر کوفی خط میں متن قرآن ہو اس کے سامنے دوسرے صفحے پر تصحیح و تنقیح شدہ روایتِ حفص کے مطابق متنِ قرآن ہو اور حواشی (Footnotes) میں قرآن حکیم کی تمام معلوم مختلف قراءتوں کو بیان کر دیا جائے[1] جیفری اپنی اس خواہش کے مطابق مکمل قرآنی نسخہ لانے میں تو کامیاب نہ ہو سکا مگر اس نے مصحف عثمانی سے فرق رکھنے والے[2] دیگر نسخہ جات ڈھونڈ نکالنے اور اسلامی علوم کے ورثہ میں سے مختلف قراءتوں کی بنا پر ۱۵ "بنیادی" اور ۱۳ "ثانوی نسخہ جات" کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ۱۵ "بنیادی نسخہ جات کو حضرات عبد اللہ بن مسعودؓ، حفصہؓ، عمر بن خطابؓ، زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، ابن عمرؓ، عائشہؓ، سالمؓ، ام سلمہؓ، عبید بن عمیر رضوان اللہ علیھم کی جانب منسوب کیا۔ اور بعض ثانوی نسخہ جات کو بھی چند تابعین کی جانب منسوب کیا۔ جن میں سے کچھ کے اسماء گرامی یہ ہیں ابو الاسود، علقمہ بن جبیر، سعید بن جبیر، طلحہ، عکرمہ، مجاہد، عطا بن ابی رباح، الاعمش، جعفر صادق، صالح بن کیسان اور الحارث بن صویب رحمھم اللہ۔ ان کے ساتھ ساتھ جیفری نے مختلف قراءتوں پر مشتمل دیگر نسخہ جات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر ان کے حاملین کے نام کا ذکر نہیں کیا، یہاں یہ حقیقت یاد رکھنے کے لائق ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے جس کے نام سے بھی جیفری نے کوئی نسخہ منسوب کیا ہے ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ نسخہ تحریری شکل میں موجود نہ تھا اور نہ ہی ان میں سے کوئی اس نسخے کو قرآن حکیم کے مقابلے میں اپنے پاس رکھنے کا دعویدار تھا۔ مگر جیفری نے مصحف عثمانی میں موجود قراءات سے کسی ایک مقام پر یا چند مقامات پر اختلاف کی بنا پر مندرجہ بالا اصحاب کو مقابل قرآن کا حامل بنا دیا۔ قطع نظر اس کے کہ اختلاف کرنے والے کو مصحف عثمانی کے نافذ و رائج ہو جانے کے بعد اپنی قراءات پر اصرار رہا یا اس نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ متذکرہ بالا طبقہ اولیٰ میں سے بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنیادی مصاحف کا موجود ہونا کتاب المصاحف[3] وغیرہ میں نقل کیا گیا ہے۔ کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس قرآن حکم کا اپنا نسخہ تھا حتی کہ مصحف عثمانی کے نافذ و رائج ہونے تک یہ صورت حال برقرار رہی لیکن ان نسخہ جات میں سے کوئی نسخہ اب صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہے۔ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے جیفری لکھتا ہے "ان نسخہ جات میں سے کوئی مناسب مواد باقی نہیں بچا جس کو پا کر ہم ان میں سے کسی نسخے کے متن کی صحیح شکل دیکھنے کے قابل بن سکتے"[4]

---

(1) Arthur,Jeffery,Quran as Scripture, The Textual history of the Quran, P.103

(2) Jeffery,Materials, P.406-408

(3) ابن ابی داود، کتاب المصاحف، صفحہ 50،10،5تا87 آرتھر جیفری، Materials، صفحہ 10

(4) آرتھر جیفری، Materials، صفحہ 10

جیفری مصحف عثمانی سے قبل کی قراءتوں کی جستجو میں ابن شنبود (۳۲۸ھ) اور ابن مقسم (۳۶۲ھ) کا بڑا مداح نظر آتا ہے جنہیں مصحف عثمانی کے نفاذ سے قبل کی غیر قانونی قرار دی جانے والی قراءتوں کو اختیار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا[1]

آرتھر جیفری یہ استدلال بھی کرتا ہے کہ:

"عہد صدیقؓ میں اگر کوئی سرکاری نسخہ تیار کیا گیا ہوتا تو دیگر صحابہؓ کے مصاحف ختم ہو چکے ہوتے۔"[2]

رچرڈ بل (Richard Bell) کا موقف بھی یہی ہے۔[3] گویا ان کے خیال میں عہد صدیقؓ میں تیار ہونے والا نسخہ کوئی باقاعدہ متفقہ اور سرکاری نسخہ نہ تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ متن قرآن کا تعین عہد صدیقؓ میں بھی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس مصحف کی تیاری کے بعد بھی بہت سے صحابہؓ کے پاس ذاتی مصاحف موجود تھے۔

اختلاف مصاحف کی آڑ میں مستشرقین دودھاری تلوار چلاتے ہیں ایک طرف کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن جلوا کر قرآن کے اصل متن کے حصول کی راہیں مسدود کر دیں تو دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ "حضرت عثمانؓ نے قرآن جلوانے کی کاروائی تو کی تھی لیکن یہ کاروائی مکمل طور پر نہیں ہو سکی اور اس کے بعد بھی کچھ مصاحف بچ گئے۔"[4]

مذکورہ بالا مصاحف سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ان بچ جانے والے مصاحف اور موجودہ قرآن میں فرق ہے گویا قرآن کا متن متنازعہ ہے متفقہ نہیں ہے اور مزید یہ کہ اب ان بچ جانے والے چند مصاحف کی مدد سے قرآن کا اصل متن تو حاصل نہیں کیا جا سکتا[5]

مصحفِ ابن مسعودؓ کا تحقیقی جائزہ :

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس جو مُصْحَف موجود تھا۔ اس میں کئی ایک باتیں، امت کے زیر استعمال نسخوں سے مختلف تھیں۔

---

(1) ایضاً، صفحہ 3-1

(2) IBID. P.3

(3) Bell, P. 39-40

(4) Jeffery, P.3

(5) ابوالفضل، میر محمدی، بحوث فی تاریخ القرآن، دار المعارف للمطبوعات، شام، 1980، ص:16

برکت اللہ 'پادری' صحت کتب، مقدمہ، عریبک سوسائٹی، لاہور، 1964، ص:290

۱۔ آپ سورۃ الفاتحہ کو قرآن کا حصہ قرار نہیں دیتے تھے۔

۲۔ آپ کے مصحف میں مُعوّذَتَیْن شامل نہیں تھیں۔

۳۔ اس مصحف میں سورتوں کی ترتیب، مصحف عثمانی سے مختلف تھی۔[1]

ان تین اختلافات کی حقیقت کا جائزہ لیتے ہوئے آئندہ سطور میں ان اختلافات کی حقیقت اور نوعیت بیان کرتے ہوئے ان روایات کا سند کے حوالے سے بھی جائزہ پیش کیا جائے گا جن میں ان اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے۔

محققین کی ایک بڑی تعداد نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ نقطہ نگاہ پیش کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تین سورتوں کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ ابن مسعودؓ سے منسوب اس نقطہ نگاہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۔ ابنِ مسعودؓ کی طرف اس اختلاف کی نسبت ثابت شدہ بات نہیں ہے۔

۲۔ جن روایات میں اس اختلاف کا ذکر ہے وہ روایات معتبر نہیں اور ان میں فنّی اعتبار سے کئی کمزوریاں ہیں۔

۳۔ کچھ وجوہ کی بنا پر ابتداء میں ابن مسعودؓ تین سورتوں کو قرآن میں نہیں لکھتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اس رائے میں تبدیلی کر لی۔

محققین نے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ مسعودؓ انہیں قرآن کا حصہ ہی سمجھتے تھے ذیل میں اس سلسلے میں محققین کی آراء پیش کی جاتی ہیں۔

کتبِ حدیث میں ایسی لاتعداد احادیث موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورتیں باقاعدہ نازل ہوئیں۔ لوگوں نے انہیں قرآن میں لکھا، حضور اکرم ﷺ نے انہیں نمازوں میں پڑھا۔ ظاہر ہے کہ غیر قرآن کی تلاوت نماز میں نہیں کی جاتی۔[2]

---

(1) ان اختلافات کی تفصیل کیلئے مزید دیکھیں عبدالرزاق، مصنف عبدالرزاق، جلد 1، ص: 578، ابن ندیم، الفہرست، ص: 45، سیوطی، الاتقان، جلد 1، ص: 66؛ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص: 15؛ ابنِ اثیر، الکامل، ص: ۱۱۲؛ سیوطی، الدر المنثور، ذیل سورۃ الفاتحہ۔

(2) صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۸۹۱، نیز ابوداؤد: حدیث نمبر: ۱۴۶۲، نیز جامع ترمذی: حدیث نمبر: ۲۹۰۲، سنن النسائی: ۹۵۵، ۹۵۴، ۹۵۳، نیز مسند احمد: حدیث نمبر: ۱۷۲۹۹، ۱۷۲۹۶، نیز سنن الدارمی، حدیث نمبر: ۳۵۰۳، ۳۵۰۲، نیز تفسیر القرآن، ذیل معوذتین، ۵۱۶/۱۴، نیز السیوطی، الدر المنثور، جلد ۱۵، ص: ۸۴۔۸۰۹

۱۔ علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

وأخرج أحمد والبخاری والنسائی وغیرهم عن زر بن حبیش قال اَتَیْتُ الْمَدِیْنَةَ فَلَقِیْتُ أُبَیَّ بْنَ کَعْبٍ فَقُلْتُ لَهٗ 'اَبَا الْمُنْذِرِ! اِنِّیْ رَاَیْتُ ابْنَ مَسْعُوْدٍ لایکتب المعوذتین فی مصحفه فقال اما والذی بعث محمدا بالحق لقد سألت رسول الله صلی علیه وآله وسلم عنهما وما سألنی عنهما أحد منذ سأله غیرك، قال: قیل لی قل، فقلت، فقولوا، فنحن نقول کما قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم۔[1]

"امام احمدؒ، امام بخاری (256ھ) اور امام نسائی وغیرہ نے زر بن حبیش سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ میں مدینہ آیا اور ابی ابن کعب سے کہا کہ اے ابالمنذر میں دیکھتا ہوں کہ ابن مسعود معوذ تین کو اپنے مصحف میں نہیں لکھتے انہوں نے کہا آگاہ ہو جاؤ اُس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ نبی بنایا تحقیق میں نے رسول ﷺ سے ان دونوں سورتوں کے بارے میں پوچھا اور ان کے بارے میں مجھ سے کسی اور نے سوال آج تک نہیں کیا (جس کا مطلب ہے کہ کسی کو سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ سب لوگ انہیں قرآن کا حصہ سمجھتے تھے) فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا کہ میں انہیں پڑھوں پھر میں نے ان سورتوں کو پڑھا انہوں نے کہا ہم بھی یہی کہتے ہیں جیسا رسول ﷺ نے فرمایا تھا یعنی آپ ﷺ نے ان سورتوں کو پڑھنے کا حکم دیا اور ہم بھی پڑھتے ہیں لہذا تم بھی پڑھا کرو۔"

وأخرج الطبرانی عن ابن مسعود ان النبی صلی الله علیه واله وسلم سئل عن هاتین السورتین، فقال قیل لی فقلت، فقولوا کما قلت۔[2]

طبرانی نے ابن مسعود سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ نبی ﷺ سے ان سورتوں کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا تم پڑھو پس تم بھی وہی کہو جو میں نے پڑھا۔ اس روایت میں زر حبیش کا اُبیّ ابن کعب سے پوچھنے کا انداز بھی ظاہر کرتا ہے کہ زر کو حیرت ہوئی تھی کہ گویا کیا ایسا ہی ہے کہ ابن مسعود ان سورتوں کو قرآن میں نہیں لکھتے جبکہ یہ سورتیں تو قرآن کا حصّہ ہیں)۔

۲۔ نورالدین الہیثمی بھی مجمع الزوائد میں اسی طرح کی روایات نقل کرتے ہیں۔[3]

---

(1) شوکانی، فتح القدیر، جلد پنجم، ص: 518، طبرانی، المعجم الکبیر، جلد دہم، ص: 132، نیز طبرانی، المعجم الاوسط حدیث نمبر: ۳۵۱۵، مکتبہ المعارف ریاض ۱۴۱۵ھ، جلد 4، ص: 13

(2) ایضا

(3) الہیثمی، نورالدین، مجمع الزوائد، جلد ہفتم، ص: ۱۴۹۔۱۵۰

۳۔ الدر المنثور میں مذکورہ بالا محدثین کے علاوہ ابن الضریس، ابن الانباری، ابن حبّان اور ابن مردویہ کے نام بھی شامل ہیں۔[1]

زر بن حبیش اور دیگر راویوں سے اور روایات بھی مروی ہیں کہ ابن مسعود معوذتین کو قرآن کا حصہ سمجھتے تھے۔

۴۔ قال أحمد ثنا وکیع ثنا سفیان عن عاصم عن زرّ بن حبیش قال سألت أبیّ بن کعب عَنِ الْمُعَوَّذَتَیْنِ فَقَالَ سَأَلْتُ النَّبِی ﷺ عَنْهُمَا فَقَالَ قِیْلَ لِی قُلْ فَقُلْتُ لَکُمْ فَقُوْلُوْا قَالَ أُبَیٌّ فَقَالَ لَنَا النَّبِی ﷺ فَنَحْنُ نَقُوْلُ۔[2]

ترجمہ: ''احمد نے وکیع سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے عاصم سے اور وہ زر بن حبیش سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابن مسعودؓ سے معوذتین کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تم لوگوں سے کہہ دیا پس تم کہو، جو اُبیؓ ابنِ کعبؓ نے کہا ہے، پس ہم سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا لہذا ہم کہتے ہیں۔''

۵۔ قَالَ الْاِمَامُ اَحْمَدُ ثَنَا عَفَّانُ ثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلْمَةَ اَنَا عَاصِمُ بن بَهْدَلَةَ عَنْ زِرِّ بِن حُبَیْشٍ قَالَ قُلْتُ لِاُبَیِّ بِنْ کَعْبٍ اِنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ لَا یَکْتُبُ الْمُعَوَّذَتَیْنِ فِی مُصْحَفِه فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَخْبَرَنِی اِنَّ جِبْرَیْلَ علیه السلام قَالَ له: '' قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ '' فَقُلْتُهَا، فَقَالَ: '' قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ '' فَقُلْتُهَا، فَنَحْنُ نَقُوْلُ مَا قَالَ النَّبِی ﷺ ۔[3]

ترجمہ: ''امام احمد نے عفان سے انہوں نے حماد سے انہوں نے عاصم سے اور انہوں نے زِر سے روایت کی ہے کہ میں نے اُبیّ سے کہا کہ ابنِ مسعودؓ اپنے مُصحفَ میں معوّذتین کو نہیں لکھتے ہیں۔ اُبیّ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے خبر دی ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپؐ سے کہا قل اعوذ برب الفلق، اور میں نے کہا (یہ کلمات پڑھے) جبریل نے کہا قل اعوذ برب الناس اور میں نے یہ کلمات پڑھے لہذا ہم کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے۔ گویا یہ دونوں سورتیں جبریل کے ذریعے دیگر قرآن کی طرح نازل کی گئیں۔''

۶۔ عَنْ سُفْیَانَ ابْنِ عُیَیْنَةَ ثَنَا عَبْدَةُ بن اَبِی لُبَابَةَ وَعَاصِمُ بْنُ بَهْدَلَةَ اِنَّهُمَا سَمِعَا زِرَّبْنِ حُبَیْشٍ

---

(1) سیوطی، جلال الدین، الدر المنثور، جلد ہشتم، ص: ۶۸۳

(2) مسند احمد: حدیث نمبر: ۲۱۱۸۲

(3) مسند احمد، حدیث نمبر ۲۱۱۸۶

یقول: سَأَلْتُ اُبَیَّ ابنَ کَعْبٍ عَنِ الْمُعَوِّذَتَیْنِ، فَقُلْتُ یَا اَبَا الْمُنْذِرِ اِنَّ اَخَاکَ ابْنَ مَسعود یَحُکُّھُما مِنَ الْمُصْحَفِ، قَالَ اِنِّی سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ، قَالَ قِیْلَ لِیْ: قُلْ، فَقُلْتُ، فَنَحْنُ نَقُوْلُ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ۔ (1)

"سفیان ابن عیینۃ عبدۃ اور عاصم سے روایت کرتے ہیں کہ ان دونوں نے زر بن حبیش سے سنا کہ میں نے اُبیؓ ابن کعبؓ سے معوذتین کے متعلق پوچھا۔ اے ابا المنذر! آپ کے بھائی ابن مسعودؓ، معوّذتین کو مُصحف سے کھرُچ دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا، میں نے رسول ﷺ سے دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا، مجھ سے کہا گیا کہ ان سورتوں کو پڑھوں اور میں نے کہا ان سورتوں کو پڑھا، لہذا ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جیسا رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے۔"

۷۔ امام بخاریؒ (256ھ) فرماتے ہیں:

حدثنا علی بن عبد اللہ ثنا سفیان ثنا عبدۃ بن ابی لبابۃ عن زر ابن حبیش قال سفیان وحد ثنا ایضاً عاصم عن زر مثلہ قال سالت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فقلت یا ابا المنذ ر ان اخاک ابن مسعود یقول کذا وکذا فقال أبیّ: سألت النبی ﷺ، فقال لی: "قیل لی" فقلت، قال: فنحن نقول کما قال رسول اللہ ﷺ۔ (2)

ترجمہ: "ہم سے علی بن عبد اللہ نے ان سے سفیان نے ان سے عبدۃ بن ابی لبابہ نے زر سے اور سفیان نے عاصم سے زر کی روایت سنی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے اُبیؓ ابن کعبؓ سے دریافت کیا اور ان سے کہا اے ابالمنذر! آپ کے بھائی ابن مسعودؓ معوذتین کے شاملِ قرآن ہونے کے بارے میں یہ اور وہ کہتے ہیں، ابیؓ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا، مجھ سے کہا گیا ان سورتوں کی تلاوت کروں اور میں نے کہا پس ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے۔"

۸۔ ابن الجزری نے جو قراءات عشرہ بیان کی ہیں ان میں سے ایک متواتر قراءت امام عاصم بن ابی النجود الاسدی کی ہے۔ امام عاصم کی قراءت ابو عبد الرحمٰن سلمی، زر بن حبیش اور ابو عمرو الشیبانی سے منقول ہے ان تینوں نے عبد اللہ ابن مسعودؓ سے قرآن پڑھا تھا عاصم کی اس متواتر قراءت

(1) مسند الحمیدی: حدیث نمبر ۳۷۸، نیز ابن حبان: حدیث نمبر ۷۹۷

(2) بخاری، کتاب التفسیر، ذیل قل اعوذ برب الناس حدیث نمبر ۴۹۷۷، نیز مشکل الآثار للطحاوی: حدیث نمبر ۹۹

میں معوذتین شامل ہیں۔[1]

اسی طرح امام حمزۃ بن حبیب الزیات کی قراءت علقمہ، اسود اور ابن وھب، مسروق، عاصم بن ابی ضمرہ اور حارث بن عبداللہ ہمدانی سے منقول ہے اور یہ سب کے سب ابن مسعود سے نقل کرتے ہیں اور حمزہ کی اس قراءت متواتر میں بھی معوذتین موجود ہیں۔[2]

اس وقت دنیا کے تمام ممالک میں قرآن مجید کے جس قدر نسخے مروج ہیں یہ سب حضرت عاصمؒ، حمزۃؒ، کسائیؒ اور خلفؒ کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ یہ سب حضرات معوذتین اور سورۃ الفاتحہ کو قرآن میں شامل سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات، حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جب ان کے شاگرد ان سورتوں کو شاملِ قرآن قرار دیتے ہیں تو لازماً شاگرد وہی بات بیان کرتے ہیں جو انہوں نے استاد سے پڑھی تھی۔ اس پر امت کا اجماع ہے کہ قراءات عشرہ کی تمام اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ تواتر سے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔[3] اس لئے اگر کوئی خبرِ واحد ان متواتر قراء توں کے خلاف ہو تو وہ لازماً رَدّ کی جائے گی۔

iv۔ علامہ ابن حزم (456ھ)ؒ "کتاب الفصل" میں فرماتے ہیں:

وَاَمَّاقَوْلُھُم اِنَّ مُصْحَفَ عَبدِاللہ ابنِ مَسْعُودٍ خِلَافُ مُصْحَفِنَافَبَاطِل '' وَکِذْبٌ وَافِكٌ، مُصْحَفُ عبداللہ ابن مَسْعود اِنَّمَافِیْہ قراءَتُہٗ بِلَاشَكٍ، وَقِراءَتہ ھی قِراءَۃُ عَاصِمِ المَشْھُورَۃُ عِنْدَ جَمِیعِ اَھلِ الاِسلَامِ فِی شَرقِ الدُّنْیَا وغَرْبِھَا، نَقْرِئُ بِھَا کما ذَکَرْنَا۔[4]

ترجمہ: یہ بات کہ ابن مسعودؓ کا قرآن ہمارے موجودہ قرآن کے خلاف ہے باطل جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ ان کا قرآن ان کی قراءت کے مطابق لکھا ہوا تھا اور ان کی قراءت وہی تھی جو "قرّائے سبعہ" میں سے عاصم کی قراءت ہے اور اس وقت تمام دنیا میں مشہور ہے۔ ابن مسعودؓ نے کبھی بھی معوذتین کی قرآنیت کا انکار نہیں کیا اور ان کی طرف منسوب قول سند کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔

۹۔ امام ابن حزم (456ھ) فرماتے ہیں "وَكُلُّ مَا رُوِیَ عَنْ اِبنِ مَسعُودٍ مِنْ اَنَّ الْمُعَوِّذَتَیْنِ وَ اُمَّ

(1) ابن الجزری، النشر فی القراءات العشر، جلد 1، ص: 155

(2) ایضاً، جلد 1، ص: 165

(3) فیض الباری، جلد 1، ص: ۲۶۲

(4) ابن حزم، کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل، جلد 2، ص: ۷۷

الْقُرْاٰنَ لَمْ تَکُنْ فِیْ مُصْحَفِہٖ فَکَذِبٌ وَ مَوضُوع'' لَا یَصِحُّ، وَاِنَّمَا صَحَّتْ عَنْہُ قِرَائَۃُ عاصم عن زربن حبیش عن ابن مسعود وفیھا أم القراٰن والمُعوّذتانِ ۔[1]

(وہ تمام روایات جو عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہیں کہ معوذتین اور سورۃ الفاتحہ ان کے مصحف میں موجود نہیں تھیں صحیح نہیں ہیں بلکہ جھوٹی اور موضوعی روایات ہیں۔ ابن مسعودؓ سے عاصم عن زربن حبیش کی قراءت سند صحیح کے ساتھ ثابت ہے اور اس میں سورۃ الفاتحہ اور معوذتین موجود ہیں۔

قاضی عیاض (544ھ) لکھتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیث نمبر 814 میں واضح دلیل موجود ہے کہ معوذتین قرآن کا حصّہ ہیں جس نے ابن مسعودؓ کی طرف اس کے خلاف روایت منسوب کی اس کی بات مردود ہے۔[2]

۱۰۔ امام فخر الدین رازی (606ھ) لکھتے ہیں:

فِیْ بَعْضِ الْکُتُبِ الْقَدِیْمَۃِ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ کَانَ یُنْکِرُ کون سُوْرَۃِ الْفَاتِحَۃِ وَالْمُعَوِّذَتَیْنِ مِنَ الْقُراٰنِ۔
بعض قدیم کتابوں میں ابن مسعودؓ کا یہ بیان پایا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک سورۃ الفاتحہ اور معوذتین قرآن مجید میں شامل نہیں لیکن امام رازی (606ھ) خود ہی اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

وَالْاَغْلَبُ عَلَی الظَّنِّ اَنَّ نقلَ ھٰذَا الْمَذْھَبِ عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ نَقْلٌ کَاذِبٌ بَاطِلٌ''۔ ظن ـ غالب یہی ہے کہ ابن مسعودؓ سے اس قسم کا مذہب نقل کرنا ہی سرے سے باطل ہے۔ ان سے ایک اور بیان منقول ہے کہ وَالْاَغْلَبُ عَلَی الظَّنِّ اَنَّ ھٰذَا النَّقْلَ عَنْ ابنِ مَسْعُوْدٍ کَذِبٌ بَاطِلٌ۔ گمان غالب یہ ہے کہ ابن مسعودؓ سے مروی یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔[3]

۱۱۔ اس سلسلے میں امام نووی (1377ھ) فرماتے ہیں:

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَی اَنَّ الْمُعَوِّذَتَیْنِ وَالْفَاتِحَۃِ وَسَائِرَ السُّوَرِ الْمَکْتُوْبَۃِ فِی الْمُصْحَفِ قُراٰن'' وَاَنَّ مَنْ جَحَدَ شَیْئًا مِنہُ کَفَرَ، وَمَا نُقِلَ عَنْ مَسْعُوْدٍ فِی الْفَاتِحَۃِ وَالْمُعَوِّذَتَیْنِ بَاطِل'' لَیْسَ بِصَحِیْحٍ عَنْہُ'[4]

---

(1) ابن حزم، المحلّٰی، جلد 1، ص: ۱۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ء

(2) اکمال المعلم بفوائد مسلم، جلد 3، ص: ۱۸۲، دار الوفاء بیروت، ۱۴۱۹ء

(3) رازی، فخر الدین، امام، مفاتیح الغیب، جلد 1، ص: ۲۲۲، بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۱ھ

(4) نووی، امام، شرح المہذب، مکتبہ الارشاد، جدہ، جلد 3، ص: ۳۶۳

ترجمہ: "مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین سورۃ فاتحہ اور تمام وہ سورتیں جو مصحف میں لکھی ہوئی ہیں وہ سب کی سب قرآن ہیں اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا منکر ہو جائے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور ابنِ مسعودؓ سے فاتحہ اور معوذتین کے بارے میں جو روایت مروی ہے وہ باطل ہے، صحیح نہیں ہے۔" روایت ودرایت دونوں کے اعتبار سے یہی رائے صحیح ہے کہ ابنِ مسعود نے معوذتین کی قرآنیت کا انکار نہیں کیا تھا۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیث ۸۱۴ میں واضح دلیل موجود ہے کہ معوذتین قرآن کا حصہ ہیں اور ابن مسعود کے بارے میں جو اس کے خلاف روایت ہے وہ مردود ہے۔ (1)

۱۲۔ علامہ بحر العلوم عبد العلی ابو العیاش لکھتے ہیں:

نِسْبَةُ اِنْكَارِ كونِهَا مِنَ الْقُرْآنِ اِلَيهِ غَلَطٌ فَاحِش '' وَمَنْ اَسْنَدَ الْاِنْكَارَ اِلَى ابْنِ مَسْعُودٍ فَلَا يُعْبَأُ بِسَنَدِهٖ عِنْدَ مُعَارَضَةِ هٰذِهِ الْأَسَانِيْدِ الصَّحِيْحَةِ بِالْاِجْمَاعِ وَ الْمُتَلَقَّاةِ بِالْقُبُوْلِ عِنْدَ الْعُلَمَاءِ الْكِرَامِ بَلْ وَالْاُمَّةِ كُلِّهَا كَافَّةً فَظَهَرَ اَنَّ نِسْبَةَ الْاِنْكَارِ اِلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ بَاطِلٌ۔ (2)

عبداللہ ابن مسعودؓ کو معوذتین کا منکر کہنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس روایت کی سند اس قابل بھی نہیں کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ کیونکہ روایت ان صحیح سندوں کے خلاف ہے جن کی صحت پر اجماع ہے اور تمام علمائے کرام بلکہ تمام امت کے نزدیک مقبول ہیں۔ پس یہ روایت غلط ہے۔

۱۳۔ قاضی ابو بکر لکھتے ہیں: لَمْ يَصِحَّ عنه اَنَّهَا لَيْسَتْ من القُرْاٰنِ وَلَا حُفِظَ عَنْه۔ (3)

"ابن مسعودؓ کا فاتحہ اور معوذتین کو قرآن نہ ماننا صحیح ثابت نہیں ہوا۔ اور نہ ان کا کوئی قول اس قسم کا یاد آتا ہے۔"

عبداللہ بن مسعودؓ نے ان سورتوں کو اپنے مصحف سے مٹا دیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سورتوں کا لکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، ایسا نہ تھا کہ وہ ان کے قرآن ہونے کے منکر ہو گئے ہوں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کے خیال میں مُصحف کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ جس چیز کو لکھنے کا حکم حضورؐ نے دیا ہے وہ تو اس میں لکھی جائے اور اس کے علاوہ کسی چیز کا لکھا جانا روا نہیں۔ انہوں نے فاتحہ اور معوذتین کو نہ تو لکھا ہوا پایا اور نہ حضورؐ کو ان کے لکھنے کا حکم دیتے ہوئے سنا۔ اس لئے وہ ان کو اپنے مصحف میں درج کرنے

(1) اکمال المعلم دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، جلد 3، ص: ۱۶۰

(2) بحر العلوم عبد العلی ابو العیاش، شرح مسلم الثبوت، جلد 2، ص: ۱۲

(3) باقلانی، قاضی ابو بکر، اعجاز القرآن، بر حاشیہ الاتقان، جلد 1، ص: ۱۹۴۔۱۹۶

سے باز رہے۔

۱۴۔ مولانا شمس الحق افغانی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

فاتحہ اور معوذتین کی قراءت قطعی تواتر سے ثابت ہے۔اس کے مقابلے میں جو روایات ہیں وہ ظنی ہیں لہٰذا تواتر کے مقابلے میں ظنی چیز کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔اگر ابن مسعودؓ سے ان روایات کو درست مانا جائے تو اس سے اجماعِ امت اور متواتر روایات کا انکار لازم آتا ہے۔[1]

۱۵۔ مولانا گوہر رحمان لکھتے ہیں:

"صحیح بات یہی ہے کہ جو ابن حزم (456ھ) امام رازی (606ھ) اور امام نووی نے کی ہے کہ ابن مسعودؓ کی جانب منسوب یہ قول ثابت نہیں ہے بلکہ باطل من گھڑت اور جھوٹ ہے۔اس لئے اس کی تاویل تلاش کرنے کے لئے تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

مولانا عبد اللطیف رحمانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ جن روایات میں اس نقطہ نگاہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ سند کے اعتبار سے بہت کمزور ہیں اس صورت میں یہ رائے بھی حتمی ٹھہرتی ہے کہ ان سے اس بیان کی نسبت درست نہیں ہے۔

"مُعوّذَتَیْن کے شامل قرآن نہ ہونے والی روایات کا جائزہ"

بہت سے محققین نے ان روایات کا تحقیقی جائزہ لیا ہے جن میں سورۃ الفاتحہ اور معوذتین کے قرآن کا حصہ نہ ہونے کے بارے میں ابن مسعودؓ کے موقف کا ذکر کیا گیا ہے۔

معوذتین کے بارے میں ابن مسعودؓ سے تین اشخاص کی روایات ہیں:

۱۔ عبد الرحمن بن یزید۔

۲۔ علقمہ۔

۳۔ زر بن حبیش۔

عبد الرحمن بن یزید کی روایت کا جائزہ:

عبد الرحمن بن یزید سے تین روایات مروی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ معوذتین کو قرآن میں نہیں لکھتے تھے۔ان میں سے ایک روایت کو الاتقان میں حافظ ابن حجر عسقلانی

---

(1) افغانی، شمس الحق، مولانا علوم القرآن، ص: ۱۲۴

(2) گوہر رحمان، مولانا، علوم القرآن، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۳، جلد 1، ص: ۳۱۸

(852ھ) کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ روایت یہ ہے:

عَبْدُ اللهِ بن أحمد من حديث الأعمش عن ابی اسحق عن عبد الرحمٰن بن يزيد قال كان عبد الله يَحُكُّ المُعَوِّذَتَيْنِ مِنْ مَّصَاحِفِه وَيَقُوْلُ انَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ الله۔ (1)

ترجمہ: "عبداللہ بن احمد نے اعمش کی حدیث کو ابواسحق سے اور انہوں نے عبدالرحمن بن یزید سے روایت کی کہ عبداللہ معوّذتین کو مصاحف سے مٹا دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دونوں کتاب اللہ میں سے نہیں۔ اس روایت میں اتقان میں من مصاحفہ کی جگہ من المصحف کے الفاظ ہیں۔"(2)

دوسری روایت قسطلانی نے شرح بخاری میں بیان کی ہے:

عَبْدُ الله بنُ اَحْمد عن عبد الرحمن بن يزيد قال كان عبد الله يَحُكُّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ مِنَ الْمُصْحَفِ وَيَقُوْلُ اِنَّمَا اَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَنْ يُتَعَوَّذَ بِهِمَا وَلَمْ يَكُنْ عَبْدُ الله يَقْرَأُ بِهِمَا وَيَقُوْلُ اِنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ الله۔ (3)

"عبداللہ بن احمد، عبدالرحمن بن یزید سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعودؓ معوذتین کو مصحف سے مٹا دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ان دونوں کے ذریعے پناہ طلب کی جائے اور عبداللہ انہیں پڑھا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دونوں کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں۔"

ایک اور روایت جو علامہ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں بیان کی ہے، اس طرح سے ہے:

اَخْرَجَ عَبْدُ اللهِ بنُ اَحْمَد فی زیادات المسند والطبرانی وابن مردويه من طريق الاعمش عن ابی اسحق عن عبد الرحمن بن يزيد النخعی قال كان عبد الله بن مسعود يَحُكُّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ مِنْ مُصَاحِفِه وَيَقُوْلُ اِنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنَ الْقُرْآنِ اَوْ مِنْ كِتَابِ الله۔ (4)

ترجمہ: "عبدالرحمن کہتے ہیں ابن مسعودؓ معوذتین کو مصحف سے چھیل دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ قرآن کی سورتیں نہیں ہیں یا کتاب اللہ میں سے نہیں۔"

---

(1) سیوطی، الاتقان، جلد اول، صفحہ ۸۱، مسند احمد، حدیث نمبر ۲۱۱۸۸، جلد ۳۵، ص: ۱۱۷، مؤسسہ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۲۰ھ؛ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد نہم، صفحہ طبرانی، المعجم الکبیر، حدیث نمبر ۹۱۵۰؛ مسند البزار، حدیث نمبر ۱۵۸۶

(2) الاتقان، جلد 1، ص: ۸۱

(3) قسطلانی، ارشاد الساری، شرح صحیح البخاری، جلد ۷، ص: ۴۴۱

(4) عینی، بدرالدین، عمدۃ القاری، جلد ۲۰، ص: ۱۶، (کتاب تفسیر القرآن، سورۃ الناس (بیروت: دارالکتب العلمیہ ۱۴۲۱ھ

مذکورہ بالا روایات کا تنقیدی جائزہ :

ان روایات کا تحقیقی جائزہ مولانا عبد اللطیف رحمانی نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ جب ہم عبد الرحمٰن کی روایت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ مسعودؓ سے اس جملہ ''لَیْسَتَا مِنْ کِتَابِ اللهِ'' کی روایت میں عبد الرحمٰن منفرد ہے۔ جبکہ علقمہ اور زر بن حبیش کی روایت جن کا ذکر آئندہ سطور میں آرہا ہے میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔[(1)]

۲۔ عبد الرحمٰن سے راوی ابو اسحٰق ہے۔ اس کے بارے میں میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ اس نے اہلِ کوفہ کی روایات کو فاسد کر دیا اور وہ ان سے صحیح روایت نہیں کرتا جبکہ یہ روایت اہلِ کوفہ سے ہے۔[(2)]

۳۔ ابو اسحٰق کے بعد راوی اعمش ہے۔ اعمش کے بارے میں میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

قَالَ ابنُ المبَارَك اَفْسَدَ حَدِيْثَ اَهْلِ الْكُوفَةِ أبواسحاق والأعمش لكم ۔ فَفِيْ حَدِيْثِ الْاَعْمَش اِضْطِرَابٌ كَثِيْرٌ۔ قلتُ: وَهُوَيُدَلِّسُ وَرُبماَ دَلَّسَ عَنْ ضَعِيْفٍ ولايدري به۔[(3)]

''اعمش کی روایت میں بہت زیادہ اضطراب ہے وہ تدلیس کرتا ہے اکثر وہ ضعیف راویوں سے روایت کرتا ہے۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ وہ اہل کوفہ کی روایات کو فاسد کر دیتا ہے۔ یہ روایت اہل کوفہ سے ہے۔ اعمش کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے وہ شیعہ ہے اور انہی کے خیالات کی تائید کرتا ہے لہذا اس کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ جب اعمش اور ابو اسحاق جمع ہوں تو اس سے فساد دوگنا ہو جائے گا۔''[(4)]

۵۔ حضورؐ نے نمازوں میں مُعَوِّذَتَین کو بارہا مرتبہ پڑھا۔ صحابہؓ کو ان کی تعلیم دی۔ صحابہؓ کے سامنے حضورؐ نے ان سورتوں کے فضائل بیان فرمائے۔ کتب صحاح میں ان سورتوں کے فضائل مذکور و منقول ہیں اس طرح صحابہؓ سے لے کر آج تک تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ معوذتین جزو قرآن ہیں۔ اس صورت میں عقل یہ بات تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ عبد اللہ ابن مسعودؓ

---

(1) رحمانی، عبد اللطیف، تاریخ القرآن، ص: ۱۰۲

(2) میزان الاعتدال، جلد 3، ص: ۳۱۶، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ

(3) ایضاً

(4) ایضاً

اتنی بڑی حقیقت سے ناواقف ہوں گے۔ یہ بات ابن مسعودؓ کے علم و فضل ہی کے منافی ہے۔(1)
ابن کثیر (774ھ) نے معوذتین کی تفسیر کرتے ہوئے متعدد احادیث بیان کی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ معوذتین کے قرآن کا حصہ ہونے میں کسی طرح کا کوئی شک شبہ نہیں ہو سکتا۔(2)

۶۔ ابن مسعودؓ صحابہ میں ممتاز، فاضل اور ذی کمال صحابی ہیں جنھوں نے شروع سے ہی مسندِ تعلیم کو عزت دی۔ حضورؐ اور آپؐ کے بعد عہد صحابہؓ میں کسی اور صحابیؓ نے ان جتنی تعلیم نہیں دی۔ حضرت عمرؓ کے دور سے وقت وفات تک کوفہ میں آپ تعلیم دیتے رہے۔ اہل کوفہ آپ ہی کے شاگرد تھے۔ آپ کے ہزاروں شاگردوں میں سے کسی ایک نے بھی زیر بحث موضوع پر کوئی روایت بیان نہیں کی۔ ہزاروں شاگردوں میں سے عبدالرحمن کا اس میں منفرد ہونا اور ابواسحق کا یہ روایت کرنا اس کے عدمِ وثوق اور موضوع ہونے پر ایسی شہادت ہے کہ اس کے بعد کسی گواہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی خصوصاً ایسی حالت میں کہ ابن مسعودؓ سے ہزاروں لوگوں نے اسی قرآن کی روایت کی ہے اور ہمیں تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ ابن مسعودؓ نے اسی قرآن کا درس دیا ہے۔

علقمہ کی روایت:

معوذتین کے شامل قرآن نہ ہونے کے بارے میں ابن مسعودؓ سے منسوب موقف کے بارے میں علقمہ سے بھی روایات مروی ہیں۔ یہ روایات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ قَالَ حَدَّثَنَا الْأَزْرَقُ بِنْ عَلِي حَدَّثَنَا حَسّان بْنُ اِبْرَاهِيم حَدَّثنا الصَّلْتُ بْنُ بِهْرَام عَنْ اِبْرَاهِيْم عَنْ عَلْقَمَةَ عن عَبْدِالله أنّه كان يَحُكُّ الْمُعَوَّذَتَيْنِ مِنَ الْمَصَاحِفِ وَيَقُوْلُ اِنَّمَا اَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَنْ يَتَعَوَّذَ بِهِمَا وَلَمْ يَكُنْ يَقْرَأُ بِهِمَا۔(3)

ترجمہ: ”علقمہ کہتے ہیں ابن مسعودؓ معوذتین کو قرآن سے چھیل دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے حضورؐ نے ان سے دم کرنے کا حکم فرمایا اور ابن مسعودؓ ان کی تلاوت بھی نہیں کیا کرتے تھے۔“

ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا تقی عثمانی اور مولانا عبداللطیف رحمانی لکھتے ہیں:

معوذتین کو قرآن مجید میں شامل نہ سمجھنے کے بارے میں ابن مسعودؓ سے منسوب نقطہ نگاہ کے بارے میں جتنی روایات ہیں وہ اول تو مضطرب، معلّل، شاذ اور مختلف ہیں۔ مضطرب روایات اگرچہ ثقہ اور دیندار راویوں سے ہی کیوں نہ مروی ہوں، قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ مضطرب روایت کے بارے میں علمائے

---

(1) رحمانی، عبداللطیف، ص: ۹۸-۹۹

(2) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ذیل معوذتین، ۵۱۶/۱۴، مؤسسۃ قرطبۃ، ۱۴۲۱ھ

(3) المعجم الکبیر للطبرانی: حدیث نمبر ۹۰۵۱، جلد ۸، ص: ۱۶۴، قسطلانی: ارشاد الساری، جلد ۷، ص: ۴۴۱

حدیث فرماتے ہیں کہ اضطراب کی وجہ سے راوی کے ضبط کی کمی اور حافظہ کی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ روایوں کے مستحکم نہ ہونے اور راویوں کے درمیان تعارض واقع ہونے کے باعث یہ روایت ضعیف ہوجاتی ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے راوی میں ضبط نہیں ہے جو کسی روایت کی قبولیت کی بنیادی شرطوں میں سے ہے۔ حافظ ابن الصلاح، علامہ سیوطی، ابن حجر اور حافظ عراقی کا یہی نقطہ نگاہ ہے۔[1]

مولانا لکھتے ہیں حدیث معلّل وہ ہوتی ہے جس میں کوئی ایسی علّت معلوم ہوئی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو۔ اگرچہ وہ بظاہر صحیح سالم ہوتی ہو اور یہ علت" اس سند میں بھی واقع ہوجاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں اور اس علّت کا ادراک علمِ حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی راوی کو منفرد دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہو اور کبھی اس کے ساتھ دیگر قرائن بھی مل جاتے ہیں۔[2]

ہم دیکھتے ہیں کہ ان روایات کے راوی ضعیف، مطعون اور غیر معتبر ہیں۔ یہ بات بھی اصولی ہے کہ اگر روایات میں اضطراب نہ بھی ہوتا اور یہ ضعیف و مطعون راویوں سے مروی بھی نہ ہوتیں تو اس صورت میں بھی یہ قابل تسلیم نہیں ہوسکتی تھیں کیونکہ ابن مسعودؓ سے ہمیں قابل اعتبار ذرائع سے یہ بات پہنچتی ہے کہ وہ ان دونوں سورتوں کو قرآن کا حصہ" قرار دیتے تھے اور آئمہ قرأت نے تواتر کے ساتھ اپنی سندوں کو ابن مسعودؓ تک پہنچایا ہے۔ چنانچہ حفّاظ اور قرّائ قرآن جیسے عاصمؒ، کسائی، خلفؒ، جو مشہور قرّاء میں سے ہیں اور ان کی سند کی صحت پر تمام اُمت کا اِتفاق ہے اور تمام بلادِ اسلامیہ میں ان کی سندیں ہزاروں حفاظ کے پاس موجود ہیں، ان چاروں کو اسی قرآن کی سند جس میں معوذتین موجود ہیں، ابن مسعودؓ سے ہے۔ ان سندوں کے مقابلے میں جو متواتر ہیں اور صحت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، دوسری ضعیف روایات کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ گزشتہ صفحات میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اَنَّھُمَا لَیْسَتَا مِنْ کِتاَبِ اللہ کے الفاظ صرف عبدالرحمن بن یزید نخعی ہی سے منقول ہیں کسی اور نے یہ الفاظ صراحتاً نقل نہیں کئے۔ لہذا یہ روایت شاذ ہے اور محدثین کے اصول کے مطابق شاذ روایت مقبول نہیں ہوتی۔[3] (مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ اگر اس طرح کی روایات درست بھی ہوں تب بھی خبر واحد ہیں۔ امت کا اجماع ہے کہ جو خبر واحد متواتر کے خلاف

---

(1) ابن الصلاح، حافظ، مقدمہ، صفحہ ۹۴، خطیب بغدادی، الکفایہ فی اصول الروایۃ، ص: ۳۵۶ سیوطی، تدریب الراوی، جلد 1، ص: ۲۲۳، سخاوی، شمس الدین، فتح المغیث، جلد 1، ص: ۲۸۰

(2) فتح الملہم، جلد 1، ص: ۵۴

(3) عثمانی، محمد تقی، مولانا، علوم القرآن، ص ۲۲۵

ہوں وہ قابل قبول نہیں ہوتیں۔[1]

اس قسم کی روایات حضرت علیؓ (40ھ) یا حضرت اُبیؓ ابنِ کعبؓ یا ابن مسعودؓ یا کسی بھی صحابیؓ کے بارے میں ہوں کہ ان کے پاس اس قرآن سے مختلف کوئی قرآن تھا، تو ایسی روایات من گھڑت اور خلاف اجماع ہوں گی۔

علقمہ سے مروی روایات کا تنقیدی جائزہ :

اس روایت کی سند میں موجود راویوں کے بارے میں محدثین کا نقطہ نگاہ اس طرح سے ہے:

اس روایت میں تین راوی ایسے ہیں جن کی وجہ سے روایت قابل تنقیح اور قابل بحث ہے۔

ا۔ اس میں ایک راوی حسان بن ابراہیم ہیں۔ گو یہ شخص معتبر ہے لیکن غریب احادیث روایت کرتا ہے اس لئے صحاح میں اس کی احادیث نہیں ہیں۔ امام نسائی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

لیس بالقوی یعنی یہ مضبوط اور ثقہ نہیں ہے۔[2]

ابن عدی اس کے بارے میں کہتے ہیں:

حَدَّثَ بافرادات كثيرة وهو من أهل الصدق الا أنه يغلط ۔[3]

یعنی حدیث کی روایت میں یہ غلطی کرتے ہیں اور ایسی روایت بیان کرتے ہیں جو کسی نے نہیں کی ہوتیں۔

صلت بن بہرام اس میں تیسرے راوی ہیں۔ یہ معتبر تو ہیں لیکن مرجیہ سے ان کا تعلق ہے۔ میزان الاعتدل میں ہے کہ ابوزرعہ نے ان کے اس مذہب کی بنا پر ان پر جرح کی ہے۔[4] صحاح ستہ میں ان سے روایت نہیں ہے۔ کسی روایت میں ان تینوں راویوں میں سے اگر ایک بھی ہو تو یہ روایت معلل ہو جائے گی اور اس کی صحت میں فرق آجائے گا۔ پھر جب کسی روایت میں یہ تینوں لوگ (ازرق بن علی، حسان بن ابراہیم اور صلت بن بہرام) موجود ہوں تو ایسی روایت بلا تحقیق و تنقید قبول نہیں کی جائے گی۔[5]

خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ روایت دوسری صحیح روایات کے خلاف ہو اور اس روایت میں اجماع امت کی مخالفت بھی ہو رہی ہو۔ اگر اس قسم کی صورت پیدا ہو کہ اجماع امت کی مخالفت ہو رہی ہو تو

---

(1) ایضاً، ص: ۲۲۳

(2) الذہبی: میزان الاعتدال فی نقد الرجال، ۴۳۵/۳

(3) ایضاً

(4) ایضاً

(5) عبداللطیف رحمانی، تاریخ قرآن، ص: ۱۰۱، ۱۰۲

اس وقت تو صحیح روایت بھی قابل وثوق نہیں رہتی اور یہ مقابلہ اور مخالفت ہی خود اس کے ضعف اور قابل رد ہونے کیلئے کافی ہو جاتا ہے۔[1]

مذکورہ بالا تنقیدی و تحقیقی جائزہ اس حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے کہ اس طرح کی کسی روایت کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور ان ضعیف روایات کی وجہ سے ہم مسلمات کو جھٹلا نہیں سکتے۔ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب، اس کا متن اور اس کی سورتوں کی تعداد صدیوں سے امت مسلمہ میں مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ابن مسعودؓ سے اس طرح کی روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ معوذتین کو قرآن میں لکھا نہیں کرتے تھے۔ تب بھی ان کے انفرادی عمل یا نظریے کی امت اور خصوصاً صحابہ کرامؓ کے اجماع کے مقابلے میں عقلاً اور شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ جبکہ مذکورہ بالا تجزیے سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ اسناد طرح طرح کے ضعف اور سقم کا شکار ہیں۔ گویا اس صورت میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ فقہ کا بنیادی اصول ہے کہ اجماع امت اور اجماعِ صحابہؓ کے مقابلے میں انفرادی رائے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

واقعاتی حقائق کے حوالے سے بھی جب ہم اس طرح کے کسی اختلاف کا جائزہ لیتے ہیں تو حقائق ان اختلافات کی موجودگی کی تائید نہیں کرتے۔ اگر بات ایسی ہوتی جیسی بیان کی جاتی ہے تو پھر حضرت ابن مسعودؓ کو حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) کی جمع قرآن کی کاروائی کے موقع پر اختلاف کرنا چاہیے تھا جب کہ ہمیں اس طرح کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جمع عثمانی کے موقع پر حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کی جمع قرآن کی کاروائی کے موقع پر جو اعتراض کئے ان میں اس طرح کا کوئی اعتراض شامل نہیں تھا۔ حضرت ابن مسعودؓ کو صرف یہ اعتراض تھا کہ انہیں جمع قرآن کی کاروائی میں شریک کیوں نہیں کیا گیا۔ حضرت عثمان کی طرف سے جواب یہ تھا کہ اس وقت حضرت ابن مسعودؓ کوفہ میں تھے اور جمع قرآن کا کام قرآن کا متن جمع کرنے کا مسئلہ نہ تھا۔ جمع قرآن کا مسئلہ تو پہلے دن ہی طے شدہ تھا۔ جو کام مطلوب تھا اس کیلئے حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) والے نسخہ اور حضرت زید بنؓ ثابت کی موجودگی کافی تھی۔

مولانا گوہر رحمان لکھتے ہیں:

"علامہ باقلانی (403ھ) نے آخری تین سورتوں کے شامل قرآن نہ ہونے کے بارے میں عبد اللہ ابن مسعودؓ سے منسوب روایت کے بارے میں ایک وضاحت یوں کی ہے کہ ممکن ہے راوی کو اس وجہ سے اشتباہ ہو گیا ہو کہ سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے ابن مسعود نے دوسروں سے اختلاف کیا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے معوذتین کو قرآن کے آخر میں نہ لکھا ہو کسی اور جگہ لکھا ہو اور راوی کی نگاہ اس پر نہ پڑی ہو۔ لیکن یہ توجیہہ بھی بالکل بے معنیٰ سی ہے۔ جس روایت میں اختلاف

---

(1) ایضاً

کا ذکر ہے وہ بالکل واضح ہے۔" (1)

یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ ابنِ مسعودؓ جیسے صحابی کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ قرآن کی سورتیں ہیں۔ یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ان سورتوں کو نمازوں میں پڑھتے تھے۔ ابنِ مسعودؓ ان نمازوں میں نبی کریم ﷺ کی اقتداء کرتے تھے۔ ابنِ مسعودؓ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں موجود بھی رہتے تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے قرآن کا حصّہ ہونے کا اعلان کھلے عام کیا تھا جب باقی صحابہؓ کو پتہ چل گیا تھا کہ انہیں رسول ﷺ نے قرآن کا حصّہ قرار دیا ہے تو کیا ابنِ مسعودؓ کو اس کا پتہ نہ چلا ہوگا۔ اگر ابن مسعودؓ نے ان سورتوں کے قرآن ہونے کا انکار کیا ہوتا تو خلیفہ اور دیگر صحابہؓ کی طرف سے ان کی مخالفت کی گئی ہوتی۔ کیونکہ صحابہؓ دین کے معاملے میں کسی دوسرے ساتھی صحابیؓ کے کسی مسئلے میں عدمِ واقفیت یا کسی کی دین کے معاملے میں غلط فہمی کو فوراً دور کر دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں درجنوں مثالیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں کہ ایک دوسرے کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ لیکن ہمارے موضوعِ بحث مسئلے میں کسی طرح کا کوئی اختلاف یا جدال منقول نہیں ہے اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ابن مسعودؓ نے کبھی بھی معوذتین کو قرآن سے خارج نہیں سمجھا اور ان کی طرف منسوب قول سنداً ثابت نہیں ہے۔ (2)

مولانا گوہر رحمن لکھتے ہیں کہ معوذتین کے شاملِ قرآن نہ ہونے کے بارے میں ابن مسعودؓ کی طرف اس بیان کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ لیکن وہ لکھتے ہیں کہ اگر شاملِ قرآن نہ ہونے والی روایات کے ثقہ ہونے کی بنا پر کسی کو مذکور بالا نقطہ نگاہ ماننے میں تردّد ہو تو پھر دوسرے نمبر پر زیادہ مناسب نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ابنِ مسعود کو غلط فہمی ہو گئی تھی (3) یہ نقطہ نگاہ بھی ابن کثیر (774ھ) کے حوالے سے آئندہ سطور میں بیان کیا گیا ہے کہ جب انہیں صحیح صورتِ حال سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔

ایک دوسرا نقطہ نگاہ قاضی ابو بکر باقلانی (403ھ)، قاضی عیاض (544ھ) اور بعض دوسرے علماء کا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابنِ مسعود کا معوذتین کو مصحف میں نہ لکھنے کا معاملہ سند کے اعتبار سے تو ثابت شدہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان سورتوں کو قرآن نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں مصحف میں لکھنے کی روایت نہیں پہنچی تھی۔ لیکن اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی نے ان سورتوں کو قرآن میں لکھا ہوتا تھا تو ابن مسعودؓ انہیں مٹا کیوں دیا کرتے تھے۔ اگر ان کے نزدیک ان

---

(1) الباقلانی، قاضی ابوبکر، اعجاز القرآن، برحاشیہ الاتقان، لاہور سہیل اکیڈمی، ۱۴۰۸ھ، جلد 2، ص: ۱۹۴

گوہر رحمان، جلد 1، ص: ۳۱۸

(2) گوہر رحمان، جلد 1، ص: ۳۲۰

(3) علوم القرآن، جلد 1، ص ۳۲۰

سورتوں کو لکھنا ضروری نہیں تھا تو مٹانا بھی تو ضروری نہیں تھا وہ توان سورتوں کو مٹا دیا کرتے تھے۔ روایات میں یہ الفاظ موجود ہیں کان یَحُكُّ الْمُعَوِّذَتَینِ اگر یہ کہا جائے کہ مصحف میں ان سورتوں کو لکھنے کی روایت ان تک پہنچی نہیں تھی تو لکھنے سے منع کرنے کی بھی روایت بھی تو انہیں نہیں پہنچی تھی۔ اس کے علاوہ عبد الرحمن بن یزید کی روایت جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے میں یہ وضاحت موجود ہے کہ إِنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ اللہ یہ دونوں سورتیں کتاب اللہ کا حصّہ نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے نزدیک کتاب اللہ سے مراد مصحف تھا یعنی یہ لکھے ہوئے مصحف کا حصّہ نہیں ہے تو یہ بعید از قیاس تاویل ہے، کیونکہ کتاب اللہ سے مراد قرآن ہی ہے۔(1)

قاضی ابو بکر باقلانی (403ھ) نے ابن مسعودؓ کے اس قول کی ایک تاویل یہ کی ہے کہ ابن مسعودؓ نے معوّذ تین کے قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ انہیں مصحف میں درج کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مصحف میں کوئی چیز اس وقت تک درج نہ کی جائے جب تک کہ نبی کریم ﷺ اسے درج کرنے کا حکم نہ دیں شاید انہیں ان سورتوں کو قرآن میں لکھنے کی اجازت والی حدیث نہ پہنچی ہو۔ اس سے ان کے ان سورتوں کو قرآن میں درج نہ کرنے کی وجہ تو معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ ان کے قرآن کا حصّہ ہونے سے انکاری نہ تھے ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ یہ اچھی تاویل ہے۔ لیکن روایت میں تو یہ الفاظ بھی ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ یہ کتاب اللہ کا حصّہ نہیں ہیں۔ لیکن اگر یہ مانا جائے کہ کتاب اللہ سے مراد مصحف تھا تو یہ تاویل مناسب معلوم ہوتی ہے۔(2)

علامہ فخر الدین رازی (606ھ) فرماتے ہیں یہ ایک مسئلہ نازک ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کے زمانے میں معوذ تین کا حصّہ قرآن ہونے کی بات متواتر تھی تو اس صورت میں ان کے قرآن ہونے سے انکار کرنا تواتر کے انکار کی وجہ سے کفر کا مستوجب ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ مسئلہ تواتر کو نہیں پہنچا ہوا تھا تو اس سے قرآن کے اور بھی حصّوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی شاید متواتر نہ ہوں۔ اس سے تو قرآن کے متن کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں گے۔(3) ایک رائے یہ دی گئی ہے کہ یہ سورتیں تو متواتر ہوں لیکن اس وقت تک ابنِ مسعودؓ کو ان کے تواتر کی خبر نہ ہوئی ہو۔ بعد میں انہیں ان کے تواتر کی خبر ہو گئی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔(4)

---

(1) فتح الباری، جلد ششم، ص: ۱۵۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

تفسیر ابن کثیر میں وہ روایات بیان کی گئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ابن مسعودؓ معوذتین کو قرآن کا حصۂ نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے ابن کثیر (774ھ) لکھتے ہیں: قاریوں اور فقہا کے نزدیک مشہور بات یہی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ ان سورتوں کو قرآن میں لکھا نہیں کرتے تھے شاید انہوں نے حضور اکرمؐ سے ان سورتوں کو نہ سنا ہو اور تواتر کے ساتھ یہ بات نہ پہنچی ہو۔ پھر یہ اپنے اس قول سے رجوع کر کے جماعت کے قول کی طرف پلٹ آئے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے ان سورتوں کو آئمہ کے قرآن میں داخل کیا جس کے نسخے ہر طرف پھیلے ابن کثیر (774ھ) کے اس قول سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ وہ اسے محض قرآن میں لکھتے نہ تھے لیکن وہ ان کے قرآن کا حصۂ ہونے کے منکر نہ تھے۔[1] یہی نقطہ نگاہ علامہ آلوسی (1270ھ) نے بھی بیان کیا ہے[2] (اس بارے میں علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ اس سے ابن مسعودؓ کا یہ خیال نہ تھا کہ وہ اسے قرآن کا حصۂ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ مصحف میں ان کا لکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔[3]

علامہ سیوطی ابن الصباغ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ سورتیں ابن مسعودؓ کے زمانے میں متواتر تھیں۔ لیکن انہیں تواتر کا علم نہ تھا اس لئے انہوں نے احتیاط برتی۔ لیکن جب تواتر کا علم ہو گیا تو انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ جیسا کہ عاصم نے بواسطہ زر بن حبیش، ابنِ مسعودؓ سے روایت کی ہے اس روایت میں مذکور قراءت میں یہ تینوں سورتیں ثابت ہیں جو پہلے قول سے رجوع کی دلیل ہیں۔[4]

علامہ باقلانی (403ھ) اور علامہ زاہد الکوثری نے اس سلسلے میں ایک توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ ابنِ مسعودؓ نے ان سورتوں کو اپنے مصحف میں اس لئے نہیں لکھا تھا کہ ان کے بھول جانے کا خدشہ نہ تھا۔ لکھا اسی لئے جاتا ہے کہ بھول نہ جائے۔ (اس نقطہ نگاہ میں بظاہر کوئی وزن اس اعتبار سے نہیں ہے کہ کیا لوگوں نے صرف یہی سورتیں یاد کرر کھی تھیں۔ انہیں تو قرآن کے اور بھی بہت سے حصّے یاد تھے بلکہ مکمل قرآن کے بہت سے حافظ موجود تھے۔ پھر تو قرآن لکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔[5]

ابن قتیبہ (276ھ) اپنی کتاب مشکل القرآن میں لکھتے ہیں:

ابن مسعودؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک مصحف موجود تھا جس میں معوذتین

---

(1) ابن کثیر، جلد ۱۴، ص: ۵۱۶۔۵۱۷

(2) آلوسی، روح المعانی، جزء تیس، ص: ۴۹۹، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ

(3) سیوطی، الاتقان، جلد اول، صفحہ ۸۲

(4) زاہد الکوثری، علامہ، مقالات الکوثری، ص: ۱۶

(5) ایضاً

اور سورۃ الفاتحہ لکھی ہوئی موجود نہ تھیں، لیکن ان کے مصحف میں ان سورتوں کی عدم موجودگی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ انہیں قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے مصحف میں ان کے نہ لکھنے کی وجہ کوئی اور تھی وہ لکھتے ہیں:

''وأمّا نقصان مصحف عبدالله بحذ فه (أم الكتاب) و (المعوّ ذتين) وزيادة أبيّ بسورتي القنوت ، فانا لا نقول : اِنّ عبدالله وأبيّا أصابا و أخطأ المهاجرون والأنصار ، ولكن عبدالله ذهب فيمايرى أهل النظر إلى أن المعوذتين كانتا كالعوذة والرّقية ، وغيرها ، وكان يرى رسول الله ﷺ يعوّذ بهما الحسن والحسين وغيرهما۔۔۔ فظّن أنهما ليستا من القرآن''۔[1]

ابن مسعودؓ کا خیال تھا کہ معوذتین قرآن میں شامل نہیں اس لئے کہ انہوں نے حضورؐ کو دیکھا تھا کہ آپؐ نے اسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دم فرمایا اس لئے ابن مسعودؓ کا خیال یہ رہا کہ یہ سورتیں قرآن مجید کا حصہ نہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپؓ کا یہ خیال درست تھا اور تمام مہاجرین وانصار غلطیؓ پر تھے سورۃ الفاتحہ کو اپنے ذاتی نسخہ قرآن میں شامل نہ کرنے کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ اس سورت کو شامل قرآن نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن مجید کو اس لئے جمع کیا گیا تھا کہ یہ نسیان کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ چونکہ سورت الفاتحہ میں اس بات کا احتمال نہ تھا کیونکہ یہ چھوٹی سی سورت ہے اور ہر مسلمان پر اس کا پڑھنا اور سیکھنا لازم تھا، لہٰذا مصحف میں اس کا لکھنا ضروری نہ سمجھا گیا۔

مولانا گوہر رحمان لکھتے ہیں:

ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ معوذتین کو مصاحف میں سے مٹادیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اللہ کی کتاب میں اس چیز کا اضافہ نہ کرو جو اس کا حصہ نہیں ہے۔ اگر یہ قول ان سے ثابت ہو تو پھر ان کے اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ رسول ﷺ اپنے نواسوں کو معوذتین پڑھ کر دم کیا کرتے تھے تو انہوں نے گمان کیا کہ یہ دم کرنے کیلئے ہی ہیں۔ مگر تمام مسلمان ابنِ مسعودؓ کے اس نقطہ نگاہ کے خلاف ہیں۔[2] معوذتین کے بارے میں اس نقطہ نگاہ سے متعلق احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔[3]

ابن مسعودؓ کے بارے میں اس طرح کے بیانات پر امام رازی (606ھ) یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

''وهو في غاية الصعوبة لانا إن قلنا أن النقل المتواتر كان حاصلاً في عصر الصحابة يكون ذلك من القرآن فانكاره يوجب الكفر ، وان قلنا لم يكن حاصلاً في ذلك الزمان فيلزم ان القرآن

---

(1) ابنِ قتیبہ، تاویل مشکل القرآن، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۱۸، جلد 1، ص: ۴۳

(2) گوہر رحمٰن، علوم القرآن، جلد 1، ص: ۳۲۰

(3) الدر المنثور، جلد ۱۵، صفحہ ۷۸۴۔۸۰۹، ذیل معوذتین، نیز ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد ۱۴، ص: ۵۱۶

لیس بمتواتر فی الاصل۔''[1]

ترجمہ: ''یہ بات انتہائی مشکل ہے کہ اگر ہم یوں کہیں کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نقل متواتر حاصل تھی، تو یہ سورتیں قرآن کا حصہ ہوئیں اور ان کا انکار کفر بن جائے گا۔ اور اگر ہم کہیں کہ اس زمانہ میں تواتر حاصل نہیں تھا تو یہ لازم آئے گا کہ قرآن اصل میں ہی متواتر نہیں۔''

اس سلسلے میں الدر المنثور میں ہے۔

أخرج أحمد والبزاز والطبرانی وابن مردویه من طرق صحیحة عن ابن عباس وابن مسعود انه کان یحك المعوذتین من المصحف ویقول لاتخلطوا القرآن بما لیس منه انهمالیستامن کتاب الله انما امر النبی صلی الله علیه وسلم ان یتعوذ بهما وکان ابن مسعود لایقرأ بهما۔ قال البزار لم یتابع ابن مسعود احد من الصحابة وقد صح عن النبی صلیالله علیه وسلم انه قرا بهما فی الصلاة واثبتتا فی المصحف۔[2]

''امام احمد، بزاز، طبرانی، اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے صحیح طرق سے روایت کیا ہے کہ وہ معوذتین کو اپنے مصحف سے کھرچ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جو قرآن میں نہیں ہے وہ قرآن میں داخل نہ کرو؛ کہ یہ دونوں سورتیں اللہ کی کتاب میں سے نہیں ہیں۔ نبی ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ان کے ذریعے اللہ کی پناہ حاصل کی جائے اور ابن مسعود ان کی تلاوت نہیں کرتے تھے۔ بزاز کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی صحابیؓ نے بھی ابن مسعود کے ساتھ اتفاق نہیں کیا اور صحیح بات یہ ہے کہ نبی ﷺ ان دونوں کی تلاوت نماز میں کیا کرتے تھے اور انہیں مصحف میں لکھا۔ یہی بات علامہ شوکانی نے اپنے تفسیر فتح القدیر میں بیان کی ہے۔''[3]

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مصحف کے اختلافات میں سے ایک اختلاف یہ ہے کہ ابنِ مسعود کے مصحف میں سورتوں کی ترتیب مصحف عثمانی سے مختلف تھی۔ اس سلسلے میں علامہ بحر العلوم لکھتے ہیں:

بَقِیَ اَمْرُ تَرْتِیْبِ السُّوَرِ فَالْمُحَقِّقُوْنَ عَلٰی اَنَّه' مِنْ اَمْرِ الرَّسُوْلِ ﷺ وَقِیْلَ هٰذَا التَّرْتِیْبُ بِاجْتِهَادٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ وَاسْتَدَلَّ عَلَیْهِ ابْنُ فَارِسٍ بِاخْتِلَافِ الْمَصَاحِفِ فِیْ تَرْتِیْبِ السُّوَرِ فَمُصْحَفُ عَلِیٍّ کَانَ عَلٰی تَرْتِیْبِ النُّزُوْلِ وَمُصْحَفُ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ عَلٰی غَیْرِ هٰذَا الَّذِیْ الْاٰنَ وَالْحَقُّ هُوَ الْاَوَّلُ وَهٰذِهِ الرِّوَایَاتُ مُزَخْرَفَةٌ'' مَوْهُوْمَةٌ'' وَلَمْ تُوْجَدْ فِی الْکُتُبِ الْمُعْتَبَرَةِ وَلَا یُعْبَأُ بِهَا فِیْ مُقَابَلَةِ التَّوَارُثِ

---

(1) الرازی، فخر الدین، امام: مفاتیح الغیب، ذیل سورۃ الفاتحۃ، جلد 1، ص: ۱۷۸، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۱ھ

(2) سیوطی، الدر المنثور، جلد ۱۰، ص: ۳۹۴، آلوسی، محمود، روح المعانی، جلد ۳۰، ص: ۲۷۹

(3) شوکانی، فتح القدیر، جلد 5، ص: ۵۱۸

اَلَّذِیْ جَرَی مِنْ لَّدُنْ رَسُوْلِ اللّٰہ ﷺ اِلَی الْاٰن۔ (1)

ترجمہ: "باقی رہا سورتوں کی ترتیب کا معاملہ تو محققین علماء کے نزدیک سورتوں کی ترتیب نبی اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق ہے اور یہ قول کہ قرآن کی ترتیب صحابہ کرامؓ نے اپنی رائے سے دی اور اس کی دلیل میں کہنا کہ حضرت علیؓ (40ھ)، ابیؓ ابن کعبؓ اور ابن مسعودؓ کے مصاحف کی ترتیب ایک دوسرے سے مختلف تھی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترتیب صحابہ کرامؓ نے اپنی رائے سے دی تھی ورنہ ان صحابہؓ کی ترتیب اس ترتیب کے مخالف نہ ہوتی۔ یہ قول اور یہ دلیل صحیح نہیں۔ ہاں پہلا قول صحیح ہے (کہ قرآن کی ترتیب حضور اکرمؐ نے دی) اس لئے جن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابہؓ کی ترتیب اس قرآن کے خلاف تھی وہ تمام من گھڑت اور خیالی ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ کسی معتبر کتاب میں ایسی روایات موجود نہیں ہیں۔ اس لئے یہ روایات قابل توجہ نہیں ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ قرآن کی ترتیب تمام امت سے آج تک منقول ہے۔ اور تمام کا اس پر اتفاق ہے۔"

بحر العلوم مزید لکھتے ہیں:

وأیضًا ظَھَرَ مِنْ ھٰذَا اَنَّ التَّرْتِیْبَ الَّذِیْ یُقْرَأُ عَلَیْہِ الْقُرْآنُ ثَابِتٌ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہ ﷺ فَاِنَّ الْقُرَّائَ الْعَشَرَۃِ بَاَسَانِیْدِھِمُ الصِّحَاحِ الْمُجْمَعِ عَلٰی صِحَّتِھَا نَقَلُوْا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہ ﷺ قِرَائَ تَھُمْ وَقَرَئُ وْا عَلٰی ھٰذَا التَّرْتِیْبِ وَنَقَلُوْا أنّ شُیُوْخَھُمْ اَقْرَأُ وْھُمْ ھٰکَذَا، وَشُیُوْخُ شُیُوْخِھِمْ اَقْرَأُ وْھُمْ، ھٰکَذَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہ ﷺ۔ (2)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی یہ موجودہ ترتیب حضورؐ کی دی ہوئی ہے۔ کیونکہ ان دس قاریوں نے جن کی سندیں متواتر ہیں اس قرآن کو اپنی سندوں سے حضورؐ تک پہنچایا اور اسی کا حضورؐ سے سماع ثابت کیا ہے اور ان قاریوں کی یہ سندیں نہایت ہی اعلیٰ درجے میں صحیح ہیں اور تمام امتِ محمدیہ ﷺ نے ان پر اعتماد کیا ہے اور تمام کا ان پر اتفاق ہے اور ہر ایک قاری اسی طرح نقل کرتا ہے کہ میں نے اپنے استاذ سے اسی طرح قرآن کو سنا اور پھر یہ استاذ اپنے استاذ سے اسی طرح سماع بیان کرتا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضورؐ تک پہنچتا ہے۔

ابن مسعودؓ کے مصحف کے، حضرت عثمانؓ کے مصحف سے مختلف ہونے کی ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ ابن سعودؓ حضرت عثمانؓ کی اس کاروائی سے خوش نہ تھے اور انہوں نے اپنے مصحف کو نذر آتش نہیں

---

(1) بحر العلوم، شرح مسلم الثبوت، جلد 2، ص: ۱۲

(2) ایضاً، جلد دوم، ص: ۱۰

ہونے دیا۔ گویا وہ اپنے مصحف کو صحیح اور دوسرے مصحف کو غلط قرار دیتے ہوں گے اس سلسلے میں علامہ ابن حجر عسقلانی (852ھ)ؒ نے فتح الباری میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ (1) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ در حقیقت ابن مسعودؓ کو اس کام سے دو طرح سے اعتراض تھا۔

۱۔ کتابتِ مصحف میں انہیں کیوں شریک نہیں کیا گیا؟

۲۔ مصاحف کو نذر آتش کیوں کیا گیا؟

پہلے اعتراض کا ذکر ترمذی شریف کی ایک روایت میں امام زہری (50-124ھ) نے فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کو شکایت تھی کہ کتابتِ قرآن کا کام انکے سپرد کیوں نہیں کیا گیا جبکہ وہ حضرت زید ابن ثابتؓ کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک حضورؐ سے فیض یاب ہوئے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں حضرت عثمانؓ کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے یہ کام مدینہ طیبہ میں کیا تھا۔ ابن مسعودؓ اس وقت کوفہ میں تھے۔ موقع کی نزاکت کے پیش نظر اس کام کو ان کے مدینہ آنے تک مؤخر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ (13ھ) نے بھی حضرت زید ابن ثابتؓ ہی کو یہ کام سونپا تھا۔ اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ تدوینِ قرآن کا یہ مرحلہ بھی انہی کے ہاتھوں مکمل ہو۔ (2)

ابن مسعودؓ کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مصحف عثمانیؓ کی تیاری کے بعد باقی تمام مصاحف نذر آتش کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا لیکن وہ اپنا مصحف نذر آتش کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (30ھ) اور حذیفہ بن یمانؓ اس سلسلے میں انہیں سمجھانے کیلئے گئے لیکن انہوں نے جواب دیا:

"واللہ لا ادفعه اليهم، اقرأني رسول الله ﷺ بضعا وسبعين سورة ثم ادفعه اليهم والله لا ادفعه اليهم"۔ (3)

"خدا کی قسم میں یہ مصحف ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ستر سے زیادہ سورتیں سکھائی ہیں پھر میں انہیں یہ مصحف کیوں دے دوں؟ خدا کی قسم انہیں نہیں دوں گا"۔

جو حضرات کوفہ میں ابن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق قرآن لکھ چکے تھے، ابن مسعودؓ نے انہیں بھی یہی ترغیب دی کہ وہ بھی اپنے مصاحف حضرت عثمانؓ کے سپرد نہ کریں۔ حضرت خمیر بن مالک سے

---

(1) فتح الباری، جلد9، ص: ۱۹-۲۰، دار المعرفۃ (باب جمع القرآن، ذیل حدیث نمبر ۴۹۸۶)

(2) جامع الترمذی، حدیث نمبر ۳۱۰۴ باب ومن سورۃ التوبۃ، نیز فتح الباری، حوالہ مذکور

(3) مستدرک حاکم، جلد 2، ص: ۲۲۸ دائرہ المعارف دکن سنہ ۱۳۴۰

روایت ہے:

أُمر بالمصاحف أن تغير ،قال: قال ابن مسعود من استطاع منكم ان يغل مصحفه فليغله۔ثم قال: قرأت من فم رسول الله ﷺ سبعين سورة أ فأ تركُ ما أخذت من فم رسول الله ﷺ - (1)

"مصاحف میں تبدیلی کا حکم دیا گیا تو ابن مسعودؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص مصحف کو چھپا سکے وہ ضرور چھپالے۔۔۔۔ پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ستر سورتیں پڑھی ہیں تو کیا وہ چیز چھوڑ دوں جو میں نے براہ راست حضورؐ کے دہن مبارک سے حاصل کی ہے۔"

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ابن مسعودؓ کا مصحف، مصحفِ عثمانیؓ سے مختلف تھا لیکن کن کن پہلوؤں سے مختلف تھا، اس کی کچھ نشاندہی نہیں کی گئی۔بظاہر یہ اختلاف سورتوں کی ترتیب ہی کا تھا۔

لیکن یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (13ھ) نے سورتوں کو اس طرح سے ترتیب وار نہیں کیا تھا جس طرح حضرت عثمانؓ نے ترتیب دی تھیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کا نسخہ محض ترتیب کے اعتبار سے ہی مصحف عثمانی سے مختلف تھا۔(2) یہ دراصل ان کی خواہش تھی کہ جو چیز انہوں نے حضورؐ سے براہ راست حاصل کی ہے وہ اسے ضائع نہ ہونے دیں۔ محض تقدس اور تبرک کے طور پر اس نسخے کا ضائع نہ ہونے دینے کی خواہش سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ ابن مسعودؓ، حضرت عثمانؓ سے قرآن کے بارے میں اختلاف رکھتے تھے۔ یہ اختلاف زیادہ سے زیادہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں ہو سکتا تھا۔ اس قدر لاتعداد صحابہؓ کے اجماع کے مقابلے میں؟ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک مخصوص پس منظر میں اصرار، اس بات کی ہر گز دلیل نہیں بن سکتا کہ ابن مسعودؓ، مصحف عثمانی سے متفق نہ تھے۔ مولانا تقی عثمانی نے اس سلسلے میں تحقیقات کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مصحفِ ابن مسعودؓ صرف ترتیب سورہ کے اعتبار سے مصحفِ عثمانیؓ سے مختلف تھا۔ انہوں نے بخاری شریف میں موجود ایک عراقی باشندے کا واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک عراقی باشندہ حضرت عائشہؓ (57ھ) کے پاس آیا اور کہا :یاأم المؤمنين أريني مصحفك ، قالت: لِمَ؟ قال لعلّي أؤلّف القرآن عليه فانهٔ يقرأ غير مؤلف ، قالت : ومايضرّك أيّهٔ قرأت قبلُ۔ (3)

ترجمہ: ام المومنین مجھے اپنا مصحف دکھائیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا تاکہ میں اپنے قرآنی مصحف کو اس کے مطابق ترتیب دے لوں، اس لئے کہ وہ (ہمارے علاقہ میں) غیر

---

(1) مسند احمد: حدیث نمبر ۳۹۲۹، نیز الفتح الربانی، جلد ۱۸، ص: ۳۵، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۳ء

(2) الاتقان، جلد 1، ص ۶۶

(3) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر ۴۹۹۳، ص: ۴۳۳

مرتب طریقہ سے پڑھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) نے فرمایا: "قرآن کا جو حصہ بھی تم پہلے پڑھ لو تمھارے لئے مضر نہیں ہے"۔

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی (852ھ) لکھتے ہیں کہ یہ شخص ابن مسعودؓ کی قراءت پر کاربند تھا اور ابن مسعودؓ نے نہ تو اپنا مصحف بدلا تھا اور نہ ہی اسے ضائع کیا تھا اس لئے اس کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی اور ظاہر ہے کہ عثمانی مصاحف کی ترتیب میں مناسبتوں کی رعایت دوسرے مصاحف کے مقابلے میں زیادہ تھی اس لئے اس عراقی شخص نے اپنے مصحف کو مصحفِ عثمانیؓ کے مقابلے میں غیر مرتب قرار دیا۔[1]

مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رسم الخط کا بھی فرق ہو اور اس میں ایسا رسم الخط اختیار کیا گیا ہو جس میں رسم الخط عثمانی کی طرح تمام قراءتوں کے سما سکنے کی گنجائش نہ ہو۔ مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ یہ اختلاف کچھ اس نوعیت کا نہیں تھا کہ جسے کہا جا سکے کہ حضرت عثمانؓ نے سبعہ احرف میں سے چھ یا کچھ حروف ضائع کروادئے تھے۔ یہ بات حقائق سے ثابت شدہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سبعہ احرف میں سے ایسی کوئی چیز قرآن سے خارج نہیں کی تھی جسے عرضۂ اخیرہ میں قرآن قرار دیا گیا تھا۔ مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ اس نقطہ نگاہ پر محققین نے اعتراضات کئے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے سبعہ احرف قرآن سے خارج کردئے تھے اور ان اعتراضات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابن مسعودؓ کا اعتراض صرف اسی نوعیت کا تھا کہ پہلے سے لکھے ہوئے مصاحف کو ضائع کیوں کیا جارہا ہے۔[2]

حافظ ابن کثیر (774ھ) نے لکھا ہے کہ ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں ایک الگ باب اس موضوع پر قائم کیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے بعد میں حضرت عثمان کے مصحف سے اختلاف سے رجوع کرلیا تھا۔[3] اس طرح کی روایات کا جائزہ دوسرے انداز سے بھی لیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ (40ھ)، مصحف ابن مسعودؓ کے بارے میں فرماتے ہیں:

قال علیؓ: لا تقولوا فی عثمان الاّ خیرًا، فواللہ مافعل الذی فعل فی المصاحف إلاّ عن مَلَاٍ منّا۔

---

(1) فتح الباری، جلد 9، ص: ۳۲

(2) علوم القرآن، ص ۱۵۴-۱۵۵

(3) السجستانی، کتاب المصاحف، باب رضاء عبداللہ بن مسعود بجمع عثمان المصاحف، جلد 1، ص ۲۰۲، نیز تفسیرِ القرآن العظیم، فضائل القرآن، جلد ہفتم، ص ۴۴۷

قال ماتقولون فی هٰذهِ القراء ة فقد بلغنی ان بعضهم یقول ان قراءتی خیر من قراء تك وهذا یکاد ان یکون کفرا قلنا فما ترٰی قال اریٰ أن نجمع الناس علیٰ مصحف واحد فلا تکون فُرقة ولا اختلاف قلنا فنعم ما رأیت۔ (1)

ترجمہ: "حضرت علیؓ (40ھ) نے فرمایا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلائی کے علاوہ نہ کہو کیونکہ انہوں نے اللہ کی قسم مصاحف کے بارے میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا۔ انہوں نے ہم سب سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ان قراءتوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے حالانکہ یہ ایسی بات ہے کہ جو کفر کے قریب تر پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے کہا کہ پھر آپؓ کی رائے کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تا کہ کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے۔ ہم سب نے کہا کہ آپؓ نے بڑی اچھی رائے قائم کی۔" اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت علیؓ (40ھ) نے فرمایا اگر میں اس کام کا ذمہ دار ہوتا جو عثمانؓ کے سپرد تھا تو میں بھی وہی کر تا جو انہوں نے کیا"۔

اس روایت میں حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے الفاظ: "أَنْ نَّجْمَعَ النَّاسَ عَلٰی مُصْحَفٍ وَاحِدٍ" ہمارے موضوع کے اعتبار سے خاص توجہ کے حامل ہیں کہ آپؓ نے یہ ارادہ ظاہر فرمایا کہ ہم ایک مصحف تیار کرنا چاہتے ہیں جو پورے عالم اسلام کیلئے یکساں اور معیاری ہو اور اس کے بعد کسی صحیح قراءت کے انکار یا منسوخ یا کسی شاذ قراءت پر اصرار کی کسی کے پاس گنجائش باقی نہ رہے۔

یہ روایت ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف میں موجود ہے۔ مصحف عثمان اور مصحف ابن مسعودؓ کے اختلافات بھی ابن ابی دائود کے حوالے سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اس مذکورہ روایت کے اس کتاب میں موجود ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ابن ابی دائود نے جن اختلافات کا ذکر کیا ہے ان کی نوعیت اختلافات متن کی نہیں بلکہ وہ محض اختلافاتِ قرأت ہیں۔ اصل متن کے حوالے سے ابن ابی دائود بھی مصحف عثمانؓ اور مصحف ابنِ مسعود میں فرق نہیں سمجھتے تھے۔ مصعب بن سعد سے بھی روایت مروی ہے کہ مصحف عثمان کی تیاری

---

(1) بغوی، شرح السنۃ، مکتبِ اسلامی، بیروت، ۱۹۸۳، جلد 4، ص: ۵۲۳۔۵۲۴؛ تفسیر القرآن العظیم، (فضائل القرآن) جلد ہفتم، ص: ۴۴۶۔۴۴۷۔ نیز فتح الباری، فضائل القرآن، باب جمع القرآن جلد 10، ص: ۳۹۳

کے بعد صحابہ کرامؓ نے یہی کہا تھا: ''اَحْسَنَ وَاللہِ عُثْمَانُ'' ۔ اللہ کی قسم عثمان نے بڑا اچھا کام کیا۔ (1)

مصحفِ عثمانؓ پر صحابہؓ کے اتفاق و اجماع کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ علامہ مقری اپنی کتاب نفح الطیب میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے تیار کروائے ہوئے مصحف پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

هٰذَا مَا اُجْمِعَ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ زَيْدُ ابْنُ ثَابِتٍ وَّ عَبْدُاللهِ ابْنُ الزُّبَيْرِ وَ سَعِيْدُ بْنُ الْعَاصِ۔ (2) اس کے بعد دیگر صحابہؓ کے نام بھی درج ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو امت مسلمہ میں عظیم محقق اور بلند پایہ عالم کی حیثیت حاصل ہے ہمارے اس موضوع زیر نظر کے بارے میں آپؒ فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ حفاظتِ خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند صالح بندوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس کی جمع و تدوین کی خدمت سر انجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہ قرآنی پر متفق ہو جائیں اور عظیم جماعتیں اس کی تعلیم و تلاوت میں مشغول رہیں تاکہ سلسلہ تواتر ٹوٹ نہ جائے۔ اس کی تکمیل اس طرح ظہور میں آئی کہ عہدِ عثمان غنیؓ میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ اور اجماع سے تمام مصاحف میں سے ایک مصحف (جو عثمانؓ نے مصحفِ صدیقؓ سے نقل کر کے تیار کروایا تھا) پر اتفاق کیا گیا۔ جس میں شاذ قراءتیں نہیں لی گئیں بلکہ متواتر قراءتیں ہی لی گئیں اور قبائل عرب کی سات زبانوں (سبعہ احرف) میں سے جن پر قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ (اور اس کے پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی ان لوگوں کو جو لغتِ قریش کے پڑھنے سے عاجز ہوں) ایک لغت قریش کو لے لیا گیا اور باقی لغات کے مصحف متروک کر دیے گئے''۔ (3)

شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ کہ صحابہؓ کے ''مشورہ اور اجماع'' سے ایک نسخہ تیار کیا گیا، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے یہی بات ثابت ہوئی کہ یہ کاروائی حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) والے مصحف پر صحابہ کرامؓ نے اجماع کیا تھا۔

---

(1) ابن داؤد، کتاب المصاحف، بیروت، ۱۹۸۵، جمع عثمان المصاحف، ص: ۳۰-۳۱ ؛فتح الباری، جلد 10، ص: ۳۹۵، نیز سخاوی، شمس الدین جمال القراء، جلد 1، ص: ۱۶۴-۱۶۵- زرقانی، عبد العظیم، مناہل العرفان، جلد 1، ص: ۲۶۱ نیز ابو عبید، فضائل القرآن، ص: ۲۸۴

(2) علامہ مقری، نفح الطیب، جلد 1، ص: ۳۹۸

(3) شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء، جلد 2، ص: ۵

دسواں باب

صحت قرآن پر مستشرقین کے متفرق اعتراضات

تحریفِ قرآن پر ڈاکٹر منگانا کے دلائل

واقعہ غرانیق اور اس کی حقیقت

روایت تلک الغرانیق کا متن

اس روایت کی فنی حیثیت

روایت تلک الغرانیق کے بارے میں مفسرین کی آراء

ایک شبہ کا ازالہ

قیامت کے قریب قرآن مجید اٹھائے جانے کی حقیقت

چند دیگر اعتراضات

***

صحت قرآن پر مستشرقین کے متفرق اعتراضات

تحریفِ قرآن پر ڈاکٹر منگانا کے دلائل

ڈاکٹر منگانا نے اپنی کتاب (Leaves from Three Ancient Qurans) میں قرآن مجید میں تحریف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں اس نے قرآن مجید کے تین اوراق پیش کئے ہیں۔ ان تین نسخوں سے اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج جو قرآن مروج ہے اور وہ قرآن جو کسی قدیم زمانے میں مروج تھا، اختلاف پایا جاتا ہے۔

یہ اوراق ڈاکٹر منگانا نے ایک لیڈی ڈاکٹر اگنس سمتھ لوئیس سے حاصل کئے تھے۔ اس نے یہ اوراق تاجروں سے ۱۸۹۵ء میں سویز کے مقام پر خریدے تھے۔ ان اوراق پر تین قسم کی عبارات تحریر ہیں۔ یہ تحریریں یکے بعد دیگرے ایک دوسری کے اوپر لکھی ہوئی تھیں اور سب سے نیچے قرآن مجید کی کچھ عبارات تھیں۔ مگر جب اس کے بعد دوسری عبارت انہی اوراق پر لکھی گئی تو پہلی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ رگڑ کر محو کر دیا گیا۔ پھر تحریر کے بارے میں مذکورہ لیڈی کا دعویٰ ہے کہ یہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے قرآن جمع کروانے سے پہلے مروّجہ کسی نسخہ کے اوراق ہیں۔[1] یہ اوراق حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے ہاتھ نہیں لگ سکے اور ان کے مالک نے قرآن مجید کی عبارات کو چمڑے پر سے مٹا کر کاغذات کو فروخت کر دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے عہد کے بعد کے یہ اوراق کیوں نہیں ہو سکتے؟ اس کا جواب اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اس قسم کی عبارات کا حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے وقت کے بعد لکھا جانا ایک بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔

جب یہ اوراق ڈاکٹر منگانا کے ہاتھ لگے تو انہوں نے پتھر سے محو کی ہوئی عبارت کو پڑھ کر ان اوراق کی قرآنی عبارات کو ۱۹۱۴ء میں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ ڈاکٹر منگانا کا خیال ہے کہ ان مسودات کے بعض حصوں کا آٹھویں صدی کے ابتداء کا ہونا (جو حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) کے بعد کا دور

(1) Levies, H.D, World Religions, C.Watt. London, 1966. p.vii

ہے) اغلب ہے۔ وہ ان کو حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے پہلے کے لکھے ہوئے قبول کرنے کیلئے کسی صورت مین تیار نہیں ہے۔ لیکن منگانا یہ بھی کہتا ہے کہ ممکن ہے ان اوراقِ عثمانیؓ سے جو جلنے سے کسی وجہ سے بچا لئے گئے ہوں یہ اوراق ان سے نقل کر لئے گئے ہوں۔[1]

لیکن یہ بات بھی محض اس کا گمان ہے وہ یہ بات قطعی طور پر نہیں کہتا[2] ان اوراق میں اس نے قرآن مجید کے مندرجہ ذیل حصے پیش کئے ہیں:

شمار	نام سورۃ	از آیۃ نمبر	تا آیۃ نمبر
1	الاعراف	139	160
2	التوبۃ	18	79
3	ہود	20	39
4	الرعد	18	43
5	ابراہیم	1	8
6	الحجر	85	99
7	النحل	1	41
8	النحل	80	128

(1) Ibid,p.2-75

(2) Ibid,p. XXXVII-XI

9	بنی اسرائیل	1	57
10	النور	17	29
11	القصص	41	51
12	العنکبوت	17	30
13	المؤمن	78	85
14	حم السجدہ	1	20
15	الدخان	38	59
16	الجاثیۃ	1	20

(1)

ان آیات اور حصوں کو جب ہم تحقیقی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ڈاکٹر منگانا کا قول ہے کہ یہ چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں۔[2] اس نے ان کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے ان میں ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حرفِ ہمزہ نہیں پایا جاتا۔ دنیا میں اس وقت جو مستند نسخہ پایا جاتا تھا ان سے ان اوراق کے اختلافات کو ڈاکٹر منگانا نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

☆ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔

☆ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی چھوٹا سا اختلاف "واو" کا ہونا یا نہ ہونا، واؤ کی جگہ فاء ہونا یا "فائ" کی جگہ "واؤ" ہونا یا اس قسم کے دیگر اختلافات۔

(1) Ibid.P.XXXVII-XL

(2) Ibid.P.XXXVII-XL

☆ تیسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی لفظ زائد پایا گیا ہے یا کم۔ (1)

پہلے حصے میں چار اختلافات ہیں۔ دوسرے حصہ میں تیس اور تیسرے حصے میں چار اختلافات دکھائے گئے ہیں۔

ذیل میں ان اوراق کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ قرآن مجید کے مختلف نسخوں اور مسودات میں اختلافات دکھانے کیلئے صرف اسی قدر دکھانا کافی نہیں کہ ایک مسودہ میں ایک حرف ایک طرح لکھا گیا ہے اور دوسرے میں دوسری طرح۔ اتنی بات سے اختلافِ قرآن ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر اس سے اختلافِ قرآن ثابت ہو جاتا تو پھر پرانی اشیاء فروخت کرنے والوں سے چند اوراق خریدنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اوراق پر غور و خوض کیا جائے۔

اس قسم کے اختلافات تو موجودہ چھپے ہوئے قرآنی نسخوں میں بھی دکھائے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کی غلطیاں دراصل کاتب کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ گذشتہ زمانے کے کاتبوں سے بھی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ایک دوسرے نسخے سے مقابلہ کرنے کے ذرائع اس قدر موجود نہ تھے اس لئے ان سے غلطی کا ہو جانا اور پھر اس کا درست نہ ہو سکنا اور بھی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ وہ زمانہ چھاپہ خانے کا نہ تھا کہ ایک نسخہ تیار کروا کر اس کی کاپیاں کل اطرافِ عالم میں پہنچا دی جاتیں۔ اور اسے سرکاری ایڈیشن قرار دے دیا جاتا۔

اگر کسی نسخہ میں فرق پایا جاتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ قرآن کا اختلاف ہے، ایک احمقانہ خیال ہے۔ اختلاف تو اس وقت ثابت ہوتا ہے جب یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن کے مختلف نسخوں میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ دکھایا جائے۔ یا کوئی لفظ دوسری طرح لکھا ہوا دکھایا جائے یا کسی لفظ کی کمی بیشی ثابت کی جائے۔ ایک کاتب اگر ایک جگہ پر وَمِنْ کو فَمِنْ لکھ دیتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ قرآن میں جو وَمِنْ لکھا ہے وہ غلط ہے بلکہ اس کا فَمِنْ لکھنا، اس کی غلطی ہو گی۔

پس ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک کاتب کے ایک لفظ کو دو طرح لکھ دینے سے صرف یہی ثابت ہو گا کہ اس سے غلطی ہو گئی۔ اس سے قرآن میں اختلاف ثابت نہیں ہوتا۔

۲۔ اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ نسخہ جو ڈاکٹر منگانا پیش کرتے ہیں اس کی حیثیت کیا ہے؟ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے متعلق یقین سے کہا جا سکے کہ کسی عیسائی نے چند الفاظ میں تغیر و تبدل کر کے اس کو مسلمانوں میں شائع کرنے کی کوشش کی ہو۔ اور کسی مسلمان کے ہاتھ آنے پر

(1) For detail see IBID.,XXXII-XXXVI

اس مسلمان نے اس کو غلطیوں کی وجہ سے محو کر دیا ہو۔ یا عیسائی نے خود ہی ان الفاظ کو مٹا دیا ہو۔ جب یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ گذشتہ دور کے عیسائیوں نے دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو بھی جائز کہا۔ پھر جب جعلی اناجیل بن سکتی ہیں جن کا وضعی ہونا خود عیسائیوں کے ہاں بھی مسلّم ہے، یہ کیوں ممکن نہیں کہ اسی طرح چند آیاتِ قرآنی میں بھی تغیر و تبدل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔(1)

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ ٹکڑے چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ پھر یہ چند ٹکڑے مختلف سورتوں کے ہیں۔ کوئی کسی سورت کا حصہ ہے اور کوئی کسی سورت کا۔ اس کیفیت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ قرآن مجید کی کوئی کامل جلد نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پوری سورت ہے۔(2)

۴۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس مسودہ کی اس اعتبار سے کیا حیثیت ہے کہ اس پر پہلے عربی عبارت لکھی گئی۔ پھر جب کسی دوسری عبارت لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو اصل عربی عبارت کو نرم پتھر سے چمڑے کے کاغذ کو رگڑ کر اس کاغذ کو صاف کیا گیا اور اس پر دوسری عبارت لکھی گئی اور اس پر کسی تیسرے زمانے میں کوئی اور عبارت لکھی گئی۔

۵۔ اس صورت میں اس قدر گڈمڈ میں اصل الفاظ کو پہچاننا، نہایت دشوار کام ہے اور ہوشیار سے ہوشیار پڑھنے والے کو بھی غلطی لگ سکتی ہے۔ چہ جائیکہ ایک مخالف گواہ کے ہاتھ میں دے کر شہادت کا سارا اعتبار اسی پر رکھا جائے کہ وہ جو کچھ کہہ دے درست ہو گا۔ یہ تحریر قدیم زمانے کی کوئی صاف صاف لکھی ہوئی عبارت نہیں کہ اس کو آسانی سے پڑھا جا سکے اور اس کے پڑھنے میں کوئی شبہ نہ ہو۔

۶۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ پتھر کے ساتھ رگڑنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض حروف کی سیاہی پھیل گئی ہو اور ایک حرف کے نقطوں نے اصل حرف کے ساتھ مل کر کوئی اور شکل اختیار کر لی ہو۔

۷۔ اس طرح بعض حصے ایسے اڑ گئے ہوں کہ وہ دوبارہ نمودار ہو سکنے کے قابل رہ ہی نہ سکے ہوں۔ چنانچہ کئی سطور کے کئی حصے اس طرح پر محو شدہ ان عبارات کے اندر موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو وہ تصویر جو منگانا کو جو اوراق دستیاب ہوئے ان میں ایک صفحہ کی تصویر جو اس نے اپنی کتاب میں شامل کی ہے:(3)

---

(1) دیکھیں بائبل سے قرآن تک، جلد دوم، ص 13 تا 165

(2) Mingana., A., Leaves from Three Ancient Korans, Cambridge University Press, 1914. p. 2-75

(3) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans

سورة ٧ آية ١٥٨—١٥٠   Surah 7. Ay. 150 - 158
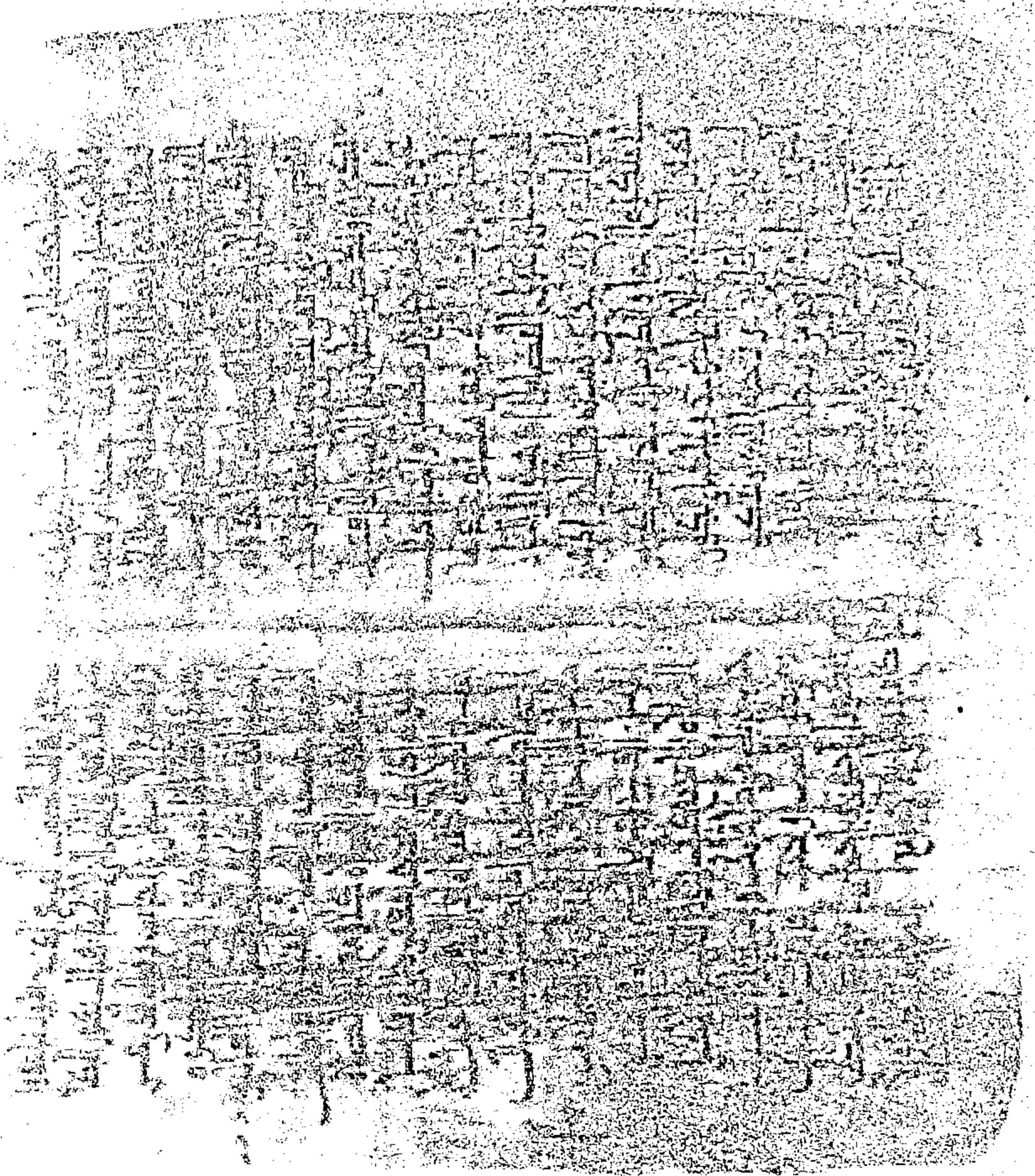
اس تصویر میں الفاظ پر نقطے لگے ہوئے ہیں۔ جس سے یقینی طور پر واضح ہوتا ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ (35ھ) کے زمانہ یا ان سے قبل کا نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ یہ بات مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں مصاحف نقطوں سے بالکل خالی تھے۔ جن آیات میں منگانا کو کمی یا فرق نظر آیا ہے ان میں سے ایک مثلاً صفحہ نمبر ٦ پر

سورة ٧ 6

Fol. 103 a

سورة ٧

v. 158 يبعث . . . . . النبي الامي الذي
يومن بالله وكلمته واتبعه لعلكم تهتدون

v. 159 ومن قوم موسى امة يهدون با . . وبه يعدلون

v. 160 قطع . . هم . . . . . اسباط . امما واوحينا الى
موسى اذ استق . . قومه ان اضرب بعصاك

. . . .

. . . .

. . . .

وما ظلمونا ولكن كانوا انفسهم يظلمون

(النسخة تنقص نصف صحيفة)

. . . .

. . . .

v. 165 كانوا يفسقون . . . . Fol. 103b

. . . .

. . . .

. . . .

v. 168 . . . . . . يغفر لنا وان ياتهم عرض

. . . .

A. S. L.

﴿وَمِنۡ قَوۡمِ مُوسٰۤى اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ وَقَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَىۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ‌ؕ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اِذِ اسۡتَسۡقٰٮهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ﴾۔ [1] جبکہ ڈاکٹر منگانا کے اس نسخے میں یوں لکھے ہیں:

گویا ان الفاظ میں بالحق کا لفظ ”با“ پڑھا جاتا ہے۔ باقی محو ہو گیا ہے۔۔۔۔

(1) سورۃ الاعراف: ۱۵۹، ۱۶۰

اب یہ کہنا بجا ہو گا کہ اس نسخہ کے لکھنے والے کو اصل قرآن سے اختلاف ہے کہ وہاں قطعتٰهم کے پہلے جو "واؤ" ہے وہ اس نسخے میں نہیں۔ بلکہ جس طرح باقی الفاظ کے بعض حصے محو کر دیئے گئے اس طرح یہ بھی محو ہو گئے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں ان اوراق میں سے اکثر دی جا سکتی ہیں۔

☆ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب کاغذ صاف کر کے دوسری عبارت لکھی گئی تو عین قرین قیاس ہے کہ اس دوسری عبارت کے بعض شوشے یا نقطے پہلے پھیکی سیاہی کے ساتھ مخلوط ہو کر کوئی اور شکل اختیار کر چکے ہوں۔

☆ ایک عبارت کو پتھر سے رگڑ کر پھر اسی پر دوسری عبارت لکھنے میں کئی قسم کے تغیرات کا آ جانا قرین قیاس ہے۔ اس لئے اس طرح کے مسودہ قرآن کو مستند نسخہ کے خلاف جس پر تحریر اور حافظہ کل اسلامی دنیا کا متفق ہو بطور شہادت پیش کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

☆ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مسودہ کے جو ایسی گڈ مڈ حالت میں ہے، پڑھنے والے کون ہیں۔ ڈاکٹر منگانا اور ان کی "لیڈی دوست" جو ان خیالات کی بدولت جو بچپن سے ان کے دلوں میں جاگزیں ہیں، ایک رائی کے دانے کو پہاڑ بنانے کو تیار ہیں۔ ان لوگوں کی نگاہ میں تنقیدی دیانت کہاں آسکتی ہے چاہئے تھا کہ ان عبارات کو پڑھنے پر کوئی بے لوث شہادت پیش کی جاتی۔ جو نسخہ پیش کیا گیا نہ اس کے لکھنے والے کی شہادت قابل اعتبار۔ نہ خود نسخہ ایسا کہ اس کی بنا پر کسی عدالت میں شہادت قابلِ اعتبار سمجھی جائے۔ نہ اس نسخہ کا پڑھنے والا ایسا جو بے تعصب ہو کر شہادت دے سکے۔ اس قدر مشکلات کی موجودگی میں اس نسخہ کو قرآن کریم میں اختلافات کی شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک مجنون کی بڑ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ملاحظہ ہو وہ اختلافات جن کو منگانا نے دریافت کیا ہے:

اگر اس معاملے کو محض ایک عدالتی کیس تصور کیا جائے کہ کیا کسی مقدمہ میں اس طرح کی مبہم تحریر کو کوئی بڑا اہم فیصلہ کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو کوئی بھی باشعور قاضی اس طرح کی مشکوک تحریر کو کسی فیصلہ کی بنیاد نہیں بنا سکتا۔ قرآن مجید کے متن کی صحت کے حساس اور اہم مسئلہ میں اس طرح کی ناقابل اعتبار عبارت کو ہرگز بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، جبکہ نزول قرآن کے فوراً بعد معتبر انداز سے وحی کی کتابت پر شواہد موجود ہوں، سینکڑوں، ہزاروں لوگوں نے اسے سینوں میں محفوظ کر لیا ہو، اس کے بعد اس طرح کی تحریروں سے کسی صورت بھی ابہام پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

ایک طرف حفاظت قرآن کے حق میں گزشتہ صفحات میں پیش کردہ حقائق ہوں اور دوسری طرف یہ ناقابل اعتبار تحریر وتو عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ مصدقہ شواہد کی موجودگی میں کوئی ابہام پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ (1)

☆ ایک اور بات جو ان اختلافات پر روشنی ڈالتی ہے یہ ہے کہ جس قدر اختلافات ڈاکٹر منگانا نے دکھائے ہیں وہ ان قراءتوں میں سے نہیں جن کا تحریر میں لانا، حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) نے منع کر دیا تھا۔ اور جس کو روکنے کیلئے انہوں نے مستند نسخوں کے علاوہ دوسرے نسخے جلا دیئے تھے۔ صرف ایک ہی بات تھی جو ڈاکٹر منگانا کی اس دریافت کو کچھ وقعت کے قابل بنا سکتی تھی اور وہ یہ کہ اس نسخے میں کچھ مختلف قرأتیں پائی جاتیں جن کی اجازت حضورؐ نے دی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نسخے کے اختلافات، ان مختلف قرأتوں میں سے ایک کو بھی اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اس صورت میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جو حملہ قرآن کی حفاظت پر کیا گیا ہے اس کی تردید خود دوسرے معترض ہی کر دیتے ہیں اگر یہ نسخہ حضرت عثمان غنیؓ (35ھ) سے پہلے کا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس میں ان مختلف قراءتوں میں سے کوئی قرأت نہیں پائی جاتی جن کا اس وقت رواج تھا۔

☆ جن ہاتھوں نے یہ نسخے لکھے ہیں ان پر بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے کس قدر ناواقف ہیں۔ ڈاکٹر منگانا نے بعض باتوں کو اس وقت کی خصوصیات میں داخل کیا ہے۔ مثلاً شیئ کی جگہ شای لکھنا۔ یایوحی کی جگہ یوحا لکھنا یا ''امّا'' کی جگہ ''ان ما'' لکھنا۔ قرآن کی جگہ قرن لکھنا۔ ینالو کی جگہ نیللو لکھنا ''اذاینا'' کی جگہ اذنا لکھنا علم کی جگہ عیلم لکھنا۔ مگر یہی باتیں ناواقفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اوّل تو قرآن کریم کے لکھنے کی طرز ابتداء سے ایک ہی چلی آرہی ہے اور جو لفظ جس طرح کاتب نے پہلے دن لکھ دیا اسی طرح آج تک قرآن میں لکھا جاتا ہے۔ (2) مثلاً لفظ ''صلوٰۃ'' اور صلاۃ۔ بعض جگہوں پر ایک حکمت کے تحت صلوٰۃ ہے اور بعض جگہ صلاۃ لکھا گیا ہے۔ یہاں منگانا والے کاغذات میں اختلافات معمولی نہیں ہیں۔ بلکہ صاف طور پر کاتب بے خبر نظر آتا ہے۔ ورنہ جن غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کوئی معمولی اغلاط نہیں ہیں۔

---

(1) Ibid, p.xxxvi

(2) اس سلسلہ میں کتاب کے آخری باب میں تفصیلات پیش کی گئی ہیں کہ رسم الخط عثمانی کا کتابت میں اہتمام لازم قرار دیا گیا ہے اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے۔

☆ ان میں کئی ایک الفاظ ایسے لکھے ہیں جو قرآن کے رسم الخط سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً: ''یوم الفصل'' کو ''یولفصل''، ''یھدیھم سبیلا'' کو ''یھدیھمسبیلا''، ''ھم بایاتنا'' کو ''ھمبایتینا''، ''ذالك الدین القیم فلا''[1] میں القیم فلا کو ''القیمفلا''[2]۔ لھم سؤ اعمالھم کو لھمسواعملھم[3] فیکم سمعون کو فیکمسمعون لکھا گیا ہے[4]

اسی طرح واتبعوہ کو واتبعہ[5] لکھا گیا ہے۔ جنود کو جندا لکھا ہے۔ یحادو کو یحیدد لکھ دیا ہے۔[6] الصلوۃ کو الصیلوۃ لکھ دیا گیا۔[7]

ڈاکٹر منگانا اس طرز کو اس دور کی خصوصیت قرار دیتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ اس وقت قرآن میں یہ الفاظ اسی طرح لکھے جاتے تھے۔ بلکہ قرآن کے الفاظ جس طرح پہلے دن لکھے گئے اسی طرح آج بھی لکھے جاتے ہیں۔ (اس کا تفصیلی ذکر رسم الخط قرآنی کے باب میں کیا گیا ہے) اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ منگانا والے کاغذات کا لکھنے والا کوئی ناواقف حال شخص ہے۔ ان مثالوں سے ڈاکٹر منگانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اس وقت کا انداز تحریر تھا لیکن یہ بات خلاف حقیقت ہے کہ مثلاً علم کو عیلم لکھنا طرزِ تحریر نہیں۔ یہ بات بھی خلاف حقیقت ہے کہ یہ الفاظ قرآن میں اس طرح لکھے جاتے ہوں۔ قرآن حکیم کے لکھنے میں آج تک ہمیشہ پہلا طرز تحریر ہی اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً کتاب کو کتٰب ہی لکھا گیا ہے۔ سبحان کو سبحٰن ہی لکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں بلکہ ایک لفظ جو ایک جگہ ایک طرز پر لکھا گیا اور دوسری جگہ دوسری طرح لکھا گیا تو اب تک اسی کا مسلسل تتبع ہوتا چلا آرہا ہے۔ مثلاً صلوۃ کا لفظ قرآن کریم میں عموماً ''و'' کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے مگر سورۃ الانعام کے آخر میں صلاتی لکھا ہے۔[8] صلوتی نہیں لکھا۔ حالانکہ سورۃ ھود آیت نمبر ۸۹ میں صلوتک ہے۔ صلاتک نہیں اور سورۃ الانعام آیت نمبر ۹۳ میں صلاتھم ہے صلوتھم نہیں ہے اور سورۃ النور میں صلاتہ ہے صلوۃ نہیں

---

(1) Mingana, P.XXXVi

(2) IBID

(3) IBID

(4) IBID

(5) IBID

(6) IBID

(7) IBID

(8) الانعام: ۱۶۲

ہے۔[1] اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ابراہیم کو ابراھم لکھا ہے۔[2] لیکن دوسرے مقامات پر ابراہیم لکھا ہے یعنی یا کے ساتھ۔ قرآن مجید میں لفظ "قال" اسی طرح لکھا ہے لیکن بعض مقامات پر اسے "قل" لکھا گیا ہے۔ اور ہمیشہ اسی طرح لکھا جا رہا ہے۔ اس طرح کی مزید کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ قرآن کریم کا طرزِ تحریر بھی محفوظ چلا آ رہا ہے۔

اگر گذشتہ صفحات میں بیان شدہ تحریروں میں کچھ خلط ملط نہیں ہوا تو ان مسودات کے لکھنے والا کوئی ناواقف آدمی تھا۔ ڈاکٹر منگانا نے جو اختلافات بیان کئے ہیں ان میں سے پہلی قسم کے اختلافات چار ہیں ان مین سے دو اختلافات ایک آیت میں بیان کئے گئے ہیں اور نہایت چالاکی کے ساتھ ایک اختلاف بنانے کیلئے دوسرا اختلاف پیدا کر دیا گیا ہے۔ سورۃ الجاثیۃ کی آیت نمبر ۱۹ اس طرح ہے ﴿ إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ﴾[3]

اس کی بجائے ڈاکٹر منگانا یوں پیش کرتا ہے کہ انھم لن یغنوعنك من اللكم ھكما

اس تحریر میں ڈاکٹر منگانا کا دعوٰی ہے کہ شیأً کی بجائے ھكما لکھا ہوا ہے۔

مگر کیا اللہ کی بجائے اللکم لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر منگانا کا مسودہ پڑھنے کے بعد اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ کیونکہ اصل مسودہ میں یہ صرف اعتراف ہے کہ لن یغنوا عنك من کے بعد پورا پڑھا نہیں جاتا بلکہ اس کا صرف ایک حصہ اللہ پڑھا جاتا ہے اس کے ساتھ "کم" ڈاکٹر منگانا نے خود اپنی طرف سے تجویز کر لیا ہے۔[4]

حالانکہ لفظ کا جس قدر حصہ پڑھا جاتا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ اللہ کا لفظ موجود ہے اور ایک مخلوط اور ڈھلے ہوئے مسودہ میں اللہ کا پہلا حصہ اللہ صاف پڑھا جاتا ہے[5] اس صورت میں ایک منصف مزاج قاری مجبور ہو گا کہ اسے اللہ صاف پڑھا جائے۔ لیکن چونکہ ایک بے ربط لفظ ھکما کے کچھ معانی بنانے تھے اس لئے واضح تحریف کر کے یہ کہہ دیا کہ اللہ کی بجائے اللکم ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس تحریف سے بھی ڈاکٹر منگانا کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

---

(1) النور: ۴۱

(2) البقرۃ: ۱۲۵

(3) الجاثیۃ: ۱۹

(4) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, xxxvii

(5) Ibid

انهم لن یغنوا عنك من اللكم هكبا جس کے معنی ڈاکٹر منگانا نے یہ کئے ہیں کہ تمسخر کرتے ہوئے وہ تیرے لئے ایک مکے کی جگہ نہیں لیں گے۔ یہ فقرہ بے معنی فقرہ ہے۔[1] بات صرف اس قدر ہے کہ شیأً کا لفظ کچھ نقطوں اور دندانوں کی سیاہی پھیل جانے سے اور کچھ اوپر کی تحریر سے گڈمڈ ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر منگانا نے کس لغت سے ھکم کا لفظ تیار کیا جس کا معنی تمسخر ہے۔ مگر چونکہ انهم لن یغنوا عنك من الله هكبا کے کچھ معنی نہ بنتے تھے اس لئے کچھ تحریف سے مددلی اور الله کی بجائے اللكم لکھ دیا۔

پہلی قسم کے اختلافات میں تیسرا اختلاف سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۴۳ میں ہے۔[2] کہ وتعلم کی جگہ ومنهم ہے۔ الفاظِ قرآن یوں ہیں وتعلم الکاذبین۔

منگانا کہتا ہے کہ ''الکاذب'' تک پڑھا جاتا ہے مگر آخری ''ین'' محو ہو چکے ہیں اب تعلم کو منهم بنانے میں ایک دقت پیش آتی تھی یعنی اگر الکاذبین ہی پڑھا جائے تو ''ومنهم الکاذبین'' درست عبارت نہیں بنتی[3] اب ڈاکٹر مذکور نے الکاذبین کی بجائے الکاذبون بنا ڈالا۔ بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح تحریف اور کذب بیانی کا مرتکب ہوا ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۵۴ میں ﴿وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ﴾ کی بجائے وفی نسختها هدی وسلم﴾ کا ایک اختلاف بھی منگانا نے پیش کیا ہے۔ درحقیقت یہ کاتب کی واضح غلطی ہے کوئی قرأت هدی وسلم کی موجود نہیں۔ اس طرح کے الفاظ کہیں موجود نہیں دوسری قسم کے اختلافات کی تعداد تیس بیان کی گئی ہے اس میں اول تو وہ الفاظ نہیں ہیں جن میں ڈاکٹر منگانا کو غلطی لگی ہے ۔بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ منگانا نے مغالطہ پیدا کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔

اس میں سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں لفظ بٰرکنا کا اختلاف دکھایا گیا ہے[4] حالانکہ یہ اختلاف کچھ بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر منگانا کہتا ہے کہ قرآن کریم میں ''بارکنا'' ہے اور اس کے دریافت کردہ اوراق میں ''بٰرکنا'' ہے اور پھر ''بٰرکنا'' کے معنی وہ گھٹنے ٹیکنا کرتا ہے۔[5] یہ محض حماقت ہے۔ قرآن کریم کے طرزِ تحریر میں ''بارکنا'' نہیں لکھا جاتا بلکہ اسے اب تک ''بٰرکنا'' لکھا جاتا ہے۔ پرانے طرزِ تحریر میں اوپر کا الف نہیں لکھا جاتا تھا مگر پڑھنے میں آتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم صرف تحریر میں محفوظ نہ تھا بلکہ ابتداء

---

(1) Ibid

(2) عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وتعلم الکاذبین

(3) Mingana, ibid

(4) IBID

(5) IBID

سے ہی تحریر کے ساتھ ساتھ حافظوں مین بھی محفوظ تھا۔ اس طرح کے اختلافات نکالنے ہیں تو صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی ایسی مثالیں دی جاسکتی ہیں:

مثلاً سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۷۰:﴿ كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ﴾[1]

میں ہمارے قرآنوں میں طرزِ تحریر بِخَلَاقِكُمْ اور خلاقکم ہے[2] مگر ان اوراق میں خلقهم لکھا ہے[3] ڈاکٹر منگانا نے بجائے خلاق کے خلق پڑھ کر اس کا معنی پیدائش کیوں نہیں کر لیا حالانکہ یہ معنی تو کچھ بن بھی جاتے ہیں۔ مگر المسجد الحرام الذی برکنا حوله کے معنی کچھ بھی نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اس کو بُرکنا نہ پڑھیں برکنا پڑھیں تو گویا خدا کہتا ہے کہ مسجد حرام جس کے گرد ہم نے گھٹنے ٹیکے تھے جو بالکل بے معنی فقرہ ہے۔ حالانکہ بُرکنا کے معنی صاف ہیں کہ "ہم نے برکت دی تھی"۔

اسی قسم کا ایک اور فرق سورۃ النّحل کی آیت نمبر ۲۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ منگانا کہتا ہے کہ ایّان کی بجائے "این" لکھا ہے حالانکہ وہ در حقیقت "ایّٰن" ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہی ڈاکٹر منگانا جو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس لکھنے والے کی طرز تحریر بھی ایسی ہے کہ وہ قرآن کو قرن لکھتا ہے[4] وہ اس قدر موٹی بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ ایان دوسری طرح بھی لکھا جاسکتا ہے یعنی "ایّٰن" کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ تصریف الریاح کو تصریف الریح لکھا ہے[5] حالانکہ مراد الریح ہی ہے اور کلماتہ کو کلمتہ ہے اور الاعراف ۱۴۱ مین بکلامی کی بکلمی لکھا ہے اور وہیں ۱۴۲[6] اور ۱۴۹[7] میں الالواح کو الالوح لکھا ہے اور لمیقاتنا[8] کو لمقتنا لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر منگانا نے یہ معنی کیوں نہ کر لئے کہ موسیٰ ہماری بیزاری کیلئے آئے؟ صرف اس لئے کہ یہ معنی بن نہ سکتے تھے؟ پھر جب اس لکھنے والوں کا طرزِ تحریر ہی یہ ہے اور ڈاکٹر منگانا خود اسی بات کو

---

(1) التوبۃ:69

(2) Mingana, ibid, p. 16

(3) IBID

(4) IBID, p. 72 (أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ)

(5) Ibid, p. 2 (ان فی خلق السموت والارض ـ ـ ـ ـ وتصریف الریح)

(6) Ibid (فلما جاء موسی لمیقاتنا ـ ـ ـ ـ)

(7) Ibid

(8) Ibid, p. 3

اس کی خصوصیات میں سے بتاتا ہے تو اس طرزِ تحریر کی بیسیوں مثالوں میں سے ایک دو کو اختلاف کے رنگ میں پیش کر دینا محض شرارت ہی ہے۔

اس قسم کے اختلافات میں اس قسم کی مثالیں دی گئی ہیں کہ

"و" کی جگہ "ق" یا "ف" کی جگہ "و" ہے یا "و" یاء کو بڑھا دیا یا چھوڑ دیا گیا ہے یا یوں ہی کوئی اور چھوٹا سا فرق ہے مثلاً یہ کہ سورۃ الرّعد آیت نمبر ۲۶ [1] میں اللہ کی جگہ واللہ ہے۔ لکھنے والے کو معمولی غلطی لگ گئی ہے۔ سورۃ النّحل آیت نمبر ۱۷ [2] میں افلا کی جگہ اولا ہے۔ پتھر سے رگڑنے میں نقطہ اُڑ گیا ہے اور فا۔ل سے الگ ہو گیا ہے یا یہ بھی محض معمولی غلطی ہے جو پورا یا "و" نہ ہونے سے لگ سکتی ہے۔

سورۃ ابراہیم آیت نمبر ۳ [3] میں ضلال کی جگہ ضل ہے۔ ظاہر ہے جو شخص اذاننا کو اذنا لکھ سکتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر منگانا نے خود مثال دی ہے اور جنودا کو جندا لکھ سکتا ہے اور واتبعوہ کو واتبعہ لکھ سکتا ہے کیا ضلال کی جگہ "ضل" لکھ دینا اس سے کچھ بعید ہے۔ ایسا ہی الحجر آیت نمبر ۹۴ [4] میں "واعرض" کی جگہ "واعرضن" ہے جہاں ممکن ہے کہ نقطہ کسی اوپر کی تحریر سے زائد پڑ گیا ہے پھر الرّعد آیت نمبر ۳۳ میں زین کی جگہ "فزین" ہے جو واضح غلطی ہے کیونکہ فزین پڑھ کر وہاں عبارت ہی نہیں بن سکتی۔ اصل عبارت ہے ﴿ أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَم بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴾۔ اس کی بجائے اگر یوں پڑھیں کہ ﴿بل فزین للذین کفروا﴾ تو یہ عربی ترکیب نہیں۔ بل اور فا دونوں میں سے ایک ہی رہ سکتا ہے [5]

ایک اختلاف یہ دکھایا گیا ہے کہ سورۃ ھود آیت نمبر ۲۲ میں ﴿لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ﴾ کو نحسرون لکھا ہے حالانکہ معلوم ہوتا ہے کہ "الأَخْسَرُونَ" کو لکھنے والے نے حسب معمول "اخسرون" کا الف چھوڑ کر الخسرون لکھا ہے۔ اس میں سے پہلا الف چونکہ پچھلی سطر کے آخر پر آیا ہے اور وہ اُدھر رہ گیا ہے اور لخسرون سطر کی ابتداء میں آگیا ہے۔ پھر وہ سطر کے آخر کا الف اُڑ گیا ہے اس کی مثال اس سے دو سطر اوپر ہی موجود ہے جہاں ا ظلمین کا الف پہلی سطر کے آخر پر ہے اور اگلی سطر کی ابتداء میں

---

(1) اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ

(2) أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

(3) الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ

(4) فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ

(5) Mingana,

صرف لظمین ہے۔ یہی حال اس اگلے اختلاف اختبوا اور خبتوا کا ہے جہاں پہلا الف ہمزہ کی بجائے سمجھ کر لکھنے میں ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ اس ساری طرزِ تحریر میں ہمزہ کہیں بھی نہیں لکھا گیا یا پتھر کی رگڑ سے محو ہو گیا ہے۔ (1)

اسی طرح ایک اختلاف النّحل آیت نمبر ۳۶ میں فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا کی جگہ "وانظروا" لکھا ہے۔ جو اگر غلطی نہیں تو محض "ف" کا نقطہ بالکل محو ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد دو مثالیں جیسی التوبۃ آیت نمبر ۳۶ (2) میں "فیھن" کی جگہ "فیھا" ہونا اور فاصابھم کی جگہ فاصابتھم ہونا۔ محض کاتب کی غلطیاں ہیں۔ (3)

ڈاکٹر منگانا کے ان اختلافات میں سے بارھواں اور انیسواں اختلاف ڈاکٹر موصوف کے تعصب کی علامت ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۲۴ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ اور آیت نمبر ۳۷ کے آخری الفاظ یہ ہیں ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ اب پڑھنے میں "يَهْدِي" کی جگہ "یا" دونوں جگہ نہیں پڑھی جاتی کیونکہ وہ "الْقَوْمَ" کے ل کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یا تو اس خیال سے لکھنے والے نے اسے نہیں لکھا یا ویسے ہی اُڑ گئی۔ منگانا کے ہاں يَهْدِي الْقَوْمَ کے بجائے "یھد القوم" ہے۔ منگانا اسے بہت بڑا اختلاف قرار دیتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ اسے "لا یھدا" دوسرا لفظ بناتا ہے۔ جہاں "ل" حرفِ جر قرار دیا ہے۔ ھدء یھدء کے معنی ہیں حالتِ سکون مین نہیں ہونا۔ اس لئے وہ معنی یوں کرتا ہے کہ خدا فاسق لوگوں کی طرف اور (دوسری جگہ کافر لوگوں کی طرف) حالتِ سکون میں نہیں ہو گا۔ (4) اس سے قطع نظر کہ یہ عبارت بے معنی ہو جاتی ہے جس سے ڈاکٹر منگانا کو کوئی سروکار نہیں کیونکہ کوئی لفظ بے معنی بن جائے سہی خواہ وہ سیاق وسباق عبارت کے لحاظ کچھ معنی نہ دے ڈاکٹر منگانا کیلئے یہی کافی ہے۔ ڈاکٹر موصوف یہ بھول جاتے ہیں یھدء میں تو ہمزہ آخر میں آتا ہے اور ہمزہ کے متعلق وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس طرزِ تحریر میں ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ پھر اب ایک اختلاف بنانے کیلئے ہمزہ بھی لکھ لیا گیا۔ ڈاکٹر مذکور کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ دونوں صورتوں میں قوم کی صفت الکٰفرین اور الفاسقین پڑی ہوئی ہے اور اگر صفت "ال" ہے تو موصوف 'ال' سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس القوم میں ایھدی کا حصہ نہیں بن سکتا اور 'ل' حرفِ جر بن سکتا ہے بلکہ "ال" تعریفی جس طرح الفاسقین اور الکافرین کے ساتھ ہے اُسی طرح موصوف "القوم" میں بھی ہونا ضروری

---

(1) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, xxxvii-viii

(2) IBID

(3) Mingana, Ibid, p. xxxviii; 12 (متن)

(4) Mingana, Ibid

ہے۔[1] اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر منگانا نے کس قدر اپنے مسلمات اور قواعد کے خلاف اختلاف بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کی معلومات کی حامل عبارات کو اس طرح خلط ملط کر دینے والے شخص کی تحقیقات کسی طرح بھی قابل اعتماد نہیں ہو سکتیں۔

سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۴۹ [2] میں بھی ایک اختلاف دکھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر منگانا کہتا ہے کہ ءانا کی بجائے انّا لکھا ہے۔ وہ مغالطہ پیدا کرنے کیلئے "ءانا" کو "انا" لکھتا ہے۔ جس کی وجہ اور جواز یہ ہے کہ وہ خود کہہ چکا ہے کہ اس طرزِ تحریر میں ہمزہ بالکل نہیں لکھا گیا۔ اس لئے اگر وہ قرآن مجید کے لفظ کو درست طور پر "ءانا" لکھتا ہے تو اس کی یہ تحریر ہی اس کے اعتراض کا جواب ہو جاتی ہے۔ پس اس نے محض دھوکہ دینے کیلئے "ءانا" کی بجائے "انا" لکھ دیا ہے۔[3] ڈاکٹر منگانا نے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۲۳ میں أَلَّا تَعْبُدُوْ کی جگہ فلا تعتدوا اور سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۲۳ میں وَمَنْ کی جگہ فمن، کاتب کا معمولی سہو ہے یا ڈاکٹر منگانا مذکور کے پڑھنے میں غلطی ہے۔ مثلاً اول الذکر مثال میں اصل الفاظ یوں ہیں۔ وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ اب اگر الاّ کی جگہ "فلا" پڑھیں تو عبارت درست ہی نہیں رہتی۔[4]

سورۃ ھود کی آیت نمبر ۲۹[5] میں اراکم کی جگہ اریکم کو اختلاف بتانا بھی ڈاکٹر مذکور کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ارلکم لکھا جاتا ہے۔ کاتب نے حسب معمول اوپر کا الف نہیں لکھا۔ لیکن منگانا نے اسے اختلاف بنا کر اس کے معانی الٹ پلٹ کر دیئے۔[6]

سورۃ ھود کی آیت نمبر ۳۲[7] میں جَادَلْتَنَا کی جگہ جادلت ممکن ہے محض آخری "نا" کے محو ہو جانے سے رہ گیا ہے یا یہ کاتب کی غلطی ہو[8]

---

(1) Ibid

(2) وَقَالُوا أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا

(3) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, p. xxxviii

(4) Mingana, Ibid.

(5) وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ

(6) Mingana, Ibid.

(7) قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا

(8) Mingana, Ibid.

سورۃ المومن کی آیت نمبر ۸۵ میں فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ بھی اس طرح کا مسئلہ ہے۔

حٰم السجدہ آیت نمبر ۱۱ [1] میں فَقَالَ کی جگہ فقیل اختلاف نہیں محض دوسرا طرزِ تحریر ہے۔ اگر ''یحادد'' کی جگہ یحیدد (التوبۃ: ۶۳) اختلاف نہیں تو قال کی جگہ قیل بھی اختلاف نہیں ہے۔ [2] خصوصاً جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ قرآن مجید میں قال بعض جگہ قل بھی لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے لکھنے والے کو اسی سے غلطی لگی ہو۔ حٰم السجدہ آیت نمبر ۵ [3] میں ''إِنَّنَا'' کی جگہ ''انما'' صرف ''ننا'' کے دوسرے نقطہ کے نون کے دندان کے ساتھ مل جانے سے نما کی شکل بن گئی ہے۔ جبکہ اس مسوّدے میں سیاہی عموماً پھیلی ہوئی ہے۔ اور ایک لفظ دوسرے سے خلط ملط ہے اصل عبارت میں '' فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ '' تو ایک معنی رکھتا ہے (تو عمل کر ہم بھی عمل کرنے والے ہیں) مگر ''فاعمل انما عملون'' کے معنی نہیں بنتے۔ سورۃ العنکبوت آیت نمبر ۲۶ [4] میں وقال کی جگہ قال، سورۃ النحل آیت نمبر ۹۳ [5] میں لجعلکم کی جگہ جعلکم۔ سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۵۴ [6] میں وما کی جگہ ''ما''، سورۃ النّحل آیت نمبر ۸۶ [7] میں واذ کی بجائے ''وا'' یہ سب پہلے حرف اور آخری سطر میں آخری حرف کے مکمل طور پر محو ہو جانے کا یا محض سہو کاتب کا نتیجہ ہے۔ سورۃ الدخان آیت نمبر ۴۴ [8] میں ''اثیم'' جگہ اثم طرزِ تحریر کا اختلاف ہے کیونکہ اثیم کو اثم بھی لکھا جا سکتا ہے جیسا کہ ابراہیم کو ابراہم لکھا جا سکتا ہے۔

---

(1) ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ

(2) Mingana,

(3) وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ

(4) فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۶)

(5) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

(6) وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَى وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ

(7) وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِنْ دُونِكَ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ

(8) طَعَامُ الْأَثِيمِ

سورۃ النّحل کی آیت نمبر ۱۱۱ [1] میں "عملت" کی جگہ "عملتہ" یا تو اوپر کی تحریر کے خلط ہو جانے سے بن گیا ہے یا یہ صریح غلطی ہے۔ سورۃ النّحل میں آیت نمبر ۲۸ [2] کے اندر "بلٰی" کی جگہ "بل" بالکل بے معنی ہے۔ اس جگہ یا تو کاتب نے کوئی انوکھا طرزِ تحریر اختیار کیا ہے یا بلٰی میں "لام" اور "یا" کا درمیانی دندانہ محو ہو گیا ہے ایک انکار پر "بلٰی ان اللہ علیھم بما کنتم تعملون" تو جواب ہو سکتا ہے لیکن بل ان اللہ علیھم ترکیب کے لحاظ سے بھی درست نہیں ہے کیونکہ "بل" کے بعد "انَّ" نہیں آ سکتا [3] تیسری قسم کے اختلافات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سورۃ النّحل کی آیت نمبر ۹۳ [4] میں ہے یضلّ من یشآء لیکن ڈاکٹر منگانا کے نسخے میں یضل اللہ من یشآء ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی اور قرینہ نہ ہوتا تو بھی ہم کہتے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ مگر یہاں تو قرینہ بھی بالکل واضح ہے۔ کیونکہ یہاں عبارت یوں ہے ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء پس اگر یضل کے بعد اللہ کا لفظ بڑھائیں تو دونوں فقروں کی موزونیت برقرار نہیں رہتی۔ [5] کسی کاتب کے ایک لفظ زائد لکھ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اصل کو غلط تسلیم کیا گیا ہے۔ غلطی نقل کی سمجھی جائے گی۔ اصل کی غلطی کیلئے کوئی اور تائیدی واقعات ہونے چاہئیں جن سے غلطی کو ثبوت مل جائے۔ اسی طرح سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۳۸ [6] میں ڈاکٹر منگانا کے نسخے کے کاتب نے الفاظ مالکم سہواً چھوڑ دیے ہیں [7] اس بنا پر انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ اصل قرآن میں مالکم کے الفاظ زائد ہیں۔ اس آیت سے تھوڑا پیچھے آیت نمبر 3 [8] ہمیں ہمارے اس موقف کی تائید میں قطعی دلیل مل جاتی ہے۔ منگانا کہتے ہیں کہ آیت نمبر ۳۳ میں لفظ "ھو" کاتب نے چھوڑ دیا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ یہ لفظ حاشیہ پر بڑھایا گیا۔ حالانکہ اصل بات صرف اس قدر ہے کہ "الذی ارسل رسولہ" سے چونکہ سطر شروع ہوتی ہے اس لئے جو لفظ "ھو" ابتداء سے رہ گیا تھا وہ مجبوراً حاشیہ پر ہی جانا تھا۔ در حقیقت وہ اسی جگہ پر ابتدائے سطر میں

---

(1) يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(2) الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

(3) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, xxxvii-xxxix

(4) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

(5) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, p. 42

(6) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ

(7) Mingan, p. 12

(8) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اب یہ بات کہ یہ مختلف ہاتھ کا ہے، اگر محض اسی تعصب کا نتیجہ ہے جس کی مثالیں مستشرقین کے ہاں ملتی ہیں تو بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ غلطی دیکھ کر کسی نے درست کر دی ہو گی۔ خود کاتب نے درست نہیں کیا ہے کسی دوسرے نے کر دیا، کوئی بھی صورت ہو غلطی تسلیم تو کر لی گئی۔

اسی طرح اگر "مالکم" (آیت نمبر ۳۸ سورۃ التوبۃ) کے لفظ رہ گئے تو اسے سہو کاتب ہی کہا جائے گا۔ نہ کہ اختلافِ قرآن۔

اسی طرح کی ایک مثال سورۃ التوبۃ ہی کی آیت نمبر ۳۶ میں ہے جہاں ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً﴾[1] کے بجائے یوں لکھا ہے۔

"وقاتلوا المشرکین کما یقاتلونکم کافۃ"[2] یہاں بھی "کما" کا لفظ چاہتا ہے کہ جس طرح آخر میں کافۃ آیا ہے "کما" سے پہلے بھی "کافۃ" ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں آیات جن میں یہ تین الفاظ رہ گئے ہیں ایک ہی جگہ واقع ہیں یعنی سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۳۳ سے لے کر آیت نمبر ۳۸ میں ہی ہیں۔ اور ان تینوں میں سے ایک غلطی کا بھی درست کر دینا ڈاکٹر منگانا کے اعتراض کا کافی جواب ہے۔

ڈاکٹر منگانا کی ان تمام کوششوں کے باوجود قرآن کریم میں کسی اختلاف اور غلطی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ لیکن اس کے مسودے سے قرآن کریم کی حقانیت اور صحت پر ہمیں کئی ایک نکات ملتے ہیں

۱۔ تمام سورتوں میں آیات کی ترتیب وہی ہے جو قرآن مجید کے متفقہ مروجہ نسخہ میں ہے۔

۲۔ کہیں کسی آیت کی کمی بیشی نہیں ہے۔ کسی لفظ کی کمی بیشی نہین ہے۔

۳۔ سب سے بڑھ کر سورتوں کی موجودہ ترتیب کی درستی پر بھی اس سے شہادت ملتی ہے۔

کیونکہ اس میں سورتیں اسی ترتیب سے ھیں جس میں موجودہ قرآن مجید میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً منگانا کے مسودہ میں صفحہ ۶۹ پر سورۃ المومن ختم ہو کر اسی صفحہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ فصلت یا حم السجدہ شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صفحہ ۷۲ پر سورۃ الدخان ختم ہو کر فوراً سورۃ الجاثیۃ شروع ہو جاتی ہے۔ یہی ترتیب اصل قرآن مجید میں ہے۔

واقعہ غرانیق اور اس کی حقیقت

قرآن مجید کے متن کے غیر محفوظ ہونے کے بارے میں مستشرقین نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان

---

(1) إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً

(2) Mingana, Leaves from Three Ancient Korans, p. 13

میں ایک "واقعہ غرانیق" ہے۔ اس کی تفصیل مستشرقین کے ہاں یہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے جب آپؐ آیت نمبر 19، 20 ومناۃ الثالثۃ الاخرٰی تک پہنچے تو شیطان نے آپؐ کی آواز کے ساتھ یہ الفاظ ملا دئے۔ ''تلك الغرانیق العلٰی ان شفاعتھن لترتجٰی'' (اس طرح اصل وحی اور شیطان کی آمیزش والے الفاظ ملا کر عبارت یوں بن گئی) "پھر تم نے کچھ غور کیا ان لات اور عزّٰی پر اور تیسری ایک (دیوی) مناۃ پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں ان کی شفاعت کی ضرور توقع ہے"

اس طرح بقول مستشرقین معلوم نہیں کہ کس کس مقام پر شیطان نے اپنے الفاظ وحی کے الفاظ کے ساتھ ملا دئے ہوں گے۔

اس طرح ان لوگوں کے نزدیک قرآن مجید کا متن معتبر نہیں رہ جاتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۵۲ سے استدلال کرتے ہیں۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ " اللہ تعالیٰ شیطان کی طرف سے ملاوٹ کی کوشش کو قرآن مجید کی اصل آیات سے الگ کر کے اسے مٹا دیتے ہیں"

آئندہ صفحات میں ہم اس "القائے شیطانی؟" کا تحقیقی جائزہ پیش کر کے واضح کریں گے کہ

۱۔ وہ روایات جن میں اس طرح کا ذکر آیا ہے تحقیق کے معیار پر پرکھی جائیں تو وہ درست نہیں ٹھہرتیں۔

۲۔ محققین اس واقعہ کی نفی کرتے ہیں کہ اس طرح کا کوئی واقعہ رونما ہوا ہی نہیں تھا۔

واقعہ غرانیق کی حقیقت:

اس واقعہ کی جو تفصیلات بخاری شریف میں بیان ہوئی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ذکر ہے کہ جب حضور ﷺ نے سورۃ النجم پڑھی تو آپ نے سجدہ کیا اور سب مسلمانوں اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔[1] مشرکوں نے جو سجدہ کیا اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ آپ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللاتَ وَالْعُزَّى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الأُخْرَى﴾[2]

"کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ کو اور اس تیسری مناۃ کو۔"

تو مشرکین اس بات سے خوش ہوئے کہ قرآن کریم میں ان کے بتوں کا ذکر آگیا اور انہوں نے بھی سجدہ کر لیا۔

---

(1) الصحیح البخاری، کتاب سجود القرآن، باب سجود المسلمین مع المشرکین، حدیث نمبر: 1071

(2) النجم: ۱۹-۲۰

روایت تلک الغرانیق کا متن:

حضور اکرم ﷺ کے الفاظ کے ساتھ شیطان کی آواز کے مل جانے کا شبہ مسند بزاز وغیرہ کی روایت اور حافظ ابن حجر عسقلانی (852ھ) کے نقطہ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

"امام بزار اپنی مسند میں یوسف بن حماد، امیہ بن خالد، شعبہ، ابو بشر، سعید بن جبیر اور حضرت ابن عباسؓ (68ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مکہ میں تھے، آپ نے سورۃ النجم پڑھی جب اس آیت پر پہنچے: ﴿أفرأيتم اللات والعزى ومنوٰة الثالثة الأخرى﴾ "تو نبی ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے " تلك الغرانيق العلى ان شفاعتهن لترتجى " " بلند مرتبہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت متوقع ہے۔" اس روایت کے بقول حضرت ابن عباسؓ (68ھ) کہتے ہیں کہ مشرکین یہ سن کر خوش ہوئے اور رسول اللہ ﷺ رنجیدہ ہوئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

(ترجمہ) "ہم نے آپ سے پہلے جب بھی کوئی نبی یا رسول بھیجا تو اس کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ جب اس نے تلاوت کی تو شیطان اس کی تلاوت میں کچھ الفاظ اپنی طرف سے ملا دیتا پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے القاء کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات پختہ کر دیتا ہے۔" (الحج:52)

اس روایت کی فنی حیثیت:

اس روایت کے بیان کرنے کے بعد امام بزاز لکھتے ہیں:

"ہمارے علم میں اس سند کے سوا اس حدیث کی اور کوئی ایسی سند متصل نہیں ہے جس کا ذکر کرنا جائز ہو۔ یہ حدیث کلبی از ابو صالح از ابن عباس کی سند کے ساتھ معروف ہے۔"(1)

امام نورالدین الہیثمیؒ (807ھ) اس روایت کو امام طبرانی اور امام بزاز کے حوالے سے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"امام طبرانیؒ نے فرمایا: میں اس حدیث کو صرف حضرت ابن عباسؓ (68ھ) کی روایت سے جانتا ہوں۔ سورہ حج کی آیت نمبر 52 تفسیر میں اس سے طویل حدیث موجود ہے لیکن وہ ضعیف الاسناد ہے۔"(2)

علامہ الہیثمیؒ (807ھ) نے امام طبرانیؒ کی اس طرح کی ایک دوسری روایت کو عروہ بن الزبیر سے

---

(1) کشف الاستار: جلد ۲، ص: ۷۲

(2) الہیثمی، نورالدین مجمع الزوائد: جلد ۷، ص: ۱۱۵، مطبوعہ دار الکتب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ

روایت کیا ہے اور یہ روایت مرسل ہے کیونکہ عروہ بن الزبیر تابعی ہیں، انہوں نے زمانہ رسالت کو نہیں پایا تھا۔ (1)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے لکھا ہے:

"ان روایات کی تمام اسانید ہر چند کہ ضعیف، انقطاع اور ارسال سے خالی نہیں لیکن چونکہ یہ روایت متعدد اسانید سے منقول ہے، اس لیے اس کی کثرت اسانید سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔" (2)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے اس روایت کی سند میں انقطاع کی صراحت کے ساتھ یہ حدیث بزاز اور ابن مردویہ کی سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ (68ھ) سے روایت کی ہے، پھر کلبی، سدی، نحاس، ابن اسحاقؒ (150ھ)، طبریؒ (310ھ)، ابن ابی حاتم، اور ابن منذر کی اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ (68ھ) سے اس روایت کا ذکر کیا ہے اور یہ تصریح بھی کی ہے کہ یہ اسانید ضعف اور انقطاع سے خالی نہیں ہیں۔

یہ روایت اپنی تمام اسانید کے ساتھ صرف حضرت ابن عباسؓ (68ھ) سے مروی ہے، ان کے علاوہ کسی اور صحابیؓ سے یہ روایت مروی نہیں ہے۔ اگر بالفرض یہ روایت صحیح ہوتی تو یہ واقعہ ان عجیب و غریب امور پر مبنی ہونے کی وجہ سے بکثرت صحابہؓ سے مروی ہوتا۔ جبکہ اس روایت کے مطابق اس وقت بکثرت صحابہؓ موجود تھے، پھر صرف حضرت ابن عباسؓ (68ھ) ہی اس کو کیوں روایت کرتے ہیں؟ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے اور ہجرت کے وقت حضرت ابن عباسؓ (68ھ) کی عمر صرف تین سال تھی۔ تو کیا ایک یا دو سال کی عمر میں حضرت ابن عباسؓ (68ھ) نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا؟ اس روایت کو وضع کر کے حضرت ابن عباسؓ (68ھ) کی طرف منسوب کرنے والوں نے اس وقت ابن عباسؓ (68ھ) کی عمر پر بھی غور نہیں کیا۔ تیسری خاص بات یہ ہے کہ اس روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی زبان سے شیطان نے یہ کلمات (تلک الغرانیق العلیٰ) کہلوا لیے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر کہا آپ نے وہ بات کہی جس کو میں لے کر نہیں آیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے نازل کی۔ اس پر آپ رنجیدہ ہوئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے حزن و ملال کو زائل کرنے کے لیے سورہ حج کی یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ

(1) اس کا ذکر مجمع الزوائد جلد ۷، ص: ۷۲۔۷۱ میں ہے

(2) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری: جلد ۸، ص: ۴۳۹، طبع لاہور

﴿فَيَنسَخُ اللهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللهُ آيَاتِهِ وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (1)

اور سورہ حج مدنی ہے، اور سورۃ نجم سن کر مشرکوں کے سجدے کا واقعہ ہجرت سے کئی سال پہلے کا ہے تو گویا آپ کو جو اس واقعہ سے رنج و ملال ہوا، اس کو زائل کرنے کے لیے کئی سال بعد سورہ حج کی یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ بات منطق کے بھی خلاف ہے اور اس من گھڑت روایت کے بھی خلاف ہے کیونکہ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپ رنجیدہ ہوئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام یہ آیت لے کر آئے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کو پہنچانے میں رسول اللہ ﷺ سے عمداً خطاءً نسیاناً، سہواً کسی طرح غلطی نہیں ہو سکتی پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ بقول اس روایت کے نبی ﷺ سے العیاذ باللہ! کفریہ کلمات صادر ہو گئے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ نبی ﷺ پر شیطان کے جبر کرنے کے بارے میں کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شیطان نے یہ کلمات آپ سے کہلوا لیے ہوں۔

حافظ بدر الدین عینیؒ (م ۸۵۵ھ) اس بحث میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) کے نقطہ نگاہ (کہ روایات کی کثرت بتاتی ہے کہ اس واقعہ کی اصل کوئی نہ کوئی ہوگی) کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قاضی عیاضؒ (544ھ) اور ابن عربی نے اس روایت کو رد کیا ہے اور یہی چیز نبی ﷺ کی جلالت قدر اور عظمت شان کے لائق ہے۔ کیونکہ کلمات کفریہ کے جاری ہونے سے آپ کی زبان کی عصمت، نزاہت، اور براءت دلائل کثیرہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ آپ اس چیز سے بری ہیں کہ آپ کے قلب یا زبان پر اس قسم کی کوئی چیز جاری ہو یا شیطان کا آپ پر تسلط ہو یا آپ اللہ تعالیٰ کی طرف غلط بات کی عمداً یا سہواً نسبت کریں۔ یہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے محال ہے اور اگر بالفرض ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے اور یہ منقول نہیں ہے۔ نیز اگر ایسا ہوتا تو صحابہؓ سے یہ امر مخفی نہ رہتا۔" (2)

قاضی عیاضؒ (544ھ) اس واقعہ کے بارے کے میں لکھتے ہیں کہ اس روایت کو مؤلفین کتب صحاح میں سے کسی نے نقل نہیں کیا نہ یہ کسی صحیح اور متصل سند سے مروی ہے۔ اس روایت کو بعض ان مفسرین اور مورخین نے ذکر کیا ہے جو عجیب و غریب باتوں کو جمع کرنے کے شوق میں ہر قسم کی رطب و یابس اور غلط سلط باتیں بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی عیاضؒ (544ھ) نے اس روایت کے راویوں کی فنی کمزوریاں ذکر کی ہیں پھر بکثرت دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ نبی ﷺ کی زبان پر شیطان کا تسلط محال ہے

---

(1) الحج: ۵۲

(2) العینی، بدر الدین، عمدۃ القاری: جز ۱۹، ص: ۶۶

اور یہ ممکن نہیں کہ قرآن مجید کو پہنچاتے ہوئے آپ کی زبان سے وہ بات نکلے جو اللہ تعالیٰ نے نہ فرمائی ہو۔ پھر قاضی عیاضؒ (544ھ) فرماتے ہیں:

''اگر ایسا ہوا ہوتا تو مشرکین مسلمانوں کا مذاق اڑاتے۔ منافقین نبی ﷺ کی نبوت میں طعنہ زنی کرتے اور العیاذ باللہ کئی ضعیف القلب مسلمان مرتد ہو جاتے۔''

قاضی عیاضؒ (544ھ) لکھتے ہیں:

''شیطان نے القاء ضرور کیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ پر نہیں بلکہ ان بعض غافل محدثین پر القاء کیا ہے جنہوں نے ضعیف مسلمانوں کے دین میں خلل ڈالنے کے لیے شیطان سے یہ روایت سنی اور (حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کرتے ہوئے) مختلف اسانید سے پھیلا دی۔'' (1)

علامہ کرمانیؒ لکھتے ہیں:

''تلک الغرانیق العلیٰ والی روایت باطل ہے۔ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً، کیونکہ مشرکین کے خداؤں کی تعریف کرنا کفر ہے۔ نبی ﷺ کی طرف اس کی نسبت کرنا صحیح نہیں، نہ یہ صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کہا، العیاذ باللہ، آپ اس سے بری ہیں، سورۃ النجم کی تفسیر میں بھی علامہ کرمانی نے اس کا رد کیا ہے۔ (2)

ملا علی قاریؒ (1014ھ) لکھتے ہیں:

''بعض مفسرین نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔''

نیز فرماتے ہیں: ''یہ جو روایت میں ہے کہ مشرکین نے اس لیے سجدہ کیا تھا کہ نبی ﷺ نے ان کے باطل خداؤں کی تعریف کی تھی، یہ باطل قول ہے اور زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے۔'' (3)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کہتے ہیں:

''یہ عقلاً اور نقلاً وجوہ کثیرہ سے باطل ہے اور یہ روایت موضوع ہے۔'' (4)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمنی کا معنیٰ 'پڑھا' کرنا صحیح بخاری کی اس حدیث پر مبنی ہے:

و قال ابن عباس فی أمنیته إذا حدث ألقی الشیطان فی حدیثه فیبطل الله ما یلقی الشیطان

---

(1) قاضی عیاض، الشفاء ملخصاج ۲ ص ۱۱۰-۱۰۶، طبع ملتان

(2) شرح الکرمانی: ج ٦ ص ۱۵۳، جلد ۸، ص: ۱۱٦

(3) علی القاری، علامہ، مرقات جلد ۳، ص: ۲۳، طبع ملتان

(4) عبدالحق، شیخ، اشعۃ اللمعات: جلد ۳، ص: ۳۲، لکھنؤ

مہمل اور لغو روایات کو نقل ہی نہیں کیا جاتا۔ انہوں نے اس کی یہ تاویل و توجیہ کی ہے کہ سورہ نجم کی آخری آیات میں گزشتہ قوموں کی تباہی و بربادی کا تذکرہ کر کے منکرین حق کو ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ ممکن ہے آیات کی ہیبت سے مشرکین مکہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سجدہ میں گر پڑے ہوں۔ بعد میں انہیں اپنے اس عمل پر ندامت ہوئی ہو تو انہوں نے بات بنانے کے لئے یہ اڑادی ہو کہ محمد ﷺ نے ان بتوں کے لئے کلمات خیر کہے تھے اسی لئے انہوں نے سجدہ کیا تھا۔

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس توجیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ روایات میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یہ ماننے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ افسانہ بعد میں گھڑا گیا ہو۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ اس کی روایت کسی صحابی سے معتبر سند سے نہیں ہے۔ اس کے تمام طرق مرسل ہیں۔ پتا نہیں عہد نبوت کے کس شخص نے اس کی روایت کی ہے۔ حدیثی نقطہ نظر سے اس قصہ کے بے بنیاد ہونے پر میں نے اپنی کتاب "نصب المجانیق لنسف قصة الغرانیق" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔"

روایت تلک الغرانیق کے بارے میں مفسرین کی آراء:

قاضی ابو بکر ابن العربی (543ھ) نے دس وجوہ سے اس روایت کو باطل کیا ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب نبی کے پاس فرشتہ کو وحی دے کر بھیجتا ہے تو اس میں ایک معرفت پیدا کرتا ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے ورنہ نبی کو کیسے یقین ہو گا کہ یہ اللہ کی وحی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شیطان آکر کچھ کلمات پڑھے اور آپ کو پتہ نہ چلے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفر و شرک سے معصوم رکھا ہے اور جو شخص ایک آن کے لیے بھی آپ پر کفر کو جائز رکھے وہ خود اسلام سے خارج ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ بتوں کی تعریف کرنا اور ان کو شفاعت کرنے والا کہنا کفر ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم امت محمدیہ کا تلچھٹ ہیں ہم بھی ان کلمات کا کفریہ ہونا جانتے ہیں تو حضور ﷺ جن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی معرفت کرائی ہے، کب ان کلمات کے کفر سے غافل ہو سکتے ہیں۔

علامہ ابن العربیؒ (543ھ) نے اسی طرح باقی وجوہات بیان کیں اور آخر میں فرمایا: "یہ تمام روایات باطل ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔"[1] علامہ نسفیؒ (701ھ) یہ روایت رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(1) ابن العربی، احکام القرآن: جلد ۳، ص ۱۳۰۲۔۱۳۰۰، بیروت

”اس روایت کے مطابق اگر آپ نے یہ کلمات عمداً کہے تو یہ باطل ہے کیونکہ یہ کفر ہے اور اگر شیطان نے بزور آپ کی زبان سے یہ کلمات جاری کرائے تو یہ بھی محال ہے۔“ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾ (1)

”میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چل سکتا۔“

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بطریق اولیٰ تسلط نہیں ہو گا، یا سہواً اور غفلت کی وجہ یہ کلمات نبی ﷺ کی زبان سے نکل گئے۔ یہ بھی باطل ہے کیونکہ وحی پہنچاتے ہوئے اس قسم کی غفلت کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا ورنہ شریعت سے بالکلیہ اعتماد اٹھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (2)

” قرآن میں باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے“

یعنی غیر قرآن، قرآن میں شامل نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (3)

”ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

امام فخر الدین محمد بن عمر رازیؒ (م ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: (4)

”یہ روایت قرآن، سنت اور عقلی دلائل کی روشنی میں پرکھی جائے تو بالکل باطل ٹھہرتی ہے پھر انہوں نے اس کو باطل ٹھہرانے والی قرآن مجید کی سات آیات پیش کی ہیں، اور سنت سے اس کے بطلان پر دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام محمد بن اسحاقؒ (150ھ) نے خزیمہ سے اس قصہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: یہ روایت زندیقوں نے گھڑی ہے اور اس پر انہوں نے ایک کتاب تصنیف کی، اور امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقیؒ (458ھ) نے فرمایا: یہ قصہ ازروئے روایت ثابت نہیں ہے اور انہوں نے اس روایت کے تمام راویوں پر کلام کیا اور یہ واضح کیا کہ اس کے تمام راوی مطعون ہیں۔ نیز صحیح بخاری میں ہے کہ نبی ﷺ نے سورۃ النجم پڑھی جس کو سن کر تمام مسلمانوں، مشرکوں اور جن وانس نے سجدہ کیا

---

(1) الاسراء: 65

(2) حم السجدہ: 42

(3) الحجر: 9

(4) مدارک التنزیل علی ہامش الخازن: جلد ۳، ص: ۳۱۳، پشاور

اور اس میں غرانیق کا قصہ نہیں ہے۔ اس کے بعد امام رازیؒ (606ھ) نے اس روایت کے بطلان پر پانچ عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ پانچویں دلیل یہ ہے کہ اگر یہ جائز ہو کہ نبی کریم ﷺ کے قرآن پہنچانے میں شیطان آپ کی زبان سے وہ کلمات کہلوا دے جو قرآن نہیں ہیں تو شریعت سے بھروسہ اور اعتماد اٹھ جائے گا اور ہر آیت میں یہ احتمال ہو گا کہ شاید یہ غیر قرآن ہو اور یہ بداہۃً باطل ہے۔“ (1)

علامہ قرطبیؒ (671ھ) لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (2)

”وہ آپ کو ہماری وحی سے لغزش دینے کے (بزعم خویش) قریب تھے تاکہ آپ ہم پر کوئی بات گھڑ دیں اور اس وقت وہ ضرور آپ کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم آپ کو مضبوط نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف تھوڑا سا ل مائل ہو جاتے۔“

ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللہ پر افتراء باندھنے سے محفوظ اور معصوم رکھا جبکہ ہماری زیر بحث روایت سے اس کے برعکس مفہوم سامنے آتا ہے۔“ لہٰذا یہ روایت صراحتاً ان آیتوں کے خلاف ہے اور ان کی ضد ہے۔ پس یہ روایت اگر سند صحیح سے بھی وارد ہوتی تو مردود قرار دی جاتی اور جب فی الواقع اس کی سند صحیح نہیں ہے تو یہ کیونکر مردود نہ ہو گی۔ نیز علامہ قرطبیؒ (671ھ) نے لکھا ہے:

”ہم اس روایت سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اس کی کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔“ (3)

علامہ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ ابن عطیہ، زمخشری (538ھ) اور بعض دوسرے مفسرین نے اس جگہ ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا وقوع عام مسلمانوں سے بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ان کی نسبت نبی معصوم ﷺ کی طرف کی جائے، جامع السیرۃ النبویۃ امام محمد بن اسحاقؒ (150ھ) سے اس قصہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کو زندیقوں نے گھڑ لیا ہے اور اس پر انہوں نے ایک مستقل کتاب لکھی، اور امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقیؒ (458ھ) نے فرمایا:

”از روئے روایت یہ قصہ صحیح نہیں ہے اور اس کے تمام راوی مطعون ہیں اور صحاح اور حدیث کی دیگر معتبر کتب میں یہ قصہ موجود نہیں ہے اور اس قصہ کو پھینک دینا واجب ہے، اس لیے میں نے اپنی کتاب

---

(1) رازی، مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر): ج ۸ ص ۲۳۸۔ ۲۴۳، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۵ھ

(2) الاسراء: 76

(3) قرطبی، ابوبکر، علامہ، الجامع لاحکام القرآن: جز ۱۲ ص ۷۶۔ ۷۵، دار الفکر، بیروت

کو اس قصہ کے ذکر سے پاک رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قصہ کو نقل کیا ہے ان پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو وہ قرآن مجید میں یہ آیات تلاوت کرتے ہیں:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾(1)

"قسم ہے روشن ستارے کی جب وہ زمین پر اترا۔ تمہارے آقا نہ کبھی گمراہ ہوئے اور نہ بے راہ چلے۔ اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے۔ ان کا فرمانا صرف وحی سے ہوتا ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔"

اور یہ آیت پڑھتے ہیں:

﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾(2)

"مجھے حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے قرآن کو بدل دوں، میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔"

اور ان آیات کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ بھی منسوب کرتے ہیں کہ آپ نے قرآن مجید پہنچاتے ہوئے اس میں کچھ اور کلمات ملا دیے۔(3)

علامہ آلوسیؒ (1270ھ) نے روح المعانی میں اس موضوع پر طویل بحث کی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) اور شیخ ابراہیم کورانی نے اس روایت کی جس قدر تاویلات بیان کی ہیں سب کا چن چن کر رد کیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے قصص الاتقیاء سے شیخ ابو منصور ماتریدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ شیطان نے اپنے زندیق اور بے دین چیلوں کے دلوں میں تلک الغرانیق کا وسوسہ ڈالا ہے تاکہ وہ ضعیف مسلمانوں کو دین کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا کریں حالانکہ بارگاہ رسالت پناہ اس قسم کی خرافات سے بری ہے۔(4)

اس کی تائید میں حضرت ملا علی قاری (1014ھ) نے یہ آیت پیش کی:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ

---

(1) النجم:1-4

(2) یونس:15

(3) ابو حیان، البحر المحیط: ج ۷ ص ۵۲۶، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ

(4) آلوسی محمود، روح المعانی: جز ۱۷ ص ۲۷۶-۲۶۴، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ

کو اس قصہ کے ذکر سے پاک رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قصہ کو نقل کیا ہے ان پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو وہ قرآن مجید میں یہ آیات تلاوت کرتے ہیں:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾(1)

''قسم ہے روشن ستارے کی جب وہ زمین پر اترا۔ تمہارے آقا نہ کبھی گمراہ ہوئے اور نہ بے راہ چلے۔ اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے۔ ان کا فرمانا صرف وحی سے ہوتا ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔''

اور یہ آیت پڑھتے ہیں:

﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ﴾(2)

''مجھے حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے قرآن کو بدل دوں، میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

اور ان آیات کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ بھی منسوب کرتے ہیں کہ آپ نے قرآن مجید پہنچاتے ہوئے اس میں کچھ اور کلمات ملا دیے۔(3)

علامہ آلوسیؒ (1270ھ) نے روح المعانی میں اس موضوع پر طویل بحث کی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) اور شیخ ابراہیم کورانی نے اس روایت کی جس قدر تاویلات بیان کی ہیں سب کا چن چن کر رد کیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے قصص الاتقیاء سے شیخ ابو منصور ماتریدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ شیطان نے اپنے زندیق اور بے دین چیلوں کے دلوں میں تلک الغرانیق کا وسوسہ ڈالا ہے تاکہ وہ ضعیف مسلمانوں کو دین کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا کریں حالانکہ بارگاہ رسالت پناہ اس قسم کی خرافات سے بری ہے۔(4)

اس کی تائید میں حضرت ملا علی قاری (1014ھ) نے یہ آیت پیش کی:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ

---

(1) النجم: 1-4

(2) یونس: 15

(3) ابو حیان، البحر المحیط: ج ۷ ص ۵۲۶، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ

(4) آلوسی محمود، روح المعانی: جز ۱۷ ص ۲۷۶-۲۶۴، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴾[1]

"اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کا شیاطین انس اور جن کو دشمن بنا دیا، یہ ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی جھوٹی بات (لوگوں کو) بہکانے کے لیے پہنچاتے ہیں اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے پس آپ انہیں اور ان کے بہتان کو چھوڑ دیں۔"

اور امام مسلمؒ (261ھ) نے حضرت ابو ہریرۃؓ (58ھ) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آخر زمانہ میں کچھ لوگ ایسی حدیثیں بیان کریں گے جن کو تم نے سنا ہو گا نہ تمہارے باپ دادا نے۔ تم ان سے دور رہو وہ تم سے دور رہیں تا کہ وہ تمہیں گمراہ کر سکیں نہ فتنہ میں ڈال سکیں۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: آخر زمانہ میں دجال اور کذاب ہوں گے وہ تم کو ایسی حدیثیں سنائیں گے جو تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے۔ تم ان سے دور رہو وہ تم سے دور رہیں تا کہ وہ تم کو گمراہ کر سکیں، نہ فتنہ میں ڈال سکیں۔[2]

ان کے علاوہ دیگر مفسرین نے الحج: ۵۲ کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ تبیان القرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

"تنویر المقباس، جامع البیان، کشاف، مدارک، روح البیان، جلالین، در منثور، جمل تفسیر مظہری اور تفاسیر شیعہ میں سے تبیان، مجمع البیان اور قمی میں ان روایات پر اعتماد کیا گیا ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب سورہ والنجم کی آیات تلاوت کر رہے تھے تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ کلمات کہلوائے تلک الغرانیق العلی ان شفاعتہن ترتجی اور سورہ الحج: ۵۲ کا یہ معنٰی کیا ہے ہم نے آپ سے پہلے جب بھی کسی رسول اور نبی کو بھیجا تو جب اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ اس کے برخلاف الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، احکام القرآن لابن العربی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر ثعالبی، احکام القرآن للجصاص، غرائب القرآن ورغائب الفرقان، زاد المسیر، فتح البیان اور تفسیر منیر میں ان روایات کو مسترد کر دیا ہے اور بر سبیل تنزل ان کی یہ توجیہ کی ہے کہ جب آپ نے تلاوت کے دوران وقفہ کیا تو شیطان نے آپ کی آواز کے مشابہ آواز بنا کر اس وقفہ میں یہ کہا: تلک الغرانیق العلی ان شفاعتہن ترتجی اور سننے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے یہ کلمات فرمائے ہیں، اور تفسیر مراغی، نظم الدرر اور تفسیر صاوی نے سورہ حج: ۵۲ کا یہ معنٰی کیا ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے جب بھی کسی رسول یا نبی کو بھیجا تو اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کے سننے والوں کے دلوں میں اس تلاوت کے خلاف شبہات ڈال دیے، اور البحر المحیط، تفسیر بیضاوی، خفاجی، تفسیر مدارک، خازن (741ھ)، روح المعانی، تفسیر کبیر، الاساس فی التفسیر، المحرر الوجیز، اضواء البیان،

---

(1) الانعام: ۱۱۲

(2) شرح الشفاء: ج ۴ ص ۹۲، بیروت

تفسیر قاسمی، الجواہر للطنطاوی، فی ظلال القرآن، فتح القدیر اور تفاسیر شیعہ میں سے منہج الصادقین اور تفسیر نمونہ میں ان روایات کو بہ کثرت دلائل سے مسترد کر دیا ہے اور سورہ حج: ۵۲ کا یہ معنیٰ کیا ہے: ہم نے آپ سے پہلے جب بھی کسی رسول اور نبی کو بھیجا اور اس نے (اپنی امت کے بڑھنے کی) تمنا کی تو شیطان نے (لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر) اس تمنا میں خلل ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے وسوسوں کو مٹا دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔ اور ہمارے نزدیک یہی تفسیر صحیح ہے اور جن اہل سنت مفسرین اور مترجمین نے اس کے خلاف ترجمہ اور تفسیر کی ہے وہ صحیح العقیدہ علماء ہیں اگر وہ بھی زیادہ غور و خوض سے کام لیتے اور زیادہ تحقیق اور جستجو کرتے تو امید ہے کہ وہ بھی اسی ترجمہ اور تفسیر کو اختیار کرتے۔[1]

مفسرین کرام نے اس واقعے کے بارے میں اپنی اپنی تحقیقات لکھی ہیں ابن کثیرؒ (774ھ) واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بیہقی دلائل النبوۃ اور محمد ابن اسحاقؒ (150ھ) نے اپنی سیرت کی کتابوں میں اسے بیان کیا ہے لیکن ان کی سندیں مرسل اور منقطع ہیں۔ امام بغویؒ (516ھ) نے یہ روایات بیان کر کے ان کے جوابات بھی دئے ہیں۔ قاضی عیاضؒ (544ھ) نے بھی اس بات کی نفی کی ہے کہ شیطان کے الفاظ سے التباس پیدا ہوا تھا بلکہ شیطان ذہنوں میں شکوک وشبہات کے ذریعے نبی کی دعوۃ میں رخنے ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ابن کثیر کے حاشیہ پر مولانا انظر شاہ کشمیری کی تحقیق درج ہے کہ یہ روایت کہ شیطان نے اس طرح کے الفاظ حضور ﷺ کی زبان پر جاری کر دئے تھے بالکل غلط ہے جب قرآن نازل ہوتا تھا اس وقت فرشتوں کا ایک گروہ شیاطین کو وحی سے دور رکھتا تھا۔

﴿يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ﴾[2]

نزول وحی کے وقت شیاطین تو وحی کے قریب آ ہی نہیں سکتے تھے۔ شیطان نے بھی کہا ہوا ہے کہ اگر تو نے مجھے مہلت دی تو میں انسان کی اولاد میں سے تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر سب کے جڑوں میں لگام ڈالوں گا[3] اللہ نے بھی اعلان کر رکھا ہے کہ اس کے بندوں پر شیطان کا اثر نہیں چلے گا۔[4]

مولانا عبد الرحمن کیلانیؒ لکھتے ہیں یہ واقعہ محققین کے نزدیک ثابت شدہ ہی نہیں۔[5] اس سلسلے میں تیسیر القرآن میں لکھا ہے:

---

(1) سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن، جلد 7، ص: 784

(2) النحل: 2

(3) بنی اسرائیل: 65

(4) ابن کثیر جلد سوم، 549

(5) صلاح الدین یوسف، مولانا، احسن البیان، ص: 442۔

کیلانی، عبد الرحمٰن، تیسیر القرآن، جلد سوم، صفحہ 172

i. یہ واقعہ کئی لحاظ سے غلط ہے مثلاً ان تمام روایات کی اسناد مرسل اور منقطع ہیں۔

ii. ان روایات میں اس شیطانی وسوسہ سے پہلے ہی بتوں اور دیویوں کی مذمت مذکور ہے اور بعد میں بھی۔ لہذا درمیان میں بتوں کی تعریف کسی طرح مناسب دکھائی نہیں دیتی۔

iii. تاریخی اعتبار سے یہ روایات غلط ہیں کہ ہجرت کا واقعہ پانچ سن نبوی میں پیش آیا اور جو مہاجر اس غلط افواہ کی بنا پر مکہ واپس آئے تھے وہ صرف تین ماہ بعد آئے تھے۔ جبکہ یہ سورت مدنی ہے اور ہجرت حبشہ سے واپسی اور اس سورت کے نزول میں آٹھ نو سال کا وقفہ ہے۔[1]

مفتی محمد شفیع (1396ھ) لکھتے ہیں یہ واقعہ جمہور محدثین کے نزدیک ثابت شدہ نہیں۔ بعض حضرات نے اسے موضوع، ملحدین وزنادقہ کی ایجاد قرار دیا ہے۔ جن حضرات نے اسے معتبر قرار دیا ہے تو اس کے ظاہری الفاظ سے جو شبہات قرآن وسنت کے قطعی اور یقینی احکام پر عائد ہوتے ہیں ان کے قطعی جواب دیئے ہیں۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ اس آیتِ قرآن کی تفسیر اس واقعہ پر موقوف نہیں بلکہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ شیطان انبیاء کے مشن میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔[2]

علامہ شبلی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ کفار کا یہ عام رویہ تھا کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو وہ شور مچاتے کہ کہیں قرآن کی آواز ان کے کانوں میں نہ پڑ جائے۔ کیونکہ جو بھی قرآن سنتا تھا وہ اس کا اثر دل پر قبول کرتا تھا۔ اسی کا ذکر سورۃ حم السجدہ کی آیت نمبر ۲۶ میں کیا گیا ہے کہ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ۔ کافر کہتے تھے کہ قرآن کو نہ سنو اور اس پر شور مچاؤ کہیں یہ تم پر غالب نہ آجائے ان کا بھی طریقہ تھا کہ کعبہ کا طواف کرتے وقت یہ الفاظ کہا کرتے تھے ''والات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ فانھن الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ[3] (لات اور عزیٰ اور تیسرے بت منات کی قسم یہ بلند وبزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔ جب رسول ﷺ نے سورۃ النجم کی یہ آیات تلاوت فرمائیں تو کسی کافر شخص نے اپنی اسی عادت کے مطابق مذکورہ بالا الفاظ کہہ دیئے ہوں گے۔ دور بیٹھے ہوئے لوگ یہ سمجھے ہوں گے کہ شاید یہ الفاظ آپ ﷺ نے ہی کہے ہیں جب اس بات کا چرچا مسلمانوں میں ہوا تو انہوں نے یہ خیال کیا ہو گا کہ یہ الفاظ آپ کے تو ہو ہی نہیں سکتے لازماً یہ الفاظ شیطان نے کہے ہوں گے۔ اس واقعہ میں روایتوں نے صورت بدل بدل کر یہ شکل اختیار کرلی کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان بول سکتا

---

(1) ایضاً

(2) معارف القرآن، جلد ششم، صفحہ: 277

(3) یاقوت الحموی، معجم البلدان، لفظ عزیٰ

ہے۔اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کرلیا۔یہ صرف قیاس ہی نہیں۔اس سلسلے میں مواہب اللدنیہ میں ہے۔ "بعض لوگوں نے کہا ہے جب آپ ﷺ آیت ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ تک پہنچے تو مشرکوں کو یہ ڈر ہوا کہ آگے ہمارے بتوں کی برائی بیان کی جانے لگی ہے۔اس لئے انہوں نے فوراً حضور ﷺ کی تلاوت کے الفاظ خلط ملط کردیئے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچادو۔یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔[1]

اس واقعے میں چھوٹے چھوٹے اختلافات موجود ہیں۔لیکن ان تمام اختلافات میں سے دو اختلافات بڑے اہم ہیں۔ایک یہ کہ بتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ ہر روایت میں تقریباً دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ مولانا مودودیؒ (1321ھ) لکھتے ہیں کہ ہم نے ان اختلافات کا شمار کرنے کی کوشش کی توان کی تعداد پندرہ نکلی۔دوسرا بڑا اختلاف یہ نکلا کہ کسی روایت کی رو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپؐ پر القاء کئے اور حضورؐ یہ سمجھے کہ یہ الفاظ بھی جبریل ہی لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ آپ کی اس خواہش کے زیر اثر سہواً آپؐ کی زبان سے نکل گئے کہ آپ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام کی طرف آئیں۔کسی روایت میں ہے کہ اس وقت آپؐ کو اونگھ آگئی اور اسی حالت میں آپؐ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ کسی کا بیان ہے کہ یہ الفاظ آپؐ نے قصداً کہے مگر استفہام انکاری کے طور پر کہے کسی کا قول ہے کہ شیطان نے یہ الفاظ آپؐ کی آواز کے ساتھ ملا کر کہہ دئیے اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ الفاظ آپ ﷺ ہی نے کہے ہیں۔

ابن خزیمہ سے اس قصہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا

یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے۔[2]

اس واقعے کے بارے میں مولانا مودودیؒ (1321ھ) لکھتے ہیں کہ اس کو محض اسی بنا پر درست نہ ماننا کہ اس کی سند صحیح نہیں درست رجحان نہیں ہے۔اس کی سند اگر درست ہوتی تو کیا پھر اس قصے کو درست تسلیم کرلیا جائے گا۔ہر گز نہیں[3]

مولانا موصوف لکھتے ہیں کہ اس قصے کو محض اس بنا پر ہی ردّ کرنا کہ اس سے پورے دین کی بنیاد مسمار ہوجائے گی اور یہ تاثر پیدا ہوگا کہ معلوم نہیں اور کہاں کہاں اس طرح کی ملاوٹ، وحی الٰہی میں ہوجاتی رہی ہوگی بھی زیادہ بہتر رجحان نہیں ہے[4] درحقیقت اس قصے کے اندر اس قسم کے تضادات ہیں کہ یہ کسی

---

(1) شبلی نعمانی، سیرت النبی، جلد اول، ص: 154

(2) بحوالہ ایضاً، جلد سوم، ص:240

(3) بحوالہ ایضاً، جلد سوم، ص:240

(4) بحوالہ ایضاً، جلد سوم، ص:240

بھی صورت میں قابل اعتماد نہیں ہے مثلاً

۱۔ قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ اس وقت پیش آیا جب ہجرت حبشہ واقع ہو چکی تھی اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرین حبشہ میں سے ایک گروہ واپس مکہ مکرمہ آگیا۔ اس واقعے اور ہجرت حبشہ کی تاریخوں کا ذرا موازنہ کر کے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہجرت حبشہ معتبر ذرائع سے ملنے والی روایات کی رو سے رجب ۵ نبوی میں واقع ہوئی اور مہاجرین حبشہ کا ایک گروہ کفار اور حضورؐ میں مصالحت کی خبر سن کر تین ماہ بعد یعنی تقریباً شوال ۵ نبوی میں مکرمہ میں واپس آگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ نبوی کا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل جس کی ایک آیت نمبر ۷۳﴿ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴾[1] کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے اس فعل پر بطور عتاب معراج کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور معتبر روایات کی رو سے معراج کا واقعہ (۱۱) یا (۱۲) نبوی میں پیش آیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس فعل پر پانچ چھ برس گزر چکے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر عتاب فرمایا۔

زیر بحث آیت مبارکہ ۱ھ ہجری میں نازل ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عتاب پر بھی جب مزید دو اڑھائی برس گزر گئے تب اعلان کیا گیا کہ بتوں کی تعریف والے الفاظ کی آمیزش شیطان کے القاء سے ہو گئی تھی اللہ تعالیٰ نے اس آمیزش کو منسوخ کر دیا ہے۔

یہ بات نا قابل فہم ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو۔ عتاب چھ برس بعد ہوا اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان ۹ برس بعد ہو[2]

اس قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سورۃ النجمؔ میں ہوئی تھی۔ یہ آمیزش اس طرح ہوئی کہ حضورؐ سورۃ النجمؔ آغاز سے پڑھ رہے تھے۔ اچانک جب آپؐ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ پر پہنچے تو آپؐ نے خود یا القائے شیطانی سے یہ فقرہ اس آیت کے ساتھ ملا دیا اور اس فقرے کے بعد پھر سورۃ النجمؔ کی تلاوت فرمانے لگے یہ سب کچھ سننے کے بعد کفّار مکہ خوش ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ اب ہمارے اختلافات حضرت محمدؐ کے ساتھ ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر "ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ" اور اس سے آگے جو القائے شیطانی کے الفاظ بیان کئے جاتے ہیں اس سب کو پڑھا جائے تو گویا آپؐ نے جو کچھ تلاوت فرمایا اس کا ترجمہ یوں ہو گا۔

"پھر تم نے کچھ غور بھی کیا ان لات اور عزّیٰ پر اور تیسری ایک اور (دیوی) مناۃ پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے کیا تمھارے لئے تو ہوں بیٹے اور اس (اللہ) کیلئے ہوں

---

(1) وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا

(2) بحوالہ ایضاً، جلد سوم، ص: 240

بیٹیاں ؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لئے ہوئے ہیں۔ اللہ نے ان کیلئے کوئی سند نہیں اتاری۔ لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں"

اس پوری عبارت کے ترجمے میں مضمون کا تضاد واضح نظر آرہا ہے۔ اوّل تو حضورؐ کی ذات گرامی سے ہی اس قسم کی پر از تضادات عبارت اور کلام کی توقع بعید از قیاس ہے۔ دوسری طرف کیا اہل مکہ کو بھی اتنی ہوش نہیں رہی کہ وہ سوچیں کہ محمدؐ کیا فرما رہے ہیں۔ آپؐ تو تعریفی کلمات (بالغرض اگر ایسا مان بھی لیا جائے کہ آپ نے یہ الفاظ کہے تھے) کی تردید بھی فرما رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ہی فقرے میں ان کے عقائد کی سخت ترین انداز سے مذمت بھی فرما رہے تھے لیکن اس کے باوجود کفار نے سمجھ لیا کہ محمدؐ ہمارے بتوں کی تعریف فرما رہے ہیں۔ ان تمام تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہوا ہو گا۔[1]

مولانا مودودیؒ (1321ھ) نے اس واقعے کے حوالے سے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ آخر یہ واقعہ مشہور کیسے ہوا؟ کس طرح بعض معتبر محدثین نے بھی اسے اپنی کتب میں درج کر دیا؟ اور آگے چل کر یہ روایت بھی کیا جانے لگا؟ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ (1321ھ) لکھتے ہیں:

بخاری[2]۔ مسلم[3]۔ ابو داوٗد[4]۔ نسائی[5] اور مسند احمد میں واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی اور اس کے خاتمے پر آپؐ نے سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین جن میں مسلمان اور مشرکین شامل تھے سبھی سجدے میں گر گئے۔ احادیث میں بس واقعہ اتنا ہی تھا۔ کفار کا سجدے میں مسلمانوں کے ساتھ مل جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے۔ قرآن مجید کا زورِ کلام اور حضورؐ کا پرزور انداز بیان سن کر اگر سارے مجمع پر وجد کی سی ایک کیفیت طاری ہو گئی ہو اور اسی کیفیت میں وہ سب آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے ہوں تو یہ کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ یہی بات تو لوگ کہا کرتے تھے کہ آپؐ جادوگر ہیں (نعوذ باللہ) عقل کہتی ہے کہ بعد میں کفار پشیماں ہوئے ہوں گے۔ پھر انہوں نے اپنے اس فعل کی توجیہہ

---

(1) بحوالہ ایضاً، جلد سوم، ص: 240

(2) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب التفسیر، باب فاسجدوا للہ واعبدوا، سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّجْمِ وَسَجَدَ مَعَهُ الْمُسْلِمُونَ وَالْمُشْرِكُونَ وَالْجِنُّ وَالْإِنْسُ، حدیث نمبر: 4862، ص: 416

(3) مسلم، بحوالہ مودودی، جلد سوم، ص: 241

(4) ابوداوٗد، السنن، کتاب الصلاۃ، باب من رای فیھا السجود، حدیث نمبر: 1406، ص: 1328

(5) النسائی: السنن، باب السجود فی والنجم: قَرَأَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ سُورَةَ النَّجْمِ فَسَجَدَ وَسَجَدَ مَنْ عِنْدَهُ، حدیث نمبر: ۹۵۹، ص ۲۱۴۹

پیش کرتے ہوئے کہہ دیا ہو گا کہ محمدؐ نے تو ہمارے معبودوں کی تعریف کی تھی اس لئے ہم سجدے میں گرے تھے۔

اتنا سا واقعہ جب مہاجرین حبشہ تک اس انداز سے پہنچا کہ حضورؐ اور کفار کے درمیان صلح ہو گئی ہے کیونکہ دور سے دیکھنے والوں نے مسلمانوں اور کفار کو اکٹھے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک صدی کے اندر اندر یہ تینوں باتیں یعنی قریش کے سجدہ کرنے کی توجیہہ اور مہاجرین حبشہ کی واپسی مل جل کر ایک قصے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض لوگوں نے اسے آگے روایت کر دیا۔ ان تمام تفصیلات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس طرح کے واقعات کی نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے۔ اور نہ ہی واقعاتی شواہد اس کے وقوع پذیر ہونے کی تائید کرتے ہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس دلائل و شواہد ملتے ہیں۔ مستشرقین نے بعض اسلامی مآخذ سے استدلال کرتے ہوئے سورۃ النجم کے سجدہ اور سورۃ الحج کی آیت میں "القائے شیطانی" کو یکجا کر کے پیش کرتے ہوئے قرآن مجید کی عدم صحت پر دلیل حاصل کی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۳، سورۃ النجم کی آیت نمبر ۲۰ا اور سورۃ الحج کی آیت نمبر ۵۲ کی تفسیر ایک دوسری آیت کی روشنی میں ہی کی جائے، جبکہ ان تینوں مقامات کے اوقات نزول کا آپس میں خاصا فرق موجود ہے۔ مستشرقین نے سورۃ الحج کی آیت نمبر ۵۲ کی تفسیر۔ [1] میں یہ بات شامل کر دی کہ سورۃ النجم کی تلاوت کے موقع پر شیطان نے جو الفاظ وحی کے ساتھ ملا دئے تھے یہاں سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ ان کی منسوخی کا اعلان فرما رہے ہیں۔ ان دونوں مقامات کو (سورۃ النجم آیت نمبر ۲۰۔ ۲۱ اور سورۃ الحج آیت نمبر ۵۲) کی ایک دوسرے کی روشنی میں تشریح کرنا زمانی اعتبار سے ہی درست نہیں ہے۔ آیت نمبر ۵۲ سورۃ الحج مین تو بات ہی دراصل کوئی اور کی گئی ہے اس کا سورۃ النجم کی آیت نمبر ۲۰۔ ۲۱ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [2]

---

(1) سورۃ الحج میں تو بتلایا گیا ہے کہ قدیم سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ جب نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا ہے اور آیات اللہ لوگوں کو سناتا ہے تو شیطان لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرتا ہے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مردہ جانور حرام ہیں تو یہ لوگ کہنے لگے: اچھا جی خود ماریں تو جانور حلال اور خدا مارے تو جانور حرام۔ نبی نے فرمایا: تم اور جن کی تم عبادت خدا کے علاوہ کرتے ہو وہ جہنم کا ایندھن ہیں، تو شیطان نے لوگوں کو بہکا دیا کہ ان میں تو حضرت عزیر، حضرت مسیحؑ، اور ملائکہ شامل ہیں۔ شیطان کے اس بہکاوے کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کھلی صاف اور محکم آیات سناتے ہیں۔ لوگ حقائق کے بارے میں شکوک و شبہات میں پڑ جاتے ہیں۔ محکم آیات انہیں دلدل سے نکالتی ہیں۔ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شکوک کو دفع فرماتے ہیں اور حقائق واضح کرتے ہیں۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خواہش تھی کہ لوگ زیادہ تعداد میں اسلام لائیں، لیکن لوگ رکاوٹیں ڈالتے ہیں، اللہ ان رکاوٹوں کا آخر کار استیصال فرماتے ہیں۔

(2) بحوالہ ایضاً، جلد سوم، ص: 236-237؛ عثمانی، شبیر احمد، مولانا، فوائد القرآن، ص: 438

اس قصے سے میں دو باتیں اہم ہیں:

i. وہ کلمات جو بتوں کی تعریف میں حضور اکرم ﷺ سے منسوب کئے گئے ہیں وہ ہر روایت میں مختلف ہیں۔

ii. ہر روایت علیحدہ علیحدہ صورتِ حال بیان کرتی دکھائی دیتی ہے۔ایک روایت میں ہے کہ یہ الفاظ شیطان نے آپ کے منہ میں ڈال دیئے اور آپ سمجھے کہ یہ جبرائیل نے بتائے ہیں۔ دوسری روایت کہتی ہے کہ آپ پر نیند طاری ہو گئی اسی دوران اسی کیفیت میں آپ نے یہ الفاظ ادا کر دیئے۔ تیسری روایت کہتی ہے کہ یہ الفاظ آپ کی خواہش کے زیر اثر تھے کہ آپ چاہتے تھے کہ مکہ کے زیادہ سے زیادہ لوگ آپ ﷺ کے پاس آئیں۔ چوتھی روایت ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر یہ الفاظ کہے۔ پانچویں روایت ہے کہ کسی مشرک نے خانہ کعبہ میں چھپ کر یہ الفاظ کہے۔ اسی طرح ان بیانات کی پندرہ مختلف صورتیں سامنے آتیں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کس روایت کے بیان کو درست کہیں اور کسے غلط؟ اگر کسی ایک کو درست مانیں تو اسے درست ماننے کی دلیل کیا ہے اور دوسری غلط قرار دینے کے لئے کیا قرینہ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ اس کے مقابلے میں گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے معتبر محدثین نے اس واقعہ کو غلط قرار دیا ہے۔ بیہقیؒ (458ھ) کہتے ہیں کہ ازروئے نقل یہ قصہ ثابت نہیں۔[1] ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے۔ امام رازیؒ (606ھ) اور علامہ آلوسیؒ (1270ھ) نے اس کا رد کیا۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (852ھ) نے اس روایت کی یہ تاویل کی ہے کہ شیطان نے نبی ﷺ کی مشابہ آواز میں یہ کلمات کہے اور سننے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے یہ کلمات فرمائے ہیں۔ اس جواب کو بعض علماء نے اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے لیکن یہ جواب اس لیے صحیح نہیں ہے کہ جس طرح شیطان آپ کی مثل نہیں بن سکتا، اسی طرح آپ کی آواز کی مثل بھی نہیں بنا سکتا، کیونکہ مماثلت کی نفی یا اس وجہ سے ہے کہ ہدایت اور گمراہی میں اشتباہ نہ ہو یا تعظیم کی وجہ سے ہے اور اگر شیطان آپ کی آواز کی مثل پر قادر ہو تو یہ تعظیم کے خلاف ہے اور اگر شیطان آپ کی آواز کی نقل اتار سکے اور لوگ شیطان کی آواز سنتے تھے کیونکہ جنگ بدر میں شیطان نے کفار سے کہا تھا کہ "لا غالب لکم الیوم" اور جنگ احد میں شیطان نے آواز دی تھی

---

(1) ذہبی، شمس الدین ابی عبداللہ، میزان الاعتدال، دار احیاء الکتب العربیہ، مصر 1963، جلد اول، صفحہ: 70

کہ "حضور ﷺ شہید ہو گئے۔" لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں شیطان کی آواز، حضور ﷺ کے مشابہ تھی نہ کسی نے اس کی آواز کو آپ کے مشابہ سمجھا تھا پھر اس سے اس پر کیسے استدلال ہو سکتا ہے کہ شیطان آپ کی آواز کی مشابہت کر سکتا ہے۔

قیامت کے قریب قرآن مجید اٹھائے جانے کی حقیقت :

تاویل القرآن کے مصنف ضربت عیسوی نے ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مطلب اس لئے یہ لکھا ہے کہ قرآن مجید پر ایک ایسا وقت آئے گا جب سارے کا سارا اٹھا لیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی ایک آیت بھی باقی نہیں رہے گی[1] اس روایت سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر سارا قرآن اٹھ جائے اور اس کی ایک آیت بھی باقی نہ رہے تو بھی حفاظت قرآن کے وعدہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ میں کچھ فرق نہیں آسکتا تو پھر قرآن کا کوئی حصہ اگر کم ہو جائے یا اس میں کوئی تصرف اور تحریف کر دی جائے تو اس وعدہ حفاظت میں فرق آنا کیونکر جائز تسلیم ہو سکتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے:

ا۔ قرآن شریف کے اٹھائے جانے کا مطلب وہ ہر گز نہیں جو مصنف تاویل القرآن نے سمجھا اور بیان کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کے الفاظ اور عبارت اٹھالی جائے گی بلکہ یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب قرآن مجید کا مغز اٹھ جائے گا لوگوں کی زبانوں پر تو قرآن کے الفاظ ہوں گے لیکن ان کی عملی زندگیوں سے وہ خارج ہو جائے گا۔

بخاری[2] اور مسلم شریف[3] میں اس موضوع پر جو صحیح احادیث موجود ہیں ان سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ علم قرآن، علماء کے نہ ہونے کی وجہ سے قبض کر لیا جائے گا نہ کہ اس کے الفاظ قبض کر لئے جانے کی وجہ سے۔ بخاری، کتاب العلم میں یہ حدیث موجود ہے:

عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلماء۔[4]

عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں میں سے چھین کر نہیں لے جائیگا بلکہ علماء کو موت دے دینے سے علم قبض کرے گا۔ ایک اور حدیث ہے:

---

(1) ضربت، عیسوی، تاویل القرآن، ص: 51

(2) بخاری: الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، حدیث: 100، ص: 11

(3) مسلم، الجامع الصحیح، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان،

(4) بخاری: الجامع الصحیح، کتاب العلم، حوالہ مذکور

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ، وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ مَنْ عِنْدَهُمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيهِمْ تَعُودُ ـ[1]

"حضرت علیؓ (40ھ) سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اسلام میں سے کچھ نہ رہے گا مگر اس کا نام۔ اور قرآن میں سے کچھ نہ رہے گا مگر اس کے الفاظ۔ ان کی مسجدیں آباد ہوں گی لیکن ہدایت کے نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت میں ویران ہوں گی۔ اور ان کے علماء بگڑ کر ایسے خراب ہو چکے ہوں گے کہ آسمان کی چھت کے نیچے ان سے بڑھ کر کوئی برا نہیں ہو گا۔ ان ہی سے فتنہ نکلے گا او انہیں میں عود کر کے داخل ہو گا"

ان احادیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے اٹھائے جانے سے مراد یہ نہیں ہو سکتا کہ گویا قرآن جس قدر لوگوں کے گھروں میں لکھے اور چھپے پڑے ہوئے ہیں یا جس قدر قرآن کتب خانوں اور دکانوں اور مساجد اور مقدس مقامات میں موجود ہیں وہ سب کے سب کسی روز دنیا سے اٹھا لئے جائیں گے اسے حافظوں سے سلب کر لیا جائے گا۔ اس طرح کی بات نہ تو مذکورہ حدیث میں کی گئی ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ مشکوۃ کتاب العلم کی ایک اور حدیث ہمارے موقف کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے:

عَنْ زِيَادِ بْنِ لَبِيدٍ قَالَ: ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَالَ ذَاكَ عِنْدَ أَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَنَا وَيُقْرِئُهُ أَبْنَاؤُنَا أَبْنَاءَهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ زِيَادُ إِنْ كُنْتُ لَأَرَاكَ مِنْ أَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِينَةِ أَوَلَيْسَ هَذِهِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى يَقْرَءُونَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ لَا يَعْمَلُونَ بِشَيْءٍ مِمَّا فِيهِمَا ـ[2]

حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے کسی بات کا ذکر کر کے فرمایا یہ اس وقت ہو گا جب علم اٹھ جائے گا میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم علم کیسے اٹھ جائے گا حالانکہ ہم خود قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں اور ہمارے بیٹوں کو (اسی طرح نسل در نسل) قیامت تک پڑھاتے رہیں گے فرمایا زیاد تیری ماں تجھ پر روئے (یعنی تم نادان نکلے) میں تو تمہیں مدینہ کے سمجھ دار لوگوں میں شمار کرتا تھا کیا یہ یہود و نصاری تورات اور انجیل نہیں پڑھتے لیکن اس کی کسی بات پر عمل نہیں کرتے۔

(1) البیہقی: شعب الایمان، فصل وینبغی لطالب العلم، حدیث: 1763

(2) ابن ماجہ: السنن، ابواب الفتن، باب ذہاب القرآن والعلم، حدیث: 4048، ص: 2721

چند دیگر اعتراضات:

آغاز میں ہم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مستشرقین قرآن مجید پر اعتراضات کرتے ہوئے ایسی روایات بیان کرتے ہیں جو یا تو ایسی کتب میں پائی جاتی ہیں جن کا شمار کتبِ حدیث میں چوتھے درجے کی کتب میں ہوتا ہے اور ان کی روایات کو کسی عام مسئلے میں تو اس وقت قبول کر لیا جاتا ہو جبکہ ان کا صحیح احادیث سے تصادم نہ ہو رہا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی صحت اور اسکی تدوین کی پوری تاریخ کو مشکوک بنا دینے والی روایات پر ہم کس طرح اعتبار کر سکتے ہیں۔ یا پھر ایسی روایات منتخب کرتے ہیں جن کے راوی، محققین کی تحقیق کی رو سے ناقابل اعتبار اور ضعیف ہوتے ہیں۔

اس طرح کی روایات سے مستشرقین نے قرآن مجید کی پوری تاریخ کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان روایات میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ابتداء میں قرآن مجید کے اندر کچھ الفاظ پڑھے جاتے تھے لیکن اب یہ الفاظ موجود نہیں رہے۔ ان میں سے ایک مقام سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۶۷ ہے۔

معترضین کہتے ہیں کہ ابن مسعودؓ (32ھ) فرماتے ہیں:

''کنا نقرء علی عهد رسول الله ﷺ ''یا یها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك ان علیا مولی المؤمنین''[1]

یعنی ہم عہد نبویؐ میں آیت یا یھا الرسول بلغ ۔۔۔ کے آگے ان علیاً مولی المؤمنین کے الفاظ بھی پڑھا کرتے تھے۔ جبکہ اب موجودہ قرآن مجید میں یہ آیت یوں ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ[2]

یعنی اس میں ''ان علیا مولی المؤمنین'' کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

جب ہم اس روایت کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو دو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ یہ الدر المنثور سے لی گئی ہے اس کتاب میں سیوطی نے ثقہ اور ضعیف ہر طرح کی روایات جمع کر دی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ انہوں نے کسی روایت کے بارے میں کیا حکم لگایا ہے

---

(1) ناصر ہے کے ایل، پادری، قرآن کے متن کا تاریخی مطالعہ، ص 58 (معترض نے فتح القدیر جلد دوم، ص: 53 کا حوالہ دیا ہے)۔

(2) المائدۃ: 67

اس کتاب میں کسی روایت کا محض موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ سیوطی اسے معتبر سمجھتے ہیں۔

محققین نے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی ہے اس کتاب میں جس قدر روایات کا عظیم ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اگر وہ رطب ویابس سے پاک ہو جائے تو گرانقدر تصنیف بن جائے۔[1]

۲۔ اس روایت کی سند میں ایک شخص ابو بکر بن عیاش ہے جس کے متعلق محققین علم الرّجال کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اکثر غلطیاں کرتا ہے اور اس کا حافظہ بھی درست نہ تھا۔

میزان الاعتدال میں اس کے بارے میں ہے: ضعیف الحافظۃ کثیر الغلط وھمی۔[2]

یہ ضعیف الحافظہ اکثر غلطیاں کرنے والا اور وہمی شخص تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا اس کے بارے میں قول ہے کہ وہ حد سے زیادہ کثیر الغلط ہے۔[3]

ابن مبارک کا قول ہے کہ حدیث پر بہت جلد جرأت کرنے والا ابو بکر عیاش سے بڑھ کر میں نے نہیں دیکھا۔[4]

۳۔ اس شخص کے علاوہ ایک راوی عاصم ہے۔ میزان الاعتدال میں ابن علیہؒ اور یحیٰ بن قطان کا یہ قول منقول ہے کہ عاصم نامی شخصوں کے حافظے خراب ہیں۔[5]

۴۔ اس روایت کی سند کے کچھ حصے کا تو پتہ نہیں چلتا کہ راوی کیا تھے اور کیسے تھے؟ مسلمانوں نے اخذِ روایت میں جو طریق کار اختیار کیا ہے اس کی رو سے اس قسم کی کمزور روایت قبول کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

اس طرح یہ روایت کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ (68ھ) کہتے ہیں کہ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم کے بعد "فی مواسم الحج" کے الفاظ بھی ہیں موجودہ قرآن مجید میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔[6]

اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:

---

(1) حریری، غلام احمد، تاریخ تفسیر و مفسرین، کشمیر بک ڈپو فیصل آباد 2000ء، ص: 231

(2) ذہبی، شمس الدین ابی عبداللہ، میزان الاعتدال، دار احیاء الکتب العربیہ، مصر 1963، جلد اول، ص: 70

(3) ایضاً، جلد اول، ص: 182

(4) ایضاً، جلد اول، ص 182

(5) ایضاً، جلد: 2 ص 357

(6) ناصر کے ایل پادی: قرآن شریف کے متن کا تاریخی مطالعہ، گوجرانوالہ س ن، ص 26

عن ابن عباس قال کانت عکاظ و ذوالجنه و ذوالمجاز اسواق الجاهلية فتأثموا ان تیجروا فی المواسم فنزلت لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم فی مواسم الحج۔ (1)

ا۔ یہاں پر "فی مواسم الحج" جار مجرور نزلت کے متعلق ہے نہ کہ آیت کا حصہ۔ گویا کہ یہ آیت مواسم حج کے متعلق نازل ہوئی۔

قرآن پاک پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بالعموم ناقص مطالعے یا سیاق وسباق سے کاٹ کر عبارات پیش کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اعتراض زیر نظر میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ جس جگہ سے یہ اعتراض حاصل کیا گیا ہے اسی جگہ حاشیے میں اس کی وضاحت اور جواب بھی موجود ہے حاشیے پر لکھا ہے۔

""قوله فی مواسم الحج کلام الراوی" اور ان الفاظ کا ذکر آیت مبارکہ کی تفسیر کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ اس بات کا ذکر کرمانی اور ابن عیینہ نے کیا ہے کہ یہ ابن عباسؓ (68ھ) کی قراءت تھی۔ طبرانی نے عن ایوب عن عکرمہ سے روایت صحیح اسناد کے ساتھ ہے کہ ابن عباسؓ (68ھ) یوں پڑھا کرتے تھے۔ ابن ابی عمر نے اپنی مسند میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ (68ھ) ایسا پڑھا کرتے تھے۔ یہ قراءت شاذہ ہے اور ائمہ کے نزدیک اس کا حکم تفسیری بیان کا ہوتا ہے۔ اس بات کا تذکرہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور قسطلانی نے بھی کیا ہے۔

معترض نے ادھورے مطالعے کا مظاہرہ کیا حالانکہ حاشیے سے پورے مسئلے کی وضاحت ہو رہی ہے کسی ابہام کی گنجائش نہیں ہے۔ الاتقان کے صفحہ ۱۱۱ پر ہے

ما زید فی القراۃ علی وجه التفسیر قراءۃ ابن عباس

یعنی ابن عباسؓ (68ھ) نے تفسیر کے طور پر ان الفاظ کا اضافہ اپنے نسخے میں کیا ہو گا۔ ابن عباس (68ھ) اور نہ ہی کسی اور کو اس سلسلے میں ابہام تھا کہ یہ حصہ" قرآن مجید کا ٹکڑا ہے۔ شاذ قراءتوں کو ویسے بھی متواتر قراءت کے مقابلے میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مقام پر واضح کر دیا ہے کہ اگر یہ اور اس طرح کے دیگر ٹکڑے قرآن مجید کا حصہ ہوتے تو دیگر صحابہ کرامؓ کو بھی اس کا پتہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ قرآن مجید کچھ اس طرح نازل نہیں ہوا کہ اس کی کسی آیت کا کسی ایک صحابیؓ ہی کو علم ہو سکا اور باقیوں کو اس کی خبر نہ ہو سکی حضور ﷺ کے پاس صحابہ کرامؓ کی جماعت ہر وقت موجود ہوتی۔ لوگ اپنی ضروریات کیلئے باہر بھی آتے جاتے لیکن جماعت کی موجودگی کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوتا۔ ان حقائق کی موجودگی میں مستشرقین کے اس قسم کے اعتراضات کی کوئی وقعت نہیں رہتی کہ فلاں فلاں صحابیؓ کے نسخہ میں فلاں فلاں الفاظ تھے اور باقی نسخوں میں یہ الفاظ موجود نہ تھے۔

---

(1) بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر 4519، ص:370 (کتاب السنۃ)

گیارھواں باب

صحت قرآن مجید پر خارجی شواہد

قرآن مجید کی زبان کا تاریخی تسلسل

تلاوت قرآن مجید کا تسلسل اور ترغیب تلاوت قرآن

مسلمانوں کی غیر معمولی قوت حافظہ

کتابت قرآن مجید میں رسم الخط عثمانی کا التزام

رسم الخط عثمانی کا التزام اور غیر عربی زبان میں کتابت قرآن کی ممانعت

حرف آخر

***

صحت قرآن مجید پر خارجی شواہد

اللہ تعالی کی طرف سے قرآن حکیم کی حفاظت کی ذمہ داری کے اعلان کے باوجود عالم اسباب میں مسلمانوں نے حفاظت قرآن مجید کا ایسا اہتمام کیا ہے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اس احتیاط کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا جس کا اہتمام مسلمانوں نے ہر دور میں کیا۔ مسلمانوں نے وحی کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھا بلکہ اس سے بھی زیادہ انہوں نے ایک ایک لفظ کی ادائیگی کے طریق کو بھی محفوظ کیا۔

آج مسلمان اس بات سے آگاہ ہیں کہ حضور ﷺ نے کس مقام پر وقف فرمایا: یا کسی لفظ کو کس طرح ادا فرمایا، ہر چیز کی تفصیل ہمارے پاس موجود ہے۔ الفاظ کی ادائیگی کے طریق کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ﴾ کو کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔ پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بسم اللہ پڑھی اور اللہ اور الرحمن کو کھینچ کر پڑھا۔ (1)

ترمذی شریف میں روایت ہے کہ حضرت ام سلمیٰؓ سے حضور ﷺ کی قراءت کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپؓ نے فرمایا حضور ﷺ خوش جمال، خوش آواز تھے اور ترجیع کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ (2)

دلائل وشواہد کی بنیاد پر ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ بلکہ ان کی ادائیگی کے طریقے بھی نسل در نسل محفوظ ہیں۔

اس باب میں ہم خارجی شواہد سے یہ ثابت کریں گے کہ ہر اعتبار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن میں نہ تبدیلی ہوئی اور نہ ہی کوئی تبدیلی ممکن تھی۔ ہم یہاں واضح کریں گے کہ

1. قرآن کی کتابت کا طریقہ اور اس کا رسم الخط وہی ہے جو مصحف عثمان میں تھا اور اس رسم الخط کے

---

(1) الجامع الترمذی، کتاب القراءات، باب ما جاء کیف کانت قراءۃ النبی ﷺ: رقم الحدیث 2923۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: (i) بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب حسن الصوت بالقراء للقرآن، حدیث نمبر 5048

(ii) ابو داود، باب کیف یستحب الترتیل فی القراءۃ، حدیث نمبر 1450 تا 1459

(2) جامع الترمذی، ابواب القراءات: رقم الحدیث 2927

مطابق نہ لکھنا بالاجماع حرام ہے اس رسم الخط کو توقیفی قرار دیا گیا ہے ۔

2. قرآن کو عربی کے علاوہ کسی رسم الخط یا زبان میں لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی حتیٰ کہ بغیر متن کے قرآن چھاپنے کی بھی اجازت نہیں۔

3. قرآن مجید کی تلاوت میں تسلسل تاریخی طور پر موجود رہا ہے۔ کبھی بھی تلاوت قرآن نہ موقوف ہوئی اور نہ ہی لوگ اس سے غافل ہوئے۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ کے ان ارشادات کا تذکرہ کیا جائے گا جن میں تلاوت قرآن مجید کی ترغیب دی گئی ہے۔

4. حفظ قرآن کا اہتمام بھی قرآن مجید کے بنیادی خصائص میں سے ہے حفاظت قرآن مجید کے خارجی شواہد میں یہ بات بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ

5. قرآن مجید کی زبان ہر دور میں زندہ رہی ہے۔ جبکہ توراۃ وانجیل کی تو زبانیں ہی دنیا سے مٹ گئیں۔ عربی زبان کا زندہ رہنا بھی اسی لئے تھا کہ قرآن محفوظ رہے۔ عربوں کا حافظہ حفاظت قرآن میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ ہم نے ان کے ممتاز حافظے کی چند مثالیں پیش کر کے واضح کیا ہے کہ اس قوت حافظہ کی مدد سے انہوں نے قرآن کو اپنے سینوں محفوظ کر لیا۔ آئندہ سطور میں ہم ان شواہد پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے خطبات بہاولپور میں بیان فرمایا کہ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے، جرمنی کے عیسائیوں کے پادریوں نے یہ سوچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آرامی زبان میں جو انجیل تھی وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں۔ اس وقت قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے اور یونانی سے ہی ساری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ لہذا یونانی مخطوطوں کو جمع کیا جائے۔ اور ان کا آپس میں موازنہ کیا جائے۔ چنانچہ یونانی زبان میں انجیل کے جتنے نسخے دنیا میں پائے جاتے تھے ان سب کو جمع کیا گیا اور ان کے ایک ایک لفظ کا مقابلہ (collation) کیا گیا۔ اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے لفظ یہ ہیں: ”کوئی دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں“۔ اس کے بعد یہ جملہ ملتا ہے: ”ان میں سے اہم ہیں“ یہ ہے انجیل کا قصہ۔ غالباً اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کو قرآن کے متعلق حسد پیدا ہوا۔ جرمنی ہی میں میونخ یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا ”قرآن مجید کی تحقیقات کا ادارہ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا سے قرآن مجید کے قدیم ترین دستیاب نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو جمع کیے جائے۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں ۱۹۳۳ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پریتشل، پیرس آیا تھا تاکہ پیرس کی لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے فوٹو حاصل کرے۔ اس پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن مجید

کے بیالیس ہزار (42,000) نسخوں کے فوٹو اسٹیٹ موجود ہیں، اور مقابلے (collation) کا کام جاری ہے۔
دوسری جنگِ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت اور اس کا کتب خانہ، سب کچھ برباد ہو گیا۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلے کا جو کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل تو نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافات روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہو گی وہ کئی دوسرے نسخوں میں نہیں ہو گی۔ مثلاً فرض کیجیے "بسم اللہ الرحیم" میں "الرحمان" کا لفظ نہیں۔ لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے۔ باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے، سب میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " ہے۔ اس کو ہم کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ یا کہیں کوئی لفظ بڑھ گیا ہے۔ مثلاً ایک نسخے میں " بسم اللہ اللہ الرحمن الرحیم " ہے باقی نسخوں میں نہیں ہے۔ تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کاتب کی غلطی سے ملتی ہیں۔ لیکن اختلاف روایت، یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں میں ملے، ایسا کہیں نہیں ہے۔ یہ ہے قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ، جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں خدا کا جو فرمان ہے۔ "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" [ہم ہی اُسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے] یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے، اس آیت کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں۔[(1)]

قرآن مجید کی زبان کا تاریخی تسلسل

قرآن مجید احادیث اور دیگر نقلی دلائل کے علاوہ ہمارے پاس دوسرے بہت سے عقلی اور خارجی دلائل موجود ہیں جن کی روشنی میں، اپنے عقیدہ سے قطع نظر کر کے بھی ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن ایسی واحد کتاب ہے جو کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ تبدیلی سے محفوظ رہی ہے۔

آئندہ سطور میں ہم ان حقائق کی نشاندہی کریں گے جو ہمارے اس موقف کی تائید کرتے ہیں اس سلسلے میں ہم قرآن مجید کے اعجاز کے لاتعداد پہلوؤں میں سے تین پہلوؤں کا ذکر کریں گے:

1. عام لسانی تاریخ کے علی الرغم قرآن مجید کی زبان (عربی) کا زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رہنا۔
2. مذہبی کتب میں قرآن مجید کا یہ استثناء کہ اس کے متن میں کسی قسم کا کوئی فرق رونما نہیں ہوا۔
3. قرآن مجید کی دعوت معارضہ کے باوجود کسی کا اس جیسی کتاب نہ لا سکنا۔

آج دنیا میں جتنی بھی قدیم کتب پائی جاتی ہیں ان میں قرآن مجید کو ایک حیرت انگیز امتیاز حاصل

---

(1) حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور، صفحہ 30

ہے کہ اس کی زبان آج بھی زندہ زبان ہے۔ عربی زبان کی تاریخ میں کوئی تعطل نہیں آیا۔ ہر دور میں لاکھوں ہزاروں لوگ یہ زبان بولتے رہے ہیں۔ یہ ادب کی زبان رہی ہے اس کی شکل لہجے اور پوری کی پوری زبان وہی ہے، جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ دنیا کی کوئی کتاب مثال کے طور پر پیش نہیں کی جاسکتی جس کی زبان آج بھی وہی ہو جس میں وہ نازل ہوئی تھی۔ [1]

یہ بات قرآن مجید کا ناقابل تردید معجزہ ہے کہ دنیا میں کچھ کتابوں کی حالت یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس زبان میں نازل ہوئی تھیں اور ان کتابوں کی زبانیں اپنی اصل حالت میں باقی رہی ہوں۔

انجیل، قرآن مجید کے بعد سب سے قریب العہد کتاب ہے۔ اس کتاب کی حالت یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی معلوم نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کون سی زبان بولتے تھے۔ قیاس آرائی کے طور پر کہا جاتا ہے کہ آپ آرامی زبان بولتے تھے۔[2] انجیل کی شکل میں آپ کی تعلیمات کا جو بالواسطہ ریکارڈ ہمیں آج ملتا ہے اس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں ہے۔ [3] گویا حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات وارشادات ہمارے پاس صرف ترجمہ شدہ حالت میں پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ یونانی زبان بھی قدیم وجدید سے بالکل مختلف ہے انجیل کی یونانی زبان کے بہت سے الفاظ کے معانی جدید یونانی میں بھی معلوم نہیں ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک عہد نامہ جدید میں کم از کم 550 الفاظ ایسے تھے جن کے معانی معلوم نہ تھے۔ یہ الفاظ انجیل کے کل متن کا بارہ فیصد تھے۔ انیسویں صدی میں ایک جرمن شخص (Adolf Deissmann) نے مصر میں کچھ قدیم تحریریں پائیں۔ ان کے مطالعے کے بعد اس نے خیال ظاہر کیا کہ بائبل کی یونانی زبان دراصل قدیم یونانی زبان کی غیر علمی بولی تھی جو پہلی صدی عیسوی میں فلسطین کے عوام میں بولی جاتی تھی۔

لیکن عملی وسیاسی انقلابات کے باوجود قرآن مجید اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت میں باقی رکھے ہوئے ہے۔ انسانی معاشرے میں کوئی بڑی بڑی تبدیلی اس میں کسی تبدیل کا باعث نہ بن سکی۔

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے، ہم سوچ سکتے ہیں کہ وہ زبان جو ابھی تک محفوظ ہے اس کی حفاظت کا کوئی خصوصی خدائی نظام ضرور موجود ہوگا۔ عقل کہتی ہے کہ قدرت نے اس کتاب کی زبان کو اسی لئے محفوظ رکھا کہ اس کتاب کی حفاظت مطلوب تھی۔ دوسری طرف یہ بات بھی اہم ہے کہ صرف وہی کتاب

---

(1) وحید الدین، مولانا، (مضمون) بعنوان ''قرآن نبی کریم ﷺ کا ایک معجزہ''، ماہنامہ الحق، دسمبر 1983ء، ص: 40

(2) ایضاً، ص: 40

(3) ایضاً

محفوظ ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے جس کی زبان محفوظ ہے۔ دوسری کسی زبان کیلئے اس قسم کے دعوے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

تاریخ عالم سے بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ قوموں کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے نئی نئی زبانیں معرض وجود میں آتی رہیں اور گذشتہ زبانیں مفقود ہوتی چلی گئیں۔ لاطینی زبان اٹلی اور بعد میں روم کی متحدہ سلطنت کی زبان رہی۔ آج سے ایک ہزار برس قبل جب رومی سلطنت کو زوال آیا تو مختلف علاقائی بولیوں کے امتزاج سے ابھرنے والی زبانوں کو آج ہم فرانسیسی، اطالوی اسپینی، پرتگالی اور رومانوی زبانیں کہتے ہیں۔ لاطینی زبان صرف رومن کلیسا کی عبادت کی زبان رہ گئی۔ اس کے علاوہ سائنس اور قانون کی زبان بھی اطالوی بن گئی۔ اب وہ کوئی زندہ زبان نہیں رہی۔ اس کی تاریخی حیثیت تو باقی رہ گئی لیکن عملاً وہ اب زندہ زبان نہ رہی۔ مثال کے طور پر آج اگر کوئی نیوٹن کی کتاب پرنسپیا (PRINCIPA) کو پڑھنا چاہے تو اسے قدیم لاطینی زبان سیکھنا پڑے گی۔ (1)

یہی معاملہ دیگر قدیم زبانوں کے ساتھ بھی ہوا۔ ہر زبان مختلف سماجی حالات کے تحت بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی ابتدائی زبان ختم ہوگئی۔ قومی اختلاط، تہذیبی تصادم، سیاسی انقلاب، زمانی تبدیلی جب بھی کسی زبان کے ساتھ پیش آئے ہیں تو وہ بدل کر کچھ کی کچھ ہوگئی۔ اسی طرح کے تمام واقعات و حوادث عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آئے۔ لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ عربی میں کوئی تبدیلی آئی ہو۔ ۷۰ ءمیں یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب کی طرف آئے۔ یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے جن کی زبان عربی تھی عمالقہ کے ساتھ اختلاط کے بعد یہودی نسلوں کی زبان عربی ہوگئی تاہم ان کی زبان عربی عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ وہ عربی اور عبری کا مرکب تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے آنے کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانے پر پیش آیا۔ جب وہ ان علاقوں میں نکلے جو ایشیاء اور افریقہ کے ممالک تھے اور ان کی زبانیں غیر عربی تھیں۔ اس اختلاط کے باوجود عربی زبان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عرب کے اندر مختلف لہجے تھے۔ بنو تمیم، جیم کا تلفظ "یائ" سے کرتے تھے، مسجد کو مسید اور شجرات کو سرات کہتے تھے۔ وہ قاف کو جیم بولتے تھے۔ مختلف قبائل کے ملنے سے لسانی تاریخ کے عام اصول کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہونا چاہئے تھا۔ جو بالآخر ایک نئی زبان کی تشکیل پر منتج ہوتا۔ مگر قرآن کے برتر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضے میں لے رکھا تھا کہ اس کے اندر اس قسم کا عمل جاری نہ ہو سکا۔ (2)

---

(1) وحید الدین، ص:40

(2) ایضاً

بلکہ بقول ڈاکٹر احمد حسن زیات:

ماکانت لغة مضر بعد الإسلام لغة أمة واحدة وإنما كانت لغة لجميع الشعوب التي دخلت في دين الله[1]

اسلام کے بعد عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں رہی بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو اللہ کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

مسلمانوں نے عراق فتح کیا جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا۔ ایران کو زیر نگین کیا جو ایک عظیم سلطنت تھی۔ شام میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے جہاں کنعانی، مصری یونانی، غسانی قوموں نے اپنے اثرات چھوڑے ہوئے تھے۔ مصر فتح کیا۔ جہاں مشرق و مغرب کے فلسفے ملے تھے۔ ان علاقوں میں گئے جن کی زبان کی جگہ ایک نئی زبان پیدا ہو جانی ضروری تھی۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کی عربی زبان کسی بھی بڑی سے بڑی تبدیلی سے سرِ مُو متاثر نہ ہو سکی۔ حالانکہ عجمی و عربی اقوام کے ملنے سے ہر دو اقوام کی مقامی بولیوں میں بہر حال تبدیلیاں ہوئیں ہر ایک نے دوسری زبان سے اثر قبول کیا۔ لیکن قرآنی عربی متاثر نہ ہوئی۔

عباسیوں نے عربی تشخص کو غالب کرنے کی بجائے عجمیوں کو زیادہ مقام دیا۔ ایرانی اثرات گہرے ہوئے۔ اس کے بعد ۹۲۳ھ میں مصر و شام سے فاطمیین کے خاتمہ اور ۸۹۸ھ میں اندلس سے مسلمانوں کے خاتمے کے بعد عربی زبان و تمدن کو دھچکا لگا۔ ترکی رسم الخط رائج ہوا۔ عربوں میں غیر عربی الفاظ ستعمال ہونے لگے۔ عالم عرب پر ساڑھے پانسو سال ایسے گزرے ہیں جب ان پر عجمی لوگوں کو حکومت تھی۔ حتّٰی کہ ترک اور ایرانی، عرب آثار کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ اسی کو جمال الدین افغانی (1897ء) نے 'تتریک العرب' کہا۔ لیکن یہ تمام واقعات اصل عربی زبان (قرآنی عربی) کو متاثر نہ کر سکے۔ بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے شام میں صلیبیوں نے، یورپ والوں نے اندلس میں عربی زبان و ادب اور تہذیب کو جو نقصان پہنچائے وہ عربی زبان کے خاتمے کیلئے کافی تھے اس انحطاط کے دور میں بھی عربی زبان و ادب ترقی کرتا رہا۔ اور اسی دور میں ابن منظور (۷۱۱۔۶۳۰) اور ابن خلدون (۸۰۸۔۷۳۲) جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔[2]

۱۸۸۲ میں مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ ایک سو برس تک عربی پر فرانسیسی اور انگریزی کا غلبہ رہا۔ یہ غلبہ حکومت کے زیر سایہ تھا۔ مسلمانوں اور عربی زبان دونوں کے خلاف منظم سازشیں پورے زور و شور سے ہوئیں۔ اس کے باوجود قرآن کی عربی پر ذرا سا اثر بھی نہیں پڑا۔

---

(1) احمد حسن زیات، تاریخ الادب العربی: ص 1، (مقدمہ)

(2) وحید الدین، ص: 40

زبان کی تبدیلی کا دوسرا سبب ادبی ارتقاء ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے پہلے ہی دن ادب کا وہ معیار دے دیا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی، اس کے چیلنج کے باوجود اس کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ گویا کوئی دوسرا قرآن نہ لکھا جاسکا۔ لہذا اس قسم کی نوبت ہی نہیں آئی کہ قرآن کی زبان کو بدلا جاسکتا۔ قرآن کی زبان میں کوئی ارتقاء نہیں ہوا کیونکہ یہ تو پہلے ہی دن ارتقاء کی انتہائی بلندیوں پر تھی۔

اس کے برعکس پروفیسر نکلسن اپنی کتاب LITERARY HISTORY OF THE ARABS میں لکھتے ہیں:

"عربی زبان ساری دنیائے اسلام کی زبان بن گئی اور یہ یقینی طور پر قرآن کا اعجاز ہے کہ قرآن نے عربی زبان وادب پر حیران کن اثرات مرتب کئے۔ متن قرآن کو تحریف سے بچانے اور اس کی مشکل آیات کی تشریح وتوضیح کیلئے مسلمانوں نے نحو اور لغت نویسی ایجاد کی اور زمانہ ما قبل اسلام کے ابیات ورومانیت کو جمع کر کے انہیں ہلاکت سے بچالیا۔" (1)

اسلام نے بنیادی عبادات اور دیگر احکام کی بجا آوری کیلئے عربی زبان کو معیار قرار دیا مسلمان دن میں کم از کم پانچ مرتبہ نماز عربی زبان میں ادا کرتا ہے۔ روزانہ تلاوت قرآن لازم قرار دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی اذان عربی میں ہے مسلمانوں کا بنیادی کلمہ عربی میں ہے۔ اقرار اسلام کی شروط عربی میں ہیں۔ باہمی سلام ودعا عربی میں ہے۔ امام شافعیؒ (204ھ) فرماتے ہیں جو شخص عربی زبان جانتا ہو اس کیلئے غیر عربی بولنا مکروہ ہے۔ (2) حضور ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ جو شخص عربی جانتا ہو وہ عجمی زبان نہ بولے۔ (3) مسلمانوں کیلئے عربی زبان جاننا ضروری قرار دیا گیا ہے کیونکہ قرآن کا سمجھنا اسی پر منحصر ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "عربی زبان سیکھو کیونکہ یہ تمھارے دین سے ہے۔" (4)

آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (30ھ) کو حکم فرمایا: "عربی زبان میں مہارت حاصل کرو۔" روزانہ کروڑوں انسان عربی زبان میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔

یوں لاتعداد ذرائع سے اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب میں بھی قرآن مجید کے محفوظ رہنے کے اسباب پیدا فرما دیئے ہیں۔

---

(1) Nicholson , LITERARY HISTORY OF THE ARABS ,P:60

(2) بحوالہ زاہد الحسینی، مولانا، ضرورۃ القرآن، ص:250

(3) ایضاً

(4) ایضاً

تلاوت قرآن مجید کا تسلسل اور ترغیب تلاوت قرآن

قرآن مجید دنیا کی واحد کتاب ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کے لگاؤ کا عالم یہ ہے کہ وہ اسے حفظ کرتے ہیں۔ روزانہ اس کی تلاوت کو باعث اجر و ثواب، قرار دیتے، اس پر عمل کرتے، حتّٰی کہ اسے دیکھ کر پڑھنا ان کیلئے کئی بیماریوں کا علاج قرار دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کی ترغیبات موجود ہیں جن میں آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم یا ترغیب فرمائی ہے کہ قرآن کے ساتھ اپنا تعلق زیادہ سے زیادہ جوڑا جائے۔ ان ترغیبات میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

1. ان افضلکم من تعلم القران وعلمه[1]

"بے شک تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن پڑھا اور پڑھایا۔"

2. مثل الذی یقرء القران کالا ترجة طعمها طیب وریحها والذی لایقرء القران کالتمرة طعمها طیب ولا ریح لها[2]

"قرآن پڑھنے والا اس پھل کی مانند ہے جس کا مزا بھی عمدہ ہے اور خوشبو بھی۔ اور جو قرآن نہیں پڑھتا، کھجور کی مانند ہے۔ مزہ عمدہ ہے مگر خوشبو نہیں۔"

3. یقال لصاحب القرآن اقرء وارتق ورتل کما کنت ترتل فی الدنیا فإن منزلك عند اٰخر اٰیة تقرءها۔[3]

"عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ) سے روایت ہے قیامت کے روز قرآن مجید پڑھنے والے کو حکم دیا جائے گا کہ پڑھ اور بلند درجات کی طرف چڑھ لیکن قرآن کو اس طرح ترتیل کے ساتھ پڑھتا ہوا جیسے دنیا میں پڑھتا تھا۔ اور جہاں تیری آخری آیت ہوگی وہی تیری منزل ہوگی۔"

4. عن أبی سعید یقول الرب تبارك وتعالی من شَغَلَه القرآن عن ذکری و مسئلتی اعطیتة أفضل ما أعطی السائلین وفضل کلام اللہ علی سائر الکلام فضل ما أعطی السائلین و فضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقه۔[4]

"رب تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو قرآن میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ مجھ سے دعا تک نہ

---

(1) الصحیح البخاری: باب خیرکم من تعلم القرآن، جلد 3، ص: 151

(2) ایضاً: باب فضل القرآن علی سائر الکلام، ج 3، ص 150

(3) جامع الترمذی، باب فضائل القرآن، حدیث نمبر 2926 (کتب الستة)

(4) مشکوٰة: کتاب فضائل القرآن، جلد 1، ص: 660

کر سکے۔ تو میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ دوں گا اللہ کے کلام کو دوسرے کلاموں پر اسی قدر فضلیت حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر۔"

ابن عمرؓ (73ھ) سے روایت ہے۔

5. قال قال رسول الله لا حسد علی اثنین رجل أتاه الله القرآن فهو یقوم به آناء اللیل وأناء النهار و رجل أتاه الله مالا فهو ینفق منه آناء اللیل و آناء النهار [1]

"ابن عمر (73ھ) کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ رشک کے قابل صرف دو شخص ہیں۔ ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن دیا اور وہ رات دن اس کی تلاوت کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ اسے دن رات خرچ کرتا ہے۔"

6. عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیه وهو علیه شاق له أجران [2]

"حضرت عائشہ صدیقہؓ (57ھ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو قرآن کا ماہر ہو وہ لکھنے والے پاک بزرگ نیکوں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کی زبان اٹکتی ہے اور یہ اس کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اس کو دوہرا ثواب ہے۔"

7. عن ابی موسیٰ أشعری قال قال رسول الله ﷺ تعاهدوا القرآن فوالذی نفسی بیده هو أشد تفضیا من الإبل فی عقلها [3]

"حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن مجید پابندی سے پڑھو کیونکہ قرآن سینوں (حافظوں) سے نکل جانے میں اس اونٹ سے تیز ہے جو اپنی بندش سے چھوٹ جائے۔"

8. حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (58ھ) سے مروی ایک طویل روایت میں یہ کلمات ہیں:

وما اجتمع قوم فی بیت من بیوت الله یتلون کتاب الله یتدارسون بینهم إلا نزلت علیهم السکینة وغشیتهم الرحمة وحفتهم الملائکة و ذکرهم الله فیمن عنده [4]

"اور جو بھی کوئی جمع ہو اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں درآنحالیکہ وہ کتاب اللہ کی تلاوت اور

(1) الصحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب اغتباط صاحب القرآن: حدیث نمبر 5025 (کتب الستۃ)

(2) الجامع الترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قارئ القرآن: حدیث نمبر 2904

(3) الصحیح البخاری، کتاب فضائل، باب استذکار القرآن وتعاهده: حدیث نمبر 5033 (کتب الستۃ)

(4) مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، ص: 677۔ ابوداود، باب فی ثواب قراءة القرآن، حدیث نمبر 1441

اس کی درس و تدریس میں باہم مشغول ہوں تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اللہ کی طرف سے ان پر ایک خاص سکینت نازل ہو گی اور اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لے گی اور فرشتے ان کو اکرام واحترام کے طور پر گھیر لیں گے اور ان کا تذکرہ اپنے پاس موجود فرشتوں میں فرمائے گا۔"

9. ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (58ھ) سے روایت ہے۔

قال رسول الله ﷺ يجی صاحب القران يوم القيامة فيقول يارب حله فيلبس تاج الكرامة ثم يقول يارب زده فيلبس حلة الكرامة ثم يقول يارب ارض عنه فيرضی عنه فيقال له اقرأ وارق ويزاد بكل اية حسنة"[1]

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (58ھ) سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب قرآن والے لائے جائیں گے تو قرآن ان کی سفارش کرے گا اور کہے گا کہ اے اللہ! ان کو خلعت عطا فرما اس پر دستارِ فضیلت ان کے سروں پر باندھی جائے گی پھر قرآن سفارش کرے گا تو اسے اعزاز واکرام والا لباس ملے گا۔ پھر سفارش کرے گا کہ اے اللہ تو ان سے راضی ہو جا۔ اس پر وہ اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار فرمائے گا اور حکم فرمائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور ہر آیت کے عوض ثواب حاصل کر۔"

قرآن مجید میں ہے:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ ﴾[2]

"بلکہ وہ کھلی ہوئی واضح آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں حفظ کے ذریعے جن کو علم دیا گیا ہے اور ہماری آیتوں سے ظالموں کے سوا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔"

جوں جوں قرآن اترتا گیا اس کے ساتھ ساتھ صحابہؓ اسے حفظ بھی کرتے چلے گئے۔ (اس کی تفصیلات عہد رسالت کے باب میں ذکر کر دی گئی ہیں) اس کے بعد سے نسل در نسل حفظ کا سلسلہ چل رہا ہے۔

قرآن مجید نے اس کی حفاظت و جمع کا جو عہد کیا تھا، مسلمانوں کی صدیوں کی تاریخ اس کی واضح تصویر ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب مثال پیش نہیں کر سکتی کہ اس کا کوئی حافظ کسی بھی دور میں موجود رہا ہو۔ حتیٰ کہ عیسائیوں کا عالمی سربراہ پوپ بھی انجیل کا حافظ نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف قرآن ہی کو بطور امتیاز حاصل ہے کہ مسلمانوں کی کوئی بھی آبادی ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی حافظ موجود نہ ہو۔

مسلمانوں کی آبادیوں میں چلے جایئے آپ کو ننھے منے حافظ عام ملیں گے۔ ہر بستی اور ہر محلہ میں حفظ قرآن کے مدارس قائم ہیں۔ رمضان المبارک میں نماز تراویح کے اندر شاید ہی کوئی مسجد ہو گی جس میں

---

(1) الجامع الترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القرآن: حدیث نمبر 2915، ص: 1944، (کتب السنہ)

(2) العنکبوت: 49

قرآن مجید ہر سال نہ سنایا جاتا ہو۔ کسی بھی مسجد میں اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ کوئی حافظ اپنے سامع کے بغیر قرآن سنائے۔ کیا مجال کہ حافظ سے پڑھنے میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور فوراً دوسرا حافظ اسے ٹوک نہ دے۔ اہل مغرب اس صورت حال سے واقف نہیں ہیں کہ مسلمان کس طرح قرآن کا حفظ اور دَور کرتے ہیں۔ اسی عدم واقفیت کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے متن میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ہمارے استاذ محترم نے ایک انگریز پروفیسر کا یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں آئے اور صدر شعبہ سے درخواست کی کہ مجھے آپ کی لائبریری سے کچھ کتب دیکھنی ہیں استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں قرآن کی کچھ آیات کا حوالہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس پر صدر شعبہ نے ایک استاذ محترم جو حافظ قرآن تھے، پروفیسر صاحب کے ساتھ کر دئے کہ آپ کی مدد کریں گے۔ انگریز پروفیسر صاحب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ آیت کے الفاظ دکھاتے اور ہمارے حافظ قرآن استاذ اپنے حافظے سے فوراً حوالہ لکھوا دیتے۔ اپنی اس حیرت کا اظہار انہوں نے صدر شعبہ کے سامنے بھی کیا اور کہا آج آپ نے ایک عجیب وغریب شخص سے ملاقات کروادی جو قرآن کی کیٹالاگ ہے۔" اس پر صدر شعبہ نے انہیں بتایا کہ ہمارے ہاں یہ عجیب بات نہیں ہے بلکہ ہمارے تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی حافظ قرآن ہوتے ہیں۔ (1)

اہل مغرب کیلئے حفظ قرآن واقعی ایک اچنبھے کی بات ہے۔ انہیں جس صورت حال کا مشاہدہ کرنے کو ملا ہے اور ان کی کتاب سے ان لوگوں کا جو تعلق ہے، اس کے پس منظر میں ایک مغربی شخص واقعی حافظ قرآن کو دیکھ کہ حیران وششدر رہ جائے گا کیونکہ ان کے ہاں نو عمر بچوں کا حافظ انجیل ہونا تو درکنار خود پوپ پال جو عیسائیوں کا دینا کا سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا ہے، بھی حافظ انجیل نہیں ہے۔ جس مذہب کی کتاب کا کوئی ایک بھی حافظ دنیا میں کبھی موجود نہ رہا ہو، اس کے پیروکار یہ کیونکر تسلیم کر لیں گے کہ مسلمانوں کی ایک ایک بستی میں ایسے بچے، جوان اور بوڑھے حفاظ قرآن موجود ہیں جو اس کی ایک حرکت اور ایک ایک حرف بلکہ ہر ہر حرف کی ادائیگی کے طریقے کے محافظ ہیں۔ ان کروڑوں حفاظ کی موجودگی میں قرآن مجید کے تحریری نسخوں میں اگر کسی وقت دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی غلطی رونما ہوتی بھی ہے تو اس کی نشاندہی فوراً ہو جاتی ہے۔ غلطی کا باقی رہنا تو بڑی دور کی بات ہے مسلمانوں نے تو قرآن کے ہر ہر لفظ کی ادائیگی کے طریقوں کو نسل در نسل محفوظ کیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کس جگہ وقف کیا تھا اور کس جگہ وصل سے تلاوت فرمائی تھی۔

اس کے برعکس باقی مذاہب میں کہیں عورتوں پر پابندی عائد رہی ہے کہ وہ انجیل کی تلاوت نہیں کر سکتیں۔ (2)

---

(1) بحوالہ حافظ احمد یارؒ، سابق استاذ ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی

(2) ہنری ہشتم کے عہد میں برطانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون منظور کیا تھا۔ بحوالہ حسنی: جلد 2، ص: 451

اور اس کی تلاوت محض اہل مذہب میں محدود ہو کر رہ گئی۔ کہیں یہ ظالمانہ قانون موجود ہے کہ برہمن کے علاوہ اگر غیر برہمن وید حفظ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔[1]

مسلمانوں کی غیر معمولی قوت حافظہ

قرآن حکیم کی حفاظت کے سلسلے میں مسلمانوں نے دو طرح کے طریقے اختیار کئے ہیں، ان میں سے ایک کتابت اور دوسرا حفظ ہے۔ لیکن اگر تاریخی حوالے سے بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت قرآن کا اصل اہتمام یہ کیا گیا کہ اسے انسانوں نے اپنے حافظوں میں محفوظ کیا۔ حفظ قرآن، قرآن مجید کا ممتاز ترین پہلو ہے۔ دنیا کی کسی کتاب کی حفاظت انسانی صدور کے ذریعے نہیں کی گئی۔ حفظ، صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص و محدود ہے۔

نزول قرآن کے وقت بھی کتابتِ قرآن کے ساتھ حفظ قرآن کا خصوصی اہتمام ہوا۔ ان سطور میں ہم نزول قرآن اور زمانہ مابعد کے حوالے سے یہ واضح کریں گے کہ عربوں کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح کا امتیازی حافظہ عطا کر رکھا تھا اور وہ کس طرح حافظے پر انحصار کیا کرتے تھے اس مختصر جائزے کا مقصود یہ ہے کہ عربوں میں حافظے پر خصوصی انحصار تھا اور قرآن مجید کے حفظ میں بھی انہوں نے خصوصی دلچسپی دکھائی۔

نزول قرآن کے وقت عربوں میں اگرچہ لکھنے کا رواج تو تھا لیکن اسے عام رواج نہیں کہا جا سکتا ان کا اصل دارومدار حافظے پر تھا۔ چونکہ حافظے پر ہی دارومدار رکھا جاتا تھا، اس لئے اس فطری اصول کے مطابق کہ جس صلاحیت کو زیادہ بروئے کار لایا جائے وہ قوت نشوونما اور ترقی پاتی ہے عربوں کا حافظہ بہت قوی ہو گیا تھا۔ عربوں کے قدرتی اور طبعی حالات، جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا کی وجہ سے ان کی قوت حافظہ بہت زیادہ تھی۔ آج بھی عرب ممالک میں جا کر ہر کوئی اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ اہل عرب دنیا کی باقی تمام اقوام سے حافظہ کے قوی ہونے میں فوقیت رکھتے ہیں۔ عربوں کے بارے میں حافظ ابن عبد البر (463ھ) لکھتے ہیں۔

مذهب العرب انهم كانوا مطبوعين على الحفظ مخصوصين بذالك[2]

"عربوں کا عام طریقہ یہ تھا کہ یاد رکھنے کی ان کی کچھ فطری عادت تھی۔ جن میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا۔"

---

(1) ایضاً

(2) ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد 1، ص: 12

یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ قرآن کو عربوں میں نازل کرنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہو کہ قوی حافظے کے مالک یہ لوگ اس کے بہتر محافظ بن سکتے تھے۔

عربوں نے مشہور جنگوں اور واقعات کو تفصیل کے ساتھ حافظوں میں محفوظ کر رکھا تھا۔ مختلف جنگوں اور اہم مواقع پر ان کے سرداروں نے جو خطبات دیئے، وہ بھی ان کے سینوں میں محفوظ تھے۔ جنگوں کے موقع پر جو اشعار پڑھے گئے وہ بھی انہیں ازبر تھے۔ اپنے قبیلے کی برتری اور فوقیت دوسرے قبیلے پر جتانے کیلئے انہیں بیسیوں اشعار یاد ہوتے تھے۔ ان کے حافظوں میں ان کے گھوڑوں کے نسب نامے تک محفوظ تھے جو ان کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے تھے۔ (1)

انہیں اپنے قبیلے کے پورے نسب نامے یاد تھے۔ اپنے اولین آباء اور گذشتہ اسلاف سے نسل در نسل تعلق ان کو ازبر ہوتا تھا۔ جب کوئی شاعر شعر کہتا تو سننے والوں کو تمام اشعار سنتے ہی یاد ہو جاتے، خواہ ان اشعار کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اشعار اور انساب کو حافظوں میں محفوظ رکھنا، چند یا مخصوص افراد سے مختص نہ تھا بلکہ یہ عرب کا عام رواج تھا۔ اور اس میں ان کے مرد اور عورتیں سبھی شامل ہوتے تھے۔ جب کبھی ان کے یہاں کوئی خاص واقعہ پیش آتا یا کوئی انوکھا نکتہ پیدا ہوتا تو وہ واقعہ ضرب المثل بن جاتا۔ اب یہ واقعات ان کے ذہنوں میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جاتے۔ طویل مدت گزرنے کے باوجود یہ واقعات محو نہ ہوتے۔ بعد کے آنے والوں نے ان ایام جنگ اور دیگر اہم واقعات کے متعلق جو کچھ معتبر لوگوں سے حاصل کیا اور جو کچھ روایت کرنے والوں کی زبان سے سنا، اسے جمع کر دیا۔ ان کی امثال اور اشعار کو بھی جمع کر دیا۔ جس سے کئی کئی جلدیں اور مجموعے تیار ہو گئے۔ اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ اہل عرب کے اشعار کا بہت سارا حصہ ضائع ہو گیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دار و مدار حافظے پر تھا۔ اور ان لوگوں کی موت کے ساتھ ہی وہ اشعار بھی ختم ہو گئے جو مرنے والوں کو یاد تھے۔ بلوغ الارب کے مصنف لکھتے ہیں ان کے اشعار پر مشتمل وہ مجموعے جو ہم تک پہنچے ہیں ان مجموعوں کے مقابلے میں جو ہم تک نہیں پہنچے، سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتے ہیں یا پہاڑ اور چٹیل میدانوں کے مقابلے میں ایک ذرے کی طرح ہیں۔ (2)

ہر عرب شاعر کا ایک راویہ ہوتا تھا جو اپنے شاعر کا ہر ہر شعر محفوظ کرتا اور انہیں ضائع ہونے سے بچاتا۔ وہ اس کے اشعار کو زبانی یاد کرتا جو مختلف مواقع پر پڑھے جاتے۔ ہر راویہ کو رجز۔ قصائد اور دیگر

---

(1) آلوسی، بلوغ الارب: جلد 1، ص: 38-40

(2) ایضاً

اقسام کے اشعار کی اتنی بڑی تعداد یاد ہوتی تھی کہ حصر وشمار سے باہر ہے متاخر شعراء کو اشعار کے بڑے مجموعے یاد ہوتے تھے۔ صرف اصمعی کو لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں ابھی بالغ نہ ہوا تھا کہ بدویوں کے بارہ ہزار رجزیہ قصائد کی روایت کر چکا تھا۔"[1]

خلف الاحمر (۱۸۴ھ) اشعار کا بہترین راوی اور اشعار کا سب سے بڑا عالم تھا۔[2]

عربی زبان میں بے پناہ وسعت اور اس کا مترادفات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک ہی چیز کیلئے صفات واحوال کیلئے اختلاف کی وجہ سے متعدد نام ہیں۔ ان کے ہاں شہد کیلئے اسی۔ اژدھے کیلئے دوسو، شیر کیلئے پانچ سو۔ اور اونٹ کیلئے ایک ہزار الفاظ ہیں۔ اسی قدر الفاظ تلوار کیلئے بھی مستعمل ہیں۔ مصیبت کی مختلف صورتوں کیلئے وہ چار ہزار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ ایک یقینی امر ہے کہ ان تمام الفاظ و اسماء کو یاد رکھنے کیلئے حافظے کا قوی ہونا نہایت ضروری ٹھہرتا ہے۔ غرض عربوں کے حافظے کی عظیم قوت اور تیزیٔ فکر سے انکار کرنے کی کسی کو مجال نہیں ہے۔ ان ہی کے مشاہیر میں سے ایک شخص حماد الراویہ ہے جس نے ایک موقع پر خلیفہ ولید سے کہا تھا کہ وہ اسے اسی مقام ہر ایک سو قصائد سنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک قصیدہ بیس سے سو اشعار تک ہوتا ہے۔ چنانچہ سنانے والے سے پہلے سننے والا تھک گیا۔[3]

مذکورہ تفصیلات محمود شکری آلوسی نے اپنی کتاب بلوغ الارب میں ایک مغربی مصنف فرانس کے سابق وزیر معارف "عمو میہ ذروی" کے حوالے سے پیش کی ہیں۔ تفصیلات کے بیان کے بعد اسی مغربی مصنف کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے محمود آلوسی لکھتے ہیں:

"جس قدر عبارت یہاں نقل کرنا مقصود تھی وہ کر دی گئی ہے۔ جس کے ذریعے سے اس فاضل نے خالص یورپی ہونے کے باوجود عربوں کی اس قوت حافظہ کو تسلیم کیا ہے جو دوسری قوموں کے ہاں نہیں تھی۔"[4]

Willium Muir ان مستشرقین میں سے ہے جو مسلمانوں کے بارے میں بالعموم نہایت متعصبانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن عربوں کی اس خصوصیت کا اعتراف اس نے بھی اپنی کتاب LIEF OF MAHOMET کے دیباچے میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"عرب کے لوگ نظم کے بہت سرگرم مشتاق تھے۔ لیکن ان کے پاس ایسے اسباب موجود نہ تھے

---

(1) ایضاً

(2) ایضاً

(3) ایضاً

(4) ایضاً

کہ جن سے وہ اپنے شعراء کے کلام کو محفوظ کرنے کیلئے ضبط تحریر میں لاسکتے۔ اس لئے ایک مدت تک ان میں یہی رواج رہا کہ اپنے شعراء کے کلام، اپنی قوم اور اپنے آباء واجداد کے تاریخی حالات اپنے سینوں میں ہی محفوظ کیے تھے ۔ اور یہی قوت اس نئی پیدا شدہ روح کے ساتھ پورے اخلاص اور شوق سے قرآن کریم حفظ کرنے میں کام آئی۔ "(1)

اس سلسلے میں بیسیوں نہیں ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ہمارے اس موضوع پر شواہد ملتے ہیں کہ عرب لوگ قوت حافظہ میں ضرب المثل تھے۔ علامہ ابن خلدون (808ھ) نے بھی عربوں کی اس معجز قوت حافظہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھنے کا اس قدر عام رواج نہ ہونے کی بنا پر بھی وہ قوت حافظہ پر مدار کرتے تھے۔ اسلام کے آغاز کے وقت یہ صلاحیت اپنے پورے عروج پر تھی۔ چنانچہ اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے قرآن مجید کے حفظ کی طرف توجہ کی۔ حفظ قرآن اور حفظ شعر میں نمایاں فرق تھا۔ حفظ قرآن، ان کیلئے عبادت کا مقام رکھتا تھا جبکہ حفظ شعر تو محض ان کے معاشرتی تفاخر کا سبب بنتا تھا چنانچہ ایک ایسی قوم کو جس کی قوت حافظہ ضرب المثل ہو، ایک ایسی کتاب مل گئی جو ان کی زندگی کیلئے نظام حیات کا صحیفہ ہدایت تھی اور جس سے ان کے شعری ذوق کی تسکین بھی ہوتی تھی۔

قرآن مجید کے حفظ کے سلسلے میں مسلمانوں نے قوت حافظہ کو جس طرح استعمال کیا، اس کا تفصیلی ذکر ہم نے عہد نبوی میں حفاظت قرآن کے باب میں کیا ہے۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قوت حافظہ کو کیا اہمیت دی گئی ہے۔ اس مقام پر ہم تاریخ اسلام کے چند مشاہیر کے بارے میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ تذکرہ الحفاظ میں امام زہری (50-124ھ) کا بیان منقول ہے۔ فرماتے ہیں:

"ما استعدت حدیثا قط وما شككت فی حدیث إلا حدیثاً واحدا فسألت صاحبی فإذا هو كما حفظت" (2)

"ایک بار حدیث سننے کے بعد مجھے دوبارہ اس کے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور نہ کبھی حدیث کے بارے میں شبہ ہوا۔ صرف ایک بار ایک حدیث کے بارے میں مجھے شک ہوا۔ لیکن جب میں نے اپنے ایک ساتھی سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو حدیث اس طرح نکلی جس طرح مجھے یاد تھی۔"

اسی کتاب میں امام زہری (50-124ھ) ہی کے بارے میں لکھا ہے۔

"ما استودعت قلبی علما فنسیته" (3)

---

(1) Muir, Life of Mahomet: I/VII

(2) تذکرۃ الحفاظ: جلد 1، ص: 104

(3) ایضاً: جلد 1، ص: 103؛ فتح الباری: جلد 1، ص: 4 (مقدمہ)

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنے دل میں علم رکھا ہو پھر اس کو بھول گیا ہوں۔"

دیگر آئمہ محدثین قوت حافظہ میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ محمد ابن ابی حاتم وراق (327ھ) کہتے ہیں۔

"سمعت البخاری یقول الھمت حفظ الحدیث وانا فی المکتب"[1]

"یعنی میں نے خود بخاری (256ھ) کو فرماتے سناوہ کہتے تھے کہ اللہ نے مجھے اس وقت حفظ حدیث کا شوق دیا جب کہ میں ابھی مکتب میں تھا۔"

حاشد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (256ھ) ہمارے ساتھ شیوخ بصرہ کی درس گاہوں میں شامل ہوتے۔ لیکن آپ کو لکھنے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اسی حالت میں کچھ دن گزر گئے۔ ہم نے انہیں سمجھانا شروع کیا کہ آپ ناحق اپنا وقت ضائع کرتے ہیں جب امام بخاری (256ھ) ہماری باتیں سن سن کر تنگ آگئے تو فرمانے لگے: "قد أکثر تم علی" یعنی تم نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ فرمانے لگے جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ پیش کرتے جاؤ۔ لوگوں نے اپنے اپنے اجزاء نکالے اور پڑھنے لگے، جب لوگ سنا کر فارغ ہو چکے تو امام صاحب نے پندرہ ہزار احادیث ان اجزاء کے علاوہ پڑھ کر سنا دیں۔ اور ہمارے لکھے سب اجزاء بھی دہرائے۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنے لکھے ہوئے اجزاء کی تصحیح بھی آپ کے حفظ سے کرلی۔[2]

اسی قسم کا بیان ازہر سجستانی سے بھی منقول ہے جو الفوائد لدراری میں موجود ہے۔[3]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (256ھ) کے بارے میں علامہ فضلک جن کا اصل نام حافظ ابو العباس الفضل بن عباس ہے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ علون اور بغداد کے سفر کے دوران میری ملاقات امام بخاری (256ھ) سے ہوگئی میں امام صاحب کے ساتھ سفر میں شریک ہوگیا اور میں نے بڑی کوشش کی کہ امام صاحب کے سامنے کوئی ایسی حدیث پیش کروں جس کو نہ جانتے ہوں، لیکن مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔[4]

ایک اور مشہور شخصیت ابوزرعہ ہیں۔ قوت حافظہ میں محدثین انہیں نظیر کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ یہی ابوزرعہ امام بخاری (256ھ) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"محمد بن اسماعیل اٰیۃ آیات اللہ فی بصرۃ ونفاذہ فی العلم"[5]

---

(1) ایضاً: جلد1، ص:104

(2) عبدالعزیز، شاہ، بستان المحدثین: 172؛ فتح الباری: جلد1، ص:12 (مقدمہ)

(3) فتح الباری: 172

(4) ایضاً، 8 مقدمہ

(5) ایضاً

''محمد بن اسماعیل اپنی بصیرت اور علم میں اللہ کی ایک نشانی ہیں۔''

شروح الفیہ شروح بخاری، کتب تاریخ، مقدمہ الفتح، تمیز المشکل، تہذیب الاسماء۔ طبقات الکبریٰ سبکی۔ طبقات حنابلہ۔ مرقاۃ اور دیگر کئی ایک کتب میں امام بخاری (256ھ) کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ بغداد کے علماء نے امام بخاری (256ھ) کا امتحان لینا چاہا کہ آپ کی قوت حافظہ کس درجے کی ہے۔ انہوں نے ایک ترکیب سوچی کہ انہوں نے ایک سو احادیث لیں اور انہیں اس طرح الٹ پلٹ کر دیا کہ ایک حدیث کی سند دوسری حدیث کے متن کے ساتھ ملا دی۔ ان سو احادیث کو دس مختلف آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ اور ایک مجمع عام میں امام صاحب کا امتحان لیا۔ لوگوں کے سامنے ان دس اصحاب میں سے ہر ایک نے باری باری یہ دس دس احادیث امام صاحب کو سنائیں ہر پڑھنے والا پڑھتا تو امام صاحب فرمادیتے: ''لا أدري'' لوگوں کے ذھنوں میں بدگمانی پیدا ہونے لگی۔ سب سے آخر میں امام صاحب کھڑے ہو گئے اور پہلے شخص کے بارے میں فرماتے:

''أما حديث الأول فبهذا الاسناد خطأ وصوابه كذا''

یعنی تمھاری پہلی روایت غلط تھی اور اس کی اصل سند یوں ہے۔ اسی طرح ایک ایک کر کے ہر ایک شخص کی بیان کردہ ہر ہر روایت کی اصلاح اس مجمع کے سامنے فرمادی۔ اس واقعہ کے بارے میں علامہ علی القاری (1014ھ) فرماتے ہیں۔

''فبهر الناس'' لوگ حیرت زدہ ہو گئے اور انہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (256ھ) کے کمالات کا یقین ہو گیا۔[1]

اسی طرح کا ایک واقعہ سمرقند کے لوگوں کے بارے میں مشہور ہے۔ اس واقعہ کا ذکر فتح الباری میں کیا گیا ہے۔ دیگر کئی ایک واقعات بھی فتح الباری کے مقدمہ میں موجود ہیں۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ (203ھ) کے بارے میں یہی بات معروف ہے کہ ان کا حافظہ بھی ضرب المثل تھا۔ محمد بن مخلد کہتے ہیں کو وہ ہزاروں احادیث کا مذاکرہ فرماسکتے تھے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تہذیب التہذیب اور تذکرۃ الحفاظ میں واقعات منقول ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی قوت حافظہ بھی بہت زیادہ تھی اور ہزاروں احادیث آپ کو سند کے ساتھ حفظ تھیں۔[2]

---

(1) فتح الباری: ص 8 (مقدمہ)

(2) محمد عبدہ، الفلاح، صحاح ستہ اور ان کے مؤلفین، ص: 97-134

کتابت قرآن مجید میں رسم الخط عثمانی کا التزام :

کتابت قرآن مجید میں ہر دور کے لکھنے والوں نے رسم الخط عثمانی کو ملحوظ رکھا اور حضرت عثمان ؓ (35ھ) کے وقت سے جو رسم الخط رائج چلا آرہا ہے ، مسلمانوں نے اس میں سر مو تبدیلی روا نہیں رکھی۔ "عثمانیؓ رسم الخط" وہی تھا جو حضور ﷺ نے اختیار فرمایا تھا۔ اس طرح ہم حقائق و شواہد کی روشنی میں بلاخوف تردید یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ قرآن مجید میں کسی تغیر کا امکان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

مصحف عثمانؓ میں قرآن مجید جس انداز سے لکھا گیا آج بھی اسی انداز سے لکھا جارہا ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس طرح کے اہتمام کے بارے میں نہ تو دعویٰ کرتی ہے اور نہ ہی اس کی نظیر کہیں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں مزید لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک لفظ دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ یہ ایک طرح لکھا گیا لیکن دوسری جگہ دوسرا انداز اختیار کیا گیا ، تو آج تک دونوں مقامات پر اسی طرح مختلف طریقوں سے لکھا ہوا چلا آرہا ہے۔ کسی نے ان دونوں کو ایک انداز سے لکھنے کی نہ جرأت کی اور نہ ہی اس کا سوچا۔

اس کی ایک مثال لفظ "صلوٰۃ" ہے۔ پورے قرآن مجید حکیم میں یہ لفظ ۶۷ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن آٹھ جگہوں کے سوا باقی انسٹھ مقامات پر واؤ پر کھڑا زبر دیا گیا ہے۔ (یعنی صلوٰۃ) آٹھ مقامات پر صاد کے لام الف لکھا جاتا ہے۔ جس قدیم سے قدیم یا جدید سے جدید قلمی یا مطبوعہ نسخے کو اٹھا کر کے دیکھ لیں۔ ہم آٹھ جگہوں پر صاد کے بعد لام الف (صلاۃ) لکھا ہوا پائیں گے اور باقی انسٹھ مقامات پر واؤ پر کھڑا زبر (صلوٰۃ) پائیں گے۔ یہ آٹھ مقامات یہ ہیں۔

1. سورۃ الانعام میں ﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (1)
2. سورۃ الانعام ﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (2)
3. سورۃ الانفال ﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ ﴾ (3)
4. سورۃ بنی اسرائیل ﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾ (4)

---

(1) الانعام: 92
(2) الانعام: 162
(3) الانفال: 35
(4) بنی اسرائیل: 110

5. سورۃ مومنون ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ (1)

6. سورۃ النور ﴿ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ﴾ (2)

7. سورۃ المعارج ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ (3)

8. وسورۃ الماعون ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ (4)

قرآن حکیم کے ان مقامات کو ذہن میں رکھیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سڑسٹھ میں سے انسٹھ مقامات پر تو لکھنے والے نے "صلوٰۃ" واؤ پر کھڑا زبر دے کر لکھا۔ باقی مقامات پر اس کے برعکس لکھا۔ تو کیا یہ کاتبوں کی بھول چوک تھی یا انہیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یا مختلف قبائل کے لوگوں نے اپنے اپنے رسم الخط کے مطابق لکھ لیا۔ اس طرح کے اختلاف رسم الخط کو کاتبوں کی بھول قرار دینا، کتاب کی گستاخی بھی ہے اور قرآن کو بے اعتبار بنانا بھی۔ جب کہ قرآن حکیم میں کاتبین وحی کی " سفرۃ" یعنی ماہرین فن کتابت واملاء وانشاء اور " کرام بررۃ" یعنی اپنے ہم عصروں میں بزرگ اور اللہ کے نزدیک نیکوکار قرار دیا گیا ہے۔ (5)

اس لئے ان کے بارے میں بھول چوک کا الزام ان کے قرآن کے بیان کردہ مقام سے نیچے گرانے کی بات ہوگی۔ جہاں تک قبائل کے اختلاف رسم الخط کی بات ہے تو ان آٹھ مقامات میں سے چھ مقامات مکی سورتوں میں ہیں اور دو مقامات مدنی میں ہیں ۔یعنی انفال اور نور مدنی ہیں باقی پانچ سورتیں انعام ۔بنی اسرائیل۔ مومنون ۔ معارج ۔ اور الماعون یہ سب مکی سورتیں ہیں۔ مکہ میں کاتبین وحی صرف قریش ہی تھے۔ مدنی کاتبوں میں بھی وہی لوگ شامل تھے جنہوں نے انہی قریشی کاتبوں سے یہ فن سیکھا تھا۔ پھر انہی سورتوں میں اور دوسری جگہ بھی صلوٰۃ کا لفظ واؤ سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پوری سورت میں بلکہ ہر جگہ صلوٰۃ کا لفظ واؤ سے لکھے وہی صرف ایک جگہ لام الف سے لکھا ہے۔ باقی ان تمام سورتوں میں صرف ایک ایک جگہ ہے۔ حالانکہ انہی سورتوں میں واؤ سے صلوٰۃ کا لفظ کئی جگہ موجود ہے۔ سورۃ الانعام کا نواں رکوع ،انفال کا پہلا رکوع، بنی اسرائیل کا نواں رکوع، سورۃ نور کا آٹھواں رکوع ملاحظہ کریں، تو ذہن میں آتا ہے کہ آخر کوئی وجہ ضرور ہے کہ کاتبین وحی جو ماہرین فن کتابت واملاء وانشاء اور لوگوں میں معزز تھے، انہوں نے

---

(1) المؤمنون:2

(2) النور:41

(3) المعارج:23

(4) الماعون:5

(5) عبس:15-16

ایک ہی سورۃ میں ایک جگہ تو "صلوٰۃ" لکھا اور دوسری جگہ اسی کو "صلاۃ" لکھ ڈالا۔ آخر اس کی کوئی معقول وجہ تو ضرور ہوگی۔ اس کی وجہ واقعی بنیادی ہے۔

جہاں جہاں لفظ "صلوٰۃ" کسی ضمیر متصل کی طرف مضاف ہوئے بغیر آیا ہے ان تمام جگہوں میں واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ان آٹھ جگہوں میں جو لام الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ آٹھوں جگہیں ایسی ہیں جہاں یہ لفظ کسی ضمیر متصل کی طرف مضاف ۔

سورۃ انعام کے گیارھویں رکوع میں [1] اور مومنون [2]، معارج [3] اور الماعون [4] میں صَلَاتِهِمْ ہے اور انفال میں صَلَاتُهُمْ [5] ہے۔ یعنی ان پانچ جگہوں پر ضمیر جمع مذکر کی طرف مضاف ہے اور انعام کے بیسویں رکوع میں یائے متکلم کی طرف مضاف ہے اور بنی اسرائیل میں ضمیر واحد مذکر حاضر کی طرف، اور سورۃ نور [6] میں ضمیر واحد مذکر غائب کی طرف مضاف ہے۔ عربی زبان میں مضاف الیہ کی ضمیر بلکہ ہر ضمیر مجرور متصل ہی ہوتی ہے، منفصل نہیں ہوتی۔ تو اس اتصال ضمائر کی وجہ سے ان آٹھ جگہوں میں "صلوٰۃ" کا لفظ لام الف سے نہیں لکھا جاتا، واؤ ہی سے لکھا جاتا تو اس طرح لکھا جاتا "صلوٰتھم" ۔ صلوٰتی، صلوٰتک اور صلوٰتہ تو کیا صلوٰۃ کو صیغہ جمع سمجھ کر پڑھنے والے ان کو صلوٰتھم، صلوٰتی، صلوٰتک اور صلوٰتہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ معنوی اعتبار سے ان تمام جگہوں میں صیغہ جمع بھی بخوبی کھپ سکتا ہے۔ مگر ادبی بلاغت اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ واحد کا صیغہ بحیثیت اسم جنس ہی کے لایا جائے تاکہ قلیل کثیر دونوں پر دلالت کر سکے۔ لیکن اس باریک ادبی لطافت کو ہر پڑھنے والا نہیں سمجھ سکتا۔ قرآن حکیم تو عرب و عجم کی کتاب ہے۔ اس لئے کاتبین وحی نے ان کے صیغہ واحد کے صیغے میں ہونے کو قطعی و غیر مشتبہ بنا دیا۔

سورۃ مومنون کی دوسری آیت میں " صَلَاتِهِمْ " [7] لام الف سے لکھا ہے اس کی ساتویں آیت میں ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ [8] ہے۔ یہاں صلوٰۃ جمع کا صیغہ ہے۔ اس لئے واؤ سے

---

(1) الانعام: 92

(2) المؤمنون: 2

(3) المعارج: 23

(4) الماعون: 5

(5) الانفال: 34

(6) النور: 41

(7) المؤمنون: 2

(8) المؤمنون: 7

لکھا ہے تاکہ صیغۂ جمع ہی پڑھا جائے۔ غرض جہاں واحد و جمع دونوں کے التباس کا خطرہ نظر آیا وہاں صیغۂ واحد لفظ صلوٰۃ کو لام الف سے لکھا اور صیغہ جمع لفظ "صلوٰۃ" کو واؤ سے تحریر کیا۔

جہاں لفظاً تحریراً یا معناً التباس کا خطرہ نہ تھا، وہاں ہر جگہ صیغہ واحد کو بھی واؤ سے لکھا اور صیغہ جمع کو بھی۔ کیونکہ بغیر ضمیر سے ملائے الگ لکھیں گے تو صیغہ واحد کو گول "ۃ" سے لکھیں گے اور صیغہ جمع کو لمبی "ت" سے۔

یعنی واحد صلوٰۃ ہے اور صلوٰت جمع۔ اس لئے الگ لکھنے میں التباس کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔

البتہ ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ سورۃ انعام کے گیارہویں رکوع میں وھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون[1] میں صیغہ واحد ہی ادبی بلاغت کے اعتبار سے مناسب ہے کہ وہاں الف لام کے ساتھ صلاتھم لایا گیا اور یہاں سورۃ مومنون کی ساتویں آیت میں صیغہ جمع ہی مناسب ہے کہ صلوٰتھم بصیغہ جمع آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کلام میں معنوی خوبیاں پیدا کرنا ایک بلیغ متکلم کے لئے ضروری ہے، وہاں سلسلہ کلام میں تکرار لفظ سے بچنا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ کلام کے بلیغ ہونے کے لئے اس کے کلمات یعنی مفرد الفاظ کی فصاحت شرط لازم ہے۔ فصاحت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس عبارت کے کلمات میں تنافر نہ ہو۔ بلاغت کی لازمی شرط یہ ہے کہ ترکیب کلمات میں بھی تنافر نہ ہو۔ اور جو لفظ اسی سلسلہ عبارت میں ایک بار استعمال ہو چکا۔ اسی طرح چند جملوں کے بعد اس کا اعادہ اسی طرح ضرور باعث تنافر ہے اور سورۃ مومنون کی دوسری آیت ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ کا لفظ آچکا تھا۔ اور پھر چار ہی جملوں کے بعد ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾[2] اگر کیا جاتا تو دونوں جملوں کا عنوان بیان بھی اور صلاتھم کا لفظ بھی دوبارہ لایا جاتا تو یہ کچھ برا سا معلوم ہوتا۔ اس لئے دوسری جگہ ساتویں آیت میں بصیغہ واحد کی بجائے صیغہ جمع لایا گیا۔ باقی رہی وہ معنوی خوبی جو صیغہ واحد اسم جنس میں تھی، کہ اس کی دلالت کثیر و قلیل سب پر ہوتی ہے ایک نماز اور ایک سے زیادہ نمازیں بھی "صلوٰۃ"، صیغہ واحد سے سمجھی جاسکتی ہیں۔ مگر صیغہ جمع سے ایک ہی نہیں بلکہ دو سے بھی زیادہ ہی نمازیں سمجھی جائیں گی اور مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ نمازوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔

مذکورہ صدر تفصیل کی روشنی میں یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی متعارف رسم الخط سے اختلاف پایا گیا ہے، یقیناً اس کی کوئی وجہ معقول ضرور موجود ہے۔

---

(1) الانعام: 92

(2) المؤمنون: 7

غرض، حضرت عثمانؓ (35ھ) نے صحابہؓ کی جو کمیٹی مقرر کی تھی، انہوں نے قرآنی نسخے مرتب کرتے وقت کلمات وحروف کو لکھنے کا ایک خاص طرز وانداز اختیار کیا تھا اس کی منظوری حضرت عثمانؓ (35ھ) نے دی تھی۔ اسی رسم کو رسم المصحف یا خط عثمانی بھی کہا گیا ہے۔[1]

اس وقت سے آج تک جہاں کہیں بھی قرآن لکھا جاتا ہے، اسی رسم الخط کا التزام کیا جاتا ہے۔

علامہ عبد العزیز دباغ لکھتے ہیں کہ "قرآن مجید کا رسم الخط معجزہ ہے۔"

ان کے بیان پر جب ہم قرآن حکیم کے متن کو سامنے رکھ کر غور کرتے ہیں تو واقعی قرآنی رسم الخط معجزہ نظر آتا ہے۔ یہ بات واقعی انسانی عقل میں نہیں آتی کہ مأئۃ[2] میں الف لکھنے میں آتا ہے لیکن فئۃ میں الف نہیں لکھا جاتا۔ سورۃ الحج میں جب لفظ سورۃ السبا میں آیا ہے اس کے آخر میں الف لکھا گیا ہے مگر سورۃ الفرقان میں اس لفظ کے آخر میں الف نہیں لکھا گیا ہے مگر سورۃ الفرقان میں اس لفظ کے آخر میں الف نہیں لکھا گیا۔[3] "امنو" کے آخر میں الف لکھا جاتا ہے لیکن باؤ[4]، جاؤ[5]، تبوّو[6] اووفاو[7] کے آخر میں الف نہیں لکھا گیا۔

اسی طرح یکساں قسم کے الفاظ میں بعض جگہ ایک حرف کو حذف کیا جاتا ہے اور بعض جگہ نہیں۔ مثلاً قرآنا (سورۃ یوسف اور سورۃ زخرف) سے الف حذف کیا گیا ہے اور دیگر جگہوں پر نہیں۔ سورۃ فصلت میں سموت میں واؤ کے بعد الف لکھا ہے اور باقی جگہوں پر نہیں لکھا جاتا۔ المیعادؑ کے لفظ میں ہر جگہ الف لکھا جاتا ہے مگر سورۃ انفال میں "ف" نہیں لکھا گیا۔ سراجا میں ہر جگہ حذف کیا جاتا ہے اور بعض جگہ باقی رکھا جاتا ہے۔

سورۃ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۸ میں "قال" اسی طرح لکھا گیا ہے۔ لیکن اس سے تھوڑا ہی آگے بڑھیں تو آیات ۱۱۲ اور ۱۱۴ میں یہی لفظ قاف ممدودہ اور لام سے قال" لکھا گیا ہے، اس کی وجہ خواہ کچھ ہی ہو،

---

(1) الاتقان فی علوم القرآن: جلد 1، ص: 159

(2) البقرۃ: 259

(3) الفرقان: 21

(4) آل عمران: 112

(5) النور: 11

(6) الحشر: 9

(7) النساء: 149

لیکن اتنی بات واضح ہے کہ مسلمانوں نے اس بظاہر ہلکی غلطی کو بھی موافق قیاس بنانے کی جرأت نہیں کی کہ کہیں رسم الخط عثمانیؓ کی مخالفت نہ ہو جائے۔ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھا ہے وہ بسم اللہ ، بحذف الف لکھا ہے لیکن سورۃ العلق کے آغاز میں اقراء باسم ربک کے ساتھ لکھا گیا ہے اگرچہ پڑھنے میں دونوں ایک ہی طرح پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ مصحف عثمانیؓ میں اسی طرح لکھا گیا تھا، لہذا باجماع امت اس کی نقل اور اتباع لازم سمجھی گئی۔

مسلمانوں کی یہ کمال احتیاط ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کے لکھنے میں کوئی تصرف نہیں کیا جن کی املاء بظاہر عقل کے برعکس ہے۔ ان کی اصلاح میں کوئی حرج نہ تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو قوم رسم الخط عثمانیؓ کے اہتمام پر اس قدر پختہ ہو وہ قرآن مجید میں کسی تغیر و تبدل کو کس طرح گوارا کر سکتی تھی؟

غرض جس طرح سورتوں کے شروع میں جو حروف مقطعات ہیں، وہ بھی عظیم اسرار کی حیثیت رکھتے ہیں اور کثیر معانی کے حامل ہیں۔ مگر اکثر لوگ ان کے اسرار سے ناواقف ہیں اور ان کے مطالب و معانی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ لوگ ان سے ناواقف ہیں، قرآنی رسم الخط کا یہی حال ہے۔

علامہ زرقانی (1122ھ) مزید لکھتے ہیں:

''الدلالة على معنى خفي دقيق كزيادة الياء في كتابة كلمة "أيد" من قوله تعالى والسماء بنيناها بأيد إذ كتبت هكذا (بأييد) و ذالك للإيماء إلى تعظيم قوة الله التي بنى بها السماء وانها لا تشبهها على حد القاعدة المشهورة وهي: زيادة المبنى تدل على زيادة المعنى''(1)

"رسم الخط عثمانیؓ پوشیدہ اور دقیق معانی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً" والسماء بنیناها بأید" میں "اید" کو جب ایک یاء کا اضافہ کر کے بایید لکھا جائے تو اس سے اللہ کی عظیم قوت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جس عظمت و شان کے ساتھ اس نے زمین و آسمان بنایا۔ نیز یہ کہ وہ طاقت و قوت میں یکتا ہے۔ اس لئے کہ مشہور قاعدہ کے مطابق لفظ کی زیادتی معنیٰ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے)۔

حضرت عثمانؓ (35ھ) نے قرآن کریم کا ایک نسخہ مرتب کروا کے اس کی نقول بلاد و امصار میں رائج کروائیں تو آپؓ نے صحابہؓ کی کمیٹی کو حکم دیا تھا کہ وہ جب ان کے اور اپنے درمیان کسی لفظ کے لکھنے کے طریقے کے بارے میں اختلاف پائیں تو قریش کی زبان کے مطابق لکھا جائے۔ آپؓ نے فرمایا۔

(1) زرقانی، عبدالعظیم، مناہل العرفان: جلد 1، ص: 367؛ زرکشی، البرہان، جلد 1، ص: 457تا486

اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیئ من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فإنه إنما أنزل بلسانهم (1)

"قرآن مجید کی کتابت کے بارے میں تمہارے اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف ہو تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھو اس لئے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔"

علامہ زرکشیؒ (794ھ) نے اس سلسلے میں لفظ التابوت کی مثال پیش کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "لفظ التابوت" لکھنے میں اختلاف ہوا کہ اسے کس طرح لکھا جائے۔ زید ابن ثابتؓ نے فرمایا کہ "التابوۃ" لکھا جائے۔ قریش نے "التابوت" کہا۔ جب معاملہ حضرت عثمانؓ (35ھ) کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا "التابوت" لکھا جائے کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ (2)

یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ رسم الخط عثمانی توقیفی ہے، یا نہیں لیکن اس بات پر تمام علمائے امت کا اتفاق ہے کہ کتابت قرآن میں اس کا اہتمام ضروری ہے اس کا اہتمام کئے بغیر قرآن لکھنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"یحرم مخالفة خط مصحف عثمان فی واو ادیاء أو ألف أو غیر ذالك" (3)

"واو ہو یا الف ہو، یا یاء کسی حرف کے لکھنے میں بھی عثمانیؓ رسم الخط کی خلاف ورزی جائز نہیں)۔

امام مالک (179ھ) سے پوچھا گیا۔ یہ فرمایئے کہ آج کل اگر کوئی شخص قرآن مجید لکھنا چاہے تو آیا لوگوں کے ایجاد کردہ جدید حروف ہجا کے مطابق لکھ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا:

لا ألا علی الکتبة الأولی (4)

"میں اس کو درست نہیں سمجھتا اسے اسی طرح لکھنا چاہیے جیسے پہلے کاتبوں نے لکھا تھا۔"

علامہ زرقانی نے اقوال العلماء فی التزم الرسم العثمانی کے عنوان کے تحت علامہ سخاوی، ابو عمر والدانی، امام احمد بن حنبل، نظام الدین نیساپوری علامہ بیہقی کے اقوال نقل کئے ہیں کہ رسم الخط عثمانی کا التزام واجب ہے اور توقیفی ہے۔ (5) انہوں نے رسم الخط عثمانی کے توقیفی نہ ہونے کے بارے میں بھی علماء کے

---

(1) الاتقان، جلد اول، صفحہ 79

(2) الاتقان، جلد دوم، صفحہ 213؛ زرکشی، جلد اول، صفحہ 457، دار الفکر للطباعة والنشر والتوزیع

(3) سیوطی، جلد اول، ص: 167

(4) زرکشی: جلد 1، ص: 459

(5) زرقانی، جلد اول، ص: 372

اقوال نقل کئے ہیں لیکن یہ بحث محض اس کے توقیفی یا غیر توقیفی ہونے کے بارے میں ہے۔جو حضرات اسے توقیفی قرار نہیں دیتے ان کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے کہ قرآن کے متن کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے رسم الخط عثمانی کے مطابق ہی لکھا جائے۔[1]

آخر میں وہ خلاصہ یوں نکالتے ہیں :

''أقول: وهذا الرأى يقوم على رعاية الاحتياط للقرآن من ناحيتين: ناحية كتابته فى كل عصر بالرسم المعروف فيه، الباد للناس عن اللبس والخلط فى القرآن، وناحية البقاء رسمه الأول الماثور ''[2]

علامہ زرقانی نے اقوال العلماء فی التزام الرسم العثمانی کے عنوان کے تحت علامہ سخاوی، ابو عمر والدانی، امام احمد بن حنبل، نظام الدین نیساپوری علامہ بیہقی کے اقوال نقل کئے ہیں کہ رسم الخط عثمانی کا التزام واجب ہے اور یہ توقیفی ہے۔[3] انہوں نے رسم الخط عثمانی کے توقیفی نہ ہونے کے بارے میں بھی علماء کے اقوال نقل کئے ہیں لیکن یہ بحث محض اس کے توقیفی یا غیر توقیفی ہونے کے بارے میں ہے۔جو حضرات اسے توقیفی قرار نہیں دیتے ان کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے کہ قرآن کے متن کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ رسم الخط عثمانی کے مطابق ہی لکھا جائے۔[4]

دور حاضر کے مصنف ڈاکٹر صبحی صالح رسم الخط عثمانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وملخص هذا الرأى الاخير ان العامة لايستطيعون ان يقرؤوالقرآن فى رسمة القديمة، فيحسن بل يحب ان يكتب لهم بالاصطلاحات الشائعة فى عصرهم ولكن هذا لايعنى الغاء الرسم العثمانى القديم لأن فى الغائه تشويها لرمزدينى عظيم اجتمعت عليه الكلمة، واعتصمت به الأمة من الشقاق، ومن الممكن. مع ذالك. كما اقترحت مجلة الأزهر أن ينبه فى ذيل كل صفحة من صفحات على ماعسى أيكون فيها من الألفاظ المخالفة للاصطلاح الحديث فى الخط والاملاء ''[5]

---

(1) ایضاً، ص:373تا379

(2) زرقانی: جلد 1 ،ص: 374-378

(3) زرقانی، جلد1، ص:372

(4) ایضاً، صفحہ 373-379

(5) صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن: ص 280

"عوام الناس قدیم رسم الخط میں پڑھ نہیں سکتے۔ اس لئے مستحسن بلکہ ضروری ہے کہ ان کے لئے قرآن کریم کو جدید رسم الخط میں شائع کیا جائے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عثمانی رسم الخط کو گلدستہ طاق نسیان بنادیا جائے۔ کیونکہ اس کے مٹانے سے ایک ایسے دینی شعار کا محو ہونا لازم آتا ہے جس پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اور جس کی وجہ سے امت افتراق وانتشار کا شکار ہونے سے بچ گئی۔ ملت اسلامیہ میں ہر وقت ایسے علماء موجود رہے ہیں جو عثمانی رسم الخط میں اس دقیق فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ مجلہ ازہر میں لکھا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے جو نسخے شائع کئے جائیں ان کے ہر صفحہ پر جن کے الفاظ کا انداز تحریر عصر حاضر کے رسم الخط اور طرز املاء سے مختلف ہو، حاشیہ پر اس کی وضاحت کر دی جائے۔"

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ (1176ھ) فرماتے ہیں:

"لہٰذا محققین علماء بآں رفتہ اند کہ در صلوٰت وغیرہ آں خواندہ نشود مگر قرأت متواترہ۔ وقرأت متواترہ آں است کہ دروی دو شرط بہم آیند۔ یکے آں کہ سلسلۂ روایت آں ثقہ عن ثقہ تا صحابہ کرام رسد نہ مجرد متحمل خطے۔ دوم آں کہ خط مصاحف عثمانیہ محتمل آں باشد۔ زیرا کہ چوں صورت حفظ آں قدوین بین اللحوحین وجمع است براں مقرر شد۔ برچہ غیر آنست غیر محفوظ است۔ وہرچہ غیر محفوظ است غیر قرآن است۔ لان اللہ تعالیٰ قال: ﴿وإنا له لحفظون﴾ وقال: ﴿إن علينا جمعه وقرآنه﴾"(1)

لہٰذا محققین علماء کی رائے ہے کہ نماز میں قرأت متواترہ کے علاوہ کسی قرأت کی تلاوت نہ کی جائے۔ اور قرأت متواترہ وہ قرأت ہے کہ جس میں دو شرائط پائی جائیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ اس کا سلسلہ ثقہ راویوں کے ذریعے صحابہ کرامؓ تک پہنچتا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ رسم الخط عثمانی کے مطابق ہو۔

ایک تیسری شرط یہ بھی ہے کہ یہ عزلی قواعد کے مطابق بھی ہو۔ جس قرأت میں ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو وہ شاذ قرأت کہلائے گی اور شاذ قرأتوں کو امت میں سے کسی نے بھی معتبر قرار نہیں دیا۔

مذکورہ بالا تمام تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا اہتمام اس انداز سے کیا گیا کہ اس میں کسی تغیر کا امکان بعید از قیاس ہے۔

"صحابہ کرامؓ اور تابعین کے طرز عمل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح قرآن مجید میں عربی زبان کی حفاظت ضروری ہے کسی عجمی زبان میں، عربی متن کے بغیر قرآن مجید کی کتابت کو جائز قرار نہیں دیا گیا۔ اسی طرح عربی لکھتے ہوئے رسم الخط کی حفاظت بھی ضروری سمجھی گئی ہے۔ مسلمانوں نے ایک

---

(1) شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخلفاء، جلد 2، ص: 5

ہی رسم الخط کا التزام اس لئے کیا کہ اگر مختلف رسوم الخط میں قرآن لکھنے کی اجازت دے دی جاتی تو قرآن میں ایک زمانہ گزرنے کے بعد تحریف کا دروازہ کھل جاتا۔ اس لئے باجماع امت رسم الخط عثمانی کے علاوہ کسی اور خط میں لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔"

ابتدائے اسلام میں جب اسلام عجمی علاقوں میں پھیلا تو اس وقت اسی رسم الخط سے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے روانہ کئے گئے۔ اسی کو رواج دیا گیا۔ اس وقت اس بات کی کس قدر ضرورت ہو گی کہ ہر ملک کے رسم الخط میں قرآن لکھوا کر ان کے پاس بھیجے جاتے تاکہ وہ آسانی سے قرآن پڑھ سکیں لیکن مسلمانوں نے جس طرح قرآن کے معانی والفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم الخط کی بھی مصحف عثمانی کے مطابق حفاظت کرنا ضروری سمجھا۔ (1)

حفاظت قرآن کے ضمن میں مسلمانوں کی اس احتیاط کے علاوہ، احتیاط کی ایک انتہا یہ بھی ہے کہ، باوجود اس بات کے کہ عربی رسم الخط میں زیر زبر وغیرہ حرکات اگرچہ کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود علمائے سلف کے ہاں اس بارے میں اختلاف رہا ہے کہ قرآن کی عبارت پر یہ حرکات لکھنا بھی جائز ہے یا نہیں۔ بعض نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ بعض نے مشکلات کے حل کے لئے یہ حرکات لکھنے کی اجازت دے دی۔ علامہ دانی جو رسم الخط قرآنی کے سلسلے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ یہ اعراب اور نقطے سرخ روشنائی سے لکھے جائیں۔ تاکہ قرآن کی اصل عبارت سے ممتاز رہیں۔ دوسری طرف امام نووی (1377ھ) اور جمہور علماء نے اس کی مطلقاً اجازت دی ہے کہ قرآن کے متن کے ساتھ ہی اعراب و حرکات لگائے جائیں۔ کیونکہ عربی رسم خط میں اعراب مستقل جداگانہ چیز ہے۔ اس کا اختلاط کلمات و حروف کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ (911ھ) نے تفصیل کے ساتھ الاتقان میں بھی بحث کی ہے۔ (2)

عثمانی رسم الخط کو کتابت قرآن مجید کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس کا التزام کس طرح کیا گیا، اسے ہم ایک مقدمہ کی مثال کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔

۱۳۵۹ھ میں "جمیعۃ الاسلام" صوبہ متحدہ ناظر باغ کانپور سے یہ استفسار کیا گیا کہ قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

اس کے بارے میں دیگر علماء سے بھی فتویٰ طلب کیا گیا۔ (3) دیوبند میں یہ مسئلہ مجلس علمی میں پیش

---

(1) الاتقان، 213/2

(2) ایضاً

(3) مقدمے کی تفصیلات کے لیے، عبدالکریم، مولانا، تحذیر الانام عن تغیر رسم الخط من مصحف الامام، مدراس، ص: 14

کیا گیا۔اس مجلس کے صدر مولانا حسین احمد مدنی (1377ھ) تھے جو دارالعلوم دیو بند کے شیخ الحدیث تھے۔انہوں نے اس بارے میں لکھا

ہندی رسم الخط میں بہت سے حروف نہیں ہیں جو عربی زبان اور قرآن میں پائے جاتے ہیں۔اور اسی لئے ہندی میں ان کے لئے کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی۔(مثلاً ذ۔ز۔ظ۔ض) ان حروف کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے۔حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بدل جاتے ہیں۔اس لئے قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں لکھنا قرآن میں تحریف ہو گی جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے۔ (1)

یہ فتویٰ پوری مجلس علمی کے اتفاق رائے سے لکھا گیا۔اس مجلس میں مندرجہ ذیل اکابرین شریک تھے۔

مولانا حسین احمد مدنی (1377ھ)	صدر مدرس دارالعلوم دیو بند
مولانا سید اصغر حسین	محدث دارالعلوم دیو بند
مولانا شبیر احمد عثمانی (1949ء)	شیخ الحدیث والتفسیر دارالعلوم، دیو بند
مولانا قاری محمد طیب	مہتمم دارالعلوم، دیو بند
مولانا اعزاز علی	مدرس دارالعلوم دیو بند (2)

ان کے علاوہ اس فتوے کی تصدیق دیگر کئی ایک اکابر علماء نے کی ہے۔ان بزرگوں میں سے ایک بزرگ مفتی فاروق احمد ہیں جو دارالعلوم کے مفتی تھے، لکھتے ہیں:

"رسم الخط عثمانی کا التزام ضروری ہے۔اور اس کی مخالفت حرام ہے۔"

مفتی صاحب موصوف نے الاتقان کے حوالہ جات بھی دیے ہیں جن میں رسم الخط عثمانی کی مخالفت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ (3)

مدراس کے قاضی محمد حبیب اللہ نے اپنے فتوے میں لکھا:

"قرآن مجید میں مصحف عثمانیہ کے موافق جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے سیدھی جانب سے لکھنا چاہیے۔اس پر آج تک تعامل اور اجماع امت ہے۔اس کے برعکس یعنی بائیں جانب سے لکھنا جائز نہیں۔" (4)

مولانا قاضی حبیب اللہ نے "نثر المرجان فی رسم الخط القرآن" کا حوالہ دیا ہے۔

---

(1) ایضاً، ص: 14

(2) ایضاً، ص، 14

(3) الاتقان، 213/2

(4) ایضاً

وہ لکھتے ہیں :

''لایجوز مخالفة المصاحف العثمانية فی الکتابہ''(1)

''یعنی قرآن مجید لکھتے وقت رسم خط عثمانی کی مخالفت جائز نہیں ہے۔''

ان حضرات کے علاوہ جن علماء نے اس فتوے پر تصدیقی دستخط ثبت فرمائے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مولانا مسعود احمد۔	دیوبند
مولانا محمد ادریس کاندھلوی	مدرس دارالعلوم دیوبند
مولانا سید احمد علی سعید	نائب مفتی دارالعلوم دیوبند
مولانا بشیر احمد	مدرس دارالعلوم دیوبند (2)

ان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی مولانا فاروق احمد، مدراس کے قاضی مولانا محمد حبیب اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا محمد غنی مدنی، حافظ محمد اسماعیل، مولانا محمد علی مدنی، مولانا عبد العزیز، مولانا عبد الرزاق، مولانا محمد حسن نے بھی دستخط ثبت فرمائے۔ (3)

مولانا عبد الغنی نے لکھا :

''فان الکتابة بخلاف المصاحف العثمانية بدعة مذمومة وفعل شنيعة باتفاق الأمة''(4)

''بے شک مصحف عثمانی کے رسم الخط کے برخلاف قرآن مجید لکھنا ایک ایسی بدعت ہے جس کی مذمت کی گئی ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ناپسندیدہ فعل ہے۔''

مذکورہ بالا فتویٰ پیش کرنے سے ہمارا مقصود یہ تھا کہ اس سے اندازہ کیا جاسکے کہ مسلم قوم نے رسم الخط عثمانی کے اہتمام کو جس قدر لازم سمجھا اور اس رسم الخط کے اہتمام کا اس قدر التزام کیا تو وہ کس طرح اپنی کتاب میں تحریف گوارا کر سکتی تھی۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ ٹامل زبان کے حوالے سے بھی پیدا ہوا۔ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ کیا قرآن

---

(1) ایضاً

(2) جواہر، ص: 91

(3) ایضاً: ص 93-94

(4) ایضاً: ص 93

مجید کو عربی میں ٹامل رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے ؟اس سلسلے میں مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے ایک رسالہ تحریر فرمایااس کا مدلل جواب لکھا گیا۔اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مصحف عثمانی میں ردوبدل باجماع امت حرام ہے۔ٹامل زبان میں بہت سے ایسے حروف موجود نہیں جو قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ٹامل زبان میں ذ۔ز۔ض۔ظ موجود نہیں اور انہیں ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ قرآن میں ان حروف کے بدل جانے سے معانی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔اس فتویٰ کی تفصیلات تحذیر الانام میں موجود ہیں۔ (1)

یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصحف عثمانیؓ کا رسم الخط تو اب موجود نہیں ہے۔کیونکہ مصحف عثمانیؓ میں خط کوفی تھا۔اسی خط میں قرآن مجید کی کتابت ہوئی۔موجودہ عربی رسم الخط ، جسے خط نسخ کہا جاتا ہے،کوفی رسم الخط سے تو بہت مختلف ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ کوفی رسم الخط اور خط نسخ دراصل دونوں عربی رسم الخط کی شکلیں ہیں۔ دونوں میں رسم خط کا کوئی تفاوت نہیں ہے۔

احمد حسن زیات لکھتے ہیں کہ دنیا میں خط وکتابت کی اصل فینیقی خط ہے۔جس سے سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں مختلف قسم کے خط اخذ کئے گئے اور رائج ہوئے۔خط سند اور آرامی اور ان کی تمام اقسام اسی سے پیدا ہوئیں۔پھر آرامی سے حوران میں خط نبطی اور عراق میں خط سریانی پیدا ہوئے۔اور یہی دونوں خط ،عربی خط کی اصل ہیں۔خط نبطی سے خط نسخ پیدا ہوا اور خط سریانی سے کوفی رسم الخط پیدا ہوا۔جو اسلام سے قبل خط حیری کے نام سے مشہور تھا۔شمالی عرب کے لوگوں نے عموماً خط نسخ اختیار کیا کیونکہ ان کی آمدورفت شام میں زیادہ رہی اور جنوبی عرب کے لوگوں نے انبار سے خط کوفی اختیار کیا۔ (2)

اس سے معلوم ہوا کہ خط کوفی اور خط نسخ دونوں عربی رسم الخط ہی کی دو صورتیں ہیں۔جس طرح اردو میں نستعلیق اور شکستہ دو قسمیں معروف ہیں۔جس طرح نستعلیق کو بدل کر شکستہ یا شکستہ کو بدل کر نستعلیق میں لے آنا، رسم الخط کا بدلنا نہیں ہے اسی طرح خط کوفی کی بجائے نسخ یا نسخ کی بجائے کوفی کے استعمال کو بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ رسم الخط کا تغیر نہیں ہے۔ (3)

ان میں صرف الفاظ و حروف کی ہیئت اور نشست کا فرق ہے۔اس ظاہری فرق، تفاوت کے بارے میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

---

(1) ایضاً،ص: 73-88

(2) احمد حسن زیات، تاریخ الادب العربی، ص: 13،مطبعہ الرسالۃ، گیارہواں ایڈیشن

(3) تحذیر، ص: 12

"قلت والذی کان یغلب علی زمان السلف الکتابة المکتوبة ثم هذبها علی بن مقلة الوزیر وصار له فی ذالك نهج واسلوب ثم قربها علی بن هلال البغدادی المعروف بابن البواب، وسلك الناس وراءه وطریقته فی ذالك واضحة جیدة"[1]

میں کہتا ہوں کہ سلف کے زمانے میں عام عادت کوفی رسم الخط میں لکھنے کی تھی پھر علی بن مقلہ نے اسے کچھ خوبصورت بنادیا۔ اور اس میں ان کا ایک خاص طرز تحریر ہو گیا۔ پھر علی بن ھلال نے اس کو اور زیادہ خوبصورت بنادیا اور عام لوگ اسی طرز پر چل پڑے اور ان کا یہ طرز واضح اور عمدہ ہے۔

حفاظت و صحت قرآن کے سلسلے میں "رسم الخط عثمانی" کی حفاظت اور کتابت قرآن مجید میں اس کا نہایت محتاط اور سختی سے اہتمام، ایک ایسی دلیل ہے جس کی موجودگی میں بلاخوف تردید، یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس قوم نے اپنی کتاب کے رسم الخط میں اس طرح کی احتیاط کا اہتمام کیا ہو، بھلا وہ اس میں کسی قسم کی تحریف کو گوارہ کر سکتی ہے۔

رسم الخط عثمانی کا التزام اور غیر عربی زبان میں کتابت قرآن کی ممانعت

متن قرآن کی حفاظت کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو حفاظتی اقدامات کئے ہیں ان میں سے ایک اقدام یہ ہے کہ علمائے امت نے متفقہ طور پر غیر عربی زبانوں میں متن کے بغیر، محض ترجمہ شائع کرنا حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح صرف ترجموں کی تلاوت اور قرأت بھی حرام ہے۔

امام اعظمؒ کا نقطہ نگاہ حسامی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"فالقرآن المنزل علی الرسول المکتوب فی مصاحف المنقول عنه نقلا متواتر بلاشبه وهو النظم والمعنی فی قول العامة العلماء وهو الصحیح من مذهب أبی حنیفة"[2]

"قرآن وہ ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوا۔ اور مصاحف عثمانیہ میں مکتوب ہے اور بلاشک وشبہ متواتر نقل کے ساتھ آپ ﷺ سے منقول ہے اور قرآن نظم اور معنیٰ دونوں کا نام ہے۔ عام علماء کا یہی قول ہے اور امام ابو حنیفہؒ (150ھ) کے مذہب میں یہی صحیح ہے۔"

حسامی کے حاشیہ پر لکھا ہے:

"حرم کتابة المصحف بالفارسیة"[3]

---

(1) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد چہارم، صفحہ 15، (فضائل القرآن۔ ذیل ابن کثیر) دار الفکر

(2) بحوالہ تحذیر: 8

(3) ایضاً: ص 8

فارسی زبان یا رسم خط میں قرآن لکھنا حرام ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) فرماتے ہیں:

''تحرم قراءته بغیر لسان العرب'' (1)

قرآن مجید کو عربی متن کے بغیر پڑھنا حرام ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''النفحة القدسیة فی احکام قرائة القرآن وکتابة بالفارسیة'' ہے۔

اس کتاب میں موصوف نے مذاہب اربعہ کی مستند کتابوں سے آئمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ غیر عربی زبان میں قرآن کا لکھنا حرام ہے اور اسی طرح غیر عربی رسم الخط میں اس کی کتابت ممنوع ہے۔ (2)

علامہ حسن شرنبلالی کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ علمائے امت اور آئمہ مجتہدین کے ہاں رسم الخط عثمانی کا لزوم کس طرح ضروری سمجھا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وأما کتابة القرآن بالفارسیة فقد نص علیها فی غیر ما کتاب من کتب ائمتنا الحنفیة المعتمدة منها ما قال مؤلف الهدایة الامام المرغینانی فی کتابة التجنیس والمزید مالصه ویمنع من کتابة القرآن بالفارسیة بالإجماع لانه یؤدی للا خلال بحفظ القرآن لانا امرنا بحفظ النظم المعنی فإنه دلالة علی النبوة ولانه ربما یؤدی إلی التعاون بامر القرآن ومنها مافی معراج الدرایة انه یمنع من کتابة المصحف بالفارسیة المنع وانه یکون معتمدة زندیقا۔ ثم ذکر مثله من الکافی وفتح القدیر للمحقق ابن الهمام ثم قال وقد افاد شیخ الاسلام العلامة ابن حجر العسقلانی الشافعی فی فتاوه تحریم الکتابة وقد سئل هل تحرم کتابة القرآن الکریم بالعجمیة کقراءته فاجاب بقوله قفیة مافی المجموع الاجماع علی التحریم وذکر التوجیه له وقال فی محل آخر قبل هذا مالضه، قال الزرکشی ولین تطییبه وجعله علی کرسی وتقبیله ویحرم مرالرجل الی شیء من القرآن او کتب العلم ویحرم ایضاً کتابه بقلم غیر العربی (ثم قال ابن حجر) وفی کتابة القرآن العظیم بالعجمی تصرف فی الفظ المعجز الذی حصل التجدی به بمالم یرو (الی قوله) لأن الألفاظ العجمیة فیها ولیشوش الفهم وقد صرحوا بان

(1) سیوطی: ج2ص168

(2) بحوالہ تحذیر: ص9

الترتيب من مناط الاعجاز وهوظاهر في حرمة تقديم الآية على اٰية يعنى أو كلمة على كلمة كتقديم المضاف إليه على المضاف ونحوه مما يحرم ذالك قراءة فقد صرحوا بان الكتابة بعكس السور مكروهة وبعكس الآيات محرمة وفرقوابان الترتيب السور على النظم المصحفي فطنون وترتيب الأيات قطعى. وزعم ان كتابته بالعجمية فيها سهولة للتعليم كذب مخالف للواقع والمشاهدة فلايلفت لذالك على انه بوسلم صدقة لم يكن مبيحا لاخراج الفاظ القران عما كتب عليه واجمع عليه السلف والخلف ''(1)

ترجمہ: لیکن قرآن مجید کی کتابت فارسی زبان میں کرنے کے بارے میں، کسی ایک کتاب میں نہیں بلکہ بہت سی کتب میں جو ہمارے آئمہ حنفیہ کے نزدیک مستند ہیں اس کی تصریح موجود ہے۔ منجملہ ان کے وہ ہے جو صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب "تجنیس" اور "مزید" میں فرمایا ہے۔ جس کی عبارت یہ ہے:

"اور فارسی میں کتابت قرآن سے باجماع منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ حفاظت قرآن میں خلل ڈالنے کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ہم قرآن مجید کے الفاظ اور معنیٰ دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں۔ کیونکہ الفاظ بھی ثبوت کی دلیل ہیں اور الفاظ کے بدلنے سے (اگرچہ معنیٰ نہ بدلیں) قرآن مجید کی حفاظت میں سستی پیدا ہوتی ہے ان میں سے ایک عبارت "مواج الدرایہ" میں ہے کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کرنا چاہیے۔ اور یہ کہ ایسا کرنے والا زندیق (بے دین) ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کا مضمون کافی اور فتح القدیر نے نقل کیا ہے (پھر فرمایا)

اور شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (852ھ) نے اپنے فتاویٰ میں ارشاد فرمایا ہے جب کہ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کی کتابت عجمی (زبان یا رسم خط) میں حرام ہے جیسا کہ اس کی تلاوت و قرأت عجمی زبان میں حرام ہے تو فرمایا کہ کتاب مجموع کا فیصلہ اس بارہ میں یہ ہے کہ اس کی حرمت پر اجماع ہے اور اس کی وجوہ بھی بیان فرمائی ہیں اور اس سے پہلے ایک جگہ فرمایا ہے کہ امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ (794ھ) فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کو معطر رکھنا اور کسی اونچی چیز مثلاً رحل وغیرہ پر رکھنا اور اس کو بوسہ دینا مسنون ہے اور قرآن کے کسی جزو کی طرف پاؤں پھیلانا حرام ہے۔ نیز غیر عربی رسم خط میں اس کی کتابت کرنا بھی حرام ہے۔

(اس کے بعد فرمایا) اور قرآن عظیم کو کسی غیر عربی رسم خط میں لکھنا اس کے الفاظ میں جن کے

(1) بحوالہ تحذیر، ص: 9-10

ذریعے تمام دنیا کے کفار کو چیلنج کیا گیا ہے، ان میں غیر مشروع تغیر کرنا ہے۔ کیونکہ عجمی الفاظ میں مضاف مقدم ہوتا ہے مضاف الیہ پر اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جو نظم قرآنی میں خلل انداز اور معنیٰ سمجھنے میں تشویش پیدا کرنے والی ہیں۔

علماء نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب حروف و کلمات اور ترتیب آیات بھی مدار اعجاز ہیں۔ اور اس سے ظاہر یہ ہے کہ ایک آیت کو دوسری آیت پر بلکہ ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ پر (کتابت میں) مقدم کرنا حرام ہے۔ جیسا کہ تلاوت میں یہ تقدیم و تاخیر حرام ہے۔ کیونکہ علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ کتابت قرآن سورتوں کی ترتیب بدل کر کرنا مکروہ ہے۔ اور آیات کی ترتیب بدل کر حرام ہے۔ اور وجہ فرق یہ ہے کہ سورتوں کی (موجودہ) ترتیب جیسی مصحف امام میں ہے اس کا من اللہ ہونا تو ظنی ہے لیکن آیات کی موجودہ ترتیب قطعی ہے۔ اور یہ گمان کرنا کہ عجمی (زبان یا رسم خط) میں تعلیم کی سہولت ہے تو یہ غلط اور مخالف واقع ہے۔ اور خلاف مشاہدہ ہے اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں اگر اس کا سچ ہونا بھی تسلیم کر لیا جائے تو تب بھی قرآن کے الفاظ کا ان کی اجمالی صورت اور قدیم طرز کتابت سے نکالنا اس مصلحت کی وجہ سے جائز نہیں ہو سکتا۔)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (852ھ) کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے۔ اور اگر صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سہولت کی خاطر قرآن کی تبدیلی و تغیر جائز نہیں ہو سکتی۔

حنابلہ کے مشہور امام ابن قدامہ (620ھ) کی کتاب "المغنی" کے حواشی میں اس بات کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ

وهوإنما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة وإنما كان تبليغة والدعوة إلى الإسلام والانزار به كما أنزل الله تعالى لم يترجم النبي ﷺ ولا اذن بترجمتة ولم يفعل ذالك الصحابة ولاخلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي ﷺ كتبه إلى قيصر وكسرىٰ و مقوقس بالغاتهم لصح التعليل الذعلل به [1]

"اور قرآن مجید عربی میں نازل ہوا۔ جیسا کہ قرآن کی متعدد آیات میں تصریح موجود ہے اور اسی عربی میں قرآن کی تبلیغ اور انذار و دعوت عمل میں آیا حضور ﷺ نے اس کا ترجمہ کر کے نہیں پہنچایا۔ اور نہ ترجمہ کر کے پہنچانے کی اجازت دی۔ اور نہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا۔ اور نہ

(1) ابن قدامہ، المغنی، جلد 1، ص: 486

خلفائے اسلام اور سلاطین اسلام نے ایسا کیا۔ اور اگر نبی کریم ﷺ اپنے خطوط قیصر و کسریٰ کے نام، ان ہی کی زبانوں میں لکھواتے تو یہ دلیل صحیح مانی جاسکتی تھی کہ عجم کو عجمی زبان میں پہنچانا زیادہ مفید ہے۔"

جب سے قرآن مجید اس دنیا میں آیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی، کہیں ایک واقعہ بھی مذکور نہیں کہ حضور ﷺ نے عجمیوں کی وجہ سے (ان کی سہولت کی خاطر) قرآن کا ترجمہ کر کے بھیجا ہو۔ یا قرآن کو کسی سہولت کی خاطر عجمی رسم الخط میں لکھوایا ہو۔ حضور ﷺ کے مکاتیب جو ملوک عجم کسریٰ، قیصر اور مقوقس کو بھیجے گئے ان میں سے خطوط چھپ چکے ہیں۔ [1]

اس سلسلے میں علمائے امت نے اس بات پر اجماع صادر فرمایا ہے کہ قرآن کی تحریر کے لئے کسی اور زبان کا اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (1176ھ) لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ قرآن کی جمع و ترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ اور ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾۔ لیکن اس وعدہ الٰہیہ کے ظہور اور حفاظت کا طریق کار ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور نہ اس طرح کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہو جاتا۔ جو مٹانے سے نہ مٹ سکے۔ بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع و تدوین کی خدمت انجادیں اور تمام دنیا کے لوگ ایک نسخہ پر جمع و متفق ہو جائیں اور ہمیشہ مسلمانوں کی عظیم جماعتیں اس کی تلاوت میں مشغول رہیں تاکہ تواتر کے سلسلہ ٹوٹ نہ جائے اور اس کی تکمیل اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے سے، صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کے ساتھ، تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کر لیا گیا۔ جس میں شاذ قراءتیں نہیں لی گئیں بلکہ قراءت متواترہ لی گئیں۔ اور قبائل عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل ہوا تھا، ایک زبان، لغت قریش لی گئی اور باقی لغات کے مصاحف متروک کروائے گئے جن کا کہیں نام و نشان نہیں رہا۔ [2]

شاہ صاحب کی اس عبارت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جس قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے وہ مصحف عثمانیؓ کی شکل میں اس وقت موجود ہے۔ یہی قرآن محفوظ من اللہ ہے اگر حفاظت خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی تو دوسرے لغات کے مصاحف کا تلف کرنا کسی انسان کے بس

(1) ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب الوثائق السیاسیۃ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

(2) شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء: جلد 2، ص: 5

میں نہ ہوتا۔ لہٰذا مصحف عثمانیؓ ہی قرآن ہے۔

مستشرق ولیم میور (1905ء) معترف ہے کہ دیگر کتب مقدسہ میں تو تحریف ہو چکی ہے لیکن قرآن مجید کا معاملہ ان کتابوں سے مختلف ہے۔ اس کی حفاظت کی ساری تاریخ پر اس نے اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بات تسلیم کی ہے کہ قرآن کی حفاظت کا اہتمام جس انداز سے کیا گیا، ہماری کتابیں اس کی مثال پیش نہیں کر سکتیں۔ آئندہ سطور میں ہم مستشرق مذکور کے طویل بیان کا حصہ نقل کریں گے تاکہ اس کے اعتراف حقیقت کا سب کو علم ہو جائے۔

ان اعترافات کا ذکر وہ یوں کرتا ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا اہتمام شروع دن سے ہی کیا گیا۔ اس کے الفاظ میں :

But the preservation of the Koran during the life time of Mohomet was not dependent or any such uncertain archives. The devine revelation was the corner stone of Islam. The racital of a passage formed an essential part of every celeberation of public worship, and its private persual and repitition was enforced as a duty and a privilage, fraughat with a richest religious merit. This is the universal voice of early tradition and may be gathered from the revelation itself. The Koran was accordingly committed to memory more or less by every adherent of Islam, and the extent to which it could be recited was reckoned one of the chief distinations of nobility in the early Moslim Empire. The custom of Arabic favoured the task. Passionately fond of poetry, yet possesed of but limited means and skill in committing to writing the effusion of thair bards, the arabs had long been habituated to imprint them on the living tallts of theirs hearts.

The recollective faculty was thus cultivated to the highet

pitch and it was applied, with all the ordour of an awakened Arabs spririt, to the Koran. Such was the of their memory, and so great their power of application, that several of Mohamats folloewers, according to early tradition, could, during his life time, rapeat with accuracy the entire revelation. (1)

ولیم میور (1905ء) کے اس طویل اقتباس سے مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

1. عہد نبوی ﷺ میں قرآن محض متفرق و منتشر لکھے ہوئے ٹکڑوں پر ہی نہ تھا۔
2. وحی الٰہی مسلمانوں کی زندگیوں کی بنیاد تھی۔
3. نمازوں مین قرآن باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا ہر مسلمان کا فرض قرار دیا گیا ہے۔
4. قرآن اس وقت بہت سے لوگوں کے حافظوں میں موجود تھا۔
5. اس وقت لوگوں کی عزت اور قدر و منزلت کا معیار یہ تھا کہ کس کو کتنا قرآن زبانی یاد ہے۔
6. عرب اس بات کے عادی تھے کہ اشعار اور خطبات ان کی زبانی یاد ہوتے تھے۔
7. ان کی قوت حافظہ غیر معمولی ہوتی تھی۔
8. قرآن کے ساتھ ان کا لگاؤ بھی انتہاء کا تھا۔ اور وہ اسے سرگرمی کے ساتھ حفظ کرنے لگ گئے۔
9. ان کی قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے اندر ہی وحی الٰہی کمال صحت کے ساتھ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو گئی تھی۔

ولیم میور (1905ء) نے وضاحت کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ قرآن مجید عہد نبوی ﷺ میں لکھا گیا تھا۔ اور عربوں نے کمال کا حافظہ رکھنے کے باوجود محض اسی پر اکتفا نہیں کر لیا کہ اسے حافظوں میں محفوظ کر لیا بلکہ اسے پورے اہتمام کے ساتھ لکھ بھی لیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

However, the retative. oral memory, we should have still regarded with distrust a transcript made entirely from that source. But there is good reason for believing that may fragmentary copies, ambracing among them the whole

(1) Muir I,I/V

Koran,or nearly the whole, were made by Mohomats followers during his life..............

The ability being thus possessed, it may be safely inferred that what was so indefatigally committed to memorywould committed carefully to writing. (1)

اس سلسلے میں میور (1905ء) مزید لکھتا ہے

ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قبیلہ مسلمان ہوتا تھا تو محمد ﷺ کی عادت تھی کہ اپنے اصحاب میں سے کسی ایک یا دو کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے کہ ان کو قرآن اور ضروریات دین کی باتیں سکھلادیں۔ اور اکثر خبر ملتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ مذہبی امور کی تعلیم کے لئے تحریریں لے جایا کرتے تھے۔ پس لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ساتھ قرآن کی سورتیں بھی لے جایا کرتے ہوں گے۔ خاص طور پر وہ اجزاء جن پر مذہبی رسوم موقوف ہوتی تھیں اور اکثر نماز میں پڑھی جاتی تھیں۔ (2)

قرآن مجید کے اندر جو تصریحات ہیں کہ یہ لکھا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ ایک اور صحیح روایت ہے کہ جس میں (حضرت عمرؓ) کے ایمان لانے کی کیفیت کی روایت بیان کی گئی ہے، قرآن مجید کی بیسویں سورت کی نقل کا تذکرہ ہے یہ اس زمانے کا ذکر ہے جو ہجرت سے چار برس پہلے گزرا۔ تو اگر اس قدر اہتمام اس ابتداء کے دور میں موجود تھا تو کیا بعد میں جب مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہو گئی، قرآن کی حفاظت کا اہتمام نہ کیا ہو گا؟ (3)

قرآن مجید کے غیر محرف ہونے کے بارے میں ولیم میور (1905ء) لکھتا ہے:

We may upon the strongest presumption affirm that every verse of the Koran is genuine and unaltered composition of Mahomet himself, and conclude with at least a close approximation of the verdict of Vanhammer(4).

---

(1) IBID, I/VIII,IX

(2) IBID, I/VIII,IX

(3) IBID, I/VIII,IX

(4) IBID, I/XXVII

مضبوط ترین مفروضوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا ہر لفظ اصلی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اس کا متن وحی ہے جو محمد ﷺ نے اکٹھا (تیار) کیا تھا اور یہ Vanhammer کے بیان اور اس کے بیان کردہ نتیجہ کے قریب ترین ہے۔

اس سلسلے میں وہ مزید لکھتا ہے:

> and the various editions of the Koran assert the same miraculaus privilage of an uniform and uncorruptable text.[1]

"اور قرآن کے مختلف ایڈیشن (حضورؐ کے عہد میں موجود اوراق، عہد صدیقی کا نسخہ، عہد عثمانی کا مصحف یا مختلف صحابہ کے پاس موجود مصاحف) ایک معجزبات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان سب نسخوں کا متن ایک جیسا اور غیر متبدل ہے۔"

ولیم میور (1905ء) کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ عہد عثمانؓ میں تیار کیا جانے والا نسخہ ہم تک بلا تحریف پہنچا ہے

اس کے الفاظ میں

> The recension of Othman has been handed down to us unaltered. So carefully, indeed, it has been preserved, that there is no variation of importance, we might almost say no variation at all among the innumerable copies of the Koran scatrered thougout the vast bounds of the empire of Islam. contending and embitted factions, taking their rise in the murder or Othman himself within a quarter of a century from the death of Mohomet, have ever since sent the Mahometan world.Yet about one Koran, has always been current amongst them, and the consentaneous use by all to the present day of the same seripture, is an proof that we

(1) IBID, I/XXVII

have now before us the very text proper by the commander of the unfortunate caliph. These are probably in the world no other work which has remained twelve centuries with so pure a text. (1)

”حضرت عثمان کا نسخہ بغیر کسی تبدیلی کے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ اس احتیاط سے محفوظ کیا گیا تھا کہ اس میں اصل کے مقابلے میں کوئی اہم ردوبدل نہیں ہوا۔ ہمیں اسے کوئی اہم تبدیلی نہیں سمجھنا چاہیے جو اس نسخہ میں ان نسخوں کے مقابلے میں تھیں جو نسخے وسیع و عریض اسلامی مملکت میں پھیل چکے تھے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ حضرت عثمان کے خلاف جب جتھہ بندی کی گئی تو اس کا کہیں ذکر نہیں ہوا۔“

اسی جگہ وہ VON HAMMER کے الفاظ نقل کرتا ہے:

That we hold the Koran to be as truly Mahomet word, as the Mahometans hold it to be the word of God. (2)

ہم قرآن کو محمد ﷺ کے حقیقی الفاظ مانتے ہیں جبکہ محمڈن انہیں اللہ کا کلام کہتے ہیں۔ گویا یہ بات الگ ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں لیکن کم از کم یہ تو مان رہے ہیں کہ محمد ﷺ نے جو کچھ دیا وہ اسی شکل میں موجود ہے۔

ایک اور مستشرق Menezes اس موضوع پر یوں اظہار خیال کرتا ہے۔

The pious venetration with which the whole body of the Musalmans form the very regarded his revelations as the word of God, the devotion with which they committed them to memory and the evidedce that Transcripts exited even from an early period of Muhammad's minisrty, combined with the fact that zaid's collection came into immediate and unquestionable use, all have no doubt in the mind that the Quran contains the very words delivered by the

---

(1) IBID, I/XIV,XV

(2) IBID, I/XXVII

Prophet.[1]

وہ مذہبی تقدس واحترام جو مسلمان وحی کو دیتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، جس عقیدت سے وہ اسے حفظ کرتے ہیں اور محمد ﷺ کے زمانے سے اس کے نسخے موجود رہے ہیں اور آگے منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اس سے مزید یہ کہ زید کا نسخہ محمدؐ کے فورا بعد استعمال میں آگیا اور اس کے صحیح ہونے پر کوئی سوال نہیں ہے، اس سب کی موجودگی میں کسی کے ذہن میں یہ شک نہیں ہے کہ قرآن کے الفاظ وہی ہیں جو پیغمبر نے ادا کئے تھے۔

یہی مستشرق مزید لکھتا ہے:

> There is every probability that the work of zaid was executed faithfully and indeed the acceptance of the Quran by Ali and his party, the antagonists to Othman, is the guarantee of its genuinness.[2]

اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ زید ابن ثابت کا (جمع قرآن کے سلسلے میں) کیا ہوا کام بڑی ایمانداری سے تلاوتؐ کے لئے نافذ ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے اس متن قرآن کو قبول کرنا (اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا) جبکہ حضرت علی اور ان کے ساتھی (بقول اس مستشرق کے) حضرت عثمان کے مخالف تھے، یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ قرآن کا متن اصلی ہے۔

ان کے علاوہ بھی کئی ایک مستشرقین نے قرآن کی عدم تحریف کا اعتراف کیا ہے۔

Wherry لکھتے ہیں:

> The text of the Quran is the purest of all the works of a like antiquity.[3]

قرآن کا متن اپنے جیسی دیگر قدیم کتابوں کے متون کے مقابلے میں سے زیادہ اصل حالت میں ہے۔

پالمر اگرچہ عثمانی دور سے قبل کے قرآن میں تو کئی ایک شکوک پیدا کرتا ہے لیکن مصحف عثمانیؓ کی

(1) Menezes, 105

(2) IBID, 105

(3) Wherry, 349

تیاری کے بعد کے بارے میں لکھتا ہے۔

Othman's srecension has remained the authorised text .... from the time it was made until the present day.(1)

حضرت عثمان کا نظر ثانی شدہ نسخہ اس وقت سے جب سے تیار ہوا تسلیم شدہ متن رہا ہے۔

آرنلڈ (Arnold) لکھتے ہیں:

"The text of this reconsion substantly corrosponds to the utterences of Muhammad himself".(2)

حضرت عثمان کا نظر ثانی شدہ نسخہ اپنی اصل کے اعتبار سے اس نسخہ سے مطابقت رکھتا ہے جو حضرت محمد ﷺ نے تیار کیا تھا۔

---

(1) Palmer,P. LIX

(2) Arnold ,T.W, Preaching of Islam,constable,London,1913,p9

حرف آخر

گذشتہ ابواب میں ہم نے واضح کر دیا ہے کہ مستشرقین نے دینی، سیاسی اور معاشی محرکات کے تحت اسلام، حضور اکرم ﷺ اور قرآن مجید پر تحقیقات کی ہیں ان کے محرکات سیاسی ہوں یا معاشی، دینی ہوں یا علمی ان کے مقاصد مشترک ہی ہیں۔ ان کے طرز استدلال میں جزئی قسم کا فرق تو موجود ہے لیکن ان کے دلائل کا حاصل و مدعا ایک ہی ہے۔ [1] قرآن مجید کے حوالے سے ان کی تمام کاوشوں کا نقطۂ عروج اور نتیجہ یہ ہے کہ

1. قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں بلکہ حضور ﷺ کا کلام ہے۔ [2]
2. قرآن مجید کا وہ متن جو ابتداء میں تھا، اب نہ تو موجود ہے اور نہ ہی اس کا حاصل کر سکنا ممکن ہے۔ [3]

اول الذکر پہلو سے ہم نے دیکھا کہ مستشرقین اور مشرکین مکہ کے موقف میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کا نقطہ نگاہ بھی یہی تھا کہ قرآن مجید حضور اکرم ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے اور مستشرقین بھی یہی کہتے ہیں۔ ان کے اس نقطہ نگاہ کے پس منظر میں ایک بہت بڑا مقصد کارفرما ہے کہ قرآن پاک کو انسانی کلام قرار دے کر اسے عام انسانی تصنیف کے مقام پر لا کھڑا کیا جائے۔ اس نقطے کے ثابت ہو جانے کے بعد پھر قرآن مجید کے تمام امتیازات ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے تمام حربے اختیار کیے ہیں۔ اور تمام دلائل و شواہد کو بالائے طاق رکھا دیا۔

مستشرقین نے ایک پہلو سے مشرکین مکہ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مثلاً مشرکین کو کبھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ قرآن مجید اور دیگر معجزانہ پہلوؤں پر کوئی اعتراض کریں بلکہ ان کا طرز عمل تو ظاہر کرتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے صوتی و معنوی اعجاز کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے لیکن عہد حاضر میں مستشرقین نے اس کے تمام معجزانہ پہلوؤں کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے نقائص کی بزعم خویش نشاندہی کی ہے۔ ہم نے

---

(1) اس سلسلے میں کتاب ہذا کا باب اول، ص: 28-31 کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(2) باب پنجم کتاب ہذا، ص: 160-164

(3) باب نمبر آٹھ اور دس بالترتیب صفحات 243 تا 293، اور 338 تا 374 کتاب ہذا

مستشرقین کی اس سلسلے میں ہرزہ سرائیوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کرتے ہوئے ان کے تمام نظریات کے بارے میں واضح کر دیا ہے کہ اس قسم کے تمام اعتراضات دراصل ان کے تعصب کا شاخسانہ ہیں اور حقائق ان کے موقف کی تائید کی بجائے تردید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک طویل باب میں ہم نے مستشرقین کے اس قسم کے تمام اعتراضات اور ان کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

قرآن مجید کے متن کے غیر محفوظ ہونے کے بارے میں مستشرقین کے تمام افکار و نظریات درحقیقت چند اعتراضات کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ ان کے موقف کو اگر ہم ایک فقرے میں سمونا چاہیں تو وہ کچھ یوں ہے کہ

"قرآن مجید مکمل طور پر لکھا ہی نہیں گیا اور جتنا لکھا گیا تھا وہ بھی بہت حد تک ضائع ہو چکا ہے۔"[1]

ہم نے واضح کیا ہے کہ مستشرقین نے مندرجہ ذیل جگہوں سے متن قرآن مجید کی صحت پر اعتراضات کئے ہیں:

1. عہد نبوی میں قرآن پاک مکمل طور پر لکھا ہوا نہ تھا۔[2]
2. عہد صدیق اکبرؓ میں بھی مکمل قرآن مجید نہ لکھا جا سکا کیونکہ اس کے بہت سے حافظ شہید ہو گئے تھے اور ان حفاظ کو جو حصے یاد تھے وہ ان کے ساتھ ہی ضائع ہو گئے تھے۔[3]
3. "صدیقی مصحف" سرکاری اور متفقہ مصحف ثابت نہ ہوا اور لوگ نے اپنے اپنے نسخوں سے تلاوت کرتے رہے۔[4]
4. عہد عثمان میں بھی متفقہ نسخہ معرض وجود میں نہ آسکا۔ مصحف عثمانؓ بھی مکمل نہ تھا۔ اور قرآن مجید کے متن پر مشتمل بہت سے دیگر مصاحف کو جلا دینے سے قرآن کے بہت سے حصے اس وقت بھی ضائع کر دیئے گئے۔

اس کے علاوہ خود حضرت عثمانؓ (35ھ) نے اعتراف کیا تھا (بقول مستشرقین) کہ "میرے اس قرآن مجید میں کئی ایک غلطیاں ہیں۔"[5]

---

(1) عہد صدیق اکبر کے اعتراضات صفحہ 298 تا 302

(2) کتاب ہذا، ص: 244

(3) کتاب ہذا، ص: 321

(4) کتاب ہذا، ص: 305

(5) کتاب ہذا، ص: 338

نیز یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (35ھ) نے اپنی مرضی سے قرآن مجید کے متن میں تبدیلیاں کر دی تھیں۔ (1)

5. نسخ فی القرآن کی بنیاد پر مستشرقین کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا بہت سارا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔

"اختلاف مصاحف"، "سبعہ احرف" اور "اختلاف قرآت" کو بھی قرآن مجید کے متن میں اختلافات کی دلیل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

ہم نے ان تمام قسم کے اعتراضات کا جائزہ عقلی اور نقلی بنیادوں پر لیا ہے۔ ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ

مستشرقین کے تمام تر اعتراضات اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب سے لبریز ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے تحقیق کے مسلمہ اصولوں کی پرواہ کئے بغیر حقائق کو توڑ موڑ کر اپنے ذہن میں پہلے سے طے شدہ مقاصد کے حق میں استعمال کیا ہے۔

مستشرقین نے قرآن مجید کے متن کی صحت پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ کسی حد تک قرآن اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کو نہ سمجھنے اور درست اندازہ نہ ہونے کی بنا پر بھی ہو سکتے ہیں مثلاً دنیا میں تورات یا انجیل کا کوئی بھی حافظ موجود نہیں ہے۔ اور نہ کبھی موجود رہا ہے۔ وہ اس بات سے ہی ناآشنا ہیں کہ اتنی بڑی کتاب کو کسی نے حفظ کیا ہو گا یا حفظ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ اگر ہماری کتابوں کا کوئی حافظ نہیں ہے تو شاید کسی بھی کتاب کا حافظ موجود نہیں ہو سکتا۔

اسی قسم کی باتوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ مستشرقین نے تورات و انجیل پر قرآن مجید کو بھی قیاس کر لیا اور سمجھ بیٹھے کہ جس طرح ان کتابوں کا ایک متن جسے کتاب کہا جا سکے، (اس کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر) ایک طویل ارتقائی مرحلے سے گزرنے کے بعد معرض وجود میں آیا ہے۔

وہ سمجھے کہ قرآن کا متن بھی اسی طرح معرض وجود میں آیا ہو گا۔ حالانکہ یہاں تو اس قسم کے حالات ہی نہ تھے پہلے دن سے ہی لوگ اسے حفظ کرنے لگے۔ اس کی کتابت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر نگرانی کروائی گئی۔ جو متن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا اور جسے قرآن مجید کا نام دیا گیا وہ اول دن سے ہی موجود ہے۔ اس کی تلاش و جستجو کی ہر گز ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اسے تلاش کیا گیا۔

کتاب میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ

ان کے دلائل ظنی اور تخیلاتی ہیں۔ علم یقین اور اعتماد کا ہر جگہ فقدان دکھائی دیتا ہے۔

---

(1) کتاب ہذا، ص: 362

ولیم میور (1905ء) (W.MUIR)ہوں یا ہر شفیلڈ(Hirchfeld) ،رچرڈ بل (Richard Bell)ہوں یا منٹگمری واٹ (M.Watt) ہر دور اور ہر جگہ پر ہمیں ظن و تخمین ہی نظر آیا ہے۔ وہ واقعات کو اصل تاریخی سیاق وسباق میں پیش کرنے کی بجائے ہر واقعے کو اپنے متعینہ اور مخصوص مقاصد کے ثبوت کے لئے ایک مخصوص تناظر اور ماحول پیدا کر کے پیش کرتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق نتائج اخذ کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ حقائق کو کس طرح مسل رہے اور مسخ کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا مستشرقین کے علاوہ تمام اہل مغرب جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ بالعموم اس طرح ہوتے ہیں:

"May be" Might be, May have, Might have perhaps", "In my openion"

ظاہر ہے ایک طرف مسلمہ حقائق ہوں اور دوسری طرف اسی کے قیاسات، تو عقل بھی یہی کہتی ہے کہ مسلمات کے مقابلے میں ان قیاسات اور بے اعتمادی پر مبنی الفاظ کی کوئی وقعت نہیں ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک مکمل باب تحریر کیا ہے کہ مستشرقین نے جن مآخذ کی بنیاد پر قرآن مجید پر اعتراضات کئے ہیں وہ ناقابل اعتبار ہیں مسلمانوں کے ہاں تو ہر مضمون کی کتب کی درجہ بندی موجود ہے۔ راویوں کے درجات موجود ہیں۔ روایت ودرایت کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے لیکن مستشرقین نے اپنے اکثر وبیشتر اعتراضات ان کتابوں کے مندرجات کی بنیاد پر کئے ہیں جو مسلمانوں کے ہاں ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں۔ مثلاً وہ دمیری کی کتاب الحیوان سے تو استدلال کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے مطلب کی بات وہاں سے مل رہی ہوتی ہے لیکن لاتعداد معتبر کتب کی ان روایات سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جن سے ان کے موقف کی تردید ہو رہی ہوتی ہے۔ کتب حدیث کا چوتھا طبقہ ان کا پسندیدہ ماخذ ہے حالانکہ اس درجہ کی کتب حدیث سے اخذ روایت میں مسلمان محققین نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

غرض ہم نے واضح کیا ہے کہ مستشرقین قرآن پاک کے محفوظ ہونے کے بارے میں پائی جانے والی ثقہ اور معتبر کتب کی صحیح احادیث وروایات کو ماننے سے گریز کرتے ہیں لیکن واقدی کی روایات کو قدم قدم پر پیش کرتے ہیں۔[1]

اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ مستشرقین نے اپنے متقدم مستشرقین کی تحقیقات پر اکتفا کیا ہے۔ گویا اگر پہلے مستشرقین نے دانستہ یا لاعلمی یا کم علمی کی وجہ سے کوئی غلطی کی ہے تو بعد والوں نے اسے

(1) See Muir1, 6; Hirrekeld,9

مسلمات کی حیثیت دے دی اور یوں مستشرقین کے افکار کی عمارت ثریا تک کجی کا شکار ہوتی چلی گئی۔[1]

باب نمبر 2 میں مستشرقین کے ایسے اقوال نقل کئے ہیں جن میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ ہم غلط معلومات کی بنا پر مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں اور تعصب کا شکار رہے ہیں۔[2]

ظن و تخمین اور غلط و غیر معتبر ذرائع سے حاصل شدہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے افکار اعتدال و توازن سے بھی مکمل طور پر محروم ہیں۔ وہ تعصب اور جانبداری کا واضح طور پر مظاہرہ کرتے ہیں۔

وہ حقائق کو چھپاتے بھی ہیں اور مسخ بھی کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا ڈھنڈورا تو پیٹتے ہیں کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کریں لیکن ان کا عمل اس کے بالکل برعکس ثابت ہوا ہے۔ پہلے باب میں اس بات کا ذکر ہم نے خود مستشرقین ہی کے اقوال کی روشنی میں کیا ہے جن میں وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے بارے میں غیر جانبدرا نہیں رہ سکے۔

دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ مستشرقین نے مسلمانوں اور قرآن مجید کے خلاف دلائل پیش کرتے ہوئے جن عبارات و اقتباسات کا سہارا لیا ہے وہ سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً مستشرقین میں سے ہر شخص اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) الاتقان میں روایت نقل کرتے ہیں کہ

"حضور ﷺ کی وفات ہوگئی حالانکہ قرآن مجید لکھا نہیں گیا تھا۔"[3]

لیکن یہ لوگ اسی باب میں موجود ان روایات سے صرف نظر کر لیتے ہیں جن میں ان اصحاب کے ناموں کا ذکر ہے جنہوں نے عہد نبوی ﷺ میں قرآن مجید لکھا بھی تھا اور حفظ بھی کیا تھا۔[4] اسی طرح وہ یہ روایات تو بیان کرتے ہیں کہ

"سورۃ الاحزاب، سورۃ البقرۃ جتنی تھی۔" اور "کئی سورتیں پہلے پہل قرآن مجید میں موجود تھیں جو اب موجود نہیں ہیں۔" اور حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ (73ھ) فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے پورا قرآن مجید پالیا بلکہ وہ یہ کہے کہ مجھے جس قدر مل سکا میں نے پالیا۔

لیکن اس کے ساتھ وہ یہ نہیں بتاتے کہ علامہ جلال الدین سیوطی (911ھ) نے ان روایات کا ذکر

---

(1) کتاب ہذا: ص 82

(2) دیکھیے کتاب ہذا باب دوم، ص: 58-68

(3) الاتقان، 76/1

(4) ایضاً

اس باب میں کیا ہے جس میں انہوں نے ایسی آیات کا ذکر کیا ہے جن کا حکم اور تلاوت اب دونوں منسوخ ہو چکے ہیں۔ گویا یہ حصے اب قرآن میں ہی نہیں۔[1]

"سبعہ احرف" کے باب میں واضح کیا ہے کہ اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے دلائل کی بنیاد پر ہمارا ثمرہ تحقیق یہ ہے کہ "سبعہ احرف "کے بارے میں مستشرقین کا یہ موقف ہرگز درست نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (35ھ) نے قرآن مجید کا ۷/۶ حصہ ضائع کر دیا تھا جو کچھ قرآن مجید تھا، اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا۔ آپؓ نے جو کچھ قرآن مجید میں شامل نہیں کیا وہ دراصل قرآن مجید تھا ہی نہیں بلکہ وہ اس طرح کے الفاظ تھے جن سے قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض جگہوں پر ضرورت اور مجبوری کے تحت وقتی طور پر دی تھی۔ اسی طرح اختلاف قرأت کے بارے میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت اسی قرأت کے مطابق جائز ہے جس کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خدا تعالیٰ کے حکم سے دی تھی اور اس کی اجازت ثابت شدہ تھی۔

(1) ایضاً

مصادر و مراجع

1. قرآن مجید، آسان ترجمہ قرآن مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی۔
2. آلوسی، محمود آفندی، سید، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، داراحیاء التراث الاسلامیہ، بیروت، دوسرا ایڈیشن۔
3. آلوسی، محمود، سید بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، قاہرہ، 1342ھ۔
4. ابن اثیر الجزری، الکامل فی التاریخ، ادارہ الطباعہ المنیریہ، مصر، 1348ھ۔
5. احمد بن حنبل، امام، المسند، دائرۃ المعارف، دکن، 1340ھ۔
6. انور شاہ کشمیری، علامہ، فیض الباری، مطبع حجازی، قاہرہ، 1358ھ۔
7. باقلانی، ابی بکر، محمد بن الطیب، اعجاز القرآن دار المعارف، مصر، دس۔ن۔
8. بخاری، محمد بن اسماعیل، امام، الجامع الصحیح، ادارہ الطباعہ المنیر، مصر، 1348ھ۔
9. بلاذری، ابو جعفر احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، مکتبہ النہضۃ المصریہ، قاہرہ، دس، ن۔
10. البلاغی، جواد محمد، آلاء الرحمٰن فی تفسیر القرآن، مطبع العرفان، تہران۔
11. تبریزی، ولی الدین، محمد بن عبد اللہ الخطیب، مشکوٰۃ المصابیح، الکتب الاسلامی للطباعہ والنشر، دمشق، 1380ھ۔
12. ترمذی، محمد بن عیسیٰ، امام، سنن ترمذی، دمشق، 1965ھ۔
13. ثناء اللہ، قاضی، التفسیر المظہری، ندوۃ المصنفین، دہلی۔
14. الجزری، ابو الخیر، النشر فی القراءات العشر، المکتبہ التجاریہ، مصر، دس۔ن۔
15. جواد مغنیہ، التفسیر الکاشف، دار العلم للملایین، بیروت، 1968ھ۔
16. حاکم، ابو عبد اللہ محمد النیساپوری، المستدرک علی الصحیحین فی الحدیث، النصر الحدیثیہ، ریاض۔
17. ابن حزم، المحلّٰی، ادارہ الطباعہ المنیریہ، مصر، 1347ھ۔
18. ایضاً، کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل، مطبع الادبیہ، مصر، 1320ھ۔
19. الحلبی، علی بن برہان، السیرۃ الحلبیۃ، المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ، مصر، 1382ھ۔
20. خازن، علاؤ الدین علی بن محمد، لباب التاویل فی معانی، مطبع خیریہ، قاہرہ، 1356ھ۔

21. ابن خلدون، عبد الرحمٰن، علامہ، مقدمہ، س،ن۔
22. الخوئی، ابو القاسم موسوی، معجم رجال الحدیث وتفصیل طبقات الرواۃ، لبنان، دوسرا ایڈیشن۔
23. ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، مکتبہ رحمانیہ، مصر، 1355ھ۔
24. ابو داؤد، سلیمان بن الاشعث السجتانی، سنن ابو داؤد، مطبع السعادۃ، مصر، 1369ھ۔
25. ذہبی، شمس الدین ابی عبد اللہ، میزان الاعتدال، داراحیاء الکتب العربیہ، مصر، 1963ھ۔
26. رازی، فخر الدین، امام، مفاتیح الغیب، مطبہ البہیہ، قاہرہ، 1324ھ۔
27. راغب اصفہانی، امام، محمد بن ابی الفضل، المفردات فی غریب القرآن، مطبعہ الیمنیہ، مصر، 1380ھ۔
28. الزاوی، طاہر احمد، القاموس المحیط، دارالمعرفۃ، بیروت۔ س۔ن۔
29. زرقانی، عبد العظیم، محمد، مناہل العرفان، داراحیاء الکتب العربیہ، داراحیاء التراث العربی، س،ن۔
30. ایضاً، شرح زرقانی علی مؤطا امام مالک۔
31. زرکشی، بدر الدین، محمد بن عبد اللہ، البرہان فی علوم القرآن، دارالحیاء الکتب العربیہ، 1957ھ۔
32. زرکلی، خیرالدین، الاعلام، المطبعۃ العربیہ، مصر، 1927ھ۔
33. زیات، احمد حسن، تاریخ ادب العربی، مطبع الرسالۃ، 1955ھ۔
34. السباعی، مصطفیٰ، السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی، مکتبہ دارالعربیہ، قاہرہ، 1961ھ۔
35. ابن سعد، ابو عبد اللہ، محمد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، 1960ھ۔
36. سعید، الخوری، سعید، اقرب الموارد فی فصح العربیہ والشوارد، لبنان، س ن۔
37. سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، مطبعہ حجازی، قاہرہ، س ن۔
38. ایضاً، تاریخ الخلفاء، نور محمد کارخانہ تجارت، کراچی، س ن۔
39. ایضاً، تدریب الراوی، دارالکتب الحدیثہ، قاہرہ، 1944ھ۔
40. ایضاً، الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور، دارالکتب العراقیہ، بغداد، 1377ھ۔
41. شمس الدین، مولانا، انوار القرآن فی اسرار القرآن، جامعہ صدیقیہ، گوجرانوالہ، 1979ھ۔
42. الصابونی، علی، التبیان فی علوم القرآن، بیروت، 1980ھ۔
43. صبحی صالح، ڈاکٹر، مباحث فی علوم القرآن، بیروت، 1979ھ۔
44. ایضاً، علوم الحدیث ومصطلحہ، مطبع جامعہ دمشق، 1963ھ۔

.45 طاش کبریٰ زادہ، احمد بن مصطفیٰ، مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ، دائرۃ معارف عثمانیہ، حیدر آباد 1977ھ۔
.46 طاہر الکردی، تاریخ القرآن و غرائب رسمہ، قاہرہ، 1953ھ۔
.47 طبرسی، ابوعلی الفاضل بن الحسن، مجمع البیان، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، 1961ھ۔
.48 طبری، محمد بن جریر بن یزید، ابو جعفر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار المعارف، قاہرہ، 1957ھ۔
.49 طنطاوی، جوہری، تفسیر الجواہر، مصطفی البابی، قاہرہ، 1350ھ۔
.50 عبد البر، ابی عمر یوسف بن عبد اللہ، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، مکتبہ نہضہ، مصر، س ن۔
.51 عبد الستار، الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، قاہرہ، 1967ھ۔
.52 عبد القہار، داؤد، الاستشراق والدراسات الاسلامیہ، العانی، بغداد، 1973ھ۔
.53 عبد اللہ، مولانا، قم الاقمار شرح نور الانوار، مطبع علیمی دہلی، 1946ھ۔
.54 عسقلانی، ابن حجر، حافظ، فتح الباری شرح البخاری، المطبعۃ البھیہ، قاہرہ، 1948ھ۔
.55 ایضاً، تقریب التہذیب، دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور، 1985ھ۔
.56 ایضاً، شرح نخبۃ الفکر، مکتبہ علیمی دہلی، 1946ھ۔
.57 ایضاً، لسان المیزان، مجلس دائرہ المعارف النظامیہ، حیدر آباد دکن 1331ھ۔
.58 العقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف، مصر، 1964ھ۔
.59 علی المتقی، کنز العمال، مؤسسہ الرسالہ، بیروت، 1979ھ۔
.60 عینی، بدر الدین، علامہ، عمدۃ القاری، الطباعۃ المنیریہ، مصر، قاہرہ، 1348ھ۔
.61 غوث، ناظر الدین، محمد، نثر المرجان فی رسم نظم القرآن، مطبعہ عثمان، حیدر آباد س ن۔
.62 فواد عبد الباقی، معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، مطبعہ دار الکتب المصریہ، قاہرہ، 1364ھ۔
.63 قرطبی، ابی عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، قاہرہ، 1967ھ۔
.64 قسطلانی، ارشاد الساری، مطبع بولاق، مصر، 1323ھ۔
.65 ابن قیم، حافظ، زاد المسیر، مکتب اسلامی، بیروت، 1407ھ۔
.66 ابن کثیر، عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمرو، تفسیر القرآن العظیم۔
.67 ایضاً، البدایہ والنہایہ، مکتبہ المعارف، بیروت، 1977ھ۔

68. کیرانوی، رحمت اللہ، مولانا، اظہار الحق (اردو ترجمہ بائبل سے قرآن تک)، مترجم اکبر علی، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، 1389ھ۔
69. الکلینی، ابوجعفر محمد بن یعقوب، اصول من الکافی، مکتبہ العرف، تہران، 1381ھ۔
70. ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، دار احیاء الکتب العربیہ، قاہرہ، 1372ھ۔
71. مسلم بن الحجاج القشیری، امام، الجامع الصحیح، مطبع محمد علی، مصر، 1334ھ۔
72. نومیں معلوف الیسوعی، لمنجد فی اللغۃ والادب والعلوم، مطبعہ الکاثولیکیہ، بیروت، 1927ھ۔
73. مناع القطان، مباحث فی علوم القرآن، موسستہ الرسالۃ، بیروت، 1978ھ۔
74. میر محمدی، ابوالفضل، بحوث فی تاریخ القرآن، دار التعارف للمطبوعات، شام، 1980ھ۔
75. نجار، عبدالحلیم، مذاہب التفسیر الاسلامی، مطبع الجانجی، مصر، 1955ھ۔
76. نووی، امام، المنہاج شرح صحیح مسلم۔
77. ابن الندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست، المکتبہ التجاریہ الکبریٰ، مصر۔
78. وحید الزمان، علامہ، القاموس الفرید، صابری دار الکتب، لاہور، 1983ھ۔
79. ہاوا، جے، جی، الفرائد الدریہ عربی الکلیزی، کیتھولک پریس بیروت، 1964ھ۔
80. ہراوی، حسین، محمد المستشرقون والسلام، المجلس الاعلیٰ للشون الاسلامیہ، 1965ھ۔
81. الہیثمی، نور الدین، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، دار الکتاب العربی۔
82. ہیکل، حسین، حیاۃ محمد، مکتبہ النہضۃ العربیہ، قاہرہ، 1947ھ۔
83. ابویوسف، امام، کتاب الخراج، ادارہ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، 1987ھ۔

فارسی کتب

1. عبدالحق، محدث دہلوی، عجالہ نافعہ، مطبع محمدی، لاہور، 1399ھ۔
2. عبدالعزیز، محدث، دہلوی، بستان المحدثین، مطبع مجتبائی، دہلی، 1898ھ۔
3. ولی اللہ، شاہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔
4. ایضاً، المصفیٰ شرح المؤطا، مطبع مرتضوی، دہلی، س ن۔

مصادر مراجع (اردو)

1. آزاد، ابوالکلام، مولانا، ترجمان القرآن،
2. اجمل، محمد، ڈاکٹر، ترتیب نزول قرآن شریف، کتب خانہ عزیزیہ، دہلی، 1941ء۔
3. اسماعیل پانی پتی، اسہل الموارد، کراچی، س۔ن۔
4. اشرف علی تھانوی، مولانا، بیان القرآن، ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، کراچی۔
5. افغانی، شمس الحق، علوم القرآن، امجد اکیڈمی، لاہور، س۔ن۔
6. امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن، 2012ء۔
7. برکت اللہ، پادری، صحت کتب مقدسہ، عربک سوسائٹی، لاہور 1964ء۔
8. ایضاً، توضیح القرآن، رلیجن بک سوسائٹی، 1964ء۔
9. ایضاً، مسیحیت کی عالمگیری اور دین فطرت، رلیجس بک سوسائٹی 1965ء۔
10. پال، سلطان محمد، میں مسیحی کیوں ہوا؟ رلیجس بک سوسائٹی 1962ء۔
11. تقی عثمانی، مولانا، علوم القرآن، مکتبہ دار العلوم، کراچی 1936ء۔
12. ثناء اللہ، امرتسری، مولانا، اسلام اور مسیحیت، جمعیت الحدیث، لاہور 1960ء۔
13. ایضاً، ترک اسلام، جمعیت اہلحدیث، امرتسر، 1940ء۔
14. ایضاً، جوابات نصاریٰ، ندوہ المحدثین، گوجرانوالہ 1948ء۔
15. ایضاً، مقدس رسول، ندوۃ المحدثین، گوجرانوالہ 1902ء۔
16. ایضاً، الہامی کتب، اہل، حدیث پریس، امرتسر، 1909ء۔
17. ایضاً، حقائق قرآن، جمعیت اہلحدیث امرتسر، 1942ء۔
18. ایضاً، معارف قرآن، جمعیت الحدیث امرتسر 1940ء۔
19. حامدی، خلیل احمد، نظام اسلامی مشاہیر کی نظر میں، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، 1963ء۔
20. ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام کراچی 1976ء۔
21. حسین علی، مولانا، جواہر القرآن، کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی۔
22. حقانی، عبدالحق، البیان فی علوم القرآن، دار الاشاعت تفسیر حقانی، دہلی 1932ء۔

23. ایضاً، تفسیر حقانی، میر محمد کتب خانہ، کراچی۔
24. حمید اللہ ڈاکٹر، خطباتِ بہاول پور، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، 1401ھ۔
25. خالد علوی، ڈاکٹر، اصول الحدیث مصطلحات وعلوم، الفیصل، 2003ء۔
26. خلیل الرحمان، ترتیب القرآن (ترجمہ و خلاصہ البیان فی تالیف القرآن) دارالکتب لاہور 1906ء۔
27. خویشگی، محمد عبداللہ، فرہنگ عامرہ، کراچی، 1957ء۔
28. داناپوری، ابوالبرکات، عبدالرؤف، اصح السیرفی ھدی خیرالبشر، نور محمد اصح المطابع، کراچی 1932ء۔
29. دریابادی، عبدالماجد، مولانا، تفسیر ماجدی، مجلس نشریات قرآن کراچی۔
30. رحمانی، عبداللطیف، مولانا، تاریخ القرآن، پروگریسو بکس لاہور 1983ء۔
31. رضی الاسلام ندوی (مترجم) روایات سیرت کا تنقیدی جائزہ، دالنوادر، لاہور، 2105ء۔
32. رفیع الدین، ڈاکٹر، اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار، دارالاشاعۃ اسلامیہ لاہور 1969ء۔
33. زاہد الحسینی، قاضی، ضرورۃ القرآن، حجازی پریس لاہور 1963ء۔
34. سعید احمد، مولانا، وحی الہیٰ، ندوۃ المصنفین دہلی، 1952ء۔
35. ایضاً، فہم قرآن، ادراۃ اسلامیہ، لاہور، 1982۔
36. سعیدی، غلام رسول، مولانا، تبیان القرآن، فرید بک سٹال، لاہور۔
37. ایضاً، شرح صحیح مسلم، فرید بک سٹال، لاہور، 2002ء۔
38. ایضاً، نعم الباری، شرح صحیح بخاری، فرید بک سٹال، 2012ء۔
39. سیف بنارسی، جمع القرآن والاحادیث، آل انڈیا اہل حدیث دارالاشاعت، لاہور 1936ء۔
40. شبلی، نعمانی، مولانا، سیرۃ النبیؐ، اعظم گڑھ، 1332ء۔
41. شبیر احمد، عثمانی، مولانا، اعجاز القرآن، ادارہ اسلامیات، لاہور 1975ء۔
42. ایضاً، فوائد القرآن، المکتبۃ العربیۃ السعودیہ۔
43. صدیق حسن، سیّد، جمع وتدوین قرآن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ 1964ء۔
44. صلاح الدین یوسف، تفسیر احسن البیان، دارالسلام، لاہور۔
45. ضربت عیسوی، تاویل القرآن، پنجاب ریلیجس سوسائٹی لاہور 1921ء۔
46. طالب کرپالوی، مسئلہ تحریف القرآن، جعفریہ دارالتبلیغ، لاہور 1982ء۔

.47 طاہر محمد، التعوّذ فی الاسلام، مطبع قاسمی، دیوبند، ہندوستان 1853ء۔

.48 عبد الحکیم، البنات، لاہور س۔ن۔

.49 عبد السلام ندوی، اسوہ صحابہؓ، مطبع اعظم گڑھ، 1984ء۔

.50 عبد الکریم، مولانا، تحذیر الانام عن تغیر رسم الخط من مصحف الامام، مطبع کریمی، مدراس (س۔ن)۔

.51 عطاء اللہ شیخ، اقبال نامہ، شیخ محمد اشرف، لاہور۔

.52 علی نقی، سید، مقدمہ تفسیر القرآن، ادارہ علمیہ، لاہور، 1380ھ۔

.53 غلام ربانی، مولانا، تدوین قرآن (ازافادات مولانا مناظر احسن گیلانی) مکتبہ البرہان، دہلی، 1951ء۔

.54 فراہی، حمید الدین، مولانا، مجموعہ تفاسیر فراہی (أردو) مکتبہ مرکزی جماعت اسلامی، لاہور، 1955ء۔

.55 فنڈر، میزان الحق، پنجاب رلیجس بک سوسائٹی لاہور، 1892ء۔

.56 فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، لاہور، (س،ن)۔

.57 کاندھلوی، محمد، مالک، منازل العرفان، ناشران قرآن، لاہور، (س،ن)۔

.58 کیلانی، عبد الرحمٰن، تیسیر القرآن، مکتبہ السلّام، 1431ھ۔

.59 گستاولی بان، تمدن عرب (اردو ترجمہ، مترجم سید علی بلگرامی) مطبع مفید عام آگرہ، 1818ء۔

.60 گوہر رحمٰن، علوم القرآن، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان۔

.61 محمد ادریس کاندھلوی، مولانا، معارف القرآن، مکتبہ المعارف، شہداد پور۔

.62 ایضاً، سیرت المصطفیٰ، مکتبہ عثمانیہ، لاہور۔

.63 محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 2001ء۔

.64 محمد علی، القول الفرقان فی توضیح حقائق القرآن، پونا۔

.65 محمود احمد، غازی، ڈاکٹر، محاضرات قرآنی، الفیصل، لاہور، 1908ء۔

.66 مودودی، ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔

.67 ایضاً، سیرت سرور عالم ﷺ، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1978ء۔

.68 ایضاً، یہودیت و نصرانیت، البدر پبلیکشنز، لاہور، 1976ء۔

.69 نادر رضا، ڈاکٹر، پاکستان میں مسیحیت، مسلم اکیڈمی، لاہور، 1979ء۔

70. ناصر، کے ایل، پادری، قرآن شریف کے متن کا تاریخی مطالعہ، گوجرانولہ (س۔ن)۔

71. نانوتوی، محمد قاسم، مولانا، الانتصار الاسلام، کتب خانہ امدادیہ، دیوبند، 1940ء۔

72. نواب علی، تاریخ صحف سماوی، مکتبہ افکار، کراچی، 1918ء۔

73. نیازی، نذیر، سید، مکتوباتِ اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی، 1957ء۔

74. وارث سرہندی، علمی اُردو لغات، علمی کتب خانہ، لاہور، 1976ء۔

75. ولی اللہ شاہ، الفوزالکبیر فی اصول التفسیر (اُردو ترجمہ مترجم رشید احمد انصاری)، نذیر سنز، لاہور۔

76. ہاشمی، عبدالقدوس، مولانا، مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلامی، مکتبہ ملی، کراچی۔

77. یعقوب حسن، کشاف الہدیٰ، دفتر اشاعت، مدراس، س۔ن۔

رسائل وجرائد

1. وحیدالدین، مولانا، قرآن نبی کریم ﷺ کا ایک معجزہ، ماہنامہ الحق، دسمبر 1983ء۔

2. اصلاحی، شرف الدین، اسلام اور مستشرقین، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی 1982ء۔

3. حبیب ندوی، سید، اسلام اور مستشرقین، معارف اعظم گڑھ، مئی، جون، جولائی 1983ء۔

فہرست آیات

فہرست احادیث

فہرست اعلام

کچھ اس کتاب کے بارے میں

''حفاظت قرآن مجید اور مستشرقین'' کے ابتدائی حصہ میں تحریک استشراق کے پس منظر، اس کی تاریخ اور مستشرقین کے اصول تحقیق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکے۔ ان کے ماخذ کمزور، نا قابل اعتبار اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ان کے ہاں معتبر اور غیر معتبر ماخذ میں کوئی تمیز نہیں۔ بلکہ اگر تحقیق کے بنیادی مسلمہ اصولوں پر ان کی تحقیقات کو پرکھا جائے تو اسلام پر تحقیقات اس عام معیار پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ اس کتاب میں قرآن مجید، حدیث نبویؐ، سیرت طیبہ اور تاریخ اسلام میں سے حوالوں کے ساتھ واقعاتی شواہد سے بھی مستشرقین کے موقف کی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان کے موقف کا رد خالص عقلی اور واقعاتی دلائل سے بھی کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اسلامی نصوص کو تو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے ان کے رد کے لئے واقعاتی تاریخی اور عقلی دلائل ہی کارگر ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اسلامی ماخذ کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب وہ ان ماخذ سے حاصل شدہ مواد کو مسخ کر کے پیش کر کے اپنے موقف کی تائید کے لئے دلائل گھڑتے ہیں تو انہیں اسلامی ماخذ سے پیش کیے جانے والے دلائل جو ان کے خلاف جاتے ہیں، کو بھی قبول کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو قبول فرمائے۔

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

ISBN: 978-969-9730-33-7
9 789699 730337

ملنے کا پتہ
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

کتاب سرائے
پبلشرز' ڈسٹری بیوٹرز' ایکسپورٹرز' شیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ پاکستان
فون: 0092-42-37239884-37320318
ای میل: kitabsaray@hotmail.com